

نومبر 2017

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع



بہنوں کا اپنا ماہنامہ

سکرا

رکن آل پاکستان شعور صحافتی
رکن پرنسپل آف پاکستان خیرات و خیرات

MEMBER
APNS
CPNE

باقی و میراثی
مسیح
میر و شہنشاہ
میر و شہنشاہ
میر و شہنشاہ
میر و شہنشاہ
میر و شہنشاہ

خط و کتابت لکھیے

ماہنامہ شمع

37 - اردو بازار کراچی





- 34 رشتہ و رشتہ 'مجھے روشنی'
74 عطیہ خالص 'یہ جہاں'
212 سنو اتم لوٹ آنا، ام ایمان قاضی



- 58 نعیمہ ساز 'متسا اشنا'
64 منشاعن علی 'دل برائے فروخت'
170 رقا العین مکتبہ 'سود و زایل کا حساب'
92 سمیرا فضا 'پیارا زندگی'



- 259 شبنم رومانی
260 جیلانی کامران
259 اختر لکھنوی
260 کلیم عاجز

غزل
اظہار
غزل
غزل

- 10 رضیہ جمیل
11 پروفیسر اسرار احمد سہاروی
11 اختر شیرانی

پہلی شعاع،
حمد،
نعت،
نئی کی باتیں

- 12 ادارہ



- 17 شاہین رشید
269 شاہین رشید
273 طی الف

بندھن،
دستک،
جب تجھ سے نانا



- 238 عفت محمد ہار

خوب شیشے کا



- 96 سلویہ سیف اللہ
180 شازیہ جمال الملک
126 سدرہ حیات

شہری دھوپ،
اتنی سی بات،
کچھ خواب ہیں

ذرا سا لکھنا ایک گیت کی جگہ پر

پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا و افریقہ، یورپ --- 8000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع و اجازت کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی اعزاز سے نوازا نہیں کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی فی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹھیکیل اور سلسلہ وار قطع کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



276	امت الصور	تاریخ کے جھوٹے	22	رضیہ جمیل	خط آب کے
287	خالہ جیلانی	تو سیم کے یگانہ	261	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خو بصورت بننے	283	واصفہ ہیل	ایٹینہ خائے میں
			264	شگفتہ جاہ	یا لول سے خوشبو لے
			267	خالہ جیلانی	کھٹا کسی پہ

نومبر 2017
جلد 32 نمبر 3
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: نامیہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی

رضیہ جمیل غلوں حسن پر تنگ پرس سے چھپوا کر شائع کیا - مقامی ایڈیٹر: سی ایچ ایس سوانی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



لٹائے سجدے نہ کیوں آساں مدینے میں
رسول پاک کا ہے آستان مدینے میں

قدم بڑھائے بلور ہروان متزلزل ثنوق
ہے ابر رحمت حق گفتاں مدینے میں

دردِ رسول کے فذوں کی گر تلاش نہیں
تو کس کو ڈھونڈتی پھرتی ہے کہکشاں مدینے میں

قدم اُٹھائے ادب سے ذرا نسیم سحر
ہیں محو خواب شرِ دجہاں مدینے میں

مدینے جلتے ہیں بیری میں لوگ سب اختر
مزل ہے کاٹ دو عمر جواں مدینے میں

اختر شیرانی

قدے قدے میں نہاں سحر ہے زیبائی کا
کوئی دیکھے تو تیرا ذوق خود آرائی کا

جلوہ دیکھا نہ کیا حُسن کی یکتائی کا
حوصلہ دیکھ لیا ہم نے تماشاں کی

قدہ قدہ مجھے تاب نظر آتا ہے
کیا کرشمہ ہے تیرے حُسن کی رعنائی کا

دلِ مایوس تمنا کو سہارا مل جائے
کچھ اشلرہ ہو میرے غم کی پذیرائی کا

خیرہ چشمی نے ہمیں کر دیا رسوا اسرار
حق ادا ہو نہ سکا ہم سے جبینِ سائی کا

پروفیسر اسرار احمد سہاوردی

ادکاری کی باتیں

دوسروں کو حقیر جاننا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل
میں ایک رائی کے برابر بھی کبر ہو گا۔“
ایک آدمی نے عرض کیا: ایک آدمی اس بات کو پسند
کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کی جوتی اچھی ہو (کیا
یہ بھی کبر ہے؟)

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ
تعالیٰ خوب صورت ہے، خوب صورتی کو پسند فرماتا
ہے۔ کبر متحق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔“
(مسلم)

کسی کو جنسی کہنا

حضرت جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے
روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”ایک آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں
فحش کو نہیں بخشے گا۔ تو اللہ عزوجل نے فرمایا: کون
ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں
فحش کو نہیں بخشوں گا۔ بے شک میں نے اس کو بخش
دیا اور تیرے عمل میں نے بڑا کر دیے۔“ (مسلم)
فائدہ: بعض لوگوں کو اپنی عبادت اور زہد و تقویٰ پر
گھمنڈ ہو جاتا ہے جو انہیں دوسروں کی بابت بدگمانی میں
جھٹکا دیتا ہے اور وہ بڑے یقین سے اس بات کا اظہار
کر دیتے ہیں کہ فلاں فحش کو تو اللہ نے بھی معاف
نہیں کیا۔

حالاںکہ یہ اللہ کی شان میں بے ادبی کا مظاہرہ اور اپنی

بابت حد سے زیادہ خوش گمانی کا نتیجہ ہے۔ یہ رویہ اللہ
کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس عابد و زاہد و متقی
کے سارے عمل برباد کر کے اسے جہنم میں پھینک
دے اور اس گناہ گار کو معاف کر کے جنت میں بھیج
دے جس کی بابت یہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ اسے اللہ
معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے انسان کو اپنی عبادت پر
گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہیں
سمجھنا چاہیے۔

مسلمان کی تکلیف پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”مومن تو بھائی بھائی ہیں۔“
(الحجرات-10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک وہ لوگ جو اللہ
ایمان کے اندر بے حیالی کے پھیلانے کو پسند کرتے
ہیں، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب
ہے۔“ (النور-19)

نسب میں طعن کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو
بغیر قصور کے تکلیف دیتے ہیں، یقیناً انہوں نے
بستان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔“ (الاحزاب-58)
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں جو ان کے کفر کا
باعث ہیں: نسب میں طعن کرنا اور فوت شدہ پر بین
کرنا۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- یہ دونوں گناہ ایسے ہیں کہ اگر انسان انہیں حلال سمجھ کر ان کا ارتکاب کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، تاہم بشری کمزوری کی وجہ سے ان کا صدور سخت کبیرہ گناہ ہے۔

2- نسب میں طعنہ زنی کا مطلب ہے کہ کسی شخص کو اس کی تحقیر و توہین کی نیت سے کہا جائے کہ تیرا باپ تو فلاں کام کرتا ہے، تیری ماں تو ایسی دہی ہے یا تو جولاہا، لوبار، دھولی اور موچی وغیرہ ہے۔ پیشوں کی وجہ سے بھی کسی خاندان یا شخص کو حقیر سمجھنا طعن فی النسب ہی کی ایک صورت ہے۔

3- نوحہ و تلمیح (بین کرنے) کا مطلب : مودے کے اوصاف بیان کر کر کے رونا پشنا اور زور زور سے چیخنا اور رونا پلا کرنا ہے۔

جعل سازی اور دھوکا دہی کی ممانعت

مسلمان پر ہتھیار اٹھانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے، وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں اور جو ہمیں دھوکا و فریب دے، وہ ہم میں سے نہیں۔“ (مسلم)

دھوکا دہی

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلے کے ایک ڈھیر پر سے گزر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ کی انگلیوں نے تری محسوس کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

”اے غلے والے! یہ کیا ہے؟“

اس نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! اسے بارش پونجی ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو تو نے اس (بھگے ہوئے حصے) کو غلے کے اوپر کیوں نہ کر دیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ (یاد رکھ) جس نے ہم سے دھوکا کیا، وہ ہم میں سے نہیں۔“

فوائد و مسائل :

1- ہتھیار اٹھانے سے مراد مسلمانوں کی جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کرنا، یا بغیر کسی وجہ کے کسی مسلمان پر تلوار، بندوق، ماؤزر اور کلاشکوف وغیرہ اٹھانا اور اسے مار دینا ہے، جیسے آج کل بد قسمتی سے یہ دہشت گردی عام ہے۔

2- جعل سازی اور دھوکا دہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک معنوی ہے، جیسے باطل پر حق کا غلاف چڑھا دینا اور دوسری مادی اور ظاہری ہیں، جیسے سوڈے میں کوئی عیب ہو تو اسے ظاہر نہ کرنا، اچھے مال میں ردی اور گھٹیا مال کی آمیزش کر دینا، سوڈے میں کسی اور چیز کی ملاوٹ کر دینا تاکہ اس کا وزن زیادہ ہو جائے، اس طرح کی اور متعدد صورتیں۔

3- ہم میں سے نہیں کا مطلب ہے، مسلمانوں کے طریقے پر نہیں۔ اس کا یہ کروار مومنانہ نہیں، غیر مومنانہ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو ہر قسم کی دھوکا دہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

قیمت بڑھانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خریداری کی نیت کے بغیر بولی میں اضافہ مت کرو۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : انسان کی نیت خریدنے کی نہ ہو، پھر بھی قیمت بڑھا کر بولی لگائے تو ظاہر بات ہے کہ اس سے دوسرا خریدار دھوکا کھا جائے گا اور اسے اصل قیمت سے کہیں زیادہ قیمت پر وہ چیز خریدنی پڑے گی۔ گویا یہ بھی دھوکا دہی کی ایک صورت ہے۔

ذمہ داری

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ وہ خرید و فروخت میں دھوکا کھا جاتا ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس سے تو سودا کرے تو یہ کہہ دیا کر کہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : مذکورہ الفاظ کہنے سے مقصد ثبوت خیارات کا تحقق ہے، یعنی اگر سودے میں کوئی دھوکا اور فریب ہو تو خریدار کو سودا واپس کرنے کا حق ہو گا۔ بیچنے والوں کو بھی اس حق کا احترام کرنا پڑے گا۔

مالک کے خلاف کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص کسی کی بیوی یا اس کے غلام کو دھوکا دے تو وہ ہم میں سے نہیں۔“ (ابوداؤد)

فائدہ : کسی کی بیوی یا غلام کو دھوکا دینا اور مالک کے خلاف کر دینا اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے متنفر کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ مومن کی شان تو اصلاح بین الناس ہے نہ کہ فساد بین الناس (لوگوں کے درمیان فساد ڈالنا)۔

بد عمدی کا حرام ہونا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔“

نیز فرمایا: ”عہد کو پورا کرو“ اس لیے کہ عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔“

(الاسراء-34)

فائدہ آیات : ایک عہد تو وہ ہے جو انسان آپس میں کرتے ہیں۔ اور ایک عہد وہ ہے جو اللہ نے انسانوں سے لیا ہے کہ وہ اس کی توحید و ربوبیت کا اقرار کریں اور اس کے احکام و ہدایات کے مطابق زندگی

گزاریں۔ ان دونوں قسم کے عہدوں کی پاس داری ضروری ہے اور ان میں کوئی پر قیامت والے دن باز ہاتھ نہیں ہوگی۔

منافق

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”چار خصلتیں ہیں جن میں وہ ہوں گی وہ خالص منافق ہو گا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔“

1- جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

2- جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

3- جب کوئی عہد کرے تو بے وفائی کرے۔

4- اور جب کسی سے جھگڑے تو بد زبانی کرے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1- یہ منافقانہ خصلتیں ہیں، ایک مومن کو ان تمام خصلتوں سے پاک ہونا چاہیے۔

2- اخلاق فاضلہ کا ایمان سے گہرا تعلق ہے، جہاں ایمان ہوگا، وہاں حسن اخلاق کی بھی جلوہ گری ہوگی اور جہاں ایمان نہیں ہوگا، اخلاق کا بھی نقصان ہوگا۔

عہد توڑنا

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”قیامت والے دن ہر عہد توڑنے والے کے لیے ایک جھنڈا ہوگا، کہا جائے گا کہ یہ فلاں کی بد عمدی کا نشان ہے۔“

(بخاری و مسلم)

فائدہ : غدر سے مراد عہد توڑنا اور اس کی پروا نہ

کرنا ہے، قیامت والے دن تمام لوگوں کے سامنے ایسے عہد شکن کو ایک جھنڈا دیا جائے گا جو اس کی بدعہدی کا ایک نشیمن ہو گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ہر عہد شکن کے لیے قیامت والے دن اس کی سرین کپاس ایک جھنڈا ہو گا۔ اسے اس کی بدعہدی کے تناسب سے بلند کیا جائے گا۔ سنو! عام لوگوں کے امیر و حاکم کے عہد کو توڑنے والے سے بدعہد شکن کوئی نہیں۔“ (مسلم)

نو ائد مسائل :

1- عامۃ المسلمین کے امیر سے مراد حاکم وقت (خلیفہ، پادشاہ اور حکمران) کیا اس کا نائب ہے اس کے عہد کو توڑنے سے مراد اس کے عہد اطاعت اور بیعت کا توڑنا اور اس کے خلاف خرف و بغاوت ہے اسلام نے حکمرانوں پر تنقید کرنے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کی اصلاح کرنے کی تو ناکید کی ہے اور اس کے لیے امیر المعروف اور نبی عن المنکو کا حکم دیا ہے، لیکن ان کے فسق و فجور یا ان کے ظلم کی وجہ سے ان کے عہد اطاعت کو توڑ دینے اور ان کے خلاف خرف و بغاوت کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس طرح ملک میں فساد اور بد امنی پیدا ہوتی ہے جس سے حالات مزید خراب ہی ہوتے ہیں، اصلاح پذیر نہیں ہوتے خلفاء و سلاطین کے خلاف خرف و بغاوت کی تاریخ کا جائزہ لینے سے بھی اس حکم کی افادیت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔

2- تاریخ میں خرف و بغاوت کے جتنے بھی واقعات ہیں، ان میں سے کسی سے بھی امت مسلمہ یا اسلام کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ نقصان ہی ہوا ہے۔ اسی طرح آج کل کی جمہوریت میں بھی جس میں حکومت وقت کے خلاف مظاہرے، جمہوریت کا ایک حصہ بلکہ اس کی جان سمجھے جاتے ہیں، یہ ایک بے ثمر عمل ہے جس سے نہ حکمرانوں کی اصلاح ہوتی ہے، نہ ملک و قوم کو

کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے، البتہ توڑ پھوڑ سے لوگوں کی الماک اور قومی الماک کو نقصان پہنچتا ہے اور بعض دفعہ انسانی جانوں کا ضیاع بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سیاسی مظاہرے بھی شرعاً محل نظر ہیں۔

3- اس حدیث میں حکمرانوں کے خلاف اس قسم کے اقدامات پر سخت و عید بیان کی گئی ہے، اس لیے ہمیں حکومت وقت اور حکمرانوں کی اصلاح کے لیے اور امیر المعروف اور نبی عن المنکو کا فریضہ ادا کرنے کے لیے کوئی اور مناسب طریق کار وضع اور اختیار کرنا چاہیے جس میں محض تنقید برائے تنقید نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں خیر خواہی اور ملک و قوم کے مفادات کا جذبہ کار فرما ہو۔ یہ احتجاجی ہڑتالیں اور سیاسی مظاہرے شرعی لحاظ سے بھی غلط ہیں اور تحریکات نے بھی حیات کر دیا ہے کہ ان سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

4- عربوں میں رواج تھا کہ وہ بدعہدی کرنے والوں کے لیے بازاروں میں جھنڈے گاڑ دیا کرتے تھے تاکہ وہ بدنام اور ذلیل ہوں۔ اسی رواج کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کی آخری سزا کا ذکر فرمایا تاکہ اس جرم اور اس کی سزا کی نوعیت لوگ سمجھ سکیں۔

تین آدمی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تین آدمی ہیں جن سے قیامت والے دن میں خود جھگڑوں گا:

ایک وہ آدمی جس نے میرے نام سے عہد کیا، پھر اسے توڑ دیا۔

دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھالی۔

اور تیسرا وہ آدمی جس نے اجرت پر ایک مزدور حاصل کیا، چنانچہ اس سے اپنا کام تو پورا لیا لیکن اس کی اجرت نہیں دی۔“

(بخاری)

فائدہ : اس میں عموماً کوپورا کرنے، آزاد شخص کو فروخت نہ کرنے اور مزدور کو اس کی مزدوری دینے کی ترغیب ہے۔

احسان جتلانے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اے ایمان والو! احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اپنے صدقے ضائع مت کرو۔“ (البقرہ-264)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وہ لوگ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ (ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، ان پر نہ تو کچھ خوف ہے اور نہ وہ اداس ہوں گے۔“

(البقرہ-262)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تین آدمیوں سے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا نہ (رحمت کی نظر سے) انہیں دیکھے گا اور نہ پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔“

راوی بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔

حضرت ابوذر نے عرض کیا: ”وہ نامراد ہوئے اور گھائے میں رہے اے اللہ کے رسول! یہ کون لوگ ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مثنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا، احسان کر کے احسان جتلانے والا اور اپنا سامان جھوٹی قسم کے ذریعے سے بیچنے والا۔“ (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: ”اپنی آزار کو بیچنے لٹکانے والا۔“ یعنی اپنی شلوار پاجامے اور کپڑے کو تبرک کی وجہ سے مثنوں سے نیچے لٹکانے والا۔

فوائد و مسائل :

1- اس سے واضح ہے کہ شلوار پاجامہ، جتلون اور یہ بند وغیرہ مثنوں سے نیچے لٹکانا حرام ہے۔ یہ حکم مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کے لیے اس کے برعکس مثنے بلکہ پیر تک بھی ڈھکنے ضروری ہیں۔

2- مشکل مشہور ہے ”نیکی کر دیا میں ڈال“ یعنی کسی پر احسان کر کے پھر اسے ہرگز نہیں جتلاتا چاہیے کیونکہ اس سے نہ صرف وہ نیکی برباد ہوتی ہے بلکہ انسان عذاب شدید کا بھی مستحق ٹھہرتا ہے اس لیے کسی پر احسان کرنے سے زیادہ مشکل اس نیکی کی حفاظت کرنا ہے۔

3- جھوٹی قسم کھانا مطلقاً ”حرام“ ہے لیکن سودا بیچنے کے لیے گاہک کو دھوکا دینے کی نیت سے جھوٹی قسم کھانا تو اور زیادہ برا جرم ہے کہ اس میں دو جرم اکٹھے

ہو جاتے ہیں: جھوٹی قسم اور دھوکا دہی۔

فخر کرنا اور ظلم و زیادتی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”تم اپنی بابت پاکیزگی کا دعویٰ مت کرو، تم میں سے جو پرہیزگار ہیں ان کو وہ خوب جانتا ہے۔“ (النجم-32)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک ملامت کے لائق وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ (الشوریٰ-42)

کسی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار

حضرت واقلدین اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اپنے (مسلمان) بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو (کیوں ایسا نہ ہو) کہ اللہ تعالیٰ اس پر توبہ فرما دے اور تمہیں آزمائش میں ڈال دے۔“ (اسے تفسیر نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)



شہزادہ شہزاد

شاہین رشید

بات کرنا، یہ سب اچھی تربیت کا نتیجہ ہے اور تربیت میں کس کا ہاتھ زیادہ ہے، والدہ کا یا جادویدہ صاحب کا؟
”میں سمجھتا ہوں دونوں کا..... مگر ماں اولاد کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ چونکہ والد صاحب زیادہ تر لاہور میں ہوتے تھے اور ہمارا ان سے ملنا چٹھیوں میں ہی ہوتا تھا، اس لیے ماں کے زیادہ قریب رہے اور ان ہی سے زیادہ سیکھا۔ والد صاحب کی بھرپور سپورٹ ملی اور مالی طور پر بھی کبھی کسی کی کا احساس نہیں ہوا۔“
”آپ کا پورا گھرانہ شوبز سے وابستہ ہے..... اداکاری کے جراثیم تو آنے ہی تھے..... ایسا ہی ہے نا.....؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن بچ بتاؤں..... اداکاری کی طرف میرا بالکل جھی رجان نہیں تھا..... میں جب اپنے چچا سلیم شیخ کے ساتھ سیٹ پر جاتا تھا تو سوچتا تھا کہ یہ کتنا بور کر دینے والا کام ہے..... کیونکہ جو اس انڈسٹری کا حصہ نہیں ہوتا اسے یہ کام بور لگتا ہے۔ ہاں شوق ہو تو پھر یہ فیلڈ بہت حسین لگتی ہے۔“
”پھر کیسے رجان ہوا؟“

”بس پھر فلمیں بہت شوق سے دیکھتا تھا۔ شوٹ پہ جا کر شوٹ دیکھتا تھا، بیچلر کرنے کے بعد (کمپیوٹر سائنس) جاب بھی نہیں کی، بس اچانک ہی اس انڈسٹری کی طرف رجان ہو گیا اور بس آ گیا پھر اس فیلڈ میں.....“

”اچانک کس بات نے متاثر کیا کہ دوڑے چلے آئے اس فیلڈ کی جانب؟“

”جب والد صاحب کی، چچا کی اور بہروز انکل کی عزت دیکھتا تھا اور یہ دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے ارد گرد

شوبز میں وہی کامیاب ہوتا ہے جس میں صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ وہ فیلڈ ہے جہاں ایک بار تو پرچی کام آتی ہے، بار بار نہیں..... آج کل آپ ”شہزاد شیخ“ کو ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں ان کے پاس ان کے والد جادویدہ کی ”پرچی“ نہیں ہے بلکہ ان کے پاس ان کے ٹیلنٹ کی پرچی ہے..... شہزاد شیخ ایک بہترین پر فارمر ہیں۔ آج کل آپ انہیں ”الف اللہ اور انسان“ میں دیکھ رہے ہیں۔ ”بندھن“ کے لیے ہم نے ان کا انتخاب کیا، مگر وہ تمام باتیں نہ پوچھ سکے جو ”بندھن“ کا خاصا ہیں۔ کچھ فیلڈ اور کچھ نئی لائف پر بات ہوئی کیونکہ شہزاد آج کل بہت مصروف ہیں..... اس لیے تھوڑے کو بھی بہت جاچے گا۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”خالی ہاتھ؟“ ”الف اللہ اور انسان“ اور ”محبت، تم سے نفرت“ ہے..... بیک وقت تین سیریلز آن ایر رہے..... سب سے اچھا رسپانس کس کا ملا؟
”سب کا ہی بہت اچھا رسپانس ملا۔“ ”خالی ہاتھ“ بھی بہت زیادہ پسند کیا گیا اور بقیہ دو سیریلز بھی ”بڑے معصوم، بڑے ڈیلنٹ اور بڑی محبت کرنے والے دکھائے گئے۔ ان ڈراموں میں..... اصل حقیقت کیا ہے؟“

”ہنستے ہوئے.....“ ”کیا ان سے مختلف ہو سکتا ہوں.....؟ ان کرداروں میں میری شخصیت کا بھی عکس نظر آتا ہے..... میں بھی عام زندگی میں محبت کرنے والا انسان ہوں۔“

”یہ تو ہے..... ادب سے بولنا..... دھیمے لہجے میں



آئے گی۔“
”شہزاد“ کچھ ساتھ ساتھ فیملی کے بارے میں بھی بات ہو جائے..... جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ کی تربیت میں ماں کا زیادہ ہاتھ ہے اور ان ہی کے ساتھ زیادہ وقت گزرا..... تو یہ بتائیں کہ شادی کس کی پسند سے کی؟“

ہنستے ہوئے..... ”سچ بتاؤں..... شادی میں نے اپنی پسند سے کی، حتا سے میری ملاقات ایک شادی میں ہوئی تھی..... مجھے یہ پسند آئیں..... میں نے گھر والوں سے ذکر کیا اور سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ میری بیگم بنیادی طور پر ایک وکیل ہیں۔“
”کتنا عرصہ ہو گیا شادی کو؟“

”28 دسمبر 2012ء میں ہماری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ سے میرا ایک بیٹا بھی ہے اور میرے بیٹے کا نام شاہ میر شیخ ہے اور فروری 25 2015ء میں ہمارا بیٹا اس دنیا میں آیا۔“
”بیگم کو اداکاری کا شوق نہیں کیا؟“

”نہیں جی..... دلچسپ بات آپ کو بتاؤں کہ جب ہم ساری فیملی جس میں بہرہ و زائل بھیملی ہوئی ہے ایک جگہ پر اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنی فیلڈ پر ڈسکس

جمع ہو کر آٹو گراف لیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا تھا..... پھر اچانک اداکاری کے شوق نے بھی سرا بھارا تو سوچا کہ اس کو پڑھنا بھی چاہیے تو امریکا چلا گیا اور وہاں نیویارک اکیڈمی سے اداکاری کا کورس کیا..... ایک سال کا کورس تھا اور بہت محنت سے میں نے پڑھا اور کلاس میں دوسرے نمبر پر آیا۔“

”گڈ..... عموماً دیکھا ہے کہ باہر سے پڑھ کر آنے والے یہاں اس انڈسٹری میں فوری طور پر سیٹ نہیں ہو پاتے..... اس کی کیا وجہ ہے؟“

”اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے کام کا طریقہ اور وہاں کے کام کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ وہاں امریکا میں اداکاری چہرے کے تاثرات سے ہوتی ہے اور یہاں اظہار کر کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یعنی ہر ملک کی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے اور اسی انداز سے سب کچھ ہوتا ہے۔“
”تو پھر اپنے ہی ملک کی اکیڈمی زیادہ بہتر نہیں ہوتی کیا؟“

”بے شک ہوتی ہیں..... مگر ہمیں ہر طرح کی اداکاری آنی چاہیے۔ اگر کل کو مجھے ”ہالی ووڈ“ سے آفر آئے تو میرا نہیں خیال کہ مجھے کوئی مشکل پیش

سے اور بچے بھی ہوں گے تو کیا انہیں اس
انڈسٹری میں آنے دیں گے؟“
بہتے ہوئے..... ”جب ہمارے بچے جوان
ہوں گے تو پتا نہیں زمانہ کیسا ہوگا..... اس وقت کے
حساب سے سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“
”بیگم مزاج کی کیسی ہیں؟“

”جیسا کہ عموماً بیگمات کا ہوتا ہے.....“ بہتے
ہوئے..... ”میری بیگم مزاج کی بہت اچھی ہیں اور
میری پسند ہیں تو بھلا وہ کسی سے کم کیوں ہوں گی۔“
”اور آپ مزاج کے کیسے ہیں؟“

”ہو..... س..... یہ سوال تو بیگم سے پوچھنا
چاہیے تھا، لیکن انسان خود بھی اپنے مزاج سے واقف
ہوتا ہے..... میں تھوڑا سا غصے کا تیز ہوں، مگر مزاج کا اچھا
بھی بہت ہوں..... ایسی مذاق میری فطرت کا حصہ ہے۔“
”گھر کے غصے اور باہر کے غصے میں فرق ہوتا
ہے..... کیا آپ اس بات کو سمجھتے ہیں؟“

”بالکل سمجھتا ہوں..... گھر سے باہر مجھے ان
لوگوں پر زیادہ غصہ آتا ہے جو دوسروں کی غلط رہنمائی

کر رہے ہوتے ہیں تو پورے فیملی میں دو لوگ بہت
بور ہو رہے ہوتے ہیں ایک میری بیگم اور ایک میرا
بہنوئی (مولیٰ شیخ کا شوہر) انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے
اس فیلڈ سے..... ہاں فلمیں چونکہ یہ دونوں بھی دیکھتے
ہیں تو ان پر تھوڑی بہت بات چیت ہو جاتی ہے۔“
”اس کا مطلب ہے کہ آپ کی بیگم ”حتا“

آپ کے ڈرامے بھی نہیں دیکھتی ہوں گی؟“
”ایسا نہیں ہے..... دیگر ڈرامے وہ دیکھے نہ
دیکھے، مگر میرے ڈرامے وہ ضرور دیکھتی ہے اور اس پر
کڑی تنقید بھی کرتی ہے۔ گھر میں وہ میرے ڈراموں
کی سب سے بڑی نقاد ہے۔“
”آپ کو برا تو لگتا ہوگا؟“

”ارے نہیں..... ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف
تنقید ہی کرتی ہے جہاں اچھا لگتا ہے۔ اسے وہاں
تعریف بھی کرتی ہے اور میں اس لیے بھی نہیں ماننا
کہ اداکاری تو مسلسل سکھتے رہنے کا نام ہے اور میری
بیگم میرا کیوں چاہیں گی۔“

”ابھی تو آپ کا بیٹا بہت چھوٹا ہے اور ماشا اللہ



”جی..... وہ ڈرامے کی ڈیماٹھ ہوتی ہے اور اب تو میں اس فیلڈ میں باقاعدہ سے آ گیا ہوں تو ہر طرح کی لڑکیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا اور میری پیگم اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔“

”پیگم آپ کے ڈراموں پر تنقید کرتی ہیں اور کیا گھر میں دیگر لوگ بھی کرتے ہیں؟“

”آپ کو سن کر حیرت ہوئی کہ گھر والے کوئی خاص فیلڈ بیک نہیں دیتے، کوئی یہ نہیں کہتا کہ تمہارا ڈراما بہت اچھا یا بہت برا تھا اور نہ ہی میں نے خود ان سے پوچھا.....“

”اس انڈسٹری میں والد کا نام تو یقیناً آپ کے لیے ایک بڑی سپورٹ بنا ہوگا؟“

”میرے والد کا بہت بڑا نام ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں جاوید شیخ صاحب کا بیٹا ہوں..... مگر یقین کریں کہ میں نے ان کے نام کا نہیں بھی فائدہ نہیں اٹھایا، میں اگر آڈیشن دینے بھی گیا تو اسے مل بوتے یہ..... کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں جاوید شیخ صاحب کا بیٹا ہوں۔ بس یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے کامیاب کیا۔“

”مگر اب تو سب کو پتا ہے نا؟“

”جی..... جی..... اب تو سب کو پتا ہے اور دلچسپ بات یہ کہ جب آڈیشن دینے گیا تو جس طرح عام لوگوں کے ساتھ آڈیشن کے دوران بہت کچھ ہوتا ہے میرے ساتھ بھی ہوا، لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ میں جاوید شیخ صاحب کا بیٹا ہوں تو پھر سب نے بہت معذرت کی۔ تب میں نے انہیں کہا کہ میرے والد بھی اپنی محنت سے آگے بڑھے تھے اور ان ہی کا یہ سبق ہے کہ انسان کو اپنی محنت سے آگے بڑھنا چاہیے اور یہ بھی میرے بزرگوں کا بڑھایا ہوا ہے کہ جی اپنے اندر ”میں“ کو نہ لانا..... کیونکہ جس دن آپ کے اندر ”میں“ آگئی اس دن آپ ختم ہو جائیں گے۔“

”مگر میں انسان کے ساتھ کئی مسائل ہوتے



کرتے ہیں..... مجھے گھما پھرا کر دوسروں کو چکر دے کر بات کرنے کا طریقہ نہیں آتا ہے اس لیے میرا دل چاہتا ہے کہ جو بھی مجھ سے بات کرے وہ صاف کوئی کے ساتھ بغیر کسی کمی لپٹی کے۔“

”شادی کے بعد اور اس فیلڈ میں آنے کے

بعد آپ میں کیا نمایاں تبدیلیاں آئیں؟“

”شادی کے بعد تو کوئی خاص تبدیلیاں نہیں آئیں، البتہ فیلڈ میں آنے کے بعد خاصی تبدیلیاں آئی ہیں..... پہلے میں بہت Shy (شریلا) ہوتا تھا، مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب کافی بہتر ہو گیا ہوں۔“

”گھر میں لڑکیوں کے فون تو آتے ہوں گے..... پیگم کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟“

”پیگم اس بات کو سمجھتی ہیں کہ اگر گھر میں لڑکیوں کے فون آئیں گے تو کوئی نہیں بات نہیں ہے، لیکن ایسا ہے نہیں کہ فون آئے کیونکہ میں اس معاملے میں بھی ٹھوڑا Shy ہوں اور ویسے بھی میں بلاوجہ لڑکیوں سے بات نہیں کرتا..... نہ پہلے نہ اب۔“

”مگر اب تو آپ خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ کام کرتے ہیں؟“



ہیں جس کی وجہ سے وہ ابھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی گھر کی وجہ سے اپنی فیملی میں ڈسٹرب نہ ہوئے؟“

”اس فیملی میں اپنا 100 فیصد دکھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے گھر میں سکون و اطمینان ہو اور آپ کی زندگی میں کوئی بہت زیادہ ابھن نہ ہوں اور اللہ کا بہت شکر ہے کہ میں اپنی اندرونی اور بیرونی زندگی کو بڑے توازن کے ساتھ لے کر چلتا ہوں..... یہی وجہ ہے کہ میں اپنے کام پہ فوکس آسانی کے ساتھ کر لیتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ گھریلو زندگی کو پرسکون رکھنے میں عورت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور ”حنا“ اس بات کو بخوبی سمجھتی ہے۔“

”آپ میڈیا میں رہ کر سوشل نہیں ہیں..... اس کی کیا وجہ ہے عادات ایسے ہیں۔ یا بیگم کی وجہ سے؟“

”میں نے آپ کو بتایا کہ میں حجاز جا خاموش طبع انسان ہوں اور ویسے بھی میڈیا سے تھوڑا دور رہتا چاہتا ہوں کیونکہ اس وقت میں جولائف جی رہا ہوں بہترین ہے..... اپنے کام سے کام رکھتا ہوں اور بس۔ مجھے سوشل ہونا پسند نہیں ہے۔“

”اب تک جن خوب صورت خواتین کے ساتھ کام کیا، ان میں سب سے اچھی کیمسٹری کس کے ساتھ رہی اور کوئی فنکارہ جس کے ساتھ کام کرنے کی بہت خواہش ہو؟“

”جن کے ساتھ لگن و محنت کے ساتھ کام کرو کیمسٹری بن جاتی ہے۔ اس فیملی کی ساری خواتین میرے لیے قابل احترام ہیں اور جس فنکارہ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں وہ ”ماہرہ خان“ ہیں۔ وہ ایک بہت اچھی آرٹسٹ ہیں۔“

”محبت تم سے نفرت ہے“ کے بارے میں کیا رسپانس ہے۔ آپ کو اپنا کردار کیسا لگ رہا ہے؟“

”بہت اچھا رسپانس ہے۔ غلیل الرحمن قمر کا سیریل ہو اور پسند نہ کیا جائے..... ممکن نہیں ہے۔“

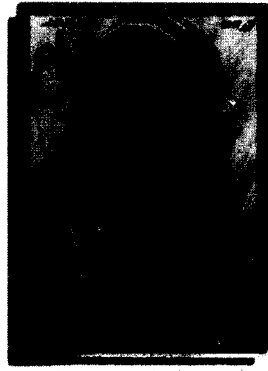
یہ بھی میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ غلیل الرحمن قمر نے میری پرفارمنس دیکھ کر مجھے فون کیا کہ ”بیٹا مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنی اچھی اداکاری کر سکتے ہو۔“ انہوں نے میری کافی تعریف کی۔“

”اور کچھ کہنا چاہیں گے؟“

”جی..... صرف یہ کہ ان شاء اللہ آپ مجھے چند سالوں میں یہ حیثیت بدایت کار بھی دیکھ سکیں گے۔ کیونکہ ڈراما بھی کر لیا، فلمیں بھی اور ماڈلنگ بھی..... اب ڈائریکشن کی طرف آنا ہے۔“

”ان شاء اللہ!“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شہزاد شیخ سے اجازت چاہی۔



خط بچوانے کے لیے ہمارا
ماہنامہ شمعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب لیے حاضر ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت و سلامتی کے ساتھ زندگی کے ہر قدم پر کامیاب و کامران رکھے۔ آمین۔
ہم سب کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنوں اور غیروں کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔
پہلا خط سرگودھا سے بلقیس ریاض کا ہے، لکھتی ہیں۔

یہ لفظوں کی شرارت ہے، سمجھ کر کچھ بھی لکھنا تم محبت لفظ ہے لیکن؟ یہ اکثر ہو بھی جاتی ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کو کس رشتے سے پکاروں؟ شاید آتی یا بانی بس یہی کہوں گی کہ ہمارا اور آپ کا بہت احرام کا رشتہ ہے۔ اور آپ سے دل کا رشتہ ہے۔ 6 سال پہلے تک ہم بھی لکھاری تھے پھر شادی ہوئی تو جیسے سب چھوٹ گیا۔ جواب عرض میں لکھتی رہی بار بار دل کیا

کہ کبھی شمعاع میں بھی لکھوں لیکن پھر ہمت نہ پڑتی کہ ہمیں شمعاع ہمیشہ سے ہی بلند معیار کا لگا کر تاویسے میں شمعاع کو گیارہ سال سے مسلسل پڑھ رہی ہوں۔

سب سے پہلے ماڈل جو زیادہ تر مجھے اچھی ہی لگتی ہے پھر حمد و نعت سے دل کو شاد و آباد کیا اور ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ ہی بہت پیاری بہت منفرد لگتی ہیں۔ میں حیران ہوتی ہوں اتنا جامع اور واضح مواد ہر دفعہ منفرد آپ کہاں سے لیتی ہیں دل کو چھو لیتی ہیں۔

”مقر اقرم کا تاج محل“ ہمیشہ مجھے یاد رہے گی یہ میرے دل نقش ہے ہمیں زبونی کی کہانیاں بہت منفرد لگتی ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے غائب ہیں۔ فرزانہ کھل اچھا اضافہ ہیں، سنبھل عمر چھوٹی بات میں بڑا پیغام دے جاتی ہیں اور عطیہ خالد کا ”دل کے رشتے“ یادگار ہے۔ باتوں سے خوشبو آئے بہترین سلسلہ، بندھن اور دستک سلسلے دلچسپ ہیں، پلیز نعمان اعجاز اور ان کی مسز کا انٹرویو شائع کریں، اشعار غریب ہمیشہ سے ہی مجھے بہت پسند ہیں۔

حاصل گفتگو یہی رہا کہ شمعاع ایک مکمل ادارہ ہے لکھنے کا اور تربیت کا۔ اس کا معیار بہت بلند ہے اور ایسا ہی رکھیے گا۔ ماشاء اللہ آپ کے لیے اتنا کہوں گی کہ آپ کا دل بہت پیارا ہے جو بہت اچھے انداز میں آپ بات کرتی

ہیں۔ اور ہاں جنید انصار کا آرٹ لا جواب ہے ان کا نام نہ جچی پڑھوں تو بتا چل جاتا ہے یہ ان کی مبنائی ہے۔ ج : پیاری بلقیس! شعر کا انتخاب بہت خوب ہے۔ جب محبت ہو سکتی ہے تو پھر کسی رشتے کی الجھن میں بڑے بغیر محبت کا رشتہ کیوں نہ قائم کیا جائے۔ ہمارے آپ کے درمیان دوستی کا رشتہ ہے۔ جو عمر اور تکلفات کا پابند نہیں ہوتا۔ دوست، دوست کا آئینہ ہوتا ہے۔ دراصل ہمارے بڑھنے والے خود بہت پیارے دل کے مالک ہیں اسی لیے انہیں ہم بھی اپنے جیسے لگتے ہیں۔ اور کسی زمانے میں راسخ جانی جاتی تھیں تو اب بھی لکھیں۔ لکھانی تو آپ کی بہت خوب صورت ہے۔ کہانی لکھ کر بھجوائیں۔

خوبی لکھا سے نونہرا داخل لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے عفت سحر کا ٹول بڑھتی ہوں۔ خوب صورت بننے لگے مجھے آئی میک اپ کا بلیقہ سکھایا۔ اس

ج : صائمہ ! آپ ہماری سرزنش سے نہ ڈریں۔ اگر آپ میں صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں۔ سیرا کے لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہ صلاحیت اللہ کی ودیعت کردہ ہے اور ان کی محنت اور کوشش نے اس صلاحیت کو جلا بخشی ہے۔

ارم کمال فیصل آباد سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے۔

اس دفعہ ٹاسکسل پسند نہیں آیا۔ مرجھایا ساتھ خیر ناک کی میزان زونیرا زونی شاہ سے ملاقات پر لطف رہی۔ جب تجھ سے نانا جوڑا ہے میٹ سٹ و ب کے حالات نے دل کو غم سے بھر دیا۔ افشین نعیم ”انت بھلا سب بھلا“ ایک ہنستی مسکراتی تحریر رہی جس نے سر کے درد میں کافی کمی کی۔
”خط آپ کے“ کی ہی کوثر خالد سے مل کر دل باغ باغ ہو گیا۔

ج : پیاری ارم! یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بھلا دیا گیا ہو۔ ہمیں اپنے تمام قارئین یاد رہتے ہیں اور اگر چار چھ مہینے وہ ہمیں خط نہ لکھیں تو تشویش بھی ہوتی ہے کہ کیا ہے کہ جیسے ہمارے بیشتر قاری خاموش رہتے ہیں اسی طرح ہم بھی خاموشی پسند ہیں۔ بس اور کوئی وجہ نہیں۔
فارحہ تنول موٹو دھمیل سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

شعاع سونیا بھابھی لے کر آئی تھیں اور اب اکثر فارغ وقت میں میرے ہاتھ میں پایا جاتا ہے۔ شعاع کا ہر سلسلہ اپنی مثال آپ ہے۔

ج : پیاری تنول! صفحات پر جگہ لے نہ لے ہمارے دل میں آپ کے لیے بڑی جگہ ہے۔ آپ جلدی نہیں بڑھ سکتیں تو کوئی مسئلہ نہیں آرام سے بڑھ کر آرام سے بھرہ بھیجا کریں۔ آپ کے دل کی بات ہمارے دل تک پہنچ جائے گی اکتا کافی نہیں؟

ہما فاروق نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

آلی آپ سے پوچھنا تھا کہ اب سائرہ رضوانے نوال والی کہانی کا گٹھا حصہ ہمیں لکھنا پائی صائمہ اکرم کا شہر زادہ بہت عمدہ ہے؟ ”شعاع“ کے تمام افسانے اور ناول بہت اچھے ہیں۔ آلی میں نے پچھلے ماہ ”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ میں اپنا تعارف بھیجا تھا۔ کیا وہ آپ کو پسند نہیں آیا؟ اور

معاملے میں بڑی پریشان تھی جو ایک چیز مجھے اتنی اچھی نہیں لگتی وہ موسم کے پکوان ہیں۔ زیادہ وقت پڑھائی میں گزارا ہے۔ تھوڑا سا اپنا تعارف میں ایم اے انگلش کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں اپنی تحریر بھیجے گی گستاخی کر رہی ہوں۔ اگر اللہ آپ لوگوں کے دل میں رحم بھیجے گا تو ایک بھول سمجھ کر شائع کر دے گا۔ اس کے بعد کتنی فیصلہ قارئین کریں گی کہ میں کس طرح کی رائٹر ہوں۔

ج : پیاری زونیرا! کہانی شائع کرنی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ہم قارئین کی پسند کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ آپ انگلش کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی اردو بھی سیکھ لیں پھر کہانی لکھیں۔ بہتر یہی ہے کہ فی الحال آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔

سونیا ربانی نے موٹو دھمیل سے لکھا ہے۔

چار سال کا عرصہ 2 نومبر 2012ء کو شادی پھر 5 اگست 2014ء کو ولید کی آمد۔ سر پہ بہت سے کام اور بھری سسرال؟ سچ بتاؤں تو خواتین اور شعاع میں پڑے گئے ناول میرے بڑے کام آئے۔ ورنہ چار لوگوں میں سے اٹھ کر اتنے بڑے خاندان میں جگہ بنانا مشکل تھا۔ چلیں اگر سونیا ربانی یا وہ، تو جگہ دے دیں اور ہاں شعاع کا وہ سلسلہ شعاع کے ساتھ ساتھ ختم کر دیا کیا؟

ج : پیاری سونیا، طویل عرصہ کے بعد آپ کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جیسے دستک پر دروازہ کھولیں تو کوئی پرانا دوست کھڑا نظر آئے، ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں چار سال اتنی بھی طویل مدت نہیں کہ پرانے دوستوں کو بھول جائیں۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔
شعاع کے ساتھ ساتھ سلسلہ بند نہیں کیا۔

صائمہ امیر نے جوہر کلاہی سرگودھا سے لکھا ہے

افسانے سب ایک سے بڑھ کے ایک تھے۔ ”سرخ آندھی“ نے بلا کے رکھ دیا۔ اجمل رضوانے ماضی اور حال کی خوب صوفیہ الفاظ سے ترجمانی کی۔ افسانہ ”طمینان“ ”ڈو اٹھیل“ سے تھوڑا سا مماثلت رکھتا تھا۔ اب آجائے ہیں یہ جو ”ریگ وشت فراق“ ہے۔ کی جانب خوب صورت آغاز تھا لیکن کہانی میں بہت جگہ میں روٹی ہوں۔ سیرامید کے بارے میں کہتا ہے ”کیا کوئی اتنا اچھا بھی لکھ سکتا ہے“

ردی کی نوکری کی نذر ہو گیا ہے۔

ج : ہا! سائرہ فی الحال حسن المآب لکھ رہی ہیں۔ اس کے بعد وہ نوال والی کمائی لکھیں گی۔
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے کے لیے آپ کی تحریر باری آنے پر شائع ہو جائے گی۔

سیما سحر نے ڈنکے سے لکھا ہے۔

”جب تجھ سے ناتا“ میں پہلے پڑھتی تھی اب نہیں پڑھتی کیونکہ مجھے تو اب شادی کے نام ہی سے خوف آتا ہے۔ ہائے کیا دن تھے جب گزرا کی شادی کرواتے خوش ہوتے، اب تو گزرا کو کڈنے سے الگ کر کے رکھا ہے (اب یہ مت سمجھیں کے میں بہت بوڑھی ہوں۔ میں صرف 17 سال کی ہوں) زنیو سے ملاقات مزہ نہیں دے سکی، بندھن شکر خدا یا، نہیں تھا مجھے تو بالکل نہیں پسند، آپ لوگ ان کا انٹرویو کرتے ہیں جنہیں ہم جانتے نہیں ڈرانے جوڑوں کا کریں (جیسے عازہ خان) سلسلہ وار ناول کی نوکریاں بات ہے! مریم عزیز شکر ہے کہ لکھا۔

افسانوں میں ایمل رضا، شازیہ، سدرہ آبی کے افسانے پسند آئے۔ نظمیں، غزلیں بھی پسند آئی۔ ”تاریخ کے جھوٹے“ مجھے بہت پسند ہیں۔

آپ صرف اس لیے میری خط ردی کی نوکری میں

ڈالتے ہیں کہ میں سچ لکھتی ہوں اور نقص نکالتی ہوں؟ برائیڈل ٹائیٹل دیا کریں یا جو تھوڑے بہت سچے ہوں۔ شعاع میں کیا کوئی ہیرو مرکب گیا ہے جو ماڈل ایسے سادہ تھی، صبا، ارماسکتی ہیں اور بھی بہت سے رسالے ہیں تم اس کی جان نہ چھوڑنا۔

ج : پیاری سیما سحر! مست نظاروں سے سچا آپ کا یہ پہلا خط ہمیں ملا ہے۔ لکھائی تو سمجھ میں آگئی مگر نام سمجھ میں نہیں آیا۔ تعریف یا تنقید کی کوئی قید نہیں ہم تو آپ کی رائے کے منتظر رہتے ہیں جو آپ بے دھڑک ہمیں لکھ کر بھیج سکتی ہیں اور سچ کے قدر دان تو ہم ہمیشہ سے ہیں۔ مگر ایسا بچ بولنے سے گریز کرنا چاہیے جس سے کسی کا دل دکھے اس سے اچھا تو وہ جھوٹ ہے جو آمن اور صلح کے لیے بولا جائے۔ آپ کا بے ساختہ اور بے تکلف انداز بہت اچھا ہے۔

اور بھی صبا، ارماسکتی ہیں۔ ان سے کہیں وہ ایک یاد

شعاع پڑھیں پھر وہ بھی اس کو پڑھنا نہیں چھوڑیں گی۔
صدف ٹھیکیل چودھری نے ضلع دہاڑی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

ڈائجسٹ ملتے ہی گویا ایک نخت طویل انتظار کی سولی کی پیدا کردہ اداسی جیسے وصل کی سرشاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ صبر کی صلاحیت زندگی کی طرح اپنا وجود گنوانا جاری ہے اور پھر معاملہ اس قدر صورت حال اختیار کر لیتا ہے کہ ہر بار ایک نیا امتحان سر اٹھائے کھڑا ملتا ہے۔ اور پھر شعاع میرے لیے بہترین ٹانگ ہے۔ سب سے پہلے ذکر کروں گی ”خواب شیشے کا“ عفت سحر طاہر نے ایسا سحر طاری کیا کہ نہ پوچھیں۔ صائے اکرم چودھری تو ویسے ہی لفظوں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ جب بھی لکھتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ باقی سب ہی سلسلے میں بہترین ہوتے ہیں۔ میں ایمل رضا، سائرہ رضا اور سمیرا حمید اور عزیزہ سید کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہے یہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ رسالہ ہر لحاظ سے بہترین ہے۔

ج : پیاری صدف! اس سال کی خاموشی کے بعد آپ نے شعاع کی محفل میں شرکت کی بہت شکریہ۔ زندگی نام ہی امتحان کا ہے۔ پوری زندگی آزمائش ہی تو ہے۔ صبر کی صلاحیت عمر کے ساتھ بڑھتی ہے۔ کم نہیں ہوتی۔

زینب شہزادی نے ڈو جوالہ سے لکھا ہے
اس ماہ کا شعاع پورا کا پورا بہت ہی اچھا تھا۔ مجھے بس فرزانہ کھل سے یہ لگتا تھا کہ پلیز پلیز جو کردار ہیلے ادا کر رہا ہوتا ہے اسے واضح کریں۔ فرزانہ جب بھی لکھتی ہیں بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ج : پیاری زینب! آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے فرزانہ کھل تک پہنچا رہے ہیں۔

اسماء گل مغل نے کوٹ مبارک سے لکھا ہے

”تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ بہت ہی خوب صورت عنوان ہے۔ میں ہر بار ضرور پڑھتی ہوں۔ سلسلے وار ناولز اچھے جا رہے ہیں۔ سنہری دھوپ الیاس احمد اور مردوںوں برے انسان ہیں۔ شعاع میری باجی لیتی ہیں اور پہلے میں پڑھتی ہوں۔ اب ان کی شادی ہو رہی ہے اور بہت سارے کام ہیں۔

ج: پیاری اسماء! آپ کی باجی کو شادی کی مبارک باد۔ زندگی کا یہ موڑ ان کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں اور محبتیں لے کر آئے۔ آمین

خدیجہ رفیق نے رحیم یار خان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں اور شعاع خواتین 1984ء سے اکٹھے ہیں۔ تجھ سے ناتا جوڑا میں شرکت چاہتی ہوں پر پتا نہیں کیسے شامل ہونا ہے۔ تمام افسانے بہت اچھے لگے۔ مکمل ناول، ناولٹ سب بہت اچھے تھے۔

ج: پیاری خدیجہ! ”تجھ سے ناتا جوڑا“، بیع سوالات شائع ہوا ہے۔ آپ ان سوالات کے جواب لکھ کر اسی طرح بھیج دیں جس طرح یہ خط بھیجا ہے۔ ہم نے تو پڑھا ہے کہ گھوٹکھ پالے بال حسن کی علامت ہوتے ہیں۔ جدید و قدیم طب میں ایسا کوئی علاج موجود نہیں جو گھوٹکھ پالے بالوں کو سیدھا کر دے۔ کسی بیوی پارلر سے رجوع کریں۔ عارضی طور پر وہ بالوں کو سیدھا کر دیں گے۔

گل رحمان پرتلی لکھتی ہیں

میں صوبہ پنجتواخواہ کے ایک دور دراز علاقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ یہ علاقہ پشاور شہر سے بھی 300 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ پشاور جانے کے لیے بھی ہمیں بارہ تیرہ گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ آپلی میں سے 9 کلاس سے آپ

کے رسالے پڑھنے شروع کیے تھے اور یہ سفر اب بھی جاری و ساری ہے۔ ڈیڑہ آپی کہا جاتا ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر ہمارے کامیابی کے پیچھے چار عورتوں کا ہاتھ ہے۔ ہماری نانی، امی، خالہ اور امی کی گزن، ہماری پیدائش سے لے کر دو سال پہلے تک ہماری نانی نے ماں اور باپ دونوں بن کر ہم سات بہن بھائیوں کو پالا ہے۔ نانی ہی کی بدولت ہم سارے بہن بھائی زبورِ تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ پیاری آپلی ہمارے کچھ بننے سے پہلے ہی ہماری نانی خالقِ حقیقی سے جا ملی ہیں۔ میں نے اپنا قلمی سفر نانی کے نام سے شروع کیا ہے۔

ج: پیاری گل رحمان! ان چاروں باہمت خواتین کو ہمارا عقیدت بھر اسلام۔ خواتین کو ایسا ہی ہونا چاہیے باہمت، ہمیشہ آگے کی طرف دیکھنے والی، ظلم نہ سنے والی، خواتین کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ وہ سب سے پہلے ”انسان

“ ہیں۔ باقی زندگی دھوپ چھاؤں کا نام ہے۔ اللہ آپ کی ہمت و حوصلے کو قائم رکھے اور ڈھیروں کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ کا مضمون شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ خواتین شعاع میں اس طرح کے مضامین شائع نہیں ہوتے۔ آپ افسانے لکھیں۔

منا کنول نے نو دھراں سے لکھا ہے

میری عمر 13 سال ہے اور میری زندگی کا سب سے بڑا خواب آپ کے شعاع میں لکھنا ہے آپ کے ڈائجسٹ میں لکھنے کے لیے بہت بہت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ ہر ایک لفظ لکھنے کے بعد ریجیکٹ کیے جانے کا ڈر اگلے الفاظ ہی بھلا دیتا ہے۔

ج: ہماری ساری شہنائی، انی الحال صرف پڑھائی پر توجہ دیں اور تھوڑا وقت گزر جانے دیں۔ پھر بہت بھی آجائے گی۔ برداشت کرنا بھی آجائے گا اور کوشش کرتی رہیں تو لکھنا بھی آجائے گا۔

صغرا شہزاد، مقدس اور سدرہ نے ڈنگلہ سے لکھا ہے

میں آپ سے اتنی دور ہوں جتنی آپ کشمیر سے۔ میں کسی بھی کمائی پر تبصرہ نہیں کروں گی۔ راحت جبین اور تنزیلہ ریاض آپ کے ہیرے تھے جو کہ گم ہو چکے ہیں۔ نمبر احمد اور ایمل رشتا تو میری جان ہیں۔ میں دسویں میں تھی جب پڑھنا شروع کیا اور اب نین بچوں کی ماں ہوں زندگی

کے کتنے موسم گزرے خوشی، غم، دکھ ہر موسم میں شعاع ہمارے ساتھ رہا مجازی خدا نے کئی ڈائجسٹ نذر آتش کیے۔ ابونے کئی مرتبہ روکا تو کا پر ہم ڈٹ گئے۔ ہم تین چار گز نز مل کر رسالے پڑھتی ہیں مقدس، سدرہ، عالیہ اور میں۔

ج: پیاری صغرا! ہم کشمیر سے کتنی ہی دور ہوں بہر حال کشمیر کا دور ہمارے دل میں ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کشمیر ایک دن آزاد ہو کر اپنی اصل سے آئے گا۔ اسی طرح ہمارے قارئین خواہ وہ ہم سے کتنی ہی فاصلے پر رہتے ہوں۔

محبت اور دوستی کا ایک خاموش رشتہ بہر حال ہمارے درمیان ہے۔ کسی مخصوص شمارے پر تبصرہ ممکن نہ تھا تو کم از کم قسط وار کمائیوں پر ہی تبصرہ کر دیتیں۔ ہمیں بھی آپ کی رائے جاننا کا موقع ملتا۔ تعریفوں کے لیے شکریہ۔

فائزہ عمران نے لنڈے خیل پرشکمنی ضلع نوشہرہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

لفظوں کو قلم کے نوک سے سنوارنا میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ لیکن میرے الفاظ بہت چھوٹے ہیں۔ بہت ہونے جیسے بہت سراٹھا کر ان قد اور لفظوں کی طرف دیکھنا پڑے گا جو میری پسندیدہ ترین مصنفین کے قلم سے نکلتے ہیں۔ میں اس میدان میں آگے جانا چاہتی ہوں مگر شاید میرے لفظوں میں وہ تاثیر نہ ہو جو دوسروں کے الفاظ میں ہوتا ہے۔ محصور کر دینے والا۔ جکڑے والا متاثر کن۔

ج : پیاری فائزہ! آپ نے اپنے لفظوں کو زبان دی۔ بہت اچھا کیا۔ اگر شروع میں ناکامی بھی ہو تو بہت نہ ہاریں۔ ناکامی ہو یا کامیابی بھی مستقل نہیں ہوتی۔

آمنہ لکھتی ہیں

خط شائع ہو گیا۔ لیکن جواب میں پیاری۔ آمنہ کی جگہ پیاری مریم لکھا نہ چڑا رہا تھا۔ (مم بھی پیارے ہمارا نام بھی تبدیل کیوں دیا)۔

ٹائٹل گرل کا دوپٹا اور اساتذہ بہت پیاری لگی۔ البتہ آنکھوں کا میک اپ بہت تھکا ہوا لگا۔ حمد اور نعت مجھے تو بیشہ مشکل ہی لگتی ہیں۔ کچھ فارمل نعتیں بھی شائع کر دیا کریں۔ پیاری بی بی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح بہترین اور جب مجھ سے نانا جوڑا ہے۔ بھی پیاری بہنوں اللہ کی رسی کو یوں مضبوطی سے تھام لو کہ کیا ہی کراچی کی بس میں سفر کرتے ہوئے کوئی ڈنڈے کو تھامتا ہو۔ زنیہ زونی کو جانتے

نہیں پھر بھی اچھا کامل کہہ دینگ میں موش حیات اور ایمن کو پڑھ کر اچھا لگا۔ خواب شیشے کا میں مہرہ ماہ کے ساتھ بہت برا ہو رہا ہے۔ سدرہ کا فسانہ سر پر سے گزر گیا۔

”سرخ آنکھی“ ایمل رضا ویل ڈن افشینی کی کہانی بس ٹھیک ہی تھی۔ جبکہ حرف شکایت بہت اچھی۔ عینا نے تو واقعی بہت پیارا نسخہ بنایا۔ لیکن مجھے عینا کے بابا کی شعر والی صیحت سمجھ نہیں آئی۔ پلیز اس شعر کا مطلب سمجھادیں۔

دھن رے دھنیے اپنی دھن
پرائی دھنی کا پاپ نہ بن
تیری روٹی میں چار بنوے
سب سے پہلے ان کو چن

سنیہہ عمیر کی بھی کہانی اچھی تھی۔

لڑکیوں کو اپنا وقار سلامت رکھنا چاہیے۔ مریم عزیز کا ناول تھوڑا فلمی نہیں تھا؟ ”آفرش شاکس“ آف اللہ۔ یہ جو ریگ وشت فراق ہے۔ واہ جی واہ بڑی بات ہے۔ سدرہ نے بیٹے کے ساتھ مل کر سو گھر سے نکالا تو اس کی سزائیں اولڈ ہوم پہنچ گئی۔ درشمار تو بہت بد تمیز لنگی اپنے مطلب کے لیے اتانیے بے چاری کے ساتھ کیا کیا۔

تاریخ کے جھوٹے ماما پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ رضیہ سلطانہ کے بارے میں پڑھیں تو یہ ہماری فرمائش ہے۔ پوری کرنے کی کوشش ضرور کر لے گا۔

ج : ارے ارے یہ تو ہماری آمنہ بڑا ظلم ہوا کہ غلط نام شائع ہو گیا۔ بھی ہم بھی بندہ بشر ہیں۔ غلطی ہو جائے تو درگزر کر دیا کریں۔ نہ حمد و نعت سمجھ میں آئیں نہ غزلیں دل کو بھائیں اور اشعار بھی ایسے۔ چلیں آئندہ خیال رکھیں گے۔ آسان چیزیں دیں گے۔ جن اشعار کا مطلب آپ نے پوچھا ہے ان کی تشریح یہ ہے کہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے اور انہیں نصیحتیں کرنے کے بجائے اپنے کردار و عمل کی فکر کریں۔ آپ سے آپ کے اعمال کی باز پرس ہوگی۔ بہت آسان لفظوں میں سمجھایا ہے۔ ایسا نہ ہوتے بھی سر سے گزر جائے۔ رضیہ سلطانہ کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ آپ کی ماما کی فرمائش پر دوبارہ شائع کر دیں گے۔

شمینہ اکرم ہمارا کالونی لیباری کراچی سے شریک محفل ہیں

پورا جبر کا مہینہ میں نے سخت اذیت اور تکلیف میں گزارا (اپنی بیماری کے باعث) میری طرف آپ کا شکریہ واجباً اور اللہ عید الاضحیٰ کے عید سروے میں اپنا نام سرفہرست دیکھ کر حیرت اور خوشی کے احساس میں گھر گئی کہ آپ لوگ اپنے قارئین کی اتنی پرانی نگارشات بھی اتنا سنبھال کر رکھتے ہیں۔ (کیونکہ تین سال سے تو ہمارے ہاں گائے کی قربانی ہو رہی ہے۔ یہ بات اس سے پہلے کی ہے) بہر حال اپنا اتنا اچھا سا لکھا ہوا سروے دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا اور بغیر سوالات کے سروے شائع کرنے کا مہمہ بھی حل ہو گیا۔

ابن انشاء کی شریک سفر کی رحلت کا پڑھ کر بہت دکھ

خواتین ڈائجسٹ

نومبر 2017ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- ”حالم“ نرہاجر کا ناول،
- ”دشت جنوں“ آصف رضا کا سلسلہ دار ناول،
- ”حسن الملک“ سائرہ رضا کا ناول،
- ”اوجھڑی“ نبیہ ناز کا مکمل ناول،
- ”پورب بچم“ نازید ذاق کا مکمل ناول،
- ”حادثہ“ قرۃ العین خرم ہاشمی کا ناول،
- ”سیراجید، راشدہ رفعت، ناظمہ زیدی،
- ”کرنا کرنا روشنی“ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ”کرنا کرنا نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے
- ”مورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
- ”قرۃ العین سکندر اور سرور فاطمہ بی کے افسانے،

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر 2017 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

میاں صاحب بھائی (جیٹھ جی) لاکھ مٹیں کروانے یہ جب شرجاتے ہیں میرے سوئیٹ شعاع کو لینے تو 18 کو دکان دار کہتا ہے آیا بی نہیں۔ شعاع اس بار میں خود لینے چلی گئی نند آئی ہوئی تھیں ان کے ساتھ دو ایسے بیماری کا مہمانہ کر کے دو ابلی لینے تو معلوم ہوا کہ دوکاندار کے پاس ڈائجسٹ ختم ہو جاتا ہے۔ سو آپ مجھے بتائیں 720 روپے آپ کو ارسال کرتی ہوں تو کیا وہ اسی لفافے میں ڈال کر بھجواؤں ہر بار کیا دوا کیا لے کر آنے کے لیے الگ لے گا؟

سلوی سیف اللہ بٹ آپ نے الیاس چاچو کو سزا دے کر اوندھ کر بھی سزا دے کر ہمارے سینوں میں ٹھنڈک کا احساس بھر دیا۔ شہزاد کے بارے بس اتنا کہوں گی کہ بڑی مزے دی استوری ہے۔ عفت سحر صاحبہ مہواہ کی مشکل آسان کر دیں۔ سرورق ماڈل صائمہ انصار اچھی ہیں۔ حمد اور نعت اور پاپا سونہ کی باتیں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہماری کیونٹ موش حیات کو دیکھ کر بڑھ کرٹی خوش ہو گیا۔ ایمن خان، منال خان، بی بی پیانی ہیں ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ یہ سسرال والے اکثریت ظلم زیادتی کرنے والے ہوتے ہیں سو پر جبکہ ان کی اپنی پٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ جب وقت آجائے گا بس ٹھیک ہی تھی۔ سرخ آندھی ایمل رضا آپ نے بہت اچھی استوری لکھی ہے انت بھلا سو بھلا یہ بہت سے گھروں کی کہانی ہے۔ حرف شکایت اینڈ پڑھ کر تو مزہ ہی آگیا۔ نسخہ عینا یوسف جیسی سو ہر آنکھ میں ہو تو زندگی خوب صورت ہو جائے۔ اطمینان ایسی نصیحت

امیر استوری، ضروری ہے کچھ لڑکیوں کے لیے۔ وہ اک درپچہ کرن اتنی پیاری استوری مریم آپ نے ہمیں دی راہ۔ آفر شاکس بھی بہت اچھی یہ جو رنگ دشت فراق ہے پہلے تو کہانی کو سمجھنے میں ناٹم لگا۔ تاریخ کے جھو کوں سے اس قح کے لیے تو میں بہت مشکور ہوں آپ لوگوں کی کہ یہ میرا فورٹ ہے۔ مین کے لٹو کی ترکیب دے کر میری مشکل آسان کر دی۔ پہلی زالی کے لٹو کی ترکیب بھی دیں جلدی۔

ج : پیاری روئی! آپ کو شعاع اتالیق ملتا ہے جان کر حیرت ہوئی جبکہ ہماری معلومات کے مطابق پہلی تاریخ کو پاکستان کے تمام شہروں میں پرچا بچ جاتا ہے۔ آپ کے لیے بہتر حل یہی ہے کہ آپ سالانہ خریدار بن جائیں۔ سالانہ خریدار بننے کے لیے 720 روپے مئی آرڈر کرنا

ہوا۔ یہ بزرگ لوگ بھی سایہ شجر کی مانند ہوتے ہیں۔ 11 نومبر کو میرے عزیز از جان بیٹے ”شمید معین اکرم“ کی پانچویں برسی ہے۔ سادگی کا پیکر سر پر دوپٹہ اوڑھے ماڈل میں اپنا عکس نظر آیا۔ ”سنہری دھوپ“ ناول کی کہانی سبک روی سے اپنے اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ جب ہم اپنے جائز حق کے لیے بھی آواز بلند نہ کریں تو پھر کوئی دوسرا کس طرح ہمارے حق میں بولے گا۔ دعا کی کمزوری اور پردہ نے آخری دن دکھایا ہے ”خواب شیشے کا“ اب اس کی کہانی پڑھنے میں مزہ آ رہا ہے۔ اس میں میرا پسندیدہ کردار موحہ ہے۔ مہواہ کے لیے موحہ ہی پرفیکٹ رہے گا۔ نمبر آفندی کو درمیان سے نکال دیں۔

مریم عزیز کا مکمل ناول ”وہ اک درپچہ کرن“ سب پر بازی لے گیا۔ ناول ”ریگ دشت فراق“ (ناتیہ احمد) کا بھی اچھا ہی تھا مگر زیادہ نہیں ”شہزاد“ ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ افسانے سب کے سب جاندار + شاندار لکے۔ ”سرخ آندھی“ ایمل رضا کا افسانہ جس میں کہانی تو وہی روایتی سی تھی مگر اس میں جملے اور مکالمے لاجواب تھے۔ منیبہ عمیر کا افسانہ ”اطمینان“ قناعت جیسی دولت موجود ہو تو دانا اور بے وقوف دونوں کو دل کا اطمینان نصیب ہو جاتا ہے۔ ”حرف شکایت“ (شازیہ جمال طارق) اس میں اچھی ہمو کے اوصاف بتائے گئے۔ رحمانہ آفتاب کا افسانہ ”آفر شاکس“ میں دونوں کی کہانی (جیسے اکبری،

اصغری ہوں)۔ باقی کے سب افسانے بھی اچھے تھے۔ ج : پیاری شینہ! ہم تو لوگوں کی امانتیں اتنے سالوں تک سنبھال کر رکھتے ہیں کہ رکھوانے والے خود بھی ان چیزوں کو بھول جاتے ہیں۔ برسوں بعد یاد دلائیں کہ بھائی آپ نے یہ چیز ہمارے پاس رکھوا رکھی ہے تو وہ بھی آپ ہی کی طرح حیرت اور خوشی میں گھر جاتے ہیں اور دوبارہ سے ہمیں ہی سوچ کر خود پھر سے بھول جاتے ہیں۔ اور نمبر کو کیوں بچ میں سے نکالیں؟ اتنی مشکلوں سے تو بچارے نے جگہ بنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ معین اکرم کی مغفرت کرے۔ آمین۔

روئی اکرم نے جھگ سے لکھا ہے

شعاع و خواتین اتنے خوب صورت ڈائجسٹ ہیں جیسے ایک ماں کا رشتہ خوب صورت ہے۔ اللہ پاک نے جہاں پہ نیا گھر دیا ہے۔ یہ شہر تو کیا آبادی سے بھی ہٹ کر ہے۔ سو

ہوں گے۔ منی آرڈر فارم پر اپنا ایڈریس صاف صاف لکھیں۔ لکھنے میں پیسے ڈال کر بجھوائے تو راستے میں گم ہونے کا خدشہ ہے۔ پرچا ڈاک یہ آپ کو گھر پر پہنچائے گا۔ ڈاکے کو الگ سے پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔ ہاں ٹھنڈا پانی یا شربت ضرور پلا سکتی ہیں کیونکہ آج کل گرمی بہت پڑ رہی ہے۔

مریم رحمانی خان پور ضلع شیخوپورہ سے شرکت کر رہی ہیں۔ لکھا ہے

میں آپ کے تینوں ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ بلکہ میں کیا میری ساری بہنیں اور دوستیں بھی آپ کے رسالوں کو پڑھتی ہیں۔ انکیتور کے شمارے کا ٹائٹل اچھا تھا۔ شہزاد میں میں بیکنے ہی جانتی تھی کہ رومی صمد کا شوہر ارسل ہی ہو گا جبکہ انابہ نے اس دفعہ صحیح معنوں میں برہان کے چھلے چھڑائے۔ عفت جی اپلیز نمبر ماہ کو کسی کنارے لگائیں۔ نادیہ احمد کی کہانی اچھی تھی۔ مریم عزیز معذرت کے ساتھ متاثر نہیں کر سکیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ خاص طور پر ”لختہ“ اور ”حرف شکایت“۔

ج : پیاری مریم! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی شرکت کرنی رہیں گی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

اقصی طیب الرحمن گاؤں مومن ضلع ہری پور سے لکھتی ہیں

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

اس ماہ کا شعاع واہ جی واہ سب سے پہلے جب تجھ سے تیار ہوا۔ ذرا اور ف کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں، شکر ہے میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ نادیہ احمد کا ناول ”ریگ وشت فراق“ پہلے باب کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی اور پھر بی بی کے ساتھ آف بہت روایا ہے اس کہانی نے۔ ایک کرن درپچہ میں مریم عزیز کے نوکیلتی کہنے بہت زبردست۔

”انت بھلا سب بھلا“ ہا ہا بہت زبردست لکھا افسانہ نعم نے۔ یہ کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا کیونکہ یہ کہانی میری اسی نے بھی پڑھی ہے اور ہنس ہنس کر رہا تھا۔ ”وہ میں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہوں تو ایک دو بولی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے اس لیے خالی آلو لے آئی“ اس جملے نے

ثناء ذوالفقار۔ نورے والی رحیم پیار خان سے شریک محفل ہیں

اکتوبر کا ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ اس ماہ ٹائٹل کے علاوہ باقی سارا شمارہ بیسٹ تھا۔ خاص طور پر افسانے بہت اچھے تھے۔ ایمل رضا کا ”سرخ آندھی“ ہو یا سنیعہ عمیر کا ”اطمینان“ سارے ہی افسانے بہترین تھے۔

ناولٹ ”انت بھلا سب بھلا“ پڑھ کر مزہ آیا ”اچھی تحریر تھی۔“ ”ایک کرن درپچہ“ میں مریم عزیز نے کہانی کا اینڈ اچھا کیا۔ ”ریگ وشت فراق“ حال اور ماضی میں لکھی گئی اچھی اسٹوری تھی۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ ز نے اچھا لکھا تھا۔ اینڈ میں جو شعر تھا وہ بہت پسند آیا۔

ج : پیاری ثناء! خط مختصر کرنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ ہم چاہتے ہیں اس محفل میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہوں۔ بصرہ آپ بے دھڑک لکھیں۔ اسے مختصر کرنا ہمیں خوب آتا ہے پچھلی مرتبہ آپ کے گاؤں کا نام غلط شائع ہوا۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ اس ماہ صحیح کر دی ہے۔

عائشہ انصاری لکھتی ہیں

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ بیٹیوں کو والدین چڑیوں کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے کھونسے میں انہیں پیار و تحفظ، عزت اور ایثار دیتے ہیں۔ آخر کس دل سے انہیں زمانے کا سروگرم اپنے نازک پرول پر سننے کے لیے جھوڑتے ہوں گے۔ وہ والدین جنہوں نے انہیں اپنی انگلیاں چھوا کر ان کے ڈمگائے قدموں کو مضبوط کیا تھا۔ انہیں زندگی کی نئی انجمن رازوں کی طرف کا مزن کر کے اپنی انگلیاں کے درمیان رکھتے ہیں۔

بازاروں کی خاک سے زندگی برقی لہائی اور منت خیز خوابوں کے پس منظر میں، سہمی خیمہ اور خاموش

سرگرمیاں۔ جب میں بھیجی آنکھوں اور واہوں سے اٹے
دل سے اپنی کتابیں، ڈائریاں، ڈائجسٹ اور دیگر رسالے
(جن میں میرے خط اور کالز ہیں) اکٹھے کیے۔ کوچ
(رخصت) کی تیاری میں ہوں۔ ایسی ہی معصوم سرگرمیوں
کے دوران اکتوبر کا شعاع ہاتھ آیا تو سوچا آخری بار اور خط
لکھ لیا جائے۔ پھر زندگی کے جھیلے جانے چھپچھپھوٹیں کہ
نہیں!

سب سے پہلے اپنے پسندیدہ ناول ”شہر زاد“ کو پڑھا۔
تجسس ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے کہ آخر ہم زاد ہے کون؟
”خواب شیشے کا“ ایک بہت فصیح آموز تحریر۔ ”سرخ
آندھی“ ایمل رضا کی بہترین (بیشہ کی طرح) کاوش۔
”نسخہ“ حنا گل صاحبہ! جانے کیوں مجھے ایسا لگے۔ یہ تحریر
آپ نے میرے لیے ہی لکھی ہو۔ (نسخہ میرے پاس محفوظ
ہے) ”اطمینان“ نے ایک بہت ہی عمدہ اور انوکھا سبق
دیا۔ کہ جو اطمینان بے وقوفوں کے پاس فطری ہوتا ہے وہ
عقل مند کو ٹھوکر کھا کر حاصل ہوتا ہے۔ (لا جواب)۔ ”وہ
اک در سچے کرن“ اور ”یہ جو رنگ دشت فرق ہے“ اچھی
مگر عام سی کاوش۔ ”ہفت روزہ شاکس“ بھی اچھی تھی۔ ”حرف
شکایت“ سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ شانہ بی! یہ
لامنیس میرے دل میں گھر کر گئیں کہ ”ممبر درگزر اور
مستقل مزاجی کے ہتھیار ساتھ ہوں۔ تو بعض معرکے بغیر
لڑے بھی جیتے جاسکتے ہیں۔“ (میری آئندہ زندگی کا لائحہ
عمل۔)

ج : پیاری عائشہ! اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کی اس حسین
تبدیلی کو خوشیوں مسرتوں اور اطمینان سے بھر دے۔

آمین۔ ہر شخص کا لائحہ نظر ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں
ضروری نہیں کہ عقل مند کو ٹھوکر لگے تو ہی اطمینان ملے۔
عقل مند وہی ہے جو دوسروں کی ٹھوکروں سے سبق لے
کر اپنا راستہ منتخب کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ٹھوکر عقل مند
کو بھی لگتی ہے اور بے وقوف کو بھی مگر اس ٹھوکر سے سبق
وہی سیکھتا ہے جسے اللہ ہدایت دے۔

عائشہ! آئندہ زندگی کے لیے آپ کا لائحہ عمل بالکل
درست ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ نے ممبر درگزر
اور مستقل مزاجی کو شعار بنایا تو ان شاء اللہ کامیاب رہیں
گی۔ افسانے ابھی پڑھیں گئے۔

رضوانہ فکیل راؤ نے لودھراں سے لکھا ہے
اکتوبر کا شمار بہت باوقار لگا۔ جس وجہ ماڈل گرل کا وہ پٹے
کالینا۔ زینہ زبئی سے ملاقات سو سو تھی۔ موش حیات اور
ایمن گفت و شنید کرتی اچھی لگیں۔ تجھ سے نانا جوڑا
میں۔ ذکی باتیں کچھ لگیں۔ خواب شیشے کا۔ مہما نمبر
اور موجد کافی الجھا ہے۔ ایمل رضا (جی نام ہی گارنٹی
ہے) کہ کمائی اچھی ہوگی۔ ویڈیو ایمل۔ مجھے کمائی کا نام
بہت اثر رکھتا ہے اور ہمارا دوستی ہے چچی میں تو راسٹر
اور کمائی کا نام پڑھتی ہی نہیں۔ لوبھلا پھر کیا پڑھا؟ شہر زاد
زبردست جاری ہے۔ در شہوار پر غصہ آ رہا ہے۔ خواہ
ہادی کے پیچھے پاگل۔ عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔
”خط آب گئے“ جی رونق لگی ہے محفل میں! اقراء عزیز
کوڑ جی کو خالد اور فوزیہ شمر آتی بول رہی ہیں۔ بھی ہم
سب ہمیں۔ ڈائجسٹ فیلو ہیں۔ دوستی کا رشتہ ہے ہم میں
جیسے کلاس فیلو۔ روڈ پر ساتھ چلنے والے روڈ فیلو۔ ”آری
ہوں!“ بھی اسد اللہ آوازیں دے رہا ہے کہ بیابانی لے
آئے ہیں کھانا پلاو۔ آج سنڈے ہے اور آج کھانا۔ پٹا
برائی۔ باب سائن روٹی اور میں بے چاری سبزی۔ کیونکہ
مجھے آج کل معدہ کا مسئلہ ہے۔

ج : پیاری رضوانہ! بہت افسوس ہوا کہ بیابانی سائن
روٹی بنانے کے بعد آپ کو صرف سبزی پر گزارہ کرنا پڑنا
ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔

در شہوار کی حرکتیں ہمیں بھی پسند نہیں۔ ایک لڑکی کے
لیے عزت نفس سب سے پہلے ہونی چاہیے۔ ایسی بھی کیا
محبت جو انسان کو ذلیل کر دے۔

آئی! بابی! آپا۔ ہمیں بھی راہ چلتے یہ رشتے بنانا پسند
نہیں۔ سب سے اچھا رشتہ دوستی کا رشتہ۔

تقسیم کوثر! ایف بی ایریا، گراچی سے لکھتی ہیں

نادیہ احمد کا ٹیول یہ جو رنگ دشت فراق بہت ہی اچھا
لگا۔ اس کی اسٹوری نہایت خوب صورت تھی۔ اس کے
پے عکس مریم عزیز کا ٹیول وہ اک در سچے کرن بھی اچھا ہی تھا
مگر زیادہ اچھا نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی اسٹوری عام سی
تھی۔ اور افشیں حکیم کا انت بھلا سب بھلا تو دل کو بھلا گیا۔
کے مصنفہ نے بہترین ٹایپ کر کمائی لکھی ہے۔ ہمیں بہت
پسند آئی۔ خواب شیشے کا تو جواب نہیں۔ شہر زاد کی کیا بات

اقصی شمس، صفر روڈ، ناسہو سے شریک محفل ہیں۔

سردق بالکل متاثر نہ کر سکا۔ ماڈل کے سر پر دوپٹہ کرنے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ ای نے کہا محرم الحرام کے احترام میں لیا ہے۔ آئینہ خانے میں وضو کی کوسیا علی کی بیٹی کے روپ میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ سجاد علی کی اتنی بڑی بیٹی؟ ماشاء اللہ۔ خط آپ کے پڑھ کر مزہ آگیا۔ شمیمہ اکرم لیاری اور فوزیہ ثمرت کے خطوط نہ ہوں تو یہ سلسلہ کچھ ادھور سا لگتا ہے۔ ”جب تجھ سے ملتا جوڑا ہے“۔ ف صاحبہ نوا ملت صاف کرنا صرف جمعداروں کا کام نہیں ہے۔ اس بات سے میری نسوانی انا پیڑی چوٹی پڑی ہے۔ آپ کی دوست نے آپ کے ساتھ دھوکا لیا اس دھوکے کو لے کے کڑھانہ کریں اب سرخ آندھی کو ہی دیکھ لیں، وڈے چوہدری کا اللہ پاک نے کیا انجام کیا۔ اللہ بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ باقی افسانے مجھے پسند نہیں آئے۔ سدرۃ المنتہی کا افسانہ فضول سا لگا۔ ”انت بھلا سو ہو بھلا“ بھی گزارے لائق تھا۔ ”ریگ دشت فراق“ جیسا ناول پہلے بھی گزر چکا ہے۔ سنہری دھوپ میں عمر اور خاص طور پر الیاس چاچو کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ در شوار کا کچھ پھوپھو ہیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کوثر خالد کا شعر پسند آیا۔ آخر میں امتل جی کے لیے۔

بلبل کے منہ میں گچھا ہے انگور کا
ملنے کو جی چاہتا ہے امتل! پر رستہ ہے دور کا
ناسہو سے کراچی ایک پورا دن پوری رات اور اگلا
آدھا دن۔

ج : پیاری اقصی! اگر یہ بکھرے ہوئے الفاظ ہیں تو موتی سے پونے ہوئے الفاظ کن لفظوں کو کہتے ہیں؟ ماڈل اگر جی سنو رہی ہو تو چمک چلو! دینا اوڑھ لے تو شیش سارہ ہو تو تبصرہ ہوتا ہے کیا ہیرو مر گیا ہے۔ ماڈل نہ ہوئی ملکی سیاست ہو گئی۔

ویسے تو عموماً ”سب ہمیں دعائیں لکھ کر بھیجتی ہیں مگر آپ نے جو بد دعائیں لکھی ہیں پڑھ کر مزہ آیا۔ ماسہو کراچی سے دور ہے تو ہم نہ کریں۔ محبت کرنے والے خواہ سکتے ہی دور ہوں ان کے دل کے تار ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ہمارا کبھی ماسہو آتا ہو تو ہم آپ سے ملنے آجائیں گے۔

ہ۔ لگتا ہے ساری رعنائی اور خوب صورتی اس پر ختم ہے۔ افسانوں میں جتنا گل کا نسخہ زبردست رہا۔ صنیمہ عمر فالسانہ اطمینان بھی قابل تعریف ہے۔ آئن شٹائن بھی ہلکی پھلکی اچھی تحریر لکھی مختصر مگر عمدہ افسانہ تھا اور ہاں خط آپ کے میں کوثر خالد کا خط پڑھ کر بیش کی طرح بہت اچھا لگا۔ ان کے لکھے کا انداز خالص سچا اور معصومانہ ہوتا ہے۔ جب تجھ سے ملتا جوڑا ہے۔ یہ سلسلہ نہایت اچھا جا رہا ہے۔ امت الصبور کا تاریخ کے جھوکوں پر لکھا مضمون دل کچھو گیا۔ اسے معلوماتی خزانہ کہہ سکتے ہیں اسی طرح پیارے نبی کی پیاری باتیں کا تو جواب ہی نہیں ہے۔

ج : پیاری شمیمہ! اللہ کے کرم سے خیریت ہی خیریت ہے بات ہماری مرضی کی ہو تو ہم تو ساری بہنوں کے اتنے دلچسپ اور محبت بھرے خطوط بغیر کسی قطع و برید کے شائع کر دیں گے۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عابدہ طہیر رعنائی، جہلم سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے کیا بتاؤں! ایک نشست میں پورا ڈائجسٹ پڑھا، کس کی تعریف کر دوں اور تبصرہ۔ آپ کو سمجھ آگیا ناں۔ یعنی میں پھر سلی سے پڑھوں گی۔

ج : پیاری عابدہ! آپ نے چند سطروں میں شعاع کی بحر پر تعریف کر دی۔ ایک نشست میں پرچا ختم کرنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ آپ نے شعاع پڑھنا شروع کیا اور اس کو اس وقت تک ہاتھ سے نہ رکھ سکیں جب تک پورا پرچا نہیں پڑھ لیا۔

عائشہ مرزا نے فیصل آباد سے لکھا ہے

سب سے پہلے ”سنہری دھوپ“ میں پہنچی۔ بہت اچھی قطر رہی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ مریم عزیز بہت اچھا لکھا۔ انس کا کردار بہت اچھا لگا۔ ”ریگ دشت فراق“ ویل ڈن نادیہ احمد اتنا اچھا لکھنے کے لیے شکریہ۔ ”انت بھلا سب بھلا“ ہنسا مکر آتا ہوا اچھا لگا جی۔ افسانے سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ”سرخ آندھی“ بہت اچھا لگا۔ ”اطمینان“ بہت نائس۔ باقی سب افسانے بھی پسند آئے۔ سب ہی سلیسے اچھے تھے۔

ج : پیاری عائشہ! بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو سارا شعاع اچھا لگا۔

اس پر میری سوچ الام کی صورت اُترتی ہے؟ ہر بار اسے پڑھ کر یہی سوچتی ہوں۔

اب ذرا اکثر کے شعاع پر تبصرہ، سرورق فضول، کہنی سنی میں پہلی شعاع، ہر بار دل کو روشن کرتی ہے اور آخر میں یہ جملہ کہ شعاع آپ کے لیے ترتیب دیا ہے۔ اپنی آراء ضرور دیں، قربان جانے کو دل کرتا ہے۔

اب مریم عزیز ہوں تو کوئی کہیں اور کیوں جائے۔ کہانی بڑھی اچھی تھی۔ مصطفیٰ کائنات، اسری وھی اور ولی سوہنی جیسی بات نہیں ہوتی اب مریم جی کے ناولز میں۔ سنہری دھوپ، دلچسپ موڈ پر آگئی ہے۔ نادیہ احمد کا جو ریگ دشت فراق ہے اسے اس ماہ کا مہتر ناول کہا جا سکتا ہے۔ ناول کا مرکزی خیال پرانا تھا۔ مگر پھر بھی مزہ آیا پڑھ کر۔ بار بار ایک جیسے موضوع پر جب اتنی کہانیاں لکھی اور پڑھی جا چکی ہوں تو پھر ایسے بھرے منہ سے نکل ہی آتے ہیں۔ واہ واہ! کیا ناول تھا افسانہ کا۔ دیکھا آپ نے، کوئی نئی چیز ہو تو تعریف کرنے میں کوئی گنجوی نہیں۔ افسانے سب ہی بے حد اچھے تھے۔ ایمل کی سرخ آندھی نے دل دکھی کر دیا۔ ویسے ایمل جی! آپ کا ڈرامہ، فیصلہ، بہت شوق سے دیکھتی ہوں صرف اس لیے کہ ایمل نے لکھا ہے۔

”حرف شکایت“ اور ”لسنہ“ جتنی کہانیاں تھیں کہ دونوں ہی بے حد فصاحت آموز اور دلچسپ تھیں۔ اور آپ کو بتاؤں کہ کوئی سات سال بعد میں نے شعاع سے شاعری نوٹ کی ہے۔ امجد اسلام امجد کی بے وفائی کی مشکطیں، واہ! کیا بات ہے۔ ”خط آپ کے“ میں ایسے ہی بڑھتی ہوں جیسے جسکے لے لے کر کہانی بڑھی جاتی ہے۔ ”تاریخ کے جھروکے“ بے حد کمال کا تھا۔ کیا آپ اس سے آگے کے حالات شائع نہیں کر سکتے؟ ”انٹرویوز“ اور ”آئینہ خانے میں“ میں بھی مزہ آیا۔ ثانیہ سعید کا انٹرویو شائع کر کے مجھ پر احسان عظیم کر دیں۔ اف میرے خدا! شہر زاد کیسے نکل گیا ذہن سے۔ صائمہ! کیا نوٹس لیا ہے آپ نے۔ پلیز زیادہ سے زیادہ صفحات دیا کریں نا۔

میں یہ قطعاً نہیں کہتی کہ شعاع نے اپنا معیار کھویا ہے۔ میں تو بس یہ یہ چاہتی ہوں کہ نئے رنگوں کے ساتھ ساتھ پرانے رنگوں کی چھب بھی قائم رہے۔ دل چاہتا ہے کہ شعاع کھولوں تو وہ ہر موسم کا بتا دیتا ہو معلوم ہو۔ امید ہے آپ سمجھ رہی ہوں گی جو میں کہنا چاہ رہی ہوں۔ اب

صائمہ مشتاق نے حافظ آباد سے لکھا ہے

بک باہ! کی حال سناؤ دل دا کوئی محرم راز نہ مل دا۔ ایک زمانہ تھا (اب تو اس زمانے کو بیسے صدیاں گزرے لگتی ہیں) جب گرمیوں میں اچاد کی پھانگوں کی چٹکارے دار خوشبو، منی کی سوندھی خوشبو، لمبی طویل دھپروں کا سکون اور اس بھری دھپر کے بعد سلونی سی شام کے مزہ سے شعاع بھرا ہوا تھا۔ عید آتی تھی تو چوڑیوں کی چھن چھن کانوں میں رس گھولتی اور مہندی کی خوشبو سانسوں کو مہکاتی اور تو اور عید کے دن لینے والے شیر خورمہ (جو کہ ہیروئن اپنے ہیرو کے لیے بناتی تھی) کا ذائقہ تک زبان چکھ لیتی تھی۔ خزاں میں گرے والے پتے اور ادا سی شعاع کا حسن بڑھاتی تھی اور سردی... کیا بات تھی سردی کی اس کی دھند کی اور ٹھنڈک سے بچانے کے لیے ہیرو کی ہیروئن کو اوڑھائی جانے والی شال کی جس کی گرماہٹ ہم پڑھنے والوں تک کو محسوس ہوتی تھی۔ شعاع کی ہمار بھی تو اپنے جو بن پر ہوتی تھی۔ رنگوں سے بھری کہانیاں زندگی میں حقیقت پر بھی زیادہ ہمارے آتی تھیں کیا دھنک سی دھنک ہوتی تھی بک باہ۔

اور اب... آہ موسم بدلے، حالات بدلے اور شعاع بھی بدل گیا۔ تھوڑوں میں وہ خوش نہ رہا، ہماروں میں وہ رنگین اور سردیوں میں وہ لطافت نہ رہی۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ اب وہ رنگ نظر نہیں آتے جو روح تک کو سرشار کر دیتے تھے۔ لیکن اب بھی... ہر بار اسی امید پہ شعاع کا در کھولتی ہوں کہ شاید... مگر دل ڈھونڈنا ہے پھر وہی... عید قرباں آتی ہے تو کہانیاں گھر گھر لو سیاستوں، مہنگے جانور لینے کی اور فریج بھرنے کی دوڑ سے بھری ہوتی ہے۔ گرمیوں میں کہانیوں میں مائے کھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں ہیروئن پینہ پینہ چکن میں کام کر رہی ہوتی ہے۔ ہائے رے ظالم وقت... قسم سے وہ زمانے بہت یاد آتے ہیں۔ نٹ کھٹ سی لڑکیاں، ٹیٹھی میٹھی نظروں سے نکتے لڑکے، کھٹی میٹھی شرارتیں اور چٹ پٹے کنز کی چٹکارے دار نوک جھونک... کوئی تو جائے انہیں ڈھونڈ لائے، بس کبھی کبھی ناسنلیجک ہو جاتی ہیں۔ وگرنہ ساتھ ساتھ سیرا حمید اور ایمل رضا کا جلد تو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ کاش میری سعید بے عزیز آفریدی کیس سے آجائے جو میرے دل کی بات لفظوں میں یوں پڑتی ہے کہ حیراں ہو جاتی ہوں کیا

کیجئے گا۔ شہر زاد بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ مگر مجھے در شہوار سے اس درجہ خود غرضی کی امید نہ تھی۔ جو محض ہادی کو ہانے کے چکر میں منانے سے راہ رو سم بھاری ہے۔ کبھی ہمیں تو اس کی چھوڑی حرکتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ افسانوں میں اس دفعہ سرخ آندھی، حرف شکایت اور نسخہ پسند آئے۔ پتا نہیں کیوں محرم عزیزی کی خبروں میں وہ بات نہیں رہی۔ اس دفعہ انہوں نے جس موضوع پر لکھا وہ کئی بار پڑھ چکے ہیں۔ مصطفیٰ تیمور جیسی بات نظری نہیں آتی۔

سنہری دھوپ کو تواب ختم ہونا چاہیے، تجھ سے ناتا سلسلہ تو میرا فیورٹ ہے ہر ماہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے فوزیہ ثمرت اور کوثر خالد جی کے خط بہت ہی پسند ہیں۔

ج : مثال اٹھادی کے بعد لہریلوزمہ داریوں اور بچے کی مصروفیت میں سے وقت نکال کر آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ شادی کے بعد بھی آپ کا مطالعہ کا شوق برقرار ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے ورنہ لڑکیاں عموماً ”شادی کے بعد ساری دنیا سے کٹ کر رہ جاتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

حلیمہ اور لیس نے لاہور سے شرکت کی ہے

عرصہ دراز سے شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ میری نظر میں یہ ایک ڈائجسٹ نہیں ایک خوب صورت دنیا ہے جو ہر انسان کو کچھ وقت کے لیے تنہا سے آزاد کر دیتی ہے۔ اس خط کے ساتھ اپنی ایک نظم بھیج رہی ہوں۔

ج : پیاری حلیمہ! یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ شعاع آپ کو کچھ دیر کے لیے دنیا کی تنہا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ شاعری کے لیے آپ کو ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔



ایکھیں نا اسی ایک شمارے میں ایک تو دو، دو، تجھ سے ناتا، دوڑا ہے، ہے پھر دو کمائیوں میں یہی چیز یعنی ساس، مندیں، سرسالی مسئلے اور میں ٹھہری، شبلی جوادی کی بہن اور روبینا کل کی کچی سیلی، جب کہ دل آرزو مندو بتا ہے سعدی حمید چوہدری اور سعدیہ عزیز آفریدی کا۔ پرانی رائٹرز سے تو دیے ہی مایوس ہو چکے۔ چلو جہاں رہیں خوش رہیں۔

ج : پیاری صائمہ! صرف موسم اور حالات ہی نہیں بدلے۔ انسان بھی بدل گئے ہیں۔ جن جھٹول کا احوال آپ نے لکھا ہے۔ ایمان داری سے بتائیں اب ایسی لڑکیاں کہاں ہیں۔ جن کی دلکش آوازیں اور معصومیت پر کوئی قربان جائے۔ اب تو شاعری بھی غم جاناں سے نکل کر غم دور ان میں سلگ رہی ہے۔

بے حد دلچسپ خط۔۔۔ پڑھ کر بہت مزا آیا اور ہمیں بھی وہ دن یاد آگئے جب ہیروئن سر دیوں میں نارتکیاں کھاتی تھی، گر میوں میں نہیں۔ دل تو ہمارا بھی چاہتا ہے کہ کوئی ایسی تحریر ہو جو ہاتھ پکڑ کر خوشبوؤں اور جھٹولوں کے اس دلیں میں لے جائے جہاں کوئی ظالم سماج نہ ہو مگر کب ہا۔۔۔

خیر یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن ہم اپنی مصنفین سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری قارئین کے لیے رنگوں کی، چھوڑوں کی خوشبوؤں کی باتیں لکھیں۔ دنیا بدلی ضرور ہے لیکن اس کی خوب صورتی اپنی جگہ قائم ہے بس زاویہ نظر کی بات ہے کہ کوئی کھڑکی کھول کر آسمان پر چمکتے تارے دیکھتا ہے اور کوئی زمین پر پڑی گندکی۔

مثال زین العابدین نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھا ہے

میں خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن کی پچھلے چودہ سالوں سے مستقل قاری ہوں۔ تمام ہی رائٹرز بہت ہی عمدہ لکھتی ہیں۔ ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا ہے۔ شادی کے بعد بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میرا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس ماہ ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ خواب شیشے کا بہت ہی زبردست تحریر ہے۔ مودہ کا مہماہ کو تھیر مارنا اچھا نہیں لگا۔ لیکن اس کا اینڈ مودہ کے ساتھ ہی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادب خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے مہماہ شعاع اور ادب نامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق شائع و نقل جی ادب محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی دینی جملہ اور نامور لفظی اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادب ادب قلمی چاہے جی کا حق رکھتا ہے۔

رُز کر ان کے منہ دھلواتی۔ ثانیہ امی کے ساتھ بچن میں ہنس جاتی۔ امی حلوے کے لیے سوچی بھونے لگتی اور ثانیہ پوریوں کے لیے میدہ گوندھنے لگتی۔
 ”آنا ذرا زیادہ گوندھنا مانی، ضویا سے کہتی ہوں اوپر سے بھائی، بھابھی کو بھی بلالائے۔“ امی کے کہنے پر ثانیہ مسکرا دیتی۔ اگلے ہی لمحے دادی بچن میں جھانکتی۔

”حلوہ پوری پتاری ہو تو توفیق کو بھی بلالو۔ ابھی پرسوں ہی کہہ رہا تھا بہت دن ہو گئے بھابھی کے ہاتھ کا حلوہ اور پوریاں نہیں کھائیں۔“ دادی کو پڑوس میں ہنسنے والے اپنے بیٹے کی یاد ستاتی۔
 ”زید باہر کھن میں ہی تو بیٹھا ہے اہل۔ اسے بھیج

آج گھر میں رونق اور چل پھل کا عجیب ہی عالم تھا۔ ایسا اور بچو تو اپنے اپنے شوہر صاحبان اور بچوں سمیت صبح سویرے ہی پھول پھول جاتے۔ جب ان کا شیکے آنے کا پروگرام ہوتا تو وہ پھٹی کے دن سوئے جاتے بچوں کو زبردستی گاڑی میں بٹھا کر پیدل کارخانہ کو تھکی نالی کے گھر کا دروازہ دیکھتے کے ساتھ ہی بچوں کی سوئی سوئی آنکھیں پٹ سے کھل جاتیں۔ نیند کا شمار ٹوٹ جاتا اور خوشی سے بے قابو بچے چیخے شور مچاتے، نانی، نانا کے گھر داخل ہوتے۔ پیچھے ان کے مسکراتے ماں باپ تشریف لاتے۔

وہیں نے تو عاقب سے اتنا کہا کہ ناشتا کر کے چلتے ہیں لیکن عاقب نے کہا کہ امی کے ہاتھ کی گرم گرم

راشدہ رفعت

وندگی کھیتریگی کھیروٹی

کر کھلو ایس توفیق کو۔“ امی کہتیں تو دادی سر ہلاتے ہوئے واپس پلٹ جاتیں۔
 ثانیہ پرابت میں مزید میدہ ڈال لیتی۔ ذرا دیر میں ضویا پردہ نکالتی بچن میں آتی۔
 ”نور بھابھی کچھ اچھا پکائیں یا برابر میں چچی، ہمیں کبھی کوئی جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھتا اور یہاں ہر کسی کے لیے دعوت عام ہے۔“
 ”بری بات ضویا! کتنی دفعہ تمہیں سمجھاؤں دسترخوان وسیع کرنے سے رزق میں خود بخود اضافہ ہوتا ہے۔“ کلثوم رسانیت سے بیٹی کو سمجھاتیں۔
 ذرا سی دیر میں عفت ایسا اور باسط بھائی آجاتے اوپر سے شعیب بھائی اور روزنہ بھابھی ہنستے مسکراتے اتر

خستہ کراری پوریاں کھائیں گے جنے ہم بازار سے لیتے آئے ہیں۔“ ماہین بچو مسکرا کر کہتیں۔
 ”بہت اچھا کیا بیٹا! جو چلے آئے آتے ہوئے عفت کو بھی لون کر دیتے۔“
 امی بیٹی واما کو کے آنے پر خوشی سے نہال ہو جاتیں پھر انہیں دوسری بیابائی بیٹی کی یاد ستاتی تھی۔
 ”باسط کو میں نے مسیج کر دیا تھا آئی جی! اگر جاگ چکا ہو گا تو مسیج پڑھتے ہی دوڑ لگا دے گا۔“ عاقب بھائی مسکراتے ہوئے بتاتے۔

”بچو! کم بچوں کے منہ تو دھلا کر لے آئیں، کیسے باگڑے بلے لگ رہے ہیں۔“ ضویا بھانجے بھانجیوں کو زبردستی پکڑ کر واش روم میں لے جا کر رکڑ



تھیں، اپنا کو اندازہ بھی نہ ہوا کہ وہ بتول بیگم کی نگاہوں کی زد میں ہیں۔

شادی بھٹکانا انہوں نے امینہ بیگم (ایپا کی ساس) سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ عفت کی امی کے ہاں چلیں انہیں اپنے ہدایت اللہ کے لیے عفت کی بہن کا رشتہ درکار ہے۔

ان کے اصرار کے آگے ہار مانتے ہوئے امینہ بیگم نے ہو کو ان کی خواہش سے آگاہ کر دیا۔ اور بھادراج کو ساتھ لے کر عفت کے مکے پہنچ گئیں۔ ساری بات جان کر کلثوم بیگم نے بتول بیگم کو رسانیت سے کہہ دیا کہ وہ بچیوں کی شادی شرمیں ہی کریں گی۔

”دیکھیں ماں جی! آپ ایک بار میرے ہدایت اللہ کو دیکھ لیں پھر کوئی فیصلہ کریں۔“ بتول بیگم بارہی نہیں مان رہی تھیں۔ اس روز داوی اور امی نے انہیں بہت مشکلوں سے ٹالا تھا۔

”میں پھر دوبارہ آؤں گی۔ آپ لوگ اچھی طرح سوچ بچار کر لیں۔“

ثانیہ ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرے میں بیٹھی بتول بیگم کی گفتگو سے لطف اٹھا رہی تھی لیکن جب ابو نے ان کے ہدایت اللہ کو دیکھنے کی ہامی بھری تو ثانیہ کے توتے اڑ گئے۔

ثانی! اتھیں عنبرہ سید کے ناول والا بابا ماسٹر ہدایت اللہ کتنا اچھا لگتا تھا نا دیکھو اللہ نے تمہارے لیے بھی ایک ماسٹر ہدایت اللہ بھیج دیا۔“ وہ ثانیہ کو چھینڑ رہی تھی۔ ثانیہ کو اس بار ہنسی نہ آئی۔ وہ بس ضویا کو گھور کر رہ گئی۔ پھر وہ دن بعد عفت اپنا کی آمد ہوئی۔

”ہی! بتول ماں کا بیٹا بڑھ دو برس سے ہمیں اپنے شہر کے باؤنر کلن میں پرہار رہا ہے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے باسٹ سے ملے آیا تو میں نے خاص طور پر دیکھا۔ بہت سلکھا ہوا اور مذہب لڑکا لگ رہا تھا۔ ایک بار دیکھنے میں کوئی حرج تو نہیں۔

باسٹ بھی ہدایت کی تعریف کر رہے تھے پر دھا لکھا خوب صورت لڑکا ہے۔ گور نمٹ جاوے ہے۔ پس

آتے پھر تو تپ چچا بھی آجاتے۔ ضویا بوے کمرے میں دسترخوان لگائی۔ امی گرم گرم پوریاں تلتیں اور ثانیہ کچن اور کمرے کے چکر کاٹتی رہتی۔ کبھی گرم پوریاں پکڑا رہی ہے۔ کبھی ڈونگے میں مزید گرم حلوہ ڈال کر لے جا رہی ہے پھر جب سب پیٹ بھر کر اعلان کر دیتے تو وہ کچن میں ہی بیٹھ کر امی کے ساتھ حلوہ پور یوں سے انصاف کرتی۔

مینے میں کسی ایک چھٹی کے دن کا تو یہ معمول لازمی تھا صبح سے شروع ہونے والی گما گما شام تک جاری رہتی۔

آج بھی ایسا ہی دن تھا۔ وہ ہی رونق وہ ہی ہنگامہ، ہر تکلف ناشتے کے بعد زبردست لہج کا اہتمام جاری تھا لیکن آج امی کچن میں نہ تھیں۔ ضویا اور ثانیہ ہی مل جل کر کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ضویا کام کی زیادتی کی وجہ سے ہائے آف کر رہی تھی تو ہمیشہ ہنسنے مسکراتے کام نمٹانے والی ثانیہ کے چہرے پر بھی کوئی مسکراہٹ نہ تھی۔ دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔



ہال کمرے میں گھر کے جملہ بیٹوں کی میٹنگ جاری تھی۔ آج سب صرف حلوہ پوری اور مٹن بریانی کھانے جمع نہیں ہوئے تھے۔ آج سب کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ ثانیہ کے مستقبل کا حتی فیصلہ کرنے کے لیے ثانیہ کے لیے آئے جس رشتے پر آج حتی غور و خوص جاری تھا۔ چند دن پیشتر اس رشتے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا تو درکنار سرے سے سوچنا ہی ضروری نہ سمجھا گیا تھا۔ ہال گھر میں سب کے ہاتھ ہنسی ٹھٹھول کے لیے ایک موضوع ہاتھ آ گیا تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ عفت اپنا کی نند کی شادی تھی باسٹ بھائی کی رشتے کی ماں بھی شادی میں شریک ہونے گاؤں سے شر آئیں۔ ان تین چار دنوں میں جوانوں نے اپنا کے سسرال میں گزارے وہ اپنا پر فدا ہی ہو گئیں۔ انہیں اپنا کی متانت اور برادری بھائی بھی پھر جس طرح چپک کر وہ سسرالی کھیرے منار ہی

”ہماری ناپسندیدگی کو تو آپ کسی خاطر میں ہی نہ لائے ابو! لیکن جس کی زندگی کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے خاندان بھر کو اٹھا کر لیا اس بے چاری کی اپنی رائے لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی آپ لوگوں نے“

ابو ضویا کی بات سن کر ذرا چونکے پھر سوالیہ نگاہیں اسی پر گاڑیں۔

”کیا ثانیہ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے؟“ ان کی نگاہوں میں یہی سوال چھپا تھا۔

”ثانیہ کو کوئی اعتراض نہیں۔ اس نے سب کچھ ہماری مرضی پر چھوڑ رکھا تھا۔“ اسی نے پہلے تو ضویا کو گھورا پھر رسائیت سے شوہر کو جواب دیا۔

”اس بے چاری کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ لوگوں کی مرضی کیا ہوگی۔ وہ تو آخر تک یہ ہی سمجھتی رہی تھی کہ آپ بٹول آئی کو انکار کر دیں گے“ ضویا نے مل باپ کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”ثانیہ کو بھیجو میرے پاس۔“ ضویا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ وہ فوراً ”ثانیہ کے پاس جا چکی۔“

”تمہارے پاس آخری موقع ہے۔ ابو تمہاری رائے جانیں گے۔ صاف صاف انکار کر دینا۔ مشرقی و مشرقی بننے کی ہرگز ضرورت نہیں۔“ ضویا نے اس کے مزاج کے پیش نظر اسے صیحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔

ثانیہ خاموشی سے اٹھ کر ابو کے پاس چلی گئی تھی۔ ابو نے اس کی رائے لینے سے پیشتر ہدایت اللہ کے متعلق اپنی رائے دینے کو ترجیح دی تھی۔

”ہدایت بہت شریف النفس اور نیک طینت لڑکا ہے۔ اسے دیکھتے ہی اس کی شرافت اور نجابت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھنے سے پہلے میں خود اس رشتے پر راضی نہ تھا لیکن اب میرا دل اس رشتے کے لیے پوری طرح مطمئن ہے۔ ہاں اگر تمہارا دل اس رشتے

الطریقہ ہستی ہے تو کیا ہوا۔ بیوی کو اپنے ساتھ شہر میں ہی رکھ لے گا نا۔ اسے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں اے۔ پھر خاندان میں ثانی اور ضویا کے جوڑ کا کون بچا ہے۔ ہوا دی لو جھوٹی پھوپھو سے امیدیں ہیں لیکن میں نے خود پھولی پھوپھو کے منہ سے سنا ہے کہ ارسلان اپنی کسی لولیک میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ابھی تو پھوپھو راضی نہیں ہو رہے اگر وہ مان گئے تو پھوپھو کو بیٹے کے دل کی خوشی پوری کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”تمہاری خالہ بھی تو انیق کے لیے خواہش ظاہر کر چکی ہیں۔“ اسی دھیرے سے بولی تھیں۔

”انیق کی سرگرمیاں کسی سے ڈھکی چھپی تو نہیں اے! خالہ محسن کے لیے بات کرتیں تو سوچا جاسکتا تھا۔ حسن کے لیے انہوں نے اپنی جھٹائی کی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا۔“

عفت اپنا کی ساری باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔ اسی واقعی سوچ میں پڑ گئیں۔ شعیب بھائی کو بتایا تو ان کی بھی یہی رائے تھی کہ لڑکا دیکھنے میں کوئی حرج تو نہیں۔

تینوں کو ہی ہدایت اللہ پسند آ گیا تھا۔ اسی کو ہدایت اللہ خاصا پسند آیا تھا وہ پھر بھی رشتہ قبول کرنے کے بارے میں متذبذب تھیں۔ ادھر بٹول بیگم نے فون کر کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ انہیں جواب چاہیے تھا ورنہ بھی ہاں میں۔

ابو نے ختمی فیصلہ کرنے کے لیے خاندانی میٹنگ طلب کر لی تھی۔ ثانیہ کی چھٹی حس اسے میٹنگ کے ممکنہ فیصلے کے بارے میں آگاہ کر چکی تھی۔ چھٹی حس کی ثابت ہوئی۔ کثرت رائے سے ہدایت اللہ کا رشتہ منظور کر لیا گیا۔ عفت، اپنا باسٹ بھائی، شعیب بھائی، بھابھی اور حتیٰ کہ توفیق چاچو تک نے ہدایت اللہ کے حق میں ووٹ دیا۔ دوسری طرف صرف رادی اور مایین بچو ہی تھے۔ ضویا اور زین کو تو کوئی کسی گنتی یا شمار میں ہی نہیں تھے البتہ ضویا نے ناراضی سے ابو کو بھی جتا دیا تھا۔

پر راضی نہیں ہے تو مجھے بغیر کسی جھجک کے بتا دو۔ ابھی سلسلہ زیادہ آگے نہیں بڑھا ہے ہم ان لوگوں سے سلیقے سے معذرت کر لیں گے۔ ”ابو پیار بھرے لہجے میں بیٹی سے مخاطب تھے۔

”مجھے آپ کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ابو۔“ وہ دھیرے سے کہہ کر ٹیٹ گئی تھی۔

”مجھے پتا تھا تم یہ ہی کرو گی اسے کہتے ہیں۔ مدعی ست گواہ چست۔ میں تمہاری خاطر ابو کے سامنے تک بولی۔ اس رشتے کے لیے تمہاری تاپندیدگی بتائی اور تم نے ایسے۔“

”میں اس رشتے پر راضی ہوں ضویا۔ پلیز میرا سر نہ کھاؤ۔“ ثانیہ نے انکار کر اس کی بات کاٹی۔

”ہاں تمہاری شکل ہی بتا رہی ہے نہ تم اس رشتے پر دلی طور پر راضی ہو۔“ ضویا نے طنز کا تیر چلایا تھا۔ اس بار ثانیہ کچھ نہ بولی۔ ضویا ہی کچھ دیر تک جھک کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ ثانیہ کے لبوں پر چٹکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔



ہدایت اللہ گاؤں کا باسی تھا بے شک بڑھنے لکھنے کے لیے شہر آیا تھا اور اب بھی شہر میں ہی نوکری کر رہا تھا لیکن اس کا پس منظر بھی وسعتی تھا اور خاندان بھی۔ ثانیہ کو انکو بھی پہنانے اس کی ساس، جھٹلی اور بڑی نند آئے تھے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ضویا اور زین نے ان لوگوں کے پینڈو پن پر خوب ہی تبصرے کیے۔

”یہ لفظ پینڈو کی کیا تعریف ہے بھی۔ تم ان لوگوں کو پینڈو کہہ رہے ہو اور ضویا اس روز تم نے شانگ مال میں مجھے اپنی وہ ماڈرن سی کلاس فیلو دور سے دکھائی تھی۔ اس کی نظر میں تو شاید ہم تم جیسے لوگ بھی پینڈو ہوتے ہوں گے اور وہ لڑکی اپنے سے اونچے طبقے میں مس فٹ اور پینڈو سی لگتی ہوگی تو یہ سلسلہ تو کیس جاکر رکنا نظر نہیں آتا۔ یوں بلاوجہ خود کو برتر سمجھنا اور کسی کی شخصیت پر کمبٹس دینا اچھی بات نہیں گزریا۔“

عفت اپنا نے چھوٹی ہن کو بہت پیار سے سمجھایا تھا۔ آج سے پہلے ثانیہ عفت اپنا کو بہت آئینہ لائز کرتی تھی لیکن آج اسے ان کی متانت بھری گفتگو ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ ضویا نے کون سا ایسی غلط بات کہہ دی تھی پینڈو لوگوں کو ہی پینڈو کہا تھا۔

بات بکلی ہونے کے بعد بھول بیگم نے جلد شادی پر زور دینا شروع کر دیا۔

”یہاں شہر میں بازاری کھلنے کھا کھا کر میرے ہدایت اللہ کا معدہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ گھر والی آجائے گی تو اسے گھر کا پکا تو کھانے کو ملا کرے گا نا بس تو صیف بھائی! اب ہماری ثانیہ کو ہمارے ساتھ رخصت کر دیں۔“ بھول بیگم نے ابو کو مخاطب کیا۔ اور پھر ان ہی دنوں غیر متوقع طور پر ضویا کا بھی رشتہ آ گیا۔

فمیدہ آئی بر رسول اسی کالونی میں ان کے پڑوس میں رہی تھیں۔ دونوں گھرانوں میں خاصا آنا جانا تھا۔ ڈھالی، تین برس پہلے وہ شہر کی نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں نیسبتنا بڑا گھر تعمیر کروا کر فیملی سمیت وہاں شفٹ ہو گئی تھیں۔ اب مہینوں بعد ہی ملنا ملنا ہوتا۔ انہیں ثانیہ کا رشتہ طے ہونے کا پتا چلا تو مبارک باد دینے آئیں۔

”چلیں اللہ مبارک کرے لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں عضویا کے لیے اوھر اوھر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا احقر آپ کا دیکھا بھلا ہے ہمارا، آپ کا برسوں کا ساتھ رہا ہے ایک دوسرے کے متعلق کسی جانچ بڑتال کی ضرورت بھی نہیں۔ تو صیف بھائی سے مشورہ کریں اور پھر مجھے جواب دیں، لیکن میں ہاں سے بغیر نہیں ٹلوں گی۔“ فمیدہ آئی نے مسکرا کر امی کو باور کرایا تھا۔

فیملی واقعی دیکھی بھالی تھی۔ اس بار سوچنے کے لیے کسی خاندانی گول میز کانفرنس کا انعقاد نہیں کیا گیا تھا۔ خاندان والوں کو مطلع کیا گیا تھا اور فمیدہ آئی کو ہاں کر دی گئی۔

فمیدہ آئی کو جب پتا چلا کہ ثانیہ کے سرال والوں کو شادی کی جلدی ہے تو انہوں نے بھی ضویا کی شادی

کا تقاضا کر دیا۔ امی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ امی، ابو ابھی صرف ثانیہ کی شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ جمع جتنا بھی ایک شادی کے حساب سے تھا۔ فوری طور پر دو شادیوں کا انتظام آسان نہ تھا۔

نقصہ آگنی اپنے دل کی تکلیف کو بنیاد بنا کر جلدی شادی پر زور دے رہی تھیں۔ ویسے بھی احرام اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ جلد از جلد بیٹے کے سر پر سرساجانے کی خواہش مند تھیں۔ اس موقع پر شعیب بھائی نے امی، ابو کے بڑا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے شادیوں کی تیاری کے لیے ایک خطیر رقم امی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”دیکھ لو بیٹا! روز نہ کوہنا چلا تو وہ ہنگامہ عبادے کی۔“ امی ہسکی عادت سے واقف تھیں۔ اس کیسے پیسے لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں۔

”امی، میری پیاری امی! آپ کی یہ ہی نیچر ہم بہن بھائیوں کو دورے میں ملتی ہے۔ ہم ہنگامہ ہونے سے ڈرتے ہیں۔ اسی خوف سے آپ نے میری شادی کے صرف تین ماہ بعد مجھے اوپر والا پورشن دے کر الگ کر دیا۔ میں نے بھی گھر کیلوسکون کی خاطر کچھ واپس کر لیا۔ لیکن امی! بچن الگ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اب آپ کا بیٹا نہیں رہا یا اپنے فرائض سے غافل ہو گیا ہوں۔ بہنوں کی شادی میں حصہ ڈالنا میرا فرض ہے۔ روز نہ کچھ کہہ کر تو دیکھئے، میں اس کی طبیعت صاف کر دوں گا۔“ شعیب بھائی آج بہت نڈر اور بے خوف لگ رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ روز نہ بھابھی میکے گئی ہوئی تھیں۔

”گلی گلی کئی شادیوں کے چھ آٹھ ماہ بعد کھلے گی تب میں تمہاری رقم لوٹا دوں گی۔“ امی نے بیٹے سے پیسے لے لیے تھے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

”جب آپ کو سہولت ہو دے دیتے گا ویسے بھی یہ میری سیونگ ہی تھی۔ بینک میں بھی تو پڑی ہوئی تھی۔ ضرورت کے وقت آپ کے کام آجائے۔“ اس سے اچھی بات کیا ہوگی اور جہاں تک روز نہ کا تعلق ہے اس سے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔“

شعیب بھائی رسائیت سے بولے۔ امی کے لیوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بیٹا ماں کو ”فرض“ دے کر اپنا ”فرض“ نبھانے آیا تھا۔ بہر حال اس وقت اس کی یہ مدد بھی بہت تھی۔ شادیوں کی تیاری زور و شور سے شروع کر دی گئی۔

ہدایت اللہ پہلے کلج کے ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا اب اس نے کلج کے قریب ایک رہائشی کالونی میں چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا۔ ماہین بچو اور عفت ایپا زین کے ساتھ اس کا گھر دیکھنے گئی تھیں۔ قالین کے سیانز اور پردوں کے لیے گھر کیوں وغیرہ کی کتنی بھی کرنا تھی۔

”میں نے اہل سے بہت بار کہا کہ وہ واضح طور پر آپ لوگوں کو جینز بیٹنے سے منع کر دیں۔ پتا نہیں اہل نے میرا پیغام پہنچایا یا نہیں، لیکن میں آپ لوگوں سے درخواست کر رہا ہوں کہ جینز وغیرہ بیٹنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اسے رسمی انکار نہ سمجھیں بلکہ میں واقعی جینز کے نام پر کچھ نہیں لیتا چاہتا۔“

ہدایت اللہ نے بہت ادب سے دونوں سالیوں کو مخاطب کی۔ عفت ایپا کی آنکھوں میں توصیفی چمک ابھری تھی جب کہ ماہین بچو کے لیوں پر استہراسیہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”برامت ماننا ہدایت! جینز تو ان لڑکیوں کو بھی دیا جاتا ہے جو بھرے بڑے گھروں میں بیہای جاتی ہیں اور تمہارے اس خالی مکان کو آباد کرنے کے لیے کیا بیوی کے ساتھ سالانہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ چھڑا چھانٹ بندہ ایسے رہ سکتا ہے لیکن اگر تمہارا خیال ہے کہ ثانیہ بھی ان دو مسہروں (سنگل بیڈ) اور چند برتنوں والے گھر میں گزارہ کر لے گی تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“ ماہین بچو نے اپنی دانست میں ایسا تفصیلی جواب دے کر اس کی طبیعت ہی صاف کر دی تھی۔

”آپ کی باتیں بجا لیکن میری خواہش تھی کہ ثانیہ شادی کے بعد میرے ساتھ آئے گھر کے لیے خود خریداری کرتی۔“ اس نے گھر کے بنا سازو سامان

ہونے کی بابت شرمندگی سے وضاحت کی۔

”ہاں تو اللہ خیر رکھے تم دونوں کو مل کر ہی اپنے گھر

کی بنیاد رکھنی ہے اور تسلی رکھو میرے والدین اپنی بساط کے مطابق ہی بیٹی کو دے کر رخصت کر سگے۔ ہم خود دنیا والوں کی طرح بلاوجہ کی نمود نمائش اور دکھاوے کے قائل نہیں۔ تمہاری سوچ ہمیں بہت اچھی لگی۔ امی ابو کو تمہارے خیالات سے آگاہ کریں گے۔“

عفت اپنا نے جلدی جلدی بول کر ماہینہ بجو کی کسی باتوں کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ زین خاموش تماشا ہی بنا کھڑا تھا لیکن گھر آکر اس نے ثانیہ کو ساری رپورٹ دی تھی۔

”ماہینہ بجو تو دادی کا پوتہ ہیں۔ سامنے والے کا لحاظ کیے بنا جو منہ میں آئے بول دیتی ہیں حالانکہ ہدایت بھائی کی بات نامعقول تو نہ تھی۔ ایسے خیالات کی تو قدر کرنا چاہیے۔ بے چاری عفت اپنا بہت مشکل سے بات سنبھالی۔ ہدایت بھائی ویسے تو مسکراتے ہوئے سر ملاتے گئے لیکن مجھے ڈر ہے کہ انہوں نے ماہینہ بجو کی باتوں کو ماننے نہ کیا ہو۔ یہ دیہاتی لوگ تو ویسے بھی غصے کے بہت تیز ہوتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس وقت تو وہ بات پی گئے ہیں مگر شادی کے بعد ہمیں طعنے نہ ماریں۔“

زین اس پر اپنے خدشات ظاہر کر رہا تھا۔ زین گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور اپنے سے بڑی ثانیہ اور ضویا کے بہت قریب تھا۔ تینوں میں بلا کی بے تکلفی تھی۔ ضویا کی طرح زین بھی اس رشتے کے حق میں نہ تھا اور آج سے پہلے ہدایت اللہ کا مذاق ہی اڑاتا تھا۔ شاید اس سے پہلے اسے ہدایت سے ملنے کا ڈھنگ سے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ثانیہ نے اس کے لبوں سے پہلی بار ”ہدایت بھائی“ کا ذکر احترام سے سنا۔ وہ ہدایت اللہ کی تعریف کر رہا تھا ساتھ ہی ماہینہ بجو کی بات پر ہدایت اللہ کے کسی ممکنہ رد عمل سے ڈر بھی رہا تھا۔

ثانیہ کو خود ماہینہ بجو کی بات اچھی نہ لگی لیکن ماہینہ بجو واقعی دادی پر گئی تھیں۔ ان کے جی میں جو آنا

سامنے والے کا لحاظ کیے بنا بول دیتیں اور بولنے کے معاملے میں تو شاید ضویا بھی ایسی ہی تھی۔ شادی کا رڈ چھینے کا مرحلہ آیا تو اسے ہدایت اللہ کے نام پر اعتراض ہو گیا۔

”پی جی یا تو میری اور ثانیہ کی شادی کے کارڈ الگ چھپوائیں اور نہ دو لہا، دو لہن کے نام ہی کارڈ پر مت لکھوائیں۔“ اس انوکھی فرمائش پر امی نے اسے گھورا۔ ”میری سہیلیاں ہدایت اللہ نام پڑھ کر میرا مذاق اڑائیں گی بھی۔“ وہ ٹھنکی۔

”ہدایت اللہ تمہارے دو لہا کا نام نہیں ہے جو تمہاری سہیلیاں تمہارا مذاق اڑائیں گی۔ تمہارا دو لہا احمر علی ہے۔“ ثانیہ کو اس کی بات سن کر غصہ آگیا تھا جب ہی تنگی سے اسے جواب دیا۔

”فہ عالی! تم تو برا مان گئیں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی بھی۔“ ثانیہ کے رد عمل سے ضویا کو اپنی بات کی نامعقولیت کا احساس ہو گیا تب ہی اپنی بات کو مذاق کے کھاتے میں ڈال دیا حالانکہ ثانیہ کو پتا تھا کہ وہ مذاق نہیں تھا۔

”آج تمام شادی کے بعد ہدایت بھائی کو ہادی کہہ کر بلایا کرنا بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں کہ ہم بھی انہیں ہادی بھائی ہی کہا کریں۔ اچھا لگے گا۔“ اس کے ذہن میں ایک اور آئیڈیا آیا۔

”تم ہدایت بھائی کی فکر چھوڑو۔ احمر کی فکر کرو۔ یاد ہے، بچپن میں آئی، احمر کو بیلو کہہ کر بلاتی تھیں۔ کیا خیال ہے ویڈنگ کارڈ پر تمہارے دو لہا کا نام احمر علی بیلو نہ لکھوادیں۔“

زین نے اسے چھیڑا۔ وہ پرمانے بغیر کھکھلا کر ہنس پڑی۔ ثانیہ کو اس کی مسکراہٹ پر رشک آیا۔ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آرہے تھے اس کی کھکھلاہٹیں بڑھتی جا رہی تھیں جب کہ ثانیہ کو مسکرانے کے لیے بھی سوچنے کرنے پڑتے تھے اور پھر وہ دن بھی آگیا جب وہ دونوں باہل کی دہلیز چھوڑ کر پیادیں سدھا رہ گئیں۔

ثانیہ رخصت ہو کر سرال گئی تھی۔ امی اور عفت

اگلے روز ضویا کا ولیمہ تھا۔ ہدایت اللہ کے ساتھ بتول بیگم بھی تقریب میں شمولیت کے لیے پہنچ گئی تھیں حالانکہ ثانیہ کے ولیمہ میں ضویا کے سرال میں سے کوئی شریک نہیں ہوا تھا لیکن ان لوگوں نے اس بات کو اتنا کامسئلہ بنائے بغیر پوری خوش دلی سے ضویا کے ولیمہ میں شرکت کی۔ پھر ثانیہ ساس اور شوہر کے ساتھ ہی واپس گاؤں چلی گئی۔

گاؤں کے متعلق جیسا تصور اس کے ذہن میں تھا وہ گاؤں اس سے خاصا مختلف تھا۔ گو سہولتوں کا فقدان تھا لیکن پھر بھی ڈراموں اور فلموں والے گاؤں سے خاصا مختلف تھا۔ ایک ہفتہ اس نے سرال میں گزارا اور یہ ایک ہفتہ تو سرالی رشتہ داروں سے واقفیت حاصل کرنے میں ہی گزارا۔ ہدایت کے بڑے بھائی سیف اللہ زمینوں کا کام سنبھالتے تھے۔ وہ بہت بڑے زمین دار تو نہ تھے لیکن جو بھی تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان کا انتظام و انصرام ان ہی کے ذمے تھا۔ سیف بھائی کی بیوی طاہرہ بھی بتول بیگم کی سگی بہتی تھیں پھر بھی دونوں ساس، بہو کی آپس میں زیادہ نہیں بنتی تھی۔

”طاہرہ کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں نے بہت پہلے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اپنے خاندان سے بہو نہیں لالی۔ اپنے ہدایت اللہ کے لیے تو کوئی بڑھی لکھی اور سبھی ہوئی لڑکی دھونڈوں گی اور جب میں نے عفت کو دیکھا تو جی میں ٹھان لی کہ اگر اس کی کوئی بہن کنواری ہوئی تو اسی کو اپنے ہدایت کی دلہن بناؤں گی۔ اللہ نے میرے من کی مراد پوری کر دی۔ جیسی بہو میں چاہتی تھی ویسی بہو مجھے مل گئی۔“

بتول بیگم اس کے واری صدقے جاتی تھیں۔ ثانیہ سر جھکا کر مسکرائے جاتی۔ ابھی تک تو طاہرہ بھابھی کا رویہ بھی اس کے ساتھ ٹھیک تھا لیکن اسے ان کے مزاج کی تیزی طراری کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا۔ ہدایت سے بڑی شاہدہ باجی تھیں۔ وہ قریبی قصبے میں بیاہی تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ سیدھی سادی، ہنس مکھ خاتون تھیں۔ ابھی تک تو گھر میں رونق

اپانے گاؤں میں اس کے سرالی گھر سے متعلق اس کی خاصی تسلی کروائی تھی۔ گیس کے سوا وہاں ہر سہولت تھی۔ کھانا وغیرہ پکانے کے لیے بھی بڑے بڑے سلنڈر استعمال ہوتے تھے۔ رہن سہن میں بلاشبہ بہت فرق تھا لیکن وہ لوگ بھی بہت اچھا کنوارا نہ تھے۔ عفت اپنا کے سرالوں سمیت ان لوگوں کے کئی رشتہ دار گھر میں بستے تھے۔ ثانیہ کو یہاں اپنا کی ساس اور منڈوں کی موجودگی کی وجہ سے بہت ڈھارس ہوئی۔ جانے بچانے لوگ تھے اور ثانیہ کا بہت خیال بھی رکھ رہے تھے۔

رسمیں ہوئیں لیکن مووی وغیرہ نہ بنی۔ لڑکیاں اپنے سیل فون ہاتھ میں لیے تصویریں وغیرہ ہوائی رہیں پھر شاہدہ باجی (بڑی نند) اسے اس کے بیڈ روم میں چھوڑ آئیں۔ کشادہ کمرہ تھا اور اچھے طریقے سے آراستہ بھی تھا حالانکہ ثانیہ کا سالانہ شہر والے گھر میں ہی بھیجا گیا تھا، لیکن اس کمرے میں بھی ضرورت کا سارا سامان موجود تھا۔

ثانیہ کے اعصاب ذرا پرسکون ہوئے تھے لیکن ہدایت اللہ کے متعلق سوچ کر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ وہ اجنبی شخص جو نکاح کے دوپلوں کے بعد اس کے مجازی خدا کے رتبے پر فائز ہو گیا تھا، پتا نہیں مزاج اور عادتوں میں کیسا تھا۔ مگر اس سے ملاقات کے بعد یہ خوف بھی دور ہو گیا۔ ہدایت اللہ ہرگز بھی اچھا کنوارا یا غیر مہذب نہ تھا۔ وہ تو بہت پروفار اور نرم خوشابندہ تھا۔ اگرچہ ثانیہ کو ابھی اس کے مزاج کے سبب ہی رنگوں سے آشنا نہ ہوئی تھی لیکن پھر بھی اس کا دل خاصا مطمئن ہو گیا تھا۔

ولیمہ کی تقریب میں سب گھروالے آئے تھے اور ثانیہ کو خوش باش دیکھ کر سب کا دل اطمینان سے بھر گیا تھا۔

”لڑکا اچھا ہے، آج مجھے تسلی ہوئی۔“ دادی کے منہ سے یہ فقرہ سن کر ثانیہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ یہ ہی تو اس کے اپنے دل کی بھی آواز تھی۔ رسم کے مطابق گھروالے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

صرف ہنس پڑا۔



شعیب بھائی، بھابی کے ساتھ اسے لینے آئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ چند دنوں کے لیے بیٹھے آگئی۔ رات تک ضویا بھی پہنچ گئی تھی۔ گھر میں رونق لگ گئی تھی۔

ثانیہ کو امی کی فکر رہتی تھی۔ ان کی شادی کے بعد امی پر کاموں کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا اور اب جب دونوں بیٹیاں شادی کے بعد پہلی بار رہنے کے لیے میکے آئی تھیں تو امی کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ان کے سارے من پسند کپڑوں کا کپڑا کر انہیں کھلاتی رہیں۔

”فوفہ امی! بیویوں اتنا کام بڑھاتی ہیں۔ سادہ سے دال چاول پنا تینیس، ساتھ سلاڈ اچار ہو جانا کافی تھا۔“ یہ ضویا بھی جو ماں کو کوفتہ کڑھی کی تیاری کرتے دیکھ کر بولی تھی حالانکہ یہ اسی کی فیورٹ ڈش تھی۔

”دال چاول کا دل کر رہا ہے تو وہ شام کو بناؤں گی۔“ امی نے بیٹی کو پیار سے دیکھا۔

”وہ ماں! یو آر سو سوٹ۔“ ضویا نے مسکرا کر ان کا گل چوما۔ اتنے میں اس کا سیل فون بجا تو وہ جھٹ کمرے میں گھس گئی۔ ثانیہ مسکرا کر کمرے سے باہر آگئی۔

ضویا جب سے آئی تھی مخون مستقل اس کے ہاتھ میں تھا۔ گھر والوں سے گپ شب لگاتے ہوئے بھی اس کا دھیان سیل فون کی طرف ہوتا اور انگلیاں ہر وقت کوئی مہیج ٹاپ کر رہی ہوتیں۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ کسی بل جلد نہ ہوتی۔ اب بھی یقیناً ”اس کے احمر صاحب کا بی فون تھا۔ ثانیہ ماں کے پاس کچن میں چلی آئی۔

”کھانا آج میں بناؤں گی امی! آپ جا کر ریسٹ کریں۔“ اس نے پیار سے ماں کے شانے تھامے۔

”اگل ہوئی ہو۔ کھانا میں خود بناؤں گی۔ باہر جا کر دادی کے پاس بیٹھو۔“ امی نے اسے پیار بھرے انداز میں گھر کاٹھا لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی تھی اور

ان کے بچوں اور خود ان کی وجہ سے ہی تھی۔ ہدایت سے چھوٹے دو بہن بھائی تھے سعادت اللہ اور فاطمہ۔ فاطمہ پرائیویٹ بی اے کر رہی تھی اور سعادت اللہ ابھی میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ہدایت ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے پہلے سے زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔ گاؤں میں ایک ہفتہ گزار کر وہ ساس کی دعائیں لے کر ہدایت کے ساتھ شہر آگئی۔ اب اسے اپنا گھر سیٹ کرنا تھا۔

”میری دلی خواہش تھی کہ میں جیزرنہ لے کر رسم شمن لوگوں کی فرست میں اپنا نام درج کرواؤں لیکن پھر اندازہ ہوا کہ شاید بہت سے لوگ میری طرح کے ہی خیالات رکھنے کے باوجود معاشرتی دباؤ کے آگے مجبور ہو جاتے ہوں گے۔“ وہ برتنوں کے ڈبوں کی پیکنگ کھولتے ہوئے ثانیہ سے مخاطب ہوا۔ ثانیہ جو الماری میں برتن سیٹ کرنے کا آغاز کر چکی تھی شوہر کی بات سن کر ٹھٹک گئی۔ ایک لمحے کو دل بھی زور سے دھڑکا۔ کیا اب وہ ماہرنہ بچو کی بات دہرا کر خفگی کا اظہار کرے گا لیکن اس نے مزید کچھ نہ کہا تھا۔

”ہیں تو خود ان رسموں کے خلاف ہوں لیکن وہی بات کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان رسوم و رواج کی پیروی کرنی پڑ جاتی ہے۔“ ثانیہ دھیمے لہجے میں بولی۔

”فٹلو! اگر تم بھی میری ہم خیال ہو تو پھر ہم اپنے بچوں کی شادیوں کے وقت ہر طرح کی فضول رسموں کا خاتمہ کریں گے۔“ ہدایت کے کہنے پر ثانیہ نے بہت مشکلوں سے اپنی ہنسی ضبط کی۔ صاحب کی اپنی شادی کو جہ جہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے اور پلاننگ کر رہے تھے اپنے ہونے والے بچوں کی شادیوں کی۔ ہدایت اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر خود بھی ہنس پڑا۔

”دل ہی دل میں میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ دل کی بات اگر زبان پر بھی لے آؤ تو میں برا نہیں مانوں گا۔“ وہ مسکرا کر مخاطب ہوا۔

ثانیہ اس کے اس قدر درست انداز پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ یہ حیرت بھی بھانپ گیا مگر کچھ کہے بغیر

میرے نام خط نہیں لکھا بس اپنی اماں کو لکھے خط کے آخر میں کہہ دیتے سب گھر والوں کو سلام ہم اسی پر خوش ہو جاتے۔ ”دادی کو اپنا زمانہ یاد آیا۔

”یہ تو دادا زیادتی کرتے تھے گھر والوں کے ساتھ گھر والی کو بھی تو خصوصی سلام بھیجنا چاہیے تھا۔“ زین نے شرارتی انداز میں دادی کو چھیڑا۔ سب ہنس پڑے اور شکر ہے کہ دادی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ضویا نے خود پر سے توجہ ہٹنے پر سکون کا سانس لیا۔ اتنے میں اس کا فون دوبارہ بج اٹھا۔

وہ قدرے سٹٹائی، لیکن پھر فون اٹھا کر کمرے سے ہی باہر چلی گئی۔ دادی کے چہرے کے زاویے پھر بگڑے تھے اور ثانیاہ اور زین کی ہنسی پچھوٹ گئی تھی۔

وہ دونوں میکے میں ہفتہ بھر قیام کی غرض سے آئی تھیں لیکن احمر میرے دن ہی ضویا کو لے گیا۔ احمر کی بے تابیوں پر ضویا مغرور اور مسرور تھی۔ ہدایت ثانیاہ کو ہفتے بعد ہی لینے آیا تھا۔

”ثانیاہ کا دل دما بھی تو ہے کتنا بریدار اور سمجھ دار۔ ایک وہ احمر ہے، متانت نام کو نہیں۔“ دادی کے منہ سے ہدایت کی تعریف سن کر ثانیاہ مسکرا دی تھی لیکن گھر آکر اس نے ہدایت سے شکوہ ضرور کیا۔

”احمر بھائی ہر بل ہر گھڑی ضویا کو یاد کرتے تھے۔ آپ نے مجھے بالکل یاد نہیں کیا۔“ ہدایت یہ شکوہ سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

”تم مجھے کتنا یاد آؤ گے یہ بتانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ضویا اور احمر بھائی تو سیل فون کے ذریعے مسلسل ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔“ اس نے ان ڈائریکٹ جواب دیا تھا۔

”تم اپنے گھر والوں کے ساتھ وقت گزارنے گئی تھیں۔ میں نے صبر شکر کر کے یہ دن یہ سوچتے ہوئے گزارے کہ بالآخر تمہیں واپس تو میرے پاس ہی آنا ہے بار بار تمہیں فون کر کے تنگ کرنے کا فائدہ لیکن سچ کہتے ہیں لوگ بیویوں کو سمجھنا آسان کام نہیں۔“ وہ مسکرایا تھا اور یوں مسکراتے ہوئے وہ کتنا پیارا لگتا

انہیں بچن سے باہر بھیج کر ہی دم لیا۔ جب کھانا پکنے کے اختتامی مراحل میں تھا تب ضویا بچن میں آئی۔ ”ہائے اللہ ثانی! تم اکیلی گئی ہوئی ہو۔ میں کیا کروں میری تو جان احمر ہی نہیں چھوڑ رہے۔ پہلے اتنی دیر مسیحہ جگ (بیخام بھیجنے) پر لگے رہے پھر کل ملائی کہ آواز سننے بغیر مرنے نہیں آ رہا۔“ ضویا ٹھکتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

ثانیاہ مسکرا دی۔ دل میں خیال بھی آیا کہ ہدایت تو احمر کی طرح کا دیوانہ پن نہیں دکھا رہے تھے۔ ایک صبح بخیر کا مسیح صبح سویرے شب بخیر کرات کو اور دن میں حال احوال پوچھنے کے لیے مختصر سی کل اور دوسری طرف ضویا اور احمر تھے جو مستقل ایک دوسرے سے رابطے میں تھے ضویا کو مسلسل سیل فون کے ساتھ مصروف دیکھ کر دادی کو بھی جلال چڑھ گیا تھا۔

”ہم خوش ہو رہے تھے بچیاں شادی کے بعد دو چار دن کے لیے آئی ہیں۔ گھر کا سونا پن ختم ہو جائے گا، کچھ ہمارا بھی دل لگے گا لیکن یہ ضویا تو اس موئے موبائل کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی۔ باپ بھائیوں کا بھی لحاظ نہیں۔ ہر وقت کھٹ کھٹ مسیح ٹائپ کرتی رہے گی۔ ساتھ ساتھ مسکرائے جائے گی۔ کوئی عقل کا اندھا بھی جان لے گا کہ کس کو مسیح کر رہی ہے۔“ دادی ضویا پر خفا ہوئی تھیں۔

”ہائے اللہ دادی! احمر سے ہی تو بات کرتی ہوں۔ شوہر ہیں وہ میرے کسی انجان! اجنبی سے تھوڑی بات کر لی ہوں۔“ ضویا دادی کا اعتراض سن کر جی بھر کر حیران ہوئی۔

”شوہر کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ چار دن بعد تم نے اس کے پاس ہی جانا ہے پھر یہ چھوڑا پن دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ دادی نے اسے مزید تازا۔ ثانیاہ اور زین نے ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت مشکل سے ہنسی ضبط کی۔

”ایک ہمارا وقت تھا۔ تمہارے دادا کی جب پشاور یونیٹنگ تھی تو ہر دس دن بعد اپنی اماں کے نام خط لکھتے۔ ہماری نئی نئی شادی تھی پھر بھی کبھی الگ سے

تھا۔ ثانیہ یہ جی میں ہی سوچ چائی تھی۔

بھی سچے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

ہدایت میں کوئی ایک خوبی نہ تھی بلکہ وہ خوبیوں کا مجموعہ تھا۔ ثانیہ پر ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی کوئی نئی خوبی کھل کر سامنے آتی۔ شام کو اس کے پاس بہت سے انسٹوڈنٹس پڑھنے آتے تھے۔ پڑوس میں سے ایک خاتون اپنے بیٹے کو اس کے پاس بیٹھنے کے لیے لائیں تو انہوں نے ثانیہ سے ٹیوشن فیس دریافت کی۔ ثانیہ نے اس وقت تو لاعلمی کا اظہار کر دیا مگر بعد میں ہدایت سے پوچھا وہ لیکچر تیار کر رہا تھا۔ ثانیہ کا سوال سن کر ڈرائیو ڈرائیو نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیسی فیس یار! میں کوئی پر اپر کوچنگ تھوڑی دیتا ہوں نہ باقاعدگی سے ٹیسٹ وغیرہ لینے کا کوئی سسٹم ہے۔ یہ کوئی اکیڈمی نہیں ہے۔ بچے اپنا کالمسٹ کلیر کرنے کے لیے تھوڑی بہت دیر کے لیے آجاتے ہیں۔ ڈسکشن والا ماحول ہوتا ہے اور بس۔“ ہدایت اپنی جانب سے مفصل جواب دے کر پھر کانڈول پر جھک گیا۔

”تو یہ جو آپ روزانہ شام کو دو ڈھائی گھنٹے بچوں کو پڑھاتے ہیں اس کی کوئی فیس نہیں لیتے؟“ ثانیہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ اس حیرت پر ہدایت قدرے خائف ہوا۔

”علم تو بانٹنے والی چیز ہے یار! بچوں کو بلا معاوضہ پڑھا دیتا ہوں تو اس میں غلط کیا ہے۔“ بیوی کی متوقع حقل کے پیش نظر وہ دھیرے سے بولا تھا۔

”آپ تو واقعی ماسٹر ہدایت اللہ جو نیر ہیں۔“ ثانیہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر ہدایت شانت ہو گیا۔

”یہ ماسٹر ہدایت اللہ سینئر کون ہیں بھلا؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں کون سی عنبرہ سید والے ماسٹر ہدایت اللہ تو آپ پوچھیں گے یہ عنبرہ سید کون ہیں بھلا؟“ ثانیہ مسکرا کر بولی۔

”میں نہیں پوچھوں گا۔ ہوگی تمہاری کوئی سہیلی وغیرہ۔“ ہدایت گے کہنے پر ثانیہ ہسی اور ہستی ہی چلی

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ ہدایت کی محبت میں گرفتار ہوتی جا رہی تھی اور شاید وہ پیاری عادتوں والا شخص پیار کرنے کے ہی لائق تھا۔ وہ بہت دھیمے مزاج اور سنجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا۔ صبح اس کی آواز میں تلاوت قرآن پاک سن کر ثانیہ کی آنکھ کھلتی۔ وہ بہت خوب صورت تلاوت کرتا تھا۔ ثانیہ مسحور ہو کر اسے سنے جاتی۔ بلکہ چھکا ناشتا کر کے وہ کالج کی راہ لیتا۔ ثانیہ گھر کے کام نمٹاتی سمیت ہی بے تابی سے اس کی واپسی کا انتظار کرتی۔

وہ ہوائز کالج میں فزکس کا لیکچرار تھا۔ ڈھائی تین بجے تک اس کی واپسی ہو جاتی۔ اس وقت تک کھانا بھی تیار ہوتا اور ثانیہ بھی۔ وہ کھانے کی بھی تعریف کرتا اور ثانیہ کی بھی۔ تعریف کا انداز سادہ سا ہوتا لیکن ثانیہ کا دل شاد ہو جاتا اور اکثر وہ اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتا تو رتا مگر منہ سے کچھ نہ بولتا۔ ثانیہ کو لگتا اس نے زیر لب کچھ پڑھا ہے۔ ایک دن وہ اس کے سر ہی ہو گئی۔

”منہ ہی منہ میں کیا پڑھتے ہیں۔ مجھے بھی تو بتائیں۔“ وہ مشکوک انداز میں دریافت کر رہی تھی۔ ہدایت نے پہلے تو بات ٹالنا چاہی پھر اس کے اصرار پر ہنس کر اویا۔

”اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اتنی اچھی بیوی کا ساتھ نصیب کیا۔“ اس کے کہنے پر ثانیہ چند لمحوں تک کچھ نہ بول پائی۔ یہ شکرانہ تو اس پر بھی واجب تھا۔ اسے شادی سے پہلے کے وہ دن یاد آئے جب وہ اس رشتے پر ناخوش رہتی تھی۔ اپنی دانست میں اپنے ماں باپ کی مرضی پر سر جھکا کر اس نے بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنے نصیب سے شاکی تھی۔ اب احساس ہوا کہ وہ کتنی غلط تھی۔ اللہ نے اس کے نصیب میں اتنے بہترین بندے کا ساتھ لکھا تھا اور وہ انجانے میں ہی سہی بکراتے بہت سے دن کفرانِ نعمت کی مرتکب ٹھہری تھی۔

دل ہی دل میں بے ساختہ استغفار پڑھ کر اس نے

گئی۔



ماہن بچو نے عاقب بھائی کی پر مشن کی خوشی میں سب خاندان والوں کو دعوت پر بلایا تھا۔ ثانیہ کو بھی فون پر مدعو کیا۔ ثانیہ بڑی بہن کے بلاوے پر شش و پنج کا شکار ہو گئی۔

”ہم ضرور آتے آئی۔ سب گھر والے اکٹھے ہوں گے، میرا تو خود اس گید رنگ کو مس کرنے کا جی نہیں چاہ رہا لیکن اس ویک اینڈ پر ہمیں — گاؤں جانا ہے۔ پچھلے ہفتے بھی مجھے بخار تھا تو نہیں جاسکے تھے اس بار تو جانا ضروری ہے۔“ ثانیہ بہن سے معذرت خواہانہ لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”یہ تم کس خوشی میں ہر دس پندرہ دن بعد گاؤں کا چکر لگاتی ہو۔ ہدایت کو گھر والوں سے ملنا ہو تو وہ شوق سے جایا کرے۔ تمہارا ساتھ جانا ضروری تو نہیں۔“

ماہن بچو نے چھوٹی بہن کو سمجھانا چاہا۔

”اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی بچو! میں دور ہوں تو کیا ہوا؟ ان کا خیال رکھنا میری بھی تو ذمہ داری ہے۔“ وہ رسانیت سے بولی۔

”ہاں، بس ایک تم اور ایک عفت، تم دونوں کو ہی اپنی گردن میں ذمہ داریوں کا طوق ڈالنے کا شوق ہے۔ ضویا کو دیکھو، کس مزے سے زندگی گزار رہی ہے۔ احمر کو ٹھیک قابو کیا ہوا ہے اس نے۔“ ماہن بچو بولیں۔

ان کی باتوں کا ثانیہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بڑی بہن انھیں بحث کرنے کو جی نہ کرتا وہ چپ چاپ ان کی سنے لگتی۔

سچ تو یہ تھا کہ ہر دس پندرہ دن بعد گاؤں جانا اس کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ پلپ ٹرا سپورٹ میں سفر کرنے سے اس کی ہمیشہ جان جاتی تھی۔ ویسے تو بمشکل ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا لیکن وہ بری طرح تھک جاتی، ہدایت کی تنخواہ ٹھیک ٹھاک تھی۔ اگر اپنے پورے گھر کی ذمہ داریاں صرف اسی کے کندھوں پر نہ ہوتیں تو وہ کب کی گاڑی لے چکا ہوتا۔

ثانیہ کے جیسٹ سیف اللہ اور ان کی بیگم طاہرہ بھابھی ہمیشہ پیسوں کی تنگی کا رونا روتے تھے۔ ان کے بقول زمینوں سے ہونے والی آمدنی سے ان کے گھر کا خرچہ ہی مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ وہ بقول بیگم کی ناراضی کے باوجود انہیں کوئی پیسہ نہ دیتے تھے۔

”بڑی حریف عورت ہے طاہرہ۔ اس کی فطرت کو دیکھ کر ہی میں نے اس کا چوما چکی الگ کر دیا تھا لیکن آنگن میں دیوار کھینچنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اب سیف اللہ میرا بیٹا نہیں رہا یا گھر کی ذمہ داریوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ابھی فاطمہ کو کیا ہانا ہے سعادت اللہ کی بددھائی کا خرچہ۔ میری دوا دارو۔ سارا خرچہ تیرے ہی کندھوں پر آگیا ہے۔“

”اللہ دے رہا ہے نالماں! آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ اور سیف بھائی سے بار بار پیسوں کا تقاضا مت کیا کریں۔ بال بچوں والے ہیں۔ ان کے سو خرچے ہیں۔ وہ اپنی کمائی سے اپنے گھر کا انتظام اچھی طرح چلائیں۔ یہ ہی بہت ہے۔“ ہدایت نے ماں کو کندھوں سے تھام کر پیار سے سمجھایا۔

”تو میری کسی نیکی کا صلہ ہے ہدایت اللہ۔“ بقول بیگم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”اور میں سیف اللہ سے بار بار پیسوں کا تقاضا نہیں کرتی لیکن اس کے ذہن میں یہ بات تو رہنی چاہیے تاکہ جن زمینوں کا وہ بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھا ہے اس میں تم تینوں — کا بھی حصہ ہے اور پھر میرے بچے! بے شک تیری بیوی بہت بھلی عورت ہے لیکن کل تو تم دو سے تین ہو جاؤ گے۔ کچھ بچت تمہارے اپنے ہاتھ میں بھی تو ہونی چاہیے۔“ بقول بیگم کی بات پر ہدایت مسکرایا۔

”آپ دعا کریں اماں! اللہ وہ وقت تولائے اور آپ ہی تو کہتی ہیں کہ آنے والا اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے۔“

”میرے لال! میں تو ہر گھڑی یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ تجھے بالکل تیرے جیسا بیٹا دے۔“ ہدایت ماں کی دعا سن کر مسکرایا تھا۔ اسے بیٹیاں اچھی لگتی تھیں لیکن اس کی بیوی اور اس کی ماں دونوں عورتیں بیٹے

کی خواہش مند تھیں۔
اور جب ثانیہ نے خوش خبری سنائی تو بتول بیگم نے

ہی اسے بار بار گاؤں آنے سے منع کر دیا۔
”اوپنی سچی سڑکیں ہیں۔ جھٹکا وغیرہ لوگ سکتا ہے

بیٹی! گھر پر ہی آرام کرو۔ ہدایت گاؤں آیا کرے تو اپنے
ان کی طرف چلی جا کر۔“

بتول بیگم نے فون پر ڈھیروں دعائیں دینے کے بعد
اسے نصیحت کی۔ ثانیہ اکثر اپنی ساس کی شخصیت پر
غور کرتی تو حیران رہ جاتی۔ رسمی تعلیم کے لحاظ سے وہ
ایک ان پڑھ عورت تھیں۔ وضع قطع کے حساب سے
بھی عام سی دہاتی عورت لگتی تھیں لیکن وہ دہاتی عورت
بہت روشن خیال اور روادار تھیں۔ شاہی سے پہلے
ثانیہ ان کے متعلق جن خدشات کا شکار تھی وہ سب دم
توڑ چکے تھے۔ اب اسے ان سے بہت انسیت ہو گئی
تھی۔

بتول بیگم ہدایت کو بار بار ثانیہ کا خیال رکھنے کی
تائید کرتیں۔ ہدایت تو ”خوش خبری“ سے پہلے بھی
اس خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ اب تو اس
کا بس چلتا تو وہ ثانیہ کو بستر سے اترنے ہی نہ دیتا۔ اوپر
کے کاموں کے لیے ماسی رکھ لی گئی تھی حالانکہ ثانیہ
نے بہت کہا کہ وہ دونوں کے گھر میں کام ہی کتنا ہوتا
ہے لیکن اس نے ثانیہ کی ایک نہ سنی۔ ثانیہ کا جی
متلا تا اور وہ الٹیاں کر کر کے بے حال ہو جاتی تو ہدایت
اس کی حالت کو دیکھ کر بری طرح پریشان ہو جاتا۔
”آپ اتنا ٹینشن کیوں لیتے ہیں ہدایت۔ اس
کنڈیشن میں یہ سب معمول کی باتیں ہیں۔“ ثانیہ
اپنی فاقہت بھلا کر اسے تسلی دیتی۔

تیسرا مہینہ ختم ہونے کو تھا اب ثانیہ کی طبیعت
میں خاصا افاقہ تھا ہر وقت کا جی متلا تا ختم ہو گیا تھا۔ اس
روز ماسی صفائی کر کے چلی گئی تو ثانیہ نے ہدایت کے
مرمت طلب کپڑوں کو سلائی کرنے کا سوچا۔ کسی
شرٹ کی جیب اوڑھڑی ہوئی تھی۔ کسی کے بٹن ٹانگنے
تھے۔ پچھلے بہت سے دنوں سے طبیعت پر چھائی کسمندی
نسب کی وجہ سے یہ چھوٹے چھوٹے کام اکٹھے ہو گئے

تھے۔ اس نے اسٹور روم سے سلائی مشین اٹھائی اور
محکم میں پچھلے تخت پر لا دھری۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ذرا سی بے
احتیاطی کتنی سنگین ثابت ہو سکتی ہے۔ زار بعد درد
کی لہروں نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ سلائی کا کام چھوڑ
چھاڑ کر پٹین کمرے کر لیٹ گئی۔ جب تکلیف زیادہ
ہو گئی تو ہدایت کو فون کیا۔ وہ گہرا کر فوراً ”گھر آیا۔ اس
کی حالت دیکھ کر اس کے رہے سے اوسان بھی خطا
ہو گئے۔ فوراً ہی ساس کو فون کیا۔ امی زین کے ساتھ
گاٹا کولو جسٹ کے ہاں پہنچی تھیں۔ ہدایت ثانیہ کو
پہلے ہی وہاں لے آیا تھا۔

ڈاکٹر نے طبیعت خرابی کی وجہ بوجھ اٹھاتا ہی بتائی
تھی۔ امی ثانیہ کی لاروائی پر بار بار خفا ہو رہی تھیں۔
”بس کریں آئی! وہ پہلے ہی بہت پریشان ہو رہی
ہے۔“ ہدایت نے ساس کو اکیلے میں سمجھایا۔ امی ولاد
کو دیکھ کر ہی رہ گئیں۔ کوئی اور مرد ہوتا تو بیوی کی اس
کم عقلی پر اسے سخت ستانا مکر وہ تو کسی اور ہی مٹی
سے بناتھا۔

اگرچہ اس نے ثانیہ کو کچھ نہ کہا تھا لیکن ثانیہ اس
سے نگاہیں ملانے کی خود میں جرات نہ پاتی تھی۔ وہ
اپنے بچے کے حوالے سے کنٹرا پر جوش تھا۔ اس نے تو
ابھی سے ہی لڑکیوں اور لڑکوں کے نام بھی سوچنا شروع
کر دیے تھے۔ آج اس کی آنکھوں کی ہجرت جیسے یکدم
بجھ گئی تھی۔ ثانیہ دل ہی دل میں خود کو اس کا مجرم تصور
کر رہی تھی۔ دو امیں غنودگی کی وجہ سے اس کی آنکھ
لگ گئی ورنہ شاید وہ آج کی رات سون پاتی۔

آدھی رات کو آنکھ کھلی تو ہدایت مصلے پر بیٹھا
تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔
ثانیہ کا جی کٹ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے اوپر سے لحاف
ہٹایا۔ چوڑیوں کی آواز پر ہدایت نے آنکھیں کھولیں۔
ثانیہ کو جاگتاپا کر لپک کر اس کے پاس آیا۔

”کچھ چاہیے ثانیہ؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔
ثانیہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اس کی اپنی آنکھیں
بھی آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

کہا یہ ہوا، کہیں درد ہو رہا ہے۔ آنٹی کو یہ عفت اپنا کو بلاؤں۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ امی اور عفت اپنا آج رات ہمیں رکھیں۔

”آئی ایم سوری ہدایت! میری وجہ سے یہ سب ہوا۔“ وہ سسک پڑی۔

”پاگل ہوئی ہو ثانیہ! جو چیز ہمارے نصیب میں تھی ہی نہیں وہ کیسے مل سکتی تھی۔“ اس نے بیوی کے آنسو پوچھتے ہوئے سمجھایا۔

”آپ آدمی رات کو جائے نماز پر بیٹھ کر آنسو بہا سکتے ہیں لیکن میرے سامنے اپنے غم کا اظہار نہیں کر سکتے۔“ وہ شامی انداز میں بولی۔

اسی عرصے میں ضویا ایک گل کو تنے سے بیٹے کی اہل جان بن گئی تھی۔ اپنے گھلو سے بھانجے برائے ٹوٹ کر ہار آتا۔ ساتھ ہی دل کے کسی نہل گوشے میں کسک کا احساس بھی جاگتا تھا۔ اگلے ہی بل وہ خود کو سرزنش کرتی۔ اگر اولاد قسمت میں تھی تو اللہ ضرور نوازے گا۔ دعا اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے رب کی رضا میں راضی رہتا تھا۔

”میری بیٹی بیوی! یہ غم کا اظہار نہیں تھا۔ ابھی میں نے شکرانے کے لفظ پڑھے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

ثانیہ نے حیرت سے آنکھیں کھلا کر اسے دیکھا جیسے کہیں اس کا دل غم تو نہیں چل گیا۔

وہ دل ہی دل میں ہدایت کے کئے الفاظ دہرائی رہتی اور پھر اللہ نے ایک بار پھر اس پر اپنا کرم کر دیا۔ میکے اور سرال میں سے ہر کسی نے اس بار نصیحتوں کے انبار لگا دیے۔ بچوں کی طبیعت اب کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ وہ خود ثانیہ کے پاس آکر نہیں رہ سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنی سب سے بڑی بیٹی شاہدہ کو آنھوں میں نہ لگتے ہی شہر بھیج دیا تھا۔ ثانیہ سسائے کی محبت کے لحاظ میں مارے موت کے کچھ نہ کہہ سکی ورنہ سچ تو یہ تھا کہ شاہدہ باقی کے آنے سے اسے سہولت ملنے کے بجائے خاصی دقت پیش آ رہی تھی۔ شاہدہ باقی ہدایت کی سب سے بڑی بہن تھیں۔ کم عمری میں ہی قریبی گاؤں میں اپنے ماموں زاد سے بیاہی گئی تھیں۔ کم عمری میں شادی پھر اوپر تلے کے بچے، شاہدہ باقی کی شخصیت میں سابقہ کا فقدان ہونا کوئی ایسی حیرت انگیز بات نہ تھی۔ ویسے وہ ایک ہنس مکھ عورت تھیں لیکن ان کی شخصیت کا بے ڈھنگا پن سامنے والے کو کوفت میں مبتلا کرتا تھا۔ بچے بھی بلا کے شرارتی تھے۔ ثانیہ کو آخری میزوں میں جس سکون کی ضرورت تھی۔ شاہدہ باقی کے آنے سے وہ سکون ملنا محال ہو گیا۔

”آج میں تمہاری حالت دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا حالانکہ وہاں کلینک میں آنٹی، عفت اپنا اور حتی کہ لیڈی ڈاکٹر نے بھی مجھے سمجھایا کہ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ یہ اونچ نیچ تو پریکٹسی میں ہو ہی جاتی ہے لیکن پھر بھی میرے دل میں عجیب عجیب سے وہم آتے رہے۔ میں سچ میں تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہو گیا تھا اور اب پھر سے اپنے بیڈ روم میں تمہیں تمہاری جگہ پر لیٹا دیکھا تو بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کیا۔ صبح تو تم نے میری جان ہی نکال دی تھی بیوی۔“

ہدایت چپ ہوا تو ثانیہ کی آنکھوں سے پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس بار اس کے آنسو بھی شکر گزاری کے ہی تھے۔ اللہ نے اسے ہدایت جیسے بندے کا ساتھ دیا وہ اس کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔



ایک بار خوش خبری روٹھ گئی تو بہت عرصے تک روٹھی ہی رہی۔ وہ امی یا بہنوں کے ساتھ شہر کی مشہور گائنا کولو جینس کے کلینک کے چکر کاٹی رہی۔ ہر ڈاکٹر

”تھوڑا سا وقت ہے ماما! کسی طرح گزار لو۔ میں جانتا ہوں تمہیں آج کل کتنی مشکل پیش آرہی

ہے۔ ہدایت تھائی میں اسے سمجھاتا۔

ثانیہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیتی۔ پھر ننھی پری اس کی گود میں آئی تو جیسے ساری کلفتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ امین نے رنگ روپ ماں کا چڑایا تھا تو کھینچے نقوش باپ سے لیے تھے۔ وہ انہی پیاری ننھی کہ ہر کوئی بے ساختہ پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ بتول بیگم کو پوتے کی خواہش تھی لیکن اب وہ پوتی پر بھی خوب ہی جان چھڑکتی۔ ہدایت اور ثانیہ ہر بندہ دن بعد امین کو ساتھ لے کر گاؤں کا رخ کرتے۔

ہدایت کی چھوٹی بہن فاطمہ کا مناسب رشتہ آیا تو بتول بیگم نے مزید دیر کیے بنا بیٹی کو وداع کر دیا۔ بیٹے برسوں میں انہوں نے بچت کر کے بیٹی کے لیے بہت کچھ جوڑ رکھا تھا۔ باقی کا خرچہ ہدایت نے ہی اٹھایا۔ سیف اللہ اور اس کی بیوی نے بہن کو دو بڑھیا جوڑے دے کر جیسے اپنی ذمہ داری ادا کر دی تھی۔

بتول بیگم میں بھی اب وہ دم خم نہ رہا تھا۔ بڑے بیٹے کو اس کی ذمہ داریوں پر ٹیکہ دینے کے بجائے انہوں نے چپ چاپ ان کا تحفہ وصول کر لیا۔ ہدایت کو وہ ہر پل دعا میں دیتی تھیں۔ ہدایت بس مسکراتے ہوئے بوڑھی ماں کے شانے دبا مارتا۔ کبھی اکیلے میں وہ ثانیہ سے اعتراف کرتا۔

”اگر تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید میں اپنے گھر والوں کے لیے اتنا کچھ نہ کہتا۔ تم بہت اچھی ہو مانی! عام عورتوں سے بہت مختلف۔“ شوہر کی بات سن کر ثانیہ مسکرا دیتی۔

”پہلی بات تو یہ ہے ماشر ہدایت اللہ صاحب! کہ بے شک میں ایک نیکی کی ماں بن چکی لیکن ابھی تک میں خود کو لڑکی ہی تصور کرتی ہوں اور آپ کس دھڑلے سے مجھے عورت، عورت کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔“ اس نے مصنوعی خشکی سے اسے گھورا۔

”اچھا اور دوسری بات؟“ ہدایت مسکرایا۔ گویا پہلی بات سنی ان سنی کروی ہو۔

”اور دوسری بات یہ کہ شاید میں بھی اندر سے وہی روایتی عورت ہوں۔ شوہر کی ہر چیز پر صرف اور صرف

پناہ حق سمجھنے والی بیچ تو یہ ہے ہدایت کہ جب آپ نے فاطمہ کی شادی پر لاکھوں روپے لگائے تو میں دل ہی دل میں بہت جربز ہوئی۔ یہ ہماری کئی سالوں کی بچت تھی۔ میرے ذہن میں اس بچت کا مصروف صرف یہ تھا کہ ہم اچھی سی رہائشی کالونی میں کسی چھوٹے موٹے پلاٹ کا ایڈوائس دے دیں۔“ وہ بول رہی تھی اور ہدایت خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔

”ایک تو میں آپ سے اپنے دل کی بات بھی نہیں چھپا سکتی، اچھی بھلی آپ کے اوپر میری عظمت کی دھاگ بیٹھ رہی ہوئی ہے اور میں خود ہی غبارے میں سے ہوا نکال دیتی ہوں۔“ اس نے منہ نہایا۔

”کون سے غبارے میں سے؟“ ہدایت نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

”ظاہر ہے عظمت کے غبارے میں سے۔“ وہ زرا سادہ مزہ ہو کر بولی۔

”اچھا بات تو مکمل کر دو۔ دل کی ادھوری بات بتا کر ادھر ادھر کے قصے چھیڑ دیتی ہو۔“ ہدایت بھی بیٹے برسوں میں اسے خوب جان چکا تھا۔ بات کئے ادھورے ہونے کا اسے سو فی صد یقین تھا سو بات مکمل کر دانا چاہتی۔

”بس پھر یہ کہ میرا دل ہماری بچت کے ٹھکانے لگنے پر بہت شور مچا رہا تھا لیکن پھر ضمیر صاحب کی انٹری ہوئی۔ آپ صرف میرے شوہر ہی تو نہیں۔ اماں کے بیٹے اور فاطمہ کے بھائی بھی تو ہیں۔ میرے دباؤ ڈالنے پر اگر آپ اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ لیتے تو تب بھی مجھے چین تو نہ آتا، نا ضمیر صاحب ہر وقت لتاڑتے رہتے۔“ ثانیہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے سب کچھ کہہ سنایا۔

”پنپنے ضمیر صاحب کا میری طرف سے بھی شکریہ ادا کر دو۔ اور ہاں شکر ہے غبارے میں سے بھی ہوا نہیں نکلی۔“ وہ اتنی سنجیدگی سے بولا کہ ثانیہ اپنی چند سیکنڈ پہلے کی بات بھی بھول گئی۔

”عظمت کے غبارے میں سے یا؟“ بیوی کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں وہ مزے سے بولا۔ ثانیہ

نے پہلے تو اسے گھورا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
ہدایت بھی طمانیت بھرے انداز میں مسکرا دیا۔



فاطمہ کی شادی کے بعد بتول بیگم اکیلی ہو گئی تھیں۔ سعادت اللہ بھی ایئر فورس میں بطور ایئر مین بھرتی ہو گیا تھا۔ ہدایت اب چھوٹے ہنس بھائی کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گیا تھا۔ اب مسئلہ بوڑھی ماں کا تھا۔ وہ گاؤں والا گھر چھوڑنے پر راضی نہ تھیں اور ہدایت کا جی نہ مانتا کہ وہ بوڑھی بیمار ماں کو وہاں بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

ساتھ والے گھر میں بھائی بھانوج تھے۔ سیف اللہ تو پھر دن میں دو چکر لگا کر مال کی خبر گیری کر لیتا۔ اس کی بیوی بوڑھی ساس کو دو وقت کا کھانا دینے کی بھی رواداد نہ تھی۔ دو چار دن کے لیے شاہدہ باجی ماں کے پاس آکر رہ جاتیں۔ بھی فاطمہ رہنے آجاتی لیکن یہ مسئلے کا مستقل حل نہ تھا۔

بتول بیگم کو کوئی ملکہ مرض لاحق نہ تھا لیکن پھیپھائے میں ان کی قوت مدافعت جواب دے گئی تھی۔ معمولی سا مرض بھی چمٹ جاتا تو ہفتوں جان نہ چھوڑتا۔ ہاتھوں میں رعشہ اتر آیا تھا۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے بارہا چرخے خانے کے کام نمائشیں توڑ رہتا کہ کہیں اپنے اوپر کچھ گرا ہی نہ لیں۔ ہدایت ماں کی فٹیں کر کے عاجز آ گیا تھا کہ وہ شرچل کر ان کے ساتھ رہیں لیکن بتول بیگم لجاجت بھرے انداز میں انکار کر دیتیں۔

”میرا آخری وقت ہے ہدایت، میرا بچہ اماں کی مجبوری سمجھ۔ میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی۔ اسی گھر سے تیرے باپ کا جنازہ اٹھا تھا۔ میں بھی اپنا آخری وقت یہیں گزارنا چاہتی ہوں پھر میں اکیلی کب ہوتی ہوں۔ دن بھر آس پڑوس کی عورتیں آتی رہتی ہیں۔ میرا جی لگا رہتا ہے۔ ہفتے دس دن بعد تم لوگ چکر لگا لیتے ہو، فکر کس بات کی میرے لال۔“

ہدایت اس وقت تو خاموش ہو جاتا لیکن ثانیہ شوہر

کی بے چینی اور اضطراب سے آگاہ تھی۔ وہ شرمیں ہوتا تب بھی ہر بل اس کا دھیان ماں کی جانب لگا رہتا۔ بتول بیگم کو سیل فون لے کر دے رکھا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ انہیں موبائل نرا جھنجھٹ لگتا تھا۔ کبھی سیف اللہ کے کسی بچے سے اسے چار جنگ پر لگواتیں تب ہدایت کا ان سے رابطہ ممکن ہو جاتا اور نہ ہدایت کو بھائی یا بھانوج کو فون کر کے درخواست کرنا پڑتی کہ وہ اماں سے ان کی بات کروا دے۔

ثانیہ بہت دن تک کوشش کرتی رہی کہ وہ شوہر کی بے چینی اور پریشانی نظر انداز کر دے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ تھک ہار کر اس نے ہدایت کے سامنے تجویز رکھ دی۔

”اماں یہاں آنے پر راضی نہیں ہو رہی تو میں ان کے پاس جا کر رہ لیتی ہوں۔“ وہ ام ایمن کو چھڑی کھلاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

ہدایت جو ماں کا فون نمبر ملانے میں ناکامی کے بعد سیل فون ہاتھ میں لیے پریشان سا بیٹھا تھا، بیوی کی بات سن کر چونکا۔

”تم کیسے تمہاری تو اپنی طبیعت۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔ ام ایمن ڈیڑھ برس کی تھی اور ثانیہ پھر سے امید سے تھی۔

”تمہارے ختم ہونے کو ہے پھر طبیعت خود بخود سنبھل جائے گی۔ کم از کم اٹیوٹوں سے تو نجات مل جائے گی اور گاؤں میں بھی میں نے کون سا مل جوتے ہیں۔ ماسی نورماں کی بہو آتی تو ہے۔ اوپر پیچھے کے سارے کام وہ ہی نمٹاتی ہے۔ میں تو بس اماں کا خیال رکھوں گی۔“ وہ ہدایت سے نگاہیں ملانے بغیر بول رہی تھی لیکن ہدایت کو اس کے دل کا حال جاننے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”میری وجہ سے خود کو مشکل میں ڈالنے کی ضرورت نہیں مانی! میں اماں کو یہاں لانے پر راضی کر لوں گا۔“

”یہاں بھی اماں کی خدمت مجھے ہی کرنی ہے تو وہاں کیوں نہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ یہاں آنے پر قطعاً“

بے زاری پورے وجود کا احاطہ کیے رہتی۔ زندگی جیسے ٹھہری گئی تھی۔

ہدایت سے وہ کچھ نہ بھی کہتی تب بھی وہ اس کی دلی کیفیت سے بخوبی آگاہ تھا۔

”ہماں نے بڑی محترک زندگی گزارا ہے ثانی! اب کے بعد انہوں نے بہت محنت مشقت سے ہمیں پالا۔ سخت جسمانی محنت بھی کی لیکن اب بڑی خود اور عورت تھیں۔ وہ بیوہ تھیں چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا لیکن انہیں کسی اپنے یا پرانے کے مدد لینا گوارا نہ تھا۔ اب انہی ماں کو اس حالت میں دیکھتا ہوں توجی کٹ جاتا ہے لیکن ثانی یہ صرف ہماں کی آزمائش نہیں ہے۔ اولاد ہونے کے ناتے اس حالت میں ان کا خیال رکھنا، یہ میری آزمائش ہے اور تم میری وجہ سے اس آزمائش میں حصہ دار بن گئی ہو۔ میں تمہارا یہ احسان بھی نہیں اتار سکتا۔“ وہ ثانیہ کے ہاتھ تھام کر ممنونیت کے احساس تلے اپنے بچوں سے نکالیتا۔

”پلیز ہدایت! آپ جانتے ہیں میں اتنی اچھی نہیں۔ میرے دل میں الٹی سیدھی سوچیں بھی آتی ہیں۔ میں تھک جاتی ہوں اور کبھی کبھی تو یہاں سے بھاگ جانے کا بھی سوچتی ہوں۔ وہ کوئی اور ہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی رضا کی خاطر بغیر ماتھے پر بل لائے خندہ پیشانی سے کسی کے کام آتے ہیں۔ میں ہرگز بھی ایسی نہیں۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔

”جیہ ہی تھا بتول بیگم کی زندگی کے حوالے سے اس کے دل میں منفی خیال جنم لینے لگے تھے اور یہ بھی سچ تھا کہ ایسے خیالات پر وہ خود کو سرزنش کرتے ہوئے“ اللہ سے ان کی صحت تندرستی کی دعا کرتی۔ دل کے نہال خانوں میں کوئی اور ہی خواہش کلبلا رہی ہوتی لیکن زبان سے اس نے بیہشہ ہدایت کی ماں کی زندگی کی دعا مانگی تھی۔ اسے اپنے الفاظ کھوکھلے لگتے تب وہ مزید شدت سے دعا مانگنے لگتی۔ اپنی خود غرضانہ سوچوں پر خود کو ملامت کرتی لیکن ان سوچوں پر اس کا اختیار نہ تھا۔ وہ اس معاملے میں بے بس تھی۔ ضمیر کی چیخیں اسے چین نہ لینے دیتی۔

تیار نہیں۔“ ثانیہ نے ذہنی طور پر خود کو وہاں جانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ وہ ہدایت کو مزید پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”تم واقعی میرے لیے اللہ کا انعام ہو۔“ ہدایت فقط یہ ہی کہہ پایا۔

”میری اتنی تعریفیں مت کیا کریں ہدایت! میں ایک عام سی عورت ہوں۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں مسکرائی۔

”عورت؟“ ہدایت نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر تصدیق کرنا چاہی۔ ثانیہ نے مسکرا کر اس کے بازو پر مکا رسید کر دیا۔

ثانیہ کے گاؤں جانے کے بعد بتول بیگم کی طبیعت میں بہتری آنے کے بجائے ان کی حالت مزید بگڑ گئی تھی۔ وہ بستر کی ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ثانیہ کے لیے ان کی خدمت اتنا آسان کام نہ تھا۔ وہ دوسرے جی سے تھی۔ ڈیڑھ برس کی بچی اس کی گود میں تھی۔ یہاں گاؤں والے گھر میں اپنے گھر کا سا آرام کہاں مل سکتا تھا۔

پندرہ دن بعد دو دن کے لیے یہاں آنا اور بات تھی اور مستقل طور پر یہاں رہنا قطعی مختلف تجربہ۔ ہدایت ہر ویک اینڈ پر آجاتا۔ جہاں ماں کی محتاجی اور بیماری دیکھ کر ابدیدہ ہو جاتا وہیں ثانیہ کی مشکل زندگی اسے پریشان کرتی۔ بتول بیگم واش روم میں پھسل جانے کے بعد چلنے پھرنے سے قطعاً معذور ہو گئی تھیں۔ وہ حواج ضروریہ سے فراغت کے لیے بھی دوسروں کی محتاج تھیں۔ گاؤں کی ایک بیوہ عورت کو بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے رکھا گیا تھا لیکن انہیں سنبھالنا ایک بندے کے بس کی بات نہیں تھی ثانیہ کو بھی ساتھ لگنا پڑتا۔

اس قسم کی خدمت کہانیوں میں آسان لگتی ہے لیکن ماتھے پر بل لائے بغیر ایک بوڑھے وجود کو سنبھالنا ہرگز آسان کام نہ تھا۔ ثانیہ بتول بیگم کی ہر ممکن خدمت کرتی لیکن اندر ہی اندر وہ ٹھنکنے لگی تھی۔ کبھی گاؤں آنے کا اپنا فیصلہ اسے حماقت لگتا۔ عجیب سی

تھا۔ زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر روانہ ہو گئی۔ پھر وادی داغ مفارقت دے گئیں۔ دل کو دھچکا لگا لیکن بہت جلد قرار بھی آ گیا۔ یہ ہی قانون قدرت ہے۔

میکے میں زین کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ زین نے امول زاد عروں کو جیون سا بھی بنانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ امی کو اس فیصلے پر تحفظات تھے۔ انہیں چھوٹی خالہ کی کنول پسند تھی لیکن بیٹے کی پسند کو مقدم جانتے ہوئے وہ اپنی پسند سے دست بردار ہو گئیں۔ چاروں بہنیں اپنی اپنی مصروف زندگیوں میں سے فرصت نکال کر باہل کے آگن میں اکٹھی ہو گئیں۔ ماہین بچو اور غفت آبی کے بچے اب سمجھ دار اور بڑے تھے۔ کبھی چھوٹی خالائیں ان کے لاڈ اٹھاتی تھیں۔ اب وہ مٹائی خالہ اور ضویا خالہ کے بچوں کو اٹھائے اٹھائے پھرتے۔

شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ چاروں بہنیں گپ شپ میں مشغول رہتیں۔ ماہین بچو کی اس اپنی دیورانیوں بمبختائیوں کی تیزی طراری کے قصے تھے۔ ضویا بھی اپنی ساس، مندوں سے ناکوں ناک عاجز آ چکی تھی۔ وہ فہمیدہ آئی جو برسوں ان کے پڑوس میں رہی تھیں لیکن ان کے جوہر کبھی کھل کر سامنے نہ آئے۔ ضویا کی ساس کے عمدے پر فائز ہونے کے بعد وہ ایک بالکل نئے روپ میں سامنے آئیں۔ خیر ضویا کو ساس کے بدلتے تیوروں کی رتی برابر پروانہ تھی۔ فہمیدہ آئی اگر سیر تھیں تو ضویا سوا سیر ثابت ہو رہی تھیں۔

امی ضویا کی باتیں سن کر خوب خفا ہوتیں۔ اسے اپنا طرز عمل درست کرنے کو کہتیں۔ غفت اپنا بھی چھوٹی بہن کو بار بار سمجھاتیں۔ ضویا پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ مزے لے لے کر ساس، مندوں کو زنج کرنے کے قصے سناتی رہتی۔ ماہین بچو اس کی خوب حوصلہ افزائی کرتیں۔

مٹائیہ خاموشی سے مسکرائے جاتی۔ ایسے موقعوں پر اسے بتول بیگم کی بات یاد آتی۔ گاؤں میں ایک بار اسٹور روم میں ملی نے بچے دیے تھے۔ کوئی کالا، کوئی

دوسری طرف اس کے گھر والے اس کے لیے پریشان تھے۔ آنکھوں مہند لگ گیا تھا کیا وہ دوسرے بچے کو گاؤں میں جنم دے گی۔ ردول ہیلتھ سینٹر موجود تھا لیکن سہولیات ناکافی۔ شاید باجی کی نند اور دیور کی شادی بھی ان کا آنا ممکن نہ تھا۔ فاطمہ کا خود آخری مہند تھا۔ بروس میں بسنے والی جھٹانی اس سے ویسے ہی خار کھاتی تھی گاؤں میں ہر کسی کی زبان پر ہدایت اللہ کی پیوی کی تعریفیں تھیں اور ہدایت اللہ کی پیوی ان تعریفوں سے بے نیاز عجیب سے اضطراب میں مبتلا تھی۔ اضطراب ختم ہوا، بتول بیگم نے ایک رات چپکے سے آنکھیں موند لیں۔ ساس کے مرنے پر مٹائیہ بلک بلک کر روئی۔ لوگ ایسی ہو کر رشک سے دیکھ رہے تھے لیکن مٹائیہ تنہائی میں شوہر کے شانے سے سر نکالے آنسو بہا رہی تھی۔

”میں نے امں سے ہمیشہ نرم لہجے میں بات کی۔ کبھی ان پر اپنی بے زاری ظاہر نہیں کی لیکن ہدایت! میں اب بے زار ہونے لگی تھی۔ میں آزمائش پر پورا نہیں اتر سکی۔ میں تھک گئی تھی۔ اتنی جلد میری ہمت جواب دے گئی۔ صرف چھ ماہ کی بات تھی لیکن یہ چھ مہینے چھ سالوں کے برابر لگنے لگے تھے۔ میں پھر سے آپ کے پاس اپنے گھر میں جا کر رہنے کے لیے تڑپ رہی تھی، میں بہت منافق اور دوغلی عورت ہوں نا۔“ وہ گلو گیر لہجے میں شوہر سے مخاطب تھی۔

”ہم سب انسان ہیں مٹائی! ہم میں سے فرشتہ کوئی نہیں۔ تم نے اپنا فرض نبھایا۔ دل کے دوسووں اور سوچوں پر کسی کا اختیار نہیں لیکن مجھے یقین ہے میری مٹائی نے ہر بار غلط سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر زبان سے خیر کا کلمہ ہی کہا ہو گا۔“ وہ شوہر کی نگاہوں میں سرخو تھری تھی۔ اسے ایک بار پھر شدت سے رونا آ گیا۔



بتول بیگم پوتے کو نہ دیکھ پائی تھیں۔ ہدایت نے ماں کی خواہش کے احترام میں بیٹے کا نام عبداللہ رکھا

سفید تو کوئی بھورا تب بتول بیگم نے کہا تھا۔

”دیکھ تو ثانیہ! ایک ماں کے بنے بچے بھی ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں“ میں ویسے ہی سوچ کر پریشان ہوتی تھی کہ میرے سارے بچوں میں ہدایت اللہ ہی کیوں، مختلف ہے باقی بچے اس جیسے کیوں نہیں۔ سب ایک جیسے کیسے ہو سکتے تھے۔ ”بتول بیگم ٹھنڈا سانس بھر کر کہتی تھیں۔

ثانیہ بھی اپنے بہن بھائیوں کو دیکھ کر یہ ہی سوچتی۔ سب کی عادتوں اور مزاج میں کتنا فرق تھا۔ اس فرق کے باوجود سب آپس میں محبت کے انوث بندھن میں بندھے تھے۔

زین کی دلہن رخصت ہو کر آگئی تو بہت سے یادگار دنوں کی یادیں سمیٹ کر سب نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

ام ایمن اب اسکول جانے لگی تھی۔ عبداللہ بھی بہت ذہین اور پھر تلامذہ تھا۔ ہر وقت ماں کو اپنے پیچھے دوڑائے رکھتا۔ ثانیہ اور ہدایت بچوں کی معصوم حرکتوں اور شرارتوں سے خوب محفوظ ہوتے۔ یہ ان کی زندگی کا خوب صورت ترین دور تھا۔

زندگی یوں ہی سبک خراہی سے آگے بڑھتی رہی پھر ایک البیہ رونما ہو گیا۔ شاہدہ باجی کے شوہر اچانک ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ شاہدہ باجی پر غموں کا ہار ٹوٹ پڑا۔ سرال والوں نے اس مشکل وقت میں آنکھیں چھیر لیں۔ ساس سر حیات نہ تھے جیسٹھ دیور پال بچوں والے تھے۔ مالی مدد دور کنار وہ اخلاقی یا جذباتی ڈھارس دینے کے بھی روادار نہ تھے۔ ہدایت اس کڑے وقت میں بڑی بہن کو بے یار و مددگار نہ چھوڑ سکتا تھا۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے اس بار بھی اسے ثانیہ کی مدد و کار تھی۔

”شاہدہ باجی کو یہاں لے آئیں ہدایت! اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں۔“ اس نے وہی بات کہہ دی جو ہدایت اس کے لبوں سے سننے کا متمنی تھا۔ ہدایت نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

شاہدہ باجی اپنے تینوں بچوں سمیت آگئی تھیں۔ گھر

اتنا کشادہ نہ تھا پھر بھی ایک کمزور شاہدہ باجی کو دیا گیا۔ بچے ماموں کے گھر آکر بہت خوش تھے۔ پہلے بھی وہ سرزدیوں، گرمیوں کی چھٹیوں کے چند روز خیر میں ضرور گزارنے آتے تھے اور انہیں یہاں آکر بہت مزہ آتا تھا۔ اب بھی ان کے جوش و خروش کا وہی عالم تھا۔ جیسے وہ چند دن کی چھٹی گزارنے آئے ہوں اور چند دنوں میں ہی ساری موجِ مستی کر لیتا جاتے ہوں۔ ابھی چھت پر جا کر پتلیوں لوٹنے کی کوشش کرتے، کبھی چھوٹے سے صحن میں کرکٹ کھیل کر خوب اوجھم مچاتے۔ گھر میں عجب سا بھونچال آگیا تھا۔ ام ایمن پریشان ہوئی تو عبداللہ بھی ہنگامے سے گھبرا کر رونے لگتا۔

شاہدہ باجی کبھی تو خالی خالی آنکھوں سے اپنے بچوں کو شور مہنگامہ کرتے سکتی رہیں۔ کبھی خالی الذہنی کے عالم سے باہر نکلتیں تو بچوں پر حلق پھاڑ کر چلاتیں اور پھر انہیں پیٹ بھی ڈالتیں۔ ہدایت اور ثانیہ انہیں روکتے رہ جاتے۔

”یہ آخری ٹھکانہ ہے من ذلیلوں کی حرکتوں کی وجہ سے یہ بھی چھین گیا تو میں کہاں درد کی ٹھوکریں کھاؤں گی۔“

وہ رونے لگتیں۔ ہدایت بہن کو بازو کے گھیرے میں لے چپ کر داتا۔ ثانیہ بھی انہیں تسلی دیتی۔ بچے جو ماں کی حالت دیکھ کر سہم کر دے بیٹھے ہوتے۔ ثانیہ لیوی چلا کر ان کا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتی۔

شاہدہ باجی ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھیں۔ شوہر کے چھڑنے کا صدمہ اپنی جگہ لیکن سرال والوں کے بدلتے تیوروں نے انہیں خست صدمہ پہنچایا تھا۔ ہر عورت کی طرح ان کی بھی یہ ہی خواہش تھی کہ جس گھر میں ان کی ڈولی اتری تھی وہیں سے ان کا جنازہ اٹھے شوہر کے مرنے کے ساتھ ہی جس طرح آنا ”فانا“ انہیں ان کی راجدھانی سے بے دخل کر دیا گیا یہ صدمہ انہیں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر گیا تھا۔

ثانیہ اور ہدایت کی دلجوئی سے آہستہ آہستہ ان کے دل کو قرار آ گیا لیکن اب وہ پہلے والی ہنس کھ سی شاہدہ

جاتے۔ بچوں سے لاڈ کا ان کا الگ انداز تھا۔ کبھی عبداللہ کو باؤ کہہ کر رورادیتے تو کبھی ام ایمن کی بونی کھینچ لیتے۔ ثانیہ ڈیرنگ نیبل کے آئینے میں خود کو بغور دیکھتی کہیں اس کے ماتھے پر بل تو نمودار ہوتا شروع نہیں ہو گئے۔

کیا اب زندگی اسی بے سکونی میں گزرنی تھی۔ یہ سوچ اسے مزید پریشان کر دیتی۔ وہ ہدایت سے یہ پریشانی بانٹ کے اسے بھی پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا جیون ساتھی اس کی دلی کیفیات سے ہرگز بے خبر نہیں تھا۔

”زندگی آزمائشوں سے ہی عبارت ہے ثانی! دوسروں کی زندگیوں سے اپنا موازنہ کر س تو شاید ہر انسان کو پھر اپنی ہی زندگی سہل لگتی ہے۔ شاہدہ باجی کے یہاں آنے سے ہماری گھریلو لائف بری طرح ڈسٹرب ہوئی ہے۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں لیکن خود سوچو! اللہ نے تمہیں پھر بھی اس آزمائش سے دوچار تو نہیں کیا جس آزمائش سے شاہدہ باجی کو دوچار کیا ہے۔“

ہدایت کے کہنے پر وہ دلی ہی تو غمی تھی۔ دل میں خدا سے بے ساختہ شوہر کی سلامتی کی دعا مانگتی تھی۔

دوسری طرف ماہین بچو اور ضویا تھیں جو شاہدہ باجی کو یہاں لانے کے فیصلے کو سراسر احقانہ قرار دے رہی تھیں۔

”بھئی، تھوڑا بہت مالی تعاون کر دیتے کیوں نند کو سر ہلا کر بٹھانے کی تو کوئی تنک نہیں تھی۔“ یہ ماہین بچو تھیں جو چھوٹی بہن کو اس کی بے وقوفی پر ٹوک رہی تھیں۔

”ثانیہ کو مصیبتیں گلے میں لٹکانے کا خود ہی شوق ہے۔“ ضویا نے بے لاگ تبصرہ کیا۔

”بجائے اس کے کہ ہم سب ثانیہ کی ہمت بندھا میں تم لوگ بلاوجہ اس کے پیچھے ہی پڑ گئے۔“ عفت اپنا نے ہی دونوں بہنوں کو ٹوکا۔

”رشتے ناتے بھاننا بھی ایک آرٹ ہے اور اگر آج ہم کسی کے کام آئیں گے تو کل کوئی ہمارے بھی کام

باجی نہ تھیں۔ وہ ایک بدلی ہوئی شخصیت تھیں۔ بہت حساس و زود رنج۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرنے لگی تھیں۔ اگر بچوں کی کسی شرارت پر ثانیہ نرمی سے بھی انہیں ٹوکتی تو شاہدہ باجی بچوں پر حلق پھاڑ کر چلاتیں۔ ثانیہ ان کا رد عمل دیکھ کر خائف سی ہو جاتی۔

اس کا گھر ہمیشہ سے ہی بہت پرسکون تھا۔ سلیقے سے سج اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کا پرسکون ماحول دوسرے لوگوں کو بھی بہت متاثر کرتا تھا۔ ضویا بھی جب کبھی آتی تو برملا اعتراف کرتی۔

”تم بہت خوش قسمت ہو ثانی! ایک انڈی پینڈنٹ لائف گزار رہی ہو۔ اپنے گھر کی آپ مالک ہو۔ ہمارے گھر میں پیسوں اور سہولتوں کی فراوانی سہی لیکن نصیب میں یہ سکون نہیں ہے۔“

ثانیہ بہن کی بات سن کر مسکرا دیتی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آئندہ آنے والے وقت میں یہ سکون خواب و خیال ہو جائے گا۔ شاہدہ باجی کی فیملی پہلے بھی آتی تھی تو گھر کی پرسکون فضا میں بھونچال سا آجاتا لیکن پہلے وہ مہمانوں کی ہنستے مسکراتے تواضع کرتی، پیشانی پر کوئی بل لائے بغیر۔ دل میں ان کے جانے کے دن لگتی رہتی۔

”خیر ہے اب تو اٹھ دن ہی رہ گئے ہیں۔ ایک ایک کر کے گزر رہی جائیں گے۔“ وہ دلی ہی دل میں خود کو سمجھاتی رہتی۔

اب مہمان مستقل کلین بن کر آگئے تھے۔ ثانیہ اب بھی ان سے خندہ پیشانی سے ہی پیش آرہی تھی۔ ماتھے پر کوئی بل ڈالے بغیر لیکن اس ڈھب پر زندگی گزارنا ہر گز آسان نہ تھا۔ وہ صفائی ستھرائی کے معاملے میں حد درجہ وہمی۔ شاہدہ باجی کے بچے گاؤں کے پلے بڑھے تھے۔ شاہدہ باجی کی اپنی شخصیت میں سلیقے کا فقدان تھا۔ بچوں کی بھی وہ خاص تربیت نہ کر پائی تھیں۔ وہ کھاپی کر برتن ادھر ادھر لڑھکا دیتے۔ گیلے واش روم سلیر زمین چھپ چھپ کرتے پورے گھر میں مزگشت کرتے۔ میلے پاؤں کے کرستہ چڑھ

آئے گل۔ ”عفت اپنا رسانیٹ سے بولیں۔

”پاپا تو کتابی باتیں کرتی ہیں۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اپنے لیے آسانیاں منتخب کرے مگر پاپا اور مانی جیسے مثالی کردار تو صرف رسالوں اور کہانیوں میں ہی ملتے ہیں۔“ ضویا ہنسی تھی۔

ثانیہ کے لبوں پر پھپکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ شادی سے پہلے ثانیہ ڈائجسٹ پڑھنے کی بہت شوقین تھیں۔ ایسی کہانیاں جس میں کوئی یتیم بیروٹن یا ہیرو کسی ظالم و جابر تائی یا ممانی کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ ایسی کہانیاں بڑھ کر ثانیہ کا جی بہت دکھتا تھا ظالم تائی اور ممانی کے لیے دل سے بددعا نکلتی۔ اب احساس ہوا کہ شاید ان کہانیوں میں تصویر کا ایک ہی رخ دکھایا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے ان تائیوں یا ممانیوں کو اپنے نادار رشتہ داروں سے کچھ سنجیدہ قسم کے مسائل بھی ہوتے ہوں۔ ثانیہ کو ایسے ہی بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔

شاہدہ باجی کی خواہش تھی کہ بچوں کو اچھے سے اسکول میں داخل کروایا جائے بلکہ شاید وہ ام ایمن والے اسکول میں ہی اپنے بچوں کا ایڈمیشن کروانا چاہتی تھیں۔ اس اسکول کا معیار خاصا بلند تھا۔ ہدایت جانتا تھا کہ نیچے داخلہ ٹیسٹ پاس کرنے کے اہل نہیں ہوں گے۔ اگر داخلہ ملتا تو پچھلی کلاسز میں مل سکتا تھا۔ ”مجھ مینے ان کے ویسے ہی ضائع ہو گئے ہیں۔ اب میں پچھلی جماعتوں میں داخلہ دلوا کر ان کے ڈیڑھ دو سال مزید ضائع نہیں کر سکتا۔ مجھے جو اسکول مناسب لگا میں نے ان کا دلایل ایڈمیشن کروا دیا ہے۔“ ہدایت دو ٹوک انداز میں بہن سے مخاطب ہوا۔ ان کا چہرہ اترا سا گیا تھا۔

”شہادہ باجی سمجھ رہی ہیں کہ شاید آپ نے پیسوں کی وجہ سے بچوں کا یہاں ایڈمیشن کروایا ہے۔“ ”یہ حقیقت ہے مانی کہ سب بچوں کی اتنی مشکل تعلیم میں انورڈ نہیں کر سکتا، لیکن اگر نیچے واقعی ذہین اور قابل ہوتے تو میں کوئی نہ کوئی سبیل نکال کر ان کا امین والے اسکول میں ہی ایڈمیشن کروا دیتا۔ اب یہ

ممکن نہیں ہے۔ میں انہیں خود گھر پر پڑھایا کروں گا۔ مناسب توجہ ملنے پر اگر انہوں نے اپنی پرو کیا تو ان شاء اللہ اگلے سال کسی اور اچھے اسکول میں داخل کروا دیں گے۔“ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔

”لوگ کہیں گے اپنی اولاد کو شہر کے سب سے بہترین اسکول میں داخلہ دلوایا ہے اور یتیم بھانجوں کو۔“

”میں دنیا والوں سے یا لوگوں کی زبان سے خائف نہیں ہوں مانی!“ ہدایت نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی ”انسان کو صرف اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہونا چاہیے اور بس۔“ وہ قطعیت بھرے انداز میں بولا۔

ثانیہ شوہر کے مزاج سے واقف تھی۔ اسے واقعی نہ لوگوں کی تعریف سے غرض ہوتی تھی نہ تنقید کی پروا۔ شاید اسی لیے وہ اتنے اطمینان سے رہتا تھا۔ وہ اطمینان جواب ثانیہ کی زندگی سے رخصت ہو چکا تھا۔



کئی مہینوں تک سوگ کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد شاہدہ باجی سنبھل گئی تھیں۔ اب انہوں نے از خود گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ثانیہ انہیں کام کرنے سے منع بھی نہ کر سکتی تھی کہ اس طرح وہ خود کو گھر میں اجنبی محسوس کر سکیں گی لیکن ان کا کیا کام بھی ثانیہ کے من کو نہ بھانا تھا۔ وہ کھانا پکاتیں تو مسالوں اور کوئنگ آئل کا بے دریغ استعمال کرتیں۔ مہینے بھر کا راشن بیس با بیس دن میں ہی ختم ہو جاتا۔ تیز مسالوں والا کھانا ثانیہ کے حلق سے بمشکل نیچے اترتا۔ وہ شاہدہ باجی کو ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔ اس مشکل کا حل ہدایت نے نکالا۔ اس نے کھانے کی میز پر سرسری انداز میں ثانیہ کو مخاطب کیا۔

”بیکم! آج آپ نے کھانا تو لا جواب بنایا ہے لیکن مرچیں بہت تیز ڈال دیں۔ کئی دنوں سے میرے معدے میں تیزابیت ہو رہی ہے۔ مرچیں ڈالتے وقت ذرا ہاتھ ہولار کھا کرو۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”کھانا تو آج میں نے بنایا ہے۔ آئندہ مرجھیں کم ڈال دیا کروں گی۔“ شاہدہ باجی بولی تھیں۔

”آپ نے بنایا ہے؟ جب ہی تو میں کوں، بالکل املاں والا ذائقہ۔ بس کپا! آٹل اور مسالے کم ڈالا کریں۔ مجھے تیزابیت رہنے لگی ہے۔“

وہ رسائیت بھرے انداز میں بولا۔ شاہدہ باجی نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ یوں ہی مسئلے جنم لیتے رہتے۔ کچھ حل ہو جاتے۔ کچھ حل طلب رہ جاتے۔

ٹانیہ بھی کبھی تو اس طرز زندگی کی علوی ہونے لگتی اور کبھی اسے شدت سے وہ ہی وقت یاد آتا جب وہ اپنی راجدھانی کی آپ مالک تھی۔ کیا سنہری وقت تھا۔ اب تو ہدایت اور اپنے بچوں کے ساتھ آؤٹنگ پر جانا بھی خواب و خیال ہو گیا تھا۔ ہدایت ہی سب بچوں کو گھر کے قریب پارک میں لے جاتے۔

ٹانیہ شاہدہ باجی کے بچوں سے ہمیشہ پیار بھرے لہجے میں مخاطب ہوتی، لیکن اسے لگتا جیسے یہ پیار صرف لہجے میں ہی ہے۔ وہ ان بچوں کے لیے اپنے دل میں محبت بھرے جذبات نہ پاتی تھی۔ وہ محبت جو اپنے بہن بھائیوں کے بچوں سے تھی۔ ہدایت کے بھانجوں سے نہ تھی۔

”بے خونی رشتوں سے محبت فطری چیز ہے ٹانی! تم ایسی باتیں سوچ کر بلاوجہ اپنے ذہن کو الجھاتی ہو۔“

”مجھے لگتا ہے ہدایت! جیسے میں ایک دوغلی عورت ہوں اور میں منافقت برتی ہوں۔“ وہ شوہر سے اپنے دل کی کوئی بات نہ چھپاتی۔

”یہ منافقت نہیں ہے ٹانی! یہ موت ہے۔ تم ان بچوں سے محبت نہیں کرتیں اس کے باوجود محبت بھرا برتاؤ اختیار کرتی ہو۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“ ہدایت کی باتیں اس کے ضمیر کی خلشیں کم کر دیتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بچوں کا ابا بلی پن قدرے کم ہوا۔ اب شاہدہ ٹانیہ کو بھی ان سے انسیت ہو گئی تھی۔ وہ ان کو مولوی کی علوی ہو گئی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو پہلے بہت کوفت میں جتلا کرتیں اب

اس نے ان باتوں سے سمجھو تاکر لیا تھا۔ کچھ وقت اور آگے سرکاک زندگی کے اگلے پریشان کن باب کا تعلق اس کے میکے سے تھا۔ ضویا احمر سے لڑجھکڑ کر میکے آن بیٹھی تھی۔ احمر جو ہمیشہ سے ہی اس کی منہمی میں تھا جانے کیسے اس کی منہمی سے پھسل گیا۔ شاید وہ گھر میں ہونے والی ہر وقت کی جھج جھج سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے بیٹیں مستقل ضویا کے خلاف اس کے کان بھرتی رہتی تھیں پہلے وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

ضویا اسے اپنی کامیابی تصور کرتی اور طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ان کا جی مزید جلاتی۔ کبھی کبھی طنزیہ فقرے بھی لڑھکا دیتی۔ لڑائی کا آغاز ان ہی چھوٹی موٹی باتوں سے ہوا۔ احمر ضویا کو خاموش ہونے کا کہتا رہا۔ اس نے شوہر کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ فریقین میں تو تکرار بڑھتی رہی۔ ضویا ساس، مندوں کو دہیدو جواب دیتی رہی اور پھر احمر کی بدداشت جواب دے گئی۔

اس نے ضویا کے چہرے پر یکے بعد دیگرے دو طمانچے رسید کیے تھے۔ ضویا اور بھڑکی۔ دونوں بچوں کی انگلی پکڑ کر اسی وقت گھر سے نکل گئی۔ اب چار مہینے ہونے کو آئے تھے، وہ میکے میں بیٹھی تھی۔ احمر یا اس کے گھر والوں نے کوئی رابطہ نہ کیا تھا۔

ای! ابو کی رائوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ امی ضویا کو ہی مورد الزام ٹھہراتیں۔ ضویا، ہسٹریائی ہو کر چلانے لگتی۔ تینوں بہنیں اس کی دل جوئی کے لیے جلدی جلدی میکے کا چکر لگاتیں۔ کوئی سمجھاتا تو کوئی تسلی دیتا۔ بہنوں کے آنے سے ضویا کا جی بھی بہل جاتا، لیکن ٹانیہ محسوس کرنے لگی تھی کہ زین کی بیوی عروج اب ان بہنوں کی آمد پر پہلے کی طرح خوش دلی سے استقبال نہیں کرتی۔ شاید اس پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ٹانیہ جب بھی جاتی اس کا ہاتھ پٹانے کی کوشش کرتی۔

”آپ رہنے دیں ٹانیہ باجی! میں کرلوں گی لیکن ضویا باجی کو سمجھائیں۔ لڑکی کا اصل گھر سسرال ہی ہوتا ہے۔ امی! ابو الگ ٹینشن میں ہیں۔ اس مسئلے کا اب

کوئی حل نکلتا چاہیے۔“

اور ہدایت کے آنے کا یمن رکھا بلکہ ان سے معذرت بھی لی اور یقین دلایا کہ وہ بہت جلد احمر کو ضویا اور بچوں کو لانے کے لیے بھیج دیں گے۔

احمر خود بچوں کے بغیر نہ رہ سکتا تھا بس اسے ضویا کے گھر والوں کے رابطے کا انتظار تھا۔ اب وہ ضویا کو لینے جاتا تو اس کی انا کو کوئی ٹھیس نہ پہنچتی۔ وہ ضویا کو لینے چلا گیا تھا۔ ضویا بنا بچوں پر ایسے اس کے ساتھ چلی گئی۔ زندگی کی حقیقتیں تلخ سی، مگر اس کڑوے گھونٹ کو پیسے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔



ہدایت کو باہر کی بہت اچھی یونیورسٹی سے اسکالر شپ پر پی ایچ ڈی کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس نے ثانیہ سے مشورے کے بعد آفر قبول کر لی تھی۔ دونوں میاں بیوی عارضی مدت کے لیے جدا ہو رہے تھے۔ ثانیہ کا دل بہت اداس تھا لیکن اس اداسی میں پریشانی کا کوئی گزرنہ تھا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں اسے میلے جاکر نہیں رہنا تھا۔ وہ میاں اپنے گھر میں آسانی سے رہ سکتی تھی۔ وہ کون سا میاں پر اکیلی تھی۔

شاہدہ باجی اور ان کے بچے تھے ناس کے پاس۔ شاہدہ باجی کے بڑے دو بیٹوں نے تو ماشاء اللہ خوب قد نکال لیا تھا۔ وہ باہر کے سارے کام بھی بہ آسانی نمٹا سکتے تھے۔ شاہدہ باجی بھی اب خاصی مصروف رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے آس بڑوس کی عورتوں کے کپڑے اجرت پر سلائی کرنا شروع کر دیے تھے۔ حالانکہ ثانیہ کو دنیا والوں کی زبانوں سے خوف آیا تھا کہ کیا کہیں گے سب کہ ہدایت بیوہ بہن کو گھر بٹھا کر کھلا بھی نہ پایا، لیکن ہدایت کو ان باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔

”شہادہ باجی کے لیے مصروفیت بہت ضروری ہے اور جب ان کے ہاتھ میں اپنی کمائی آئے گی تو ان کا اپنی ذات پر اعتماد بڑھے گا۔ ان کی زندگی میں اسی اعتماد کی کمی ہے۔ ہاں اگر وہ جسمانی طور پر اس مشقت سے ٹھکنے لگیں تو مجھے بتا دینا۔ میں اسی روز ان کا کام چھڑوا دوں گا۔“

”ہاں حل تو نکلتا چاہیے۔“ ثانیہ یہ ہی کہہ سکی۔

ضویا کے بچوں نے ہمیشہ پیسوں کی فراوانی دیکھی تھی۔ اب بھی وہ ضد کر کے زین کے ساتھ بازار جاتے تو چیزوں سے لدے پھندے کھر لوٹتے۔ زین بے چارہ برا چھنسا تھا۔ ضویا کے لحاظ میں اس کے بچوں کی فراہمیش پوری کرتا تو جب کا کبڑا ہوتا سو ہوتا بیوی کا منہ بھی پھول کر غبارہ ہو جاتا۔

عروج کی ناگوار ی اور بے زاری رفتہ رفتہ کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ ضویا سے چھوٹی ہونے کے باوجود وہ ضویا پر ڈھکے چھپے الفاظ میں طنز کرنے لگی تھی۔ ثانیہ ضویا کی وجہ سے پریشان بھی سو تھی۔ کبھی کبھار اسے ہدایت کی بہت پہلے کی بات یاد آتی تو وہ لرز رہ جاتی۔ اگر اللہ نے اسے شاہدہ باجی والی آزمائش میں مبتلا کیا ہو تا تو لاکھ سر جھٹک کر سوچ کو دماغ سے نکالتی، مگر یہ سوچ رگ و پے میں جھڑھری دوڑانے کا باعث بن جاتی۔ اللہ سے اپنا ساگ سدا سلامت رکھنے کی دعا کرتی۔

شہادہ باجی اور ان کے بچوں سے مزید محبت اور اپنائیت سے پیش آتی۔ عفت اپنا صحیح کتہی تھیں رشتے نبھانا بھی ایک آرٹ ہے۔ اگر آج ہم کسی کے کام نہیں آئیں گے تو کل کوئی ہمارے بھی کام نہیں آئے گا اور ضویا کہتی تھی کہ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ زندگی میں آسانیاں منتخب کرے۔ یہ ہی حق عروج بھی استعمال کر رہی تھی۔ اسے اپنے گھر میں ضویا اور اس کے بچوں کا وجود نرا الجھجھٹ لگتا تھا۔ ماں باپ بوڑھے اور بے بس تھے۔ اب گھر پر بھابھیوں کا راج تھا۔

ضویا کو بالآخر یہ حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ ابو ہدایت کو ساتھ لے کر ضویا کے سرال گئے تھے۔ انہیں اپنے بیٹوں سے زیادہ ہدایت کی فہم و فراست پر بھروسہ تھا۔ اس نے خود کو کسی موقع پر دانا نہیں سمجھا تھا بلکہ ہمیشہ بیابان کردھایا تھا۔ ضویا کے سرال میں اس نے بہت سلیقے بھلاؤ سے بات کی۔ فہمیدہ آئی کاروبار اب بھی درہشتی لیے ہوئے تھا لیکن ضویا کے سرے ابو

اس نے ثانیہ کو مخاطب کیا اور فی الحال تو شاہدہ باجی اپنے کام سے پوری طرح مطمئن تھیں۔ گھر کے دوسرے کاموں میں وہ جس قدر بے ذہنتی تھیں سلائی کا کام اتنا ہی نفیس انداز میں کرتی تھیں۔ اب انہیں بوتھک کا کام بھی ملنے لگا تھا جس کے دام انتہائی مناسب تھے۔

”جب ہدایت پڑھائی مکمل کر کے وطن واپس آئیں گے ناشاہدہ باجی تو ان کی ترتی بھی ہوگی اور تنخواہ میں بھی ٹھیک ٹھاک اضافہ ہوگا پھر ہم ان شاء اللہ اپنا بزنس شروع کریں گے اپنا بوتھک کھولیں گے۔“ وہ شاہدہ باجی سے مخاطب تھی۔

”ہدایت ابھی وطن سے باہر گیا نہیں اور آپ دونوں خواتین اس کی واپسی کے بعد کی پلاننگز کر بیٹھیں۔ کیا کہنے آپ کے۔“ وہ ہنسنا تھا۔

”اچھا ناظم ضائع مت کرو۔ جاؤ جہاں جانا ہے۔“ شاہدہ نے مسکرا کر چھوٹے بھائی کو ٹوکا۔

”کہاں جانا ہے؟“ ثانیہ حیران ہوئی۔

”مگر آپ اجازت دیں خاتون تو آپ کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے۔ اگلے مہینے کی چودہ تاریخ کو ہماری ویڈنگ انیورسری ہے۔ ہم ایک مہینے بعد گوروں کے دیس میں ہوں گے تو کیا خیال ہے پیٹھی سالگرہ منالیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ثانیہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر شوہر کو دیکھا۔ اس کی شادی کو آٹھ برس ہونے کو آئے تھے اور وہ پہلی بار شادی کی سالگرہ پر ڈنر کروانے لے جا رہا تھا۔

”حیران بعد میں ہونا۔ فائنٹ تیار ہو جاؤ۔ ابھی عبداللہ سو رہا ہے۔ جاگ گیا تو ساتھ چلنے کی رٹ لگا دے گا۔ ہمارے پیچھے تو شاہدہ باجی سنبھال لیں گی اسے۔“

”ہاں میں سنبھال لوں گی لیکن واپسی پر ہمارے لیے بھی یاد سے چرغہ بیک کروا کر لانا۔ ہم نے آگے کو بھی کوئی نہیں کھائی۔“

شاہدہ باجی نے بے تکلفی سے فرمائش کی۔ ہدایت نے محبت سے انہیں دیکھا۔ بت عرصہ لگا تھا انہیں

یوں بے تکلفی سے فرمائش کرنے میں۔

”فکر ہی نہ کریں شاہدہ باجی۔ چکن روٹ بھی لاؤں گا اور ساتھ آپ کی پسند کی رس ملائی بھی۔ بس اتنے ہم واپس آئیں آپ نے اپنے بچوں اور ہمارے بچوں کا خیال رکھنا ہے۔“ اس نے انہیں مسکرا کر مخاطب کیا۔

”بیوی یار جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ وہ ثانیہ کو ہانک لگا تا اس کے پیچھے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہ کپڑوں کی الماری کا پٹ کھولے کھڑی تھی۔ سوٹ کا انتخاب مشکل ہو رہا تھا۔

”وہ پیازی رنگ والا سوٹ پہن لو نا جو تم نے اتنے عرصے پہلے بنوایا تھا اور ابھی تک صرف ایک بار پہنا ہے۔“ اس نے فرمائش کی۔

”پیازی والا سوٹ پہنوں گی تو آپ ڈنر کے بعد مجھے وہ غزل سنا میں گے جو آپ نے اتنے عرصے پہلے اپنی ڈائری میں میرے لیے لکھی تھی اور مجھے ایک بار بھی نہیں سنائی۔“ ثانیہ نے جوابی فرمائش کی۔

”تم نے کب پڑھی؟“ ہدایت نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

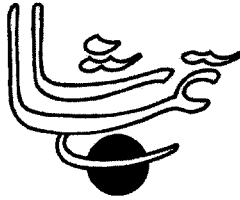
”بس دن آپ نے لکھی تھی اس سے اگلے روز۔“ ثانیہ نے مزے سے بتایا۔ ہدایت بلاناغہ ڈائری لکھتا تھا اور ثانیہ اس کے کالج جانے کے بعد اس کی ڈائری لازمی پڑھتی تھی۔

”کسی کی ڈائری پڑھنا غیر اخلاقی فعل ہے ثانیہ بیگم۔“ وہ جبر ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں تو کسی کی ڈائری تھوڑی پڑھتی ہوں۔ میں تو اپنے ماسٹر ہدایت اللہ کی ڈائری پڑھتی ہوں۔ باقاعدگی سے بلاناغہ۔“ اس نے کمال بے نیازی سے اعتراف کیا۔

”اللہ ہی تمہیں ہدایت دے دیو! اس چوری اور سینہ زوری پر وہ فقط یہی کہہ پایا۔

”اللہ نے مجھے ہدایت ہی دیا ہے میاں جی۔“ وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ ہدایت نے اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا پھر خود بھی مسکرا دیا تھا۔



ساری ہو گئی تھیں۔ مگر بنیادی وجہ ایک تھی، جس پر سب سے زیادہ سب سے سنجیدہ معرکے ہوتے تھے۔ وہ مسئلہ تھا لباس، غریبوں کے ہاں پیسوں کے کم ہونے پر جھگڑا ہوتا ہے۔ امیر اور مارڈرن فیملیز میں لباس کم ہونے پر جھگڑا ہوتا ہے۔ جیسے جیسے عیشیا کی شہرت اور مقبولیت کا گراف بڑھ رہا تھا اس کا لباس مختصر ہوتا جا رہا تھا۔ فیشن کی دنیا میں وہ اب آئی کون کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ملک کی ٹاپ ماڈل اور بہترین اداکارہ کے ایوارڈ اس کے پاس تھے۔

علی اشعر اس سے پیار کرتا تھا۔ اس کی اور اس کی صلاحیتوں کی قدر کرتا تھا۔ اسی لیے شادی اور ایک بیٹی کے بعد جب وہ انتہائی سنجیدگی اور محنت سے اپنے کیریئر کے لیے جدوجہد کر رہی تھی تو علی اشعر نے اسے بھرپور سپورٹ کیا تھا۔ اب بھی اسے اپنی بیوی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ لباس میں کچھ تو محدود و قیود کی پابندی کر لے۔ سیلویو لیس، شوڈر لیس یہ اسے کوئی خاص اعتراض نہ ہوا۔ بندلیاں دکھاتے لباس بھی قابل قبول تھے۔ مگر جب کچھ انگلش میگزین میں تو اتر سے ایسی تصاویر کی اشاعت ہوئی جو نظیر اکبر آبادی کے اس شعری تفسیر تھی کہ

یاں آکا بھی کھل رہا ہے یاں چچھا بھی کھل رہا ہے
یاں یوں بھی واہ واہ ہے یاں دوں — بھی واہ واہ ہے
علی اشعر تصاویر دیکھ کر بھٹا گیا۔ دونوں کے درمیان زبردست معرکہ ہوا۔

”مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنے کنزرویٹو ہو۔“ عیشیا چلائی۔

”مجھے بھی معلوم نہیں تھا تم اتنی بے شرم ہو۔“

باتیں تو دونوں کے درمیان بہت سالوں سے تھیں۔ تب سے جب سے دونوں کا ”لو“ شروع ہوا تھا اور تب سے بھی جب دونوں کے ”لو“ کے آگے ”میں“ کے نئے لفظ کا اضافہ ہو گیا۔ پھر میرج جیسے آگے بڑھتی گئی۔ اس سے جڑا ”لو“ جانے کیوں پیچھے ہٹا گیا، جس طرح محبت کرنے کے لیے ایک سے زیادہ وجوہات ہوتی ہیں۔ اسی طرح محبت کے خاتمے کی بھی کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی، ایک کے بعد ایک پیار کی مالا کے موتی گرتے جاتے ہیں، ٹکھرتے جاتے ہیں، دونوں کے درمیان باتیں اب بھی ہوتیں، مگر ان باتوں کی نوعیت بدل گئی تھی۔ الفاظ بدل گئے تھے۔ موضوعات بدل گئے تھے۔ اب دونوں کے درمیان گفتگو کا آغاز کسی اختلافی موضوع پر ہوتا اور اختتام جھگڑے پر، ایک دوسرے سے ناراضی اور منہ پھلانے کے سیشن طویل ہوتے جا رہے تھے۔ لڑائیوں کا دورانیہ بڑھتا جا رہا تھا۔

یہ دونوں امیر تھے۔ بہت زیادہ مشہور تھے، بہت زیادہ، ان دونوں چیزوں یعنی دولت اور شہرت کی زیادتی دو دھاری تلوار ہے، انسان لاپرواہ جائے، انہیں برتنے کا طریقہ اور سلیقہ ملحوظ نہ رکھے تو یہ تلوار بڑا ہی نقصان پہنچاتی ہے۔ تو پھر ملک کے مشہور برنس ٹائیکون علی اشعر اور اس سے زیادہ مشہور، مصوف اور معروف ماڈل اور اداکارہ بیوی کے درمیان یہ دو دھاری تلوار محبت اور رشتے کے خوب صورت مگر نازک دھاگے کے عین اوپر آگئی تھی، کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔

دونوں کے درمیان جھگڑوں کی وجوہات اب تو بہت

”کس چیز کی ماؤلنگ ہے یہ؟“ علی اشعر نے دانت پیسے۔
 ”نظر نہیں آ رہا، کپڑوں کی ہے۔“ عیسا نے اس
 ”اندھے“ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
 ”کہاں ہیں کپڑے؟ اس میں تو صرف تم نظر آ رہی
 ہو اس پروڈکٹ کے بغیر جس کی ماؤلنگ کر رہی ہو۔“
 ”تمہارا دل خراب ہو گیا ہے۔“ عیسا تلملائی۔

علی اشعر اس سے زیادہ زور سے چلایا۔
 ”میں نے کیا بے شرمی دکھائی ہے؟“ دکھ اور
 صدمے کے بارے عیسا کے منہ سے کوئی اور لفظ نہ
 نکلا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 ”یہ دیکھا ہے تم نے۔“ علی اشعر نے میگزین اس
 کی طرف پھینکا۔
 ”ماؤلنگ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔“



”انتہا نہیں ہوا کہ اپنی فیملی کو ذلیل کرنے والے کام کروں۔“

”تم آئے دن بہانے ڈھونڈتے رہتے ہو مجھ سے لڑنے جھگڑنے کے، ایک بار ہمت کر کے فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے“ عیسا اسے صرف غصہ نہیں دلا رہی تھی بلکہ آکسا بھی رہی تھی۔

قصور دراصل علی اشعر کا بھی انتہا نہیں تھا، وہ ملک کی ایک بہت بڑی کاروباری فیملی سے تعلق رکھتا تھا جن کے باپ، دادا نے قریباً پاکستان کے بعد محنت اور ایمان داری کے ساتھ کام کرتے ہوئے اپنے بزنس کی بنیاد رکھی تھی۔ ستر سالوں میں انہیں اللہ نے برکت بھی دی اور ترقی بھی آگئی یہ گھرانہ ان بہت سی برائیوں اور وباؤں سے دور تھا جو حرام رزق کی زیادتی سے گھرانوں اور گھروں میں در آتی ہیں۔ اس کے والدین تعلیم یافتہ تھے۔ جدید دور کے تقاضوں سے بہرہ مند تھے مگر کچھ مذہبی اور اخلاقی قدریں ابھی گھرانے میں موجود تھیں۔ والدہ کا دل پٹا سر سے اتر کر کانڈھے پر آگیا تھا مگر ابھی لباس کا حصہ تھا، اسے کاٹھ کباڑ بنا کر اسٹور میں نہیں ڈال دیا تھا۔ والد صاحب پانچوں وقت کے نہ سہی مگر جمعے کی نماز کی پابندی ضرور کرتے تھے۔ سالانہ زکوٰۃ اور عیسوں کی اوائلی کی پابندی۔ ایمان داری اور پاسداری کی جارہی تھی۔

اس ماحول میں مل کر بڑا ہوا علی اشعر اگرچہ باہر سے بزنس کی بہت اعلا ڈگری لے کر آیا تھا اور اپنے رویے، حلیمے اور رین سمن میں بہت ماڈرن اور جدید ہونے کے باوجود اندر کہیں نہ کہیں اخلاقی اور مشرقی اقدار کا حامی ضرور تھا، عیسا سے شادی اپنی مرضی اور پسند سے کی تھی۔ والدین کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا کہ اس سے پہلے تین بیٹوں کی شادی اپنی مرضی اور پسند سے کر چکے تھے۔ چوتھے نے اپنی مرضی کرنی چاہی تو وہ اپنے فیصلوں میں آزاد تھا۔ عیسا سے جب اس کی ملاقات ہوئی تو وہ شوہر میں آنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ارادے بنا رہی تھی، محبت ہوئی تو وہ شوہر میں قدم رکھ چکی تھی اور شادی ہوئی تو اس فیملی میں اس کے قدم

کچھ جم گئے تھے۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد شہرت کی ابتدائی سیریز میں پہنچی اور اب جب ان کی شادی کی عمر سات سال اور بیٹی کی عمر چھ سال تھی وہ شہرت کے آسمان پر تھی۔

آسمان پہ ہونے کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں رہنے والے جب نیچے زمین پر دیکھتے ہیں تو انہیں سب کچھ بہت چھوٹا چھوٹا اور معمولی سا دکھائی دیتا ہے۔ عیسا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اسے علی اشعر سے محبت تو تھی، مگر اس کے اعتراضات بہت فصول لگتے تھے۔ شادی قائم رکھنے کا معاملہ انتہا سنجیدہ اور اہم نہ رہا اس کے نزدیک، وہ روٹھ کر میکے آگئی تھی۔ جہاں والدین تو حیات نہیں تھے، مگر شادی شدہ بھائی تھے۔ کسی کو ضرورت نہیں تھی، نہ ہی ہمت کہ اس کے معاملات میں دخل دے۔ سوائے اس کی بڑی بہن کے۔ جن سے علی اشعر کی بات ہوئی تھی۔

”آپ اسے سمجھائیں گھر توڑنے کی بے وقوفی نہ کرے۔ میرا نہیں تو کم سے کم اپنی بیٹی کے بارے میں تو سوچے۔“

آبانے عیسا کو سمجھانے کی کوشش کی، اس نے سب کچھ سنا اور شرط عائد کر دی۔

”اس سے کہو، لینے آجائے۔“

علی اشعر تک یہ شرط پہنچی۔ وہ راضی ہو گیا، مگر ایک شرط اس نے بھی رکھ دی۔ عیسا کے اس طرح جانے سے اس کی اتنا ہرٹ ہوئی تھی۔ اتنی چاہت، الفت اور ہر طرح سے خیال رکھنے کے باوجود بھی وہ ناراض ہو کر پوچھ چھوڑ گئی۔ اس کا اصرار تھا کہ پہلے عیسا اسے فون کر کے اس طرح گھر چھوڑنے پر معذرت کرے۔ پھر وہ لینے آ جائے گا۔

عیسا کو یہ شرط قبول نہیں ہوئی۔ اپنی بات منوائے بغیر وہ عیسا کی بات ماننے پہ راضی نہیں تھا۔ رشتے کی ڈور میں کھینچا تالی اپنی آخری حدود میں پہنچ چکی تھی۔

”تم ہی کچھ جگ دکھاؤ، وہ حال شوہر ہے، تم سے محبت کرنا ہے اور پھر ایمان داری کی بات ہے۔ دیکھا جائے تو غلطی تمہاری ہے۔ تمہیں گھر چھوڑ کر نہیں

آنا چاہیے تھا۔“ آپ کے سمجھانے کا اثر بس اتنا ہی تھا جتنا کہ چلنے گھرے پہ پانی کی چند بوندیں۔

”سوری کس بات کی؟ میں گھر چھوڑ کر اس لیے آئی ہوں کہ اس گھر کا ماحول اور علی کی باتیں اب ناقابلِ برداشت ہو چکی ہیں۔ ہر وقت اعتراض ہر بات میں اعتراض، میرے کیمرے کے راستے میں ایک بھاری پتھر بنتا جا رہا ہے۔“ عیسا نخوت سے بول رہی تھی۔

”تمہیں اس مقام تک پہنچنے کے لیے سب سے زیادہ اسی نے سپورٹ کیا ہے تمہیں۔“ آپا کو اس کی تو اتنی شہسی سی باتیں اور روئے کھل رہا تھا۔

”اور اب وہی میری شہرت اور میری کامیابی سے جھلس ہو رہا ہے۔“ عیسا نے ایک نظر بڑی ہنس کو دیکھا۔

”آپ کو معلوم ہے مجھے پڑوسی ملک سے آفر آرہی ہے، ایسے ویسے لوگوں کی نہیں، بلکہ بہت بڑے بڑے ناموں اور بینرز کی طرف سے، علی چاہتا ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاؤں گھر بیٹھ جاؤں۔ آپ میری جگہ ہونیں تو کیا کریں۔“ عیسا نے گیند ان کے کورٹ میں ڈال دی جو بڑے محل سے اسے سن رہی تھیں۔

”میں تمہاری جگہ ہوتی تو مفاہمت کا راستہ اختیار کرتی۔“ آپا نے محل سے ہی اسے جواب دیا تھا۔

”ایک آزاد، خود مختار اور کامیاب عورت کو، مفاہمت کی کیا ضرورت ہے؟ اگر وہ واقعی میری اور میرے کیمرے کی پروا کرتا ہے تو لینے آجائے۔ میں چلی جاؤں گی، لیکن میں اس سے سوری کیوں کیوں؟ جیسے اسے اپنی انا عزت ہے، مجھے بھی ہے۔“

”وہ تمہارے کیمرے کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ عزت اور وقار کے ساتھ کام کرو۔ وہ ہر جگہ تمہیں سپورٹ کرے گا۔“ آپا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر سعیِ لاحاصل تھی۔

عیسا کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ اندازہ نہ سمجھی اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی، پتا نہیں کیا بات ہے، دنیا بھر میں بہت سے کامیاب افراد خصوصاً کامیاب عورتیں اپنی شان وادار کیمرے اور بلند یوں پہ پہنچ کر کامیابی کا خراج

ناکام از رو باجی زندگی کی قیمت میں ادا کرتی ہیں۔ عیسا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا، اسے اس ایسے کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ بیٹی سے اسے محبت تھی۔ مگر اس کے اور اپنے بہترین مفاد میں یہی تھا کہ وہ علی اشعر کے پاس رہے، بیٹی سے ملنے پہ کوئی پابندی تو نہیں تھی، گاہے گاہے ملاقات بھی ہو جاتی، کبھی براہِ راست ورنہ روزانہ فون کے ذریعے۔

شادی ختم ہو گئی تو اسے بھی سکون آگیا اور میڈیا کو بھی جو روزانہ کی بنیاد پر اس کی گھریلو زندگی کے بارے میں خبریں چھاپ رہا تھا۔

کچھ دن افسوس کے عالم میں گزار کر وہ اپنی دنیا میں گم ہو گئی۔ شہرت اور کامیابی کا ایک اور اونچا آسمان اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ بلا توقف سیڑھیاں چڑھنے میں مگن ہو گئی، بڑوسی ملک میں ایک کے بعد ایک دونوں فلمیں اس کی سپر ہٹ گئیں۔ وہ مقبولیت کا ایک نیا اور انوکھا مزاج چکھ رہی تھی۔ اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کے چرچے ہر طرف تھے۔ اس کے ساحرانہ حسن اور باوقار انداز و اطوار میں بڑی کشش تھی۔ زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا، صف اول کی فنکاراؤں میں اس کا شمار کیا جا رہا تھا۔

مقدور کا ستارہ عروج پر ہو تو اکیلا ہوتے ہوئے بھی انسان اکیلا نہیں ہوتا، ثنائی کو بانٹنے کے بہت سے متشی قریب آجاتے ہیں یا آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مزاج نہیں تھا۔ اس طرح کسی کی حوصلہ افزائی کرنا، مگر اچھے دوست کی ضرورت تو ہر کسی کی طرح اسے بھی محسوس ہوتی تھی۔ اس دنیا میں جہاں ہر رشتے خصوصاً دوستی اور تعلقات کی بنیاد کسی نہ کسی غرض پر ہوتی ہے، وہاں ہم مزاج، ہم نفس و دم ساز کا دم غنیمت ہی لگتا ہے۔

وہ ساٹھی فن کار تھا۔ مہیاں اور دوست فطرت کا بالک دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار کر خوشی محسوس ہوتی تھی۔ شوہر کی دنیا بڑی کینکرو لیڈ سی دنیا ہے۔ اپنے ایک ایک لمحے کی بھرپور قیمت وصول کرتی ہے۔

نے۔ ہیرو کی باتوں میں جھوٹے ہوئے کسی قدر بولڈ متاثر عکس بند کرائے تھے۔ ان سب پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا؟

”وہ فلم بھی میری جان، فلم میں عموماً لوگ بہت کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔ عام زندگی میں نہیں۔“ یہ اس کی میڈیا مینجمر بھی تھی اور پرنسٹل سیکرٹری بھی، جیسا کہ پتہ چلتا ہے۔

”کسی کو کیا کہ میں اپنی پرائیویٹ لائف میں کیا کرتی ہوں۔“ ایشا نے سکرینٹ سلگایا۔ وہ واقعی بہت ٹینس ہو رہی تھی۔

”تم ایک پبلک فکرو ہو، پبلک فکرو کی کوئی پرائیویسی نہیں ہوتی، ہو ہی نہیں سکتی، ایک طرف آپ لوگ چاہتے ہو کہ شہرت کے آسمان پہ چاند بن کر چکو، دنیا آپ کو دیکھے، جانے اور سراہے اور جب دنیا ہر زاویے سے آپ کو دیکھنے کی، آپ کو جاننے کی کوشش کرتی ہے تو آپ چھپنے لگتے ہو، پرائیویسی، پرائیویسی۔ ایشا ناٹ ٹینس۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو جیسا؟“ عیشا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”یار! یہاں سب لوگ سب کچھ کرتے ہیں، تم جو چاہتی ہو کرو، مگر پاپا رازلوں سے بچ کر، یہ ہی لوگ تمہاری پرائیویٹ لائف کو پبلک تک پہنچاتے ہیں۔ ان سے بلکہ کسی سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تمہاری پرائیویسی کا احترام کریں گے۔ بہت سوں کی روزی روتی ان ہی طور طریقوں سے بندھی ہے۔“

”اور یہ جو لوگوں کے ٹوئٹس آرہے ہیں؟“

اپنے پورے کیریئر میں پہلی بار اسے یوں لٹاوا جا رہا تھا، باتیں سنائی جارہی تھیں۔ تنقید کی وہ علوی تھی مگر وہ کچھ مخصوص تنقید نگاروں کی طرف سے ہوتی تھی۔ عوام سے تو ہمیشہ اسے پار و محبت اور پسندیدگی ملی تھی۔ بے چاری عیشا بولکھلا سی تھی۔ اتنے سال اس فیلڈ میں گزارنے کے باوجود بھی وہ خود کو بالکل نووارد محسوس کر رہی تھی۔ فی الحال تو اس نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

دونوں کسی پارٹی میں تھے۔ ہاتھوں میں گلاس اور سب کو معلوم ہے کہ ان میں سافٹ ڈرنک نہیں ہوتا، عیشا کا لباس جدید فلمی فیشن کے عین مطابق تھا۔ تھوڑا سا چھپا ہوا اور بہت کچھ دکھاتا ہوا۔

ویسے فیشن کا یہ انداز بھی بہت خوب ہے کہ مرد حضرات کے لباس یوں تیار کیے جاتے ہیں کہ سر سے پاؤں تک وہ بالکل ڈھک جائیں۔ کالر سے گردن چھپ جائے، نگوں اور آستینوں سے بازو اور کلائیوں، مونوں میں پیر تک چھپ جاتے ہیں اور خواتین کے لیے ایسے لمبوسات، فیشن کی اساس ہیں جو ہر بند نہیں ہے، نہیں ہے۔

اس طرح کے لباس دیکھ خیال آتا ہے کہ شاید کچھ لوگ ذہنی طور پر ابھی بھی لاکھوں، کروڑوں سال پہلے والی دنیا کے باسی ہیں، جب چند پتوں سے جسم کی ستر پوشی کا کام لیا جاتا تھا، اب چند پتوں کی جگہ کپڑے کے چند ٹکڑوں اور ڈور یوں نے لے لی ہے۔ کبھی ہوگی یہ جنگل کی تہذیب، مگر آج کی جدید دنیا میں فیشن کے نام پہ آج کا تمدن ہے۔

ایشا اور اس کے ساتھی فنکار کی تصویر وائرل ہو گئیں۔ سوشل میڈیا میں جیسے بھونچال آگیا۔ بھانت بھانت کے تبصرے اور ججز بے مورہے تھے۔ وطن کے لوگوں کی شرم جاگ رہی تھی۔ غیرت انگریزوں نے لے رہی تھی، کسی کو مذہبی روایات یاد آ رہی تھیں، کسی کو مشرقی کلچر، کسی کو ملک کے وقار کا خیال آیا۔ کسی کو قوم کی عزت کی فکر ہوئی۔ کوئی اسے بالکل عیاں تلا کر شرم دلا رہا تھا، تو کوئی نیم عریاں بتا کر اپنی پار سالی جتا رہا تھا۔

کسی کسی نے تو حد ہی کی دی، اسے بد صورت بھی کہہ دیا۔ حالانکہ اگر حسن کی تعریف یہ ہی ہے کہ وہ دل و نظر کو خود پر سے ہٹنے نہ دے، تو عیشا کی یہ تصویر حسن کے معیار پر پوری اتر رہی تھی۔

”میری تعجب میں نہیں آ رہا کہ ایسی کیا قیامت آگئی ہے؟“ عیشا جھنجھلا رہی تھی، اپنی فلم میں اس سے زیادہ خود کو ایک ہیروز کرنے والے ڈریس پہنے تھے اس

”کچھ تو کہو۔“ جیسے اسکیا۔ سوشل میڈیا پہ وہ اپنا ہانٹ آف دیو لوگوں سے شیر کر سکتی تھی، کرنا چاہیے تھا جیسا کہ خیال میں۔
 ”اوہ ہنس۔“ وہ تنقیدی۔ ”مجھے کیا ضرورت ہے اپنی صفائی پیش کرنے کی، اپنی پرست لائف میں کچھ بھی کروں، کسی کو کیا؟ میں کیا سب کے آگے جوابدہ ہوں؟“

کھڑا تھا۔
 ”کیونکہ تم ان کی آنے والی فلم کی ہیروئن ہو۔ جب تمہیں سائن کیا گیا تو تم رہنکنگ میں نمبروٹھیں اب فائبر پینچ رہی ہو، انہیں تمہاری وہی پوزیشن چاہیے پہلے والی۔“ جیسا کہ کیر نے دو ٹوک اور واضح پیغام اس تک پہنچایا تھا۔

اس کی اونچی ناک اور اس سے اونچی ان کی دیوار آڑے آ رہی تھی معذرت؟ سوری کا ایک لفظ بہت چھوٹا سا، آسان سالفظ مگر عیسا کے لیے چھوٹا نہیں تھا، آسان بھی نہیں تھا۔

”کیلیہ ضروری ہے؟“ اس نے جیسا کہ کیر کو دیکھا۔
 ”بالکل ضروری ہے۔“ اس نے عیسا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”اس بینر تلے کلام کرنے والی دو ہیروئنیں ہلی ووڈ کی پینچ تھیں اور ان کی تین فلمیں آسکر کے لیے نامزد ہوئی ہیں۔ اب تم سوچ لو، آگے جانا ہے یا واپس پلٹ کر گھر جانا ہے۔“

اور وہ کوئی پیچھے پلٹ کر جانے کے لیے تو یہاں نہیں آئی تھی۔
 ایک مختصر ٹیٹ میں اس نے کہا۔

”میں اپنے تمام بد احوال سے معذرت چاہتی ہوں، جنہیں میری غیر متوقع تصویر سے دلی کوفت ہوئی۔ آپ سب کی محبت میری خوش نصیبی ہے اور میں یہ خوش نصیبی برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔“

عیسا کا یہ ٹیٹ اس کی تصویر سے زیادہ وائرل ہوا اور رہنکنگ میں وہ اپنی پہلے والی پوزیشن نمبروٹھ کے بجائے نمبروٹھ پر آ گئی تھی۔

سوچ سوچ کر اسے ٹھیک ٹھاک غصہ آنے لگا تھا۔ اس کی ہم وطن ایک اور اداکارہ اپنی فلم میں موم بتی جلا کر چرچ میں کھڑی دعا مانگ رہی تھی۔ دیکھ جلا کر دیوی کے آگے کھڑی دعا مانگ رہی تھی۔ اس پر کسی کو نہ غصہ آیا، نہ شرم، کیونکہ وہ فلم تھی۔ اداکاری تھی، ہاں جو کچھ غلط اور ناجائز ہوتا ہے وہ فلم میں جائز ہو جاتا ہے۔ صحیح ہو جاتا ہے۔

”اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ اپنی خوشی کے لیے کچھ وقت کسی کے ساتھ نہیں گزار سکتی میں؟“ وہ پھٹ پڑی۔ سوشل میڈیا اور عوام تو ایک طرف اب اس کی تصویر پر اخبارات میں کالم بھی لکھے جارہے تھے، کالم از کالموں میں اس کا تذکرہ کیا جا رہا تھا۔
 جیسا کہ فیس بڑی، پھر ٹکٹائی۔

”ہو نٹوں پہ بھی ان کے میرا نام بھی آئے۔“
 ”ہماری فیلڈ میں خبر میں رہنا ضروری ہے۔ نام آنا چاہیے لوگوں کی زبانوں پہ، چاہے اس کے ساتھ بد لگے یا نیک۔“

”سٹاپ دوس یار؟“
 عیسا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ویسے بھی اسے یہاں کے سب سے بڑے بینر کی فلم ملی تھی۔ اس کی شوٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ اپنی تمام توجہ اور دھیان اس طرف لگانا تھا اور اس نے لگا ہی لیا تھا کہ پھر ایک نیا کھڑاک پیدا ہو گیا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ وہاں سے مسیح آیا تھا اس کے لیے کہ اسے اپنے بد احوال سے معذرت کرنی چاہیے۔

”مگر کیوں؟“ عیسا کا احتجاج حیرت کے ستونوں پہ



منشا محسن علی

دل ایرے دُورِ حُت



ناکام کوشش کرتے ہوئے آنکھیں سامنے پھری روش
کی طرف حملوی تھیں۔



میں نے ”آدم جی سرکس ہاؤس“ میں آنکھ کھولی
تھی اور ارد گرد کا ماحول مجھے حیرت زدہ کر گیا تھا۔ حیات
کا یہ زندگی نامہ بڑا حیران کن تھا۔ میرے ارد گرد جیسے
انسان نہیں چھلاوے بیٹے تھے جو میری حیران آنکھیں
دیکھ کر قہقہے لگاتے تھے۔ مجھے یہ زندگی بھی ناپسند نہیں
رہی۔ میرے لیے یہ دلچسپ صورت حال تھی۔ میں
فیڈر تھا۔ ہل میں قطاروں کے درمیان اطمینان سے
چلتی ہوئی لوگوں کی حیرت دیکھتی تھی اور وہ کبھی کبھی تو
اتنی اونچی آواز میں تلبلیاں پیتے تھے کہ میں خوف سے
کانوں پر ہاتھ رکھ جاتی تھی اور فیڈر رجم کے قدموں
میں کیس گم ہو جاتا تھا۔ میں گلے کا ہینڈل پکڑتی اور خود
بھی پکڑی جاتی تھی۔ وہ محفوظ ہوتا تھا۔

”چوری کر رہی تھیں؟“

”نہیں تو۔“

”تو پھر گلے کا ہینڈل کا بے کو پھینڈا؟“

میں نے ہینڈل سے ہاتھ اٹھالیا۔ ”میں تو دیکھ رہی
تھی۔“

”وہ ہنس۔“ سونو۔ تم آنکھوں سے نہیں دیکھتی ہو
کیا؟“

میں جانتی تھی، وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ ”میں
تمہاری آدمی سے شکایت لگانوں گی۔“

وہ یہ دہوار برنگی لالٹین کی اوپر صاف رہا تھا۔ ”ہاں۔۔۔ یہ
بھی کر دیکھو۔“ چوبیلا۔ ویسے آدم جی لبا ہیں
تمہارے، منہ بھاڑ کر ان کا نام مت لیا کرو۔“

نکلش بر دھریے پیپوٹ سے میں سردار کا سر پھاڑ
کر باہر نکل آئی تھی۔ اور دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا
تھا۔ وہ بے چارہ کلٹ گھر کی چھوٹی کھڑکی سے واویلا
کر رہا تھا۔

شام کا شو ختم ہوتا ہل خلی ہو جاتا۔ لوگ قہقہے
آوازیں سب گم ہو جاتے تھے۔

وہ اکتوبر کی ایک کیلی آوارہ سی شام تھی۔ میں نے
سراٹھا کر فہنی کو دیکھا جو میرے قریب بیٹھا تھا۔ میں
جانتی تھی کہ کچھ دیر بعد وہ مجھے تسلی دے رہا ہو گا اور مجھ
سے زیادہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہو گا۔ وہ ہمیشہ سے
ی تو ایسا کرتا آ رہا ہے اور اگر آج کسی نامعلوم وجہ کی بنا
پر ایسا نہیں بھی کرے گا تو مجھے قطعاً ”حیرت“ نہیں
ہوگی۔ میں رست واپس کے مدھم پڑتے ڈائل کو دیکھ
رہی تھی اور فہنی مجھ دیکھ رہا تھا۔
”وہ نہیں آیا نا؟“

میں نے دور تک پھلی روش کو دیکھا ”اس نے کہا
نا چھن کر پانچ منٹ پر پہنچے گا۔“
اس نے ڈائل کی طرف دیکھا ”چھن کر بیس منٹ
پر رہے ہیں سوئل۔“ سوئل کب کا جا چکا تھا۔ پوسٹ
سب جلنے لگے تھے۔

”شاید میری رست واپس خراب ہو گئی ہے۔“
اس نے لرزتی ہوئی آواز میں اس کے سامنے انتہائی
دی ویل دی۔

”گھڑی خراب نہیں ہوئی سوئل۔ اس نے جھوٹ بولا
اسے۔“ فریب دیا تھیں۔ اور تم نے یقین کر لیا۔“
مجھے وہ نیلی آنکھیں یاد آئیں وہ فریب دینے والی تو
بس لگتی تھیں۔ فہنی بھی تو جھوٹ نہیں بولتا تھا اور
م از کم قیامت تک مجھ سے تو ہرگز نہیں بول سکتا
اسے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو سوئل۔“

”کہاں؟“

وہ تاسف سے سر ہلا رہا تھا۔ ”پیکنگ ہو چکی ہوگی۔
بس جانا ہو گا۔“

”فہنی اگر۔۔۔ اگر وہ آگیا اور میں اسے یہاں نہ ملی تو
وٹ جائے گا۔“ وہ یقین تھا تو کچے دھاگے کا سا تھا۔
”وہ نہیں ٹوٹے گا۔“ آخر آل مشرقی لڑکا ہے۔“
میں طنز سے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اور میں اس
پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

”وہ آئے گا۔ اسے آنا ہو گا۔ نیلی آنکھوں والے
نہ بے وفا تو نہیں ہوتے۔“ میں نے مسکرانے کی

ہو گئی تھی۔

”ارے یہ آدم جی سرکس والے کی بیٹی ہے۔ دوستی کے لیے بہت سے ہاتھ بڑھے تھے۔“
”سوئل۔۔۔ اپنے ابا سے دو ٹکٹ تو لے آنا۔“
اور میں آدم جی کے پاس پہنچ جاتی تھی ان کے لیے بال شاونوں تک آتے تھے میں ان میں ہاتھ پھیرتی انہیں پیار سے سلاتی تو وہ چونک اٹھتے تھے۔

”کیا چاہیے سوئل۔۔۔؟“ شاید وہ بھی اب میری دلداروں کے مقاصد و مطالب اچھی طرح جان گئے تھے۔

”آدم جی۔۔۔ وہ میری دوستوں کو ٹکٹ چاہیے تھے۔“

وہ مجھے پاس بٹھالیتے تھے۔ ”اپنی دوستوں سے کہو مفت میں شود کچھ لیا کر س۔“

میں خوش ہو کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیتی۔ ”شکریہ آدم جی۔“

جانے کیوں آج تک مجھے انہیں ”بابا“ کہنا نہیں آتا تھا۔ سب کی دیکھا دیکھی میں انہیں ”آدم جی“ ہی کہتی تھی۔

کھانا پکانے کا شعبہ تو سردار کے پاس تھا لیکن جب سے میں نے ہوم آکنامکس پڑھنی شروع کی تھی سوچنے لگی کہ آئندہ میں ہی کچھ بنایا کروں اور پھر میں آدم جی کے پاس پہنچ گئی تھی۔

”آج سے کھانا میں پکاؤں گی۔“ میری آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ باورچی خانے میں موجود ہستی تک پہنچ گئی۔ دو تین دیکھیاں اکٹھی گری تھی اور شاید الٹا کر کے فرارنگ پین بھی دیوار پر دے مارا گیا تھا۔

آدم جی نے زندگی میں پہلی بار حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔ ”کم کر لو گی سوئل۔۔۔؟“

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں کر لوں گی۔“ اور پھر میں کچن میں آگئی تھی۔

جو میں نے گوندھا وہ ”آنا“ تو ہرگز نہیں تھا خیر جب روٹی تو بے پروا لی تو جانے وہ کون سے برا عظم کا نقشہ تھی اس شام سب نے ہوٹل سے کھانا کھایا تھا حتیٰ کہ

میں سات سال کی ہو کر بھی فیڈر پتی تھی آٹھویں سال یہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ آدم جی نے اکیلے ہی مجھے پالا ہو سکتا تھا۔ اماں تو میرے پیدائش کے وقت ہی چل بسی تھیں اور آدم جی کا کہنا تھا کہ انہوں نے تو مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ کافی عرصہ تو میں اماں سے خفا رہی پھر دل کو سمجھا بچھا ہی لیا کہ بھلا مرے ہوؤں سے کیا خفگی؟

خیر اماں کی کمی آدم جی نے بڑے احسن طریقے سے پوری کی تھی سرسوں کے تیل سے چچی کر کے دو چولیاں گوندھ دیتے تھے اور تو اور میرے کھا گھرے چولیاں تک انہوں نے سسی تھیں۔۔۔ مجھے تو بڑی حیرت ہوتی تھی اور میں اس کا اظہار بھی کر دیتی تھی۔

”آپ کام کیوں کرتے ہیں؟“
رنگ برنگی نلکیوں سے وہ مطلوبہ نلکی ڈھونڈ رہے ہوتے تھے۔ ”اس کی دودھ جبات ہیں۔“
”وہ کیا؟“

”تیری ماں کو بیٹے پسند تھے اور مجھے بیٹیاں۔ طے یہ پایا کہ اگر بیٹا ہوا تو اس کی ساری دیکھ بھال وہ کرے گی اور اگر بیٹی ہوئی تو اس کا خیال رکھنا میرے ذمہ ہو گا۔“
وہ مسکرائے تھے۔

”اور دوسری وجہ؟“ میں نے پوچھا تھا۔
”دوسری وجہ یہ کہ سلائی کا کام میں کر سکتا ہوں۔ سرکس والوں کے کاسٹیوم بھی تو میں خود دیتا ہوں۔“
اور میں جانتی تھی کہ وہ سارے کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ میں نے انہیں آدھی آدھی رات کو اٹھ کر کام کرتے دیکھا تھا۔

”اب تو سوجا میں آدم جی۔ بہت رات ہو چکی ہے۔ اتنی دیر تک کام کیوں کرتے ہیں آپ؟“ میں منہ بسور کران کے کندھے پر سر رکھ دیتی تھی۔

”پیشاپانا آسان نہیں ہوتا سوئل۔“

اس بات کی تو مجھے صدیوں خبر نہ ہوئی تھی۔ مجھے بڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ سرکاری اسکول میں داخلہ بھی مل گیا تھا سختی اور سلیٹ پر املا آدم جی ہی لکھواتے تھے۔ اسکول میں میری دنوں میں شہرت

”کیوں؟“

وہ رو دینے کو تھا۔ ”جی۔۔۔ وہ آپ سردار ماما سے پوچھ لو ناں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہاری بات ہو رہی ہے تو تم سے ہی پوچھا جائے گا۔“ وہ چپ چاپ ٹمن پر گرے استعمال شدہ ٹکٹ دیکھ رہا تھا۔

”اچھا سنو۔“

”جی؟“ اس نے سراٹھایا تھا۔

”تمہیں سیٹی بجانی آتی ہے؟“ وہ حیران رہ گیا تھا۔ کالی آنکھوں میں حیرت جگمگاتی تھی۔

”جی ہاں آتی ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جیسے ہی سرکس شو میں کوئی اونگھنے لگے گا تم سیٹی بجا کر اسے جگانا۔“

اور پھر مجھے بھی فہنی نے سیٹی بجانا سکھایا تھا۔ آدم جی پہلے تو حیران ہوئے اور پھر سر جھٹک کر ہنس دیے تھے۔ سرکس شو کے دوران نیند کی داریوں میں قیدم رکھتے خواتین و حضرات کو ہماری سہیلیاں جگا دیتی تھیں۔



بلاشبہ فہنی ایک اچھا دوست تھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ میری شرارتوں میں برابر کا حصہ دار تھا۔ آدم جی اسے سرکس کے مختلف کرتب سکھا رہے تھے اور اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایریل ایکٹ، تانبے کی تار پر چال، کنٹنگ بورڈ کرتب، رقص اور بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ پھر آنے والے دنوں میں، میں نے اور فہنی نے اکٹھے شو کر کے سب کو حیران کر دیا تھا۔ آدم جی نے میرا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”سوفو۔ تم نے یہ کیسے کر لیا؟“

میں کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ ”آدم جی! آخر بیٹی کس کی ہوں۔ جب اتنا کچھ آپ کر سکتے ہیں تو تھوڑا بہت میں بھی کر سکتی ہوں۔“ میں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اور وہ فقط سر ہلا کر رہ گئے تھے۔

میں نے بھی ہوٹل کا کھانا کھایا تھا۔

آدم جی کھانا بہت دیر سے کھاتے تھے تو اس شام میں جب اچھی تو دیکھا وہ میرا کپا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔ میں تڑپ کے آگے بڑھی تھی۔

”آدم جی۔۔۔ یہ مت کھا میں۔“

”کیوں؟“

”روٹی بچی ہے اور سالن میں نمک مرچ تیز ہے۔“

”سوئل۔۔۔ بیٹیوں کی پہلی روٹی اور پہلا سالن تو ماں باپ ہی کھاتے ہیں ناں۔۔۔“ وہ نوالے بنایا کر کھاتے رہے اور

میں بس انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

میں جو بھی دیکھا کچھ نہ بنانے کا سوچے بیٹھی تھی، کچھ ماہ بعد پہلی روٹی اور اچھا سالن بنانا سیکھ گئی تھی۔ بھلا بیٹیاں کب اپنے ماں باپ کو کچی روٹیاں کھانا پسند کرتی ہیں؟ کبھی نہیں۔ سچ کہوں تو آدم جی سرکس ہاؤس رنگ نسل ذاتیات سے پرے کی ایک چیز تھا۔ ایک خاندان کی طرح تھا۔ جہاں ہر فرد یکساں عزت پاتا تھا اور شاید یہی بات سب سے اہم بھی ہوتی ہے۔



جن دنوں میں انھوں نے پیر دے کر فارغ تھی اور ایک نئی اسکول میں سلائی سیکھ رہی تھی، ان ہی دنوں سردار اپنے بھانجے کو لے آیا تھا۔ نام تو اصل میں اس کا کچھ اور تھا مگر سب اسے ”فہنی“ کہتے تھے۔ وہ سوکھا چرخ سا گرے سانولے رنگ کا لڑکا تھا جس میں دلچسپی لینے کی واحد وجہ یہ تھی کہ مجھے اس کا نام بڑا ہی پسند آیا تھا۔

میں اور فہنی ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور میں اس کی عدالت لگائے بیٹھی تھی۔ وہ میرے پاس ہی سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”تمہارا نام فہنی کیوں ہے؟“

سرے سے بھری آنکھیں میری طرف اٹھی تھیں۔ ”جی پتا نہیں۔“

شو کے وقت میں اور فہنی ہال کے باہر کھڑے تھے۔ لگاتار ہونے والی بارشوں کی وجہ سے موسم میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ وہ دایمیں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جبکہ میں بائیں ستون کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

”پتا ہے سونو۔ رات آدم جی نے مجھ سے کیا سوال کیا؟“

میں نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ ”کیا سوال؟“

وہ مسکرایا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ اس کے نمکین سانولے نقوش پر وہ مسکراہٹ کتنی جھلی لگ رہی تھی۔ ”انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ سونو تمہیں کیسی لگتی ہے؟“ وہ پُرشوق نظروں سے مجھ دیکھ رہا تھا۔

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ جیسے شرمایا تھا۔ ”میں نے جواب دیا کہ سونو تو مجھے دنیا میں سب سے اچھی لگتی ہے۔ بہت پیاری۔“ وہ کتنی خوشی خوشی سب بتا رہا تھا۔

میں نے اپنے دل کی طرف نگاہ کی تھی۔ وہاں دور دور تک سنا تھا۔ اتنی گہری چپ کہ مجھے خوف آنے لگا تھا۔

”اور تمہیں معلوم ہے کہ آدم جی نے مجھ سے بھی ایک سوال کیا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

”کون سا سوال؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگا تھا۔

”انہوں نے پوچھا کہ فہنی تمہیں کیسا لگتا ہے؟“

ٹھنڈے موسم میں بھی میں نے اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے دیکھے تھے۔

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“ وہ پوچھ رہا تھا اور میں چپ ہو گئی تھی۔ ”تم نے کیا جواب دیا۔ بتاؤ۔“ وہ دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ اسے جواب دوں مگر میں کچھ بول ہی نہ پائی تھی۔ ایک لفظ تک نہیں۔!!! وہ چند ثانیے کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اس کے گہرے سانولے گالوں پر آنسو لڑھکتے دیکھے تھے۔ وہ روتا ہوا فانی میں سر ہلا رہا تھا۔

”تو میں تمہیں اچھا نہیں لگتا سونو۔ کوئی بات

اکثر بوریٹ سے آتا کر میں اور فہنی لال حویلی کی سڑک پر چل قدمی کے لیے نکل جاتے تھے قدم سے قدم ملا کر چلنا بہت اچھا لگتا تھا۔

”تم اس زندگی سے خوش ہو سوتی؟“ وہ کبھی کبھی بہت ہی عجیب سوال کرتا تھا۔

”میں ناخوش نہیں ہوں فہنی۔ زندگی بغیر کسی فکر اور پریشانی کے گزر رہی ہے تو اچھا ہے۔“

وہ ٹھہم گیا تھا۔ مجھے بھی رکتا پڑا تھا۔ ”تم نے آگے کا کچھ نہیں سوچا؟ آگے زندگی کس ڈھب پر چلے گی؟“

”جیسے گزرے گی گزار لوں گی۔“ میں اپنی دانست میں مطمئن تھی اور پھر مجھے فہنی نے پتھر کا کر دیا تھا۔

”تم ایک لڑکی ہو سوتی۔ تم ہمیشہ ایسے نہیں رہ سکتیں۔“

ایسا تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میری زندگی تو آدم جی کے گرد گھومتی تھی۔ میرا مرکز تھے وہ اور مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ لڑکیوں کے لیے تو مرکز چھوڑنا ضروری ہوتے ہیں۔ مدار سے ہٹنا اہم ہوتا ہے۔ میں نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”میری پرسکون زندگی میں یہ تم نے کیسا پتھر پھینکا ہے فہنی!“

”یہ حقیقت ہے جس پر آج تک پردہ بڑا رہا ہے۔ آج وہ پردہ ہٹا تو سب واضح ہوا۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“

اور اس رات جب لالین کی مدھم روشنی میں دیواریں بر آڑے ترچھے سامنے پڑ رہے تھے تو آدم جی نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

”سونو۔ تمہیں فہنی کیسا لگتا ہے؟“ اندھیرے میں وہ سوال روشنی تو نہ تھا۔

”بڑا نہیں لگتا آدم جی!“ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کس سوچ کے تحت وہ جواب دیا تھا۔ بہر حال آدم جی مطمئن ہو گئے تھے۔

زندگی نے وقت نے عجیب طور سے میرا امتحان لیا تھا۔ تو مجھے آدم جی کو چھوڑنا تھا۔ یوں لگا کوئی کند چھری سے مجھے فزک کر رہا ہو۔ دل کے آگے لاکھ تاویلیں دلیں دھیر کر دو مگر سمجھتا ہی نہیں۔ شام چھ بجے کے

میں۔ کوئی بات نہیں۔“

وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ میں نے دائیں ستون کے پاس ایک لال گلاب کی تازہ کلی دیکھی تھی میں نے جھک کر اسے اٹھالیا۔

میں تو اسے صرف اور صرف دوست سمجھتی رہی تھی۔ جو میری شرارتوں اور دکھوں میں حصہ دار تھا۔ وہ واقعی میرا اچھا دوست تھا۔ اس رات سونے کے لیے لیٹی تو یہ سوچ کر ہنس پڑی۔ ”سوئل۔ تمہارے پاس تو کوئی چوائس ہی نہیں۔“ مجھے شرمندگی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی بات نہیں، میں اگلی صبح اس سے معافی مانگ لوں گی۔

فلٹ گھر کی ایک بیٹ والی چھوٹی کھڑکی سے وہ باہر دیکھتا ہوا برا بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میں اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ رخ موڑ لیا تھا۔

”سنو۔ میں تم سے یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ۔۔۔“ میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کا ردِ عمل دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

”میں نہیں سن رہا۔“

میری ہنسی۔۔۔ چھوٹ گئی۔ خیر میں نے ہنسی پر قابو پا کر اسے آہستگی سے مخاطب کیا تھا۔ ”فہنی۔۔۔ میں نے لو مجھ سے۔۔۔ میں تمہیں ناپسند نہیں کرتی اور تم مجھے بُرے بھی نہیں لگتے۔“

وہ اب میری طرف دیکھتا مجھے شرمندہ کر رہا تھا۔ ”میں نے ایسا سوال نہیں کیا تھا کہ جواب دینے میں تمہیں صدیاں لگ جائیں سنو۔“ میں جانتی تھی اس کی بات سچ تھی۔ ”تمہارا سوال ایسا بھی نہیں تھا کہ لمحوں میں جواب تمہارے آگے رکھ دیتی۔“

”میں نے تو آدم جی کو جھٹ کہہ دیا تھا کہ سنو مجھے بہت پسند ہے۔“ وہ اپنی دلیل میرے سامنے رکھ رہا

تھا۔

میں زچ ہو گئی۔ ”تمہاری بات اور ہے فہنی۔“

”میری بات اور کیوں ہے؟“

”کیونکہ تم لڑکے ہو۔“

”اور تم؟“ وہ جھکے چوتن سے پوچھ رہا تھا۔

”میں لڑکی ہوں اور لڑکیاں لڑکوں کے بارے میں پوچھ گچھ گئے سوالوں کے جواب منہ پھاڑ کر نہیں دیتیں۔“ میں نے اسے مطلع کیا تھا۔

جانے وہ سمجھا تھا یا نہیں۔ چھوٹی کھڑکی کا اکلوتا بیٹ لہرا رہا تھا۔ میں اس کا اضطراب دیکھ رہی تھی۔

”مجھے لگا تھا تم اپنے دل میں میرے لیے کچھ خاص جذبات رکھتی ہو گی مگر شاید میں غلط تھا۔“

جانے وہ غلط تھا یا صحیح تھا، مگر پھر بھی میں اتنا جانتی تھی کہ کبھی مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ اس خاص جذبے کے بارے میں کچھ سوچتی۔ تو میں اسے کیسے چھوٹی امید دلاتی۔ اس لیے میں نے اس سے صاف صاف بات کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

”دیکھو فہنی۔۔۔ جھوٹ کہہ کر میں تمہارا دل نہیں رکھنا چاہتی، تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“ وہ سر ہلا گیا تھا۔ ”مجھے زندگی میں کبھی اس بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔“ تپتی عجیب بات ہے، شاید اب تک میں کسی دائرے میں ہی سفر کر رہی تھی۔ ”میں چپ ہو گئی تھی اور وہ بھی چپ ہونے لگی دیوار کو کھرچنے لگا تھا۔“

”تو تم واقعی مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟“

میں بمشکل دروازے سے لگی کھڑکی تھی۔ ”میں نے کبھی تمہارے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ مگر میں کوشش کروں گی۔“

”وہ تو جیسے ہنسنے کے پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔“ واقعی! تم سچ کہہ رہی ہو سنو؟“ وہ پہلی بار مسکرا کر مجھ سے تصدیق چاہ رہا تھا۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ”میں جھوٹ نہیں بولتی۔“

”اور ان ہی دنوں جب میں اسے سوچنے والی تھی۔“

”تم کتنے ڈرپوک ہو۔“ میں نے اسے چھیڑا تھا۔
 وہ کمری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”محبت کے
 معاملے میں ہر شخص ڈرپوک ہوتا ہے سونو۔“
 اب اسے کافی حد تک اندازہ ہو چکا تھا کہ مجھے کیسے
 خاموش کرایا جاسکتا ہے۔ اب میں نے بھی پانی کی بوتل
 اٹھا کر منہ سے لگالی تھی۔ باہر اکتوبر کی شام کھلی
 کھڑکیوں سے اندر جھانک رہی تھی۔ ہال اور راہداری
 کی رنگ برنگی بتیوں کی روشنی تڑپتے رخ سے گر رہی
 تھی۔



کسی نے سچ کہا ہے کہ جب محبت ہو رہی ہوتی ہے
 تب یوں لگتا ہے جیسے کوئی دوسرا ہمارے اندر آگنا
 شروع ہو گیا ہے اور یہ بات یقین میں تب بدلی جب
 آدم جی سرکس کے خصوصی شو کے تیسرے دن میں
 نے اسے دیکھا تھا۔

میں نے پہلی بار کسی مرد کے بھورے بال اور نیلی
 آنکھیں دیکھی تھیں۔ شو کے دوران میں نے اسے
 اپنی طرف منگنی باندھے دیکھا تھا۔ پہلے مجھے الجھن
 ہوئی تھی مگر پھر توجیسے صدیوں کا سفر لٹخوں میں ہی طے
 ہو گیا۔ سکھر میں ہمارا قیام ایک ماہ کے لیے تھا۔ وہ ہر
 روز آنے لگا تھا۔ گیارہویں روز مجھ سے وہ شو کے
 اختتام پر ملا تھا۔ لمبی سی چادر اوڑھے، میں رہائش گاہ
 کے قریب ہی ٹہل رہی تھی جب وہ میرے قریب آیا
 تھا۔

”ہائے۔“ میں نے اسے اپنے ساتھ ساتھ چلتا
 ہوا پایا۔ سرمئی رنگ کی شرٹ پہنے مجھے وہ بڑا اچھا لگا
 تھا۔

”جی۔“ میں نے سوالیہ نظر اٹھائی تھی۔
 ”کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“ فوراً یورپی
 بھینسی بھینسی مسک پھیل رہی تھی۔
 ”میں سوئل ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے
 اسے جواب دیا تھا۔

”آپ کی پرفارمنس دیکھ کر تو میں آپ کا فین ہو گیا

آدم جی نے مطلع کیا کہ ہمیں سکھر شو کے لیے جانا
 ہے۔ یہ پہلی بار تھا کہ آدم جی کسی اور شہر میں شو کرنے
 جا رہے تھے۔ میں اور فہنی اس خاص شو کی سیرسلز
 میں جُت گئے تھے۔ ہمیں دن رات کا ہوش نہ تھا۔ یہ
 بہت عرصے بعد تھا کہ میں کسی شو میں حصہ لے رہی
 تھی، کیونکہ میں تین ماہ پہلے اپنا دایاں بازو تڑوا چکی
 تھی۔ آدم جی نے مجھے منع بھی کیا تھا۔
 ”سونو۔“ تم کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ پہلے ہی
 بمشکل تمہارے بازو کی ہڈی جڑی ہے۔“ وہ فکر مندی
 سے بولے۔

”ارے آپ فکر مت کریں۔ آدم جی کی بیٹی
 ہوں۔ میں بہت بہادر ہوں۔“ میں نے اتر کر انہیں
 دیکھا تھا۔

”تم اپنے دل سے یہ سب کرنا چاہ رہی ہو۔“ وہ پوچھ
 رہے تھے۔

میں نے ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”ہاں
 بابا۔ میں اپنی خوشی سے یہ سب کرنا چاہتی ہوں۔ میں
 دنیا کو دکھانے والی ہوں کہ آدم جی کی بیٹی کسی سے بھی
 کم نہیں ہے۔“

اور وہ چونک گئے ٹھنک کر رہ گئے۔ ”بیٹیاں تو
 سات پردوں میں اچھی لگتی ہیں۔ دھنپنا ہو گا اور وہ ہوتی
 ہیں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے اور میں
 انجھتی ہوئی سیرسل کے لیے آگئی تھی۔

میں بار پر ننگے پاؤں چلنے والی تھی اور گول رنگز کے
 ساتھ رقص کرنے والی تھی۔ تار پر ننگے پاؤں چلنا
 انتہائی دشوار تھا، توازن میں ذرا سی گریز بھی موت کے
 منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ مگر شاید مجھے رسک لینا پسند
 تھا۔

فہنی نے مجھے کئی بار ٹوکا تھا۔ ”سونو۔ یہ بہت
 خطرناک ہے۔“

”میں خطروں سے نہیں ڈرتی۔ تم مجھے ڈراؤ
 مت۔“ میں نے اسے وارننگ دی تھی۔

وہ بیچ پرانی کی بوتل منہ سے لگائے بیٹھا تھا۔ ”یہ تم
 نے خوب لی۔ میں تمہارے لیے ڈر رہا تھا۔“

اندازے ہمیشہ ہی غلط ثابت ہوتے ہیں۔ بتائے عباس!
آدم جی کہتے ہیں کہ آج کے انسان کو پرکھنے کے لیے
صدیاں بھی ناکافی ہیں۔“
وہ اپنی رست و راج کے ڈائل کو دیکھ رہا تھا۔ ”کیا تم
بھی مجھے پرکھنے کے لیے صدیاں چاہتی ہو؟“
میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ”تم تو لمحوں کی سستی
کے شمار میں ہو۔“



اکتوبر کی وہ ٹھنڈی شام عجب یاسیت بھری تھی۔
میں نے واپسی پر فہنی کو اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا
پایا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میری سمجھ میں
نہیں آئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے ایک
مسکراہٹ سے نوازوں، مگر میں چاہ کر بھی ایسا نہیں کر
پائی تھی، جو میں نہیں کر پائی تھی وہ اس نے کر دیا تھا۔
”تم اس نیلی آنکھوں والے لڑکے سے مل کر آ رہی
ہو نا؟“

”ہاں۔۔۔ وہ میں۔۔۔“

”ان ملاقاتوں کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

”ہر بات کی وجہ نہیں ہوتی فہنی۔“

وہ چپ چاپ جوتے کی نوک سے گھاس کرید رہا
تھا۔ ”سوئل اٹم پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔“
”کیسی؟“ یہ سوال بڑا اہم تھا۔

”تم خود غرض ہوتی جا رہی ہو،“ مجھے یہ لفظ
”خود غرض“ بڑا مانوس سا لگا تھا، جانے کیوں؟ ”تم نے
اس کے لیے میری آفر ٹھکرا دی۔“

”آئی ایم سوری۔۔۔ میں اس کو پہلے ہاں کہہ چکی
تھی۔“ میں شرمندہ ہوتی تھی۔

”تم اس اجنبی کو منع بھی تو کر سکتی تھیں ناسوئل؟“
اس کا عباس کو اجنبی کہنا مجھے سخت برا لگا تھا۔

”وہ اجنبی نہیں ہے، سمجھ۔“

”تو پھر کون ہے؟“

اس کا سوال مجھے مزید برا لگا تھا۔ میں ہولے سے
بولی تھی۔ ”دوست ہے وہ میرا۔“

”یو آر امیزنگ۔“ وہ کچھ زیادہ ہی جوش کا مظاہرہ
کر رہا تھا، میں بس مسکراتی رہی تھی۔

”ویسے آپ کا نام بہت پارا ہے۔“ اس دن مجھے
پہلی بار اپنے نام کی خوب صورتی کا علم ہوا تھا۔

”آپ کا کیا نام ہے؟“ میں نے رک کر پوچھا تھا۔

”میرا نام عباس ہے۔“ زرد روشنوں تلے کھڑا وہ
دو تاؤں سا شخص مجھے تو کسی اور ہی دنیا کا باشندہ لگا تھا۔

اس رات پہلی بار میں نے کسی شخص کو ایک الگ
نظر سے دیکھا تھا۔ شاید میں بدل رہی تھی یا پھر بدل

گئی تھی اس بات کا احساس مجھے فہنی نے دلایا تھا۔
”تم کھوٹی کھوٹی سی رہنے لگی ہو۔“

”ارے نہیں۔۔۔ تمہیں غلط محسوس ہوا۔“ جانے
کیوں میں نے اسے ٹال دیا تھا۔

”چھا کیس چائے پینے چلیں۔“ وہ میری رائے
جاننا چاہ رہا تھا۔

”نہیں فہنی، پلیز پھر کبھی۔“ میں نے فہنی کو تو
انکار کر دیا تھا مگر میں عباس کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم دونوں ایک ہوٹل میں چائے پی
رہے تھے۔

”میں نے تم جیسی لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔“
”مجھ جیسی کیا مطلب؟“

اتنی انوسنٹ، اتنی ڈیرنگ۔۔۔ تم نے مجھے حیران
کر دیا ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا تھا

اور میں چاہ کر بھی اسے روک نہیں پائی تھی۔ وہ میری
آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”پتا ہے سوئل۔۔۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا
ہے، میں خود کو بھول رہا ہوں۔ جانے یہ میرے ساتھ

کیا ہو رہا ہے۔“ مجھے واقعی وہ بے بس سا لگا تھا۔
”فکٹر کر رہے ہو؟“ میں نے اطمینان سے چائے

کے کپ کے کناروں پر انگلیاں پھیری تھیں۔
”تمہیں میں ایسا لگتا ہوں؟“ وہ ناراض ہوا تھا اور

میں دور کیس خلاؤں میں گھور رہی تھی۔
”میں نے کبھی بھی انسانوں کے بارے میں

اندازے نہیں لگائے، کیونکہ میرے لگائے گئے

بلکہ ہے کہ نیلی آنکھوں والے بے وفا ہوتے ہیں۔



اکتوبر کی آوارہ شام نے میری آنکھیں پتھر کر دی تھیں۔ اندھیرا پھیل گیا تھا اور اندھیرے میں تو مسافر راستہ بھٹک ہی جاتے ہیں۔ اب جانے اس اندھیرے نے عباس کو کھوکھایا تھا یا پھر سوتل کو؟
 ”سوتل۔“ آدم جی میرے سامنے کھڑے تھے، میں بس انہیں وحشت کے عالم میں دیکھ گئی تھی۔
 ”وہ نہیں آئے گا۔“

آدم جی کے اس تھکے تھکے لہجے پر میں زبردست انداز میں چونکی تھی۔ میرا دل تو جیسے سینے سے نکل کر باہر آ رہا تھا۔ ”تو وہ جانتے تھے؟ مگر کب؟ کیسے؟ کہیں فہنی نے تو؟ نہیں۔۔۔ نہیں فہنی جیسا۔۔۔ شخص باتیں ادھر ادھر نہیں کر سکتا، ابھی نہیں۔“ میں نے سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

آدم جی میرے قریب بیٹھے تھے۔ ”پتا ہے سونو۔ مجھے علم تھا ایسا ہی ہو گا۔ ایسا ہی تو ہوتا آیا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ آج کے انسان کو سمجھنے پر کھنے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں اور کبھی کبھی تو یہ بھی کم پڑ جاتی ہیں، میں نے سچ کہا تھا۔“

میں نیم زد سی روشنی میں ڈبڈبائی آنکھوں سے ہتھیلیوں کی لکیریں دیکھ رہی تھی۔ ”آپ کو۔۔۔ کیسے علم ہوا آدم جی؟“

”یہ جو اولاد ہوتی ہے نا، اس کے بھی رنگ ہوتے ہیں اور یہ رنگ ماں باپ ہی پڑھ سکتے ہیں۔ کسی اور کو نظر نہیں آتے۔“

”تو پھر فہنی کو وہ رنگ کیسے نظر آ گئے تھے؟ شاید۔۔۔ خیر۔۔۔“

آدم جی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ”چلو سوتل۔۔۔ وقت بہت ہو گیا ہے، کہا سفر کرنا ہے۔“

”آپ چلیں میں آتی ہوں۔“
 وہ رگے اور بغور مجھے دیکھا تھا۔ ”تم آؤ گی نا سونو؟“

وہ چند ثانئیں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ پھر برسرِ پایا۔ ”شاید میں بھی کبھی دوست ہوا کرتا تھا۔ تمہارا۔۔۔“ وہ آگے چل دیا تھا اور میں جیسے وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

سرد اکتوبر اپنے جوں پر تھا، فضا میں خنکی سی تیرتی رہتی تھی۔ ہماری واپسی میں پانچ دن رہ گئے تھے۔ اگلے دن شوکے اختتام پر میری معمول کے مطابق عباس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس دن وہ جینز پر دھاریوں والی ٹی شرٹ پہن کر آیا تھا، جس میں اس کا کرسی جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ میں اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”ہماری واپسی میں اب صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔“ میں نے انگلیوں پر گھنٹے ہوئے اسے خبردار کیا تھا۔

”تو تم چلی جاؤ گی؟“ نیلی آنکھوں میں بے تابی بڑھنے لگی تھی۔

”جانا تو ہوتا ہے نا۔ مسافری تو تھی اس شہر میں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

”رک جاؤ سوتل۔“ وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور میں جیسے اپنے آپ کو ٹھنڈا ہوتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”کس کے لیے رک جاؤں عباس؟“ میں نے آنکھوں میں پانی جمع ہوتا محسوس کیا تھا۔

”میرے لیے رک جاؤ۔“
 ”کس حیثیت سے؟“

یہ ہی وہ سوال تھا جس پر اکتوبر کی وہ شام ختم ہوئی تھی۔ وہ سوال ادھر اور اہر گیا تھا اور پھر وہ آیا ہی نہیں۔ میں راہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

فہنی نے سڑک سڑک چائے پیتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں تو نیلی آنکھیں دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا ان سے بے وفائی جھلکتی تھی۔“ میں خاموش رہی تھی۔

آخری دن سے پہلے میں نے اسے فون کیا تھا۔ ”سوتل۔۔۔ میں تمہیں روک لوں گا۔“ اور میں جھلی ایک جھلی کی آس میں نیندیں گنوا بیٹھی تھی۔

جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گا۔ فہنی جھوٹ

سبق دینے آتے ہیں۔ ہماری زندگی میں بس ان کا اثنا ہی کام ہوتا ہے فیضی۔ پھر وہ روپوش ہو جاتے ہیں۔“
جانے وہ سمجھا تھا یا نہیں، مگر سر ہلا کر رہ گیا تھا۔
جانے کیوں میرا دل آہستہ آہستہ پر سکون ہونا چاہ رہا تھا۔

”سنو“ میں نے پکارا تو وہ متوجہ ہوا تھا۔

”سن رہا ہوں۔“

”دل بیچنا چاہ رہی ہوں، خریدو گے؟“ اس رات میں نے فینی کے چہرے پر روشنیاں اترتی دیکھی تھیں۔

”میں خریدوں گا سونل۔“ وہ ہکلا رہا تھا اور میں مسکرا رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں کہ اپنے دل کا خیال نہیں رکھ پاؤں گی، اسی لیے فہنی کو بیچ رہی ہوں، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ میرے دل کا خیال مجھ سے زیادہ بہتر طریقے سے رکھے گا۔“

آپ کا کیا خیال ہے کیا دل کو واقعی فروخت کر دینا چاہیے؟

یوں لگا سینے سے نکلے دل کو کسی نے چل کر رکھ دیا
 -ہ- میں نے آہستہ سے کہا تھا۔ ”میں آؤں گی آدم
 جی۔ آؤں گی۔“

وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ میں کچی زمین پر جھک گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی مٹھی دھیرے سے کھول۔ ادھ کھلا گلاب سوکھ چکا تھا مگر میری ہتھیلی کے پسینے سے بھگی دکھاتا تھا۔ میں نے آخری بار اس جگہ کو دیکھا تھا جہاں ہم بیٹھتے تھے۔ ڈھیروں بائیں کرتے تھے۔ میں نے گہری سانس لی تھی۔

”عباس۔۔۔ میں آدم جی کی بہادر بیٹی ہوں۔ تین چار بار ٹوٹے ہوئے بازو جڑوا چکی ہوں۔ کیا ہوا جو تم نے دل توڑ دیا۔ خیر۔۔۔ دل بھی جڑ ہی جائے گا۔“

لہٰذا لہٰذا کی طرف پلٹتے ہوئے میرے دل میں کوئی رنج، کوئی ملال نہیں تھا۔ شاید وہ کسی یہاں آئے گا تو اسے کبھی مٹی تلے سویا ہوا محبت کا پسلا اور آخری تحفہ (سوکھالال گلاب) یاد آئے گا۔ میں قہقہہ لگاتے ہوئے لہٰذا کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی، وہ حیرت سے جیسے مرے نوکتھا۔

”اس۔۔۔ یہ کیا ہے سونل؟“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔ تمہیں کیا لگ رہا ہے؟“

”مجھے لگتا تھا تمہاری بو ابھی اڑی تھی وہ بھوتے ہوئی اور
میں سارے راستے تمہیں چپ کر داکر تھک جاؤں
—“

”میں نے تمہاری تھکن کا خیال کر لیا۔“

وہ ہنسنے لایا۔ ”میری محبت کا خیال کرو تو مزا بھی آئے“

”تم نے کچھ کہا؟“

”نا... نہیں... کچھ نہیں... کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ
مے گڑبگڑا گیا تھا۔

”تم اتنی پرسکون کیسے ہو؟“

”محبت و فنا کر آرہی ہوں۔“

”واقعی...؟“ میرے اطمینان نے اسے مزید متوحش کیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کچھ لوگ ہماری زندگی میں ہمیں صرف

خواہن ڈائجسٹ
کی طرف سے برہمنوں کے لیے ایک اور ماحول

دستِ سجا
مہدیما

قیمت -/400 روپے

مکمل تصویر

کے ڈرائنگ ڈائجسٹ - 37 - (اردو اور انگریزی) - نمبر 32735021

عطیہ خالد

.....



”راگ نمبر تھا۔“ میں نے گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا تھا۔

”ایک تو یہ راگ نمبر ز!! خیر امی! میں کہہ رہی تھی کہ آج میرا آخری پیر ہے تو واپسی پر میں انیہ کے ساتھ چلی جاؤں ان کی طرف۔ اگر آپ اجازت دیں تو.....“

”کیسے جاؤ گی تم لوگ؟“
”وہ ارسل انکل لے جائیں گے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”گویا پروگرام تو طے ہے؟“

ایسی بات نہیں امی، جب رات انیہ کا فون آیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر امی نے اجازت دی تو میں اوکے کروں گی۔ آپ اس وقت سوچیں۔“
”تو پھر سارا دن کالج یونیفارم میں گزارا جائے گا۔“ مجھے ہر قسم کی بے ترتیبی سخت ناپسندھی۔
”یعنی کہ اجازت ہے؟“ شامہ نے سائڈ پر

ناولٹ



گھٹکھو رسیاہ رات اکیلی باقی تھی، اب آسمان پر۔ ستارے تو سب ہی ٹوٹ کر برس گئے تھے یک نیت۔ اور ٹوٹ کے گر جانے والوں کی کسے خبر ہوتی ہے۔ وہ کہاں جا کر گر گئے۔
میں یک ٹک تک رہی تھی اس سیاہ رات کو۔ بنا پلک جھپکائے۔ مٹی کی مورت کی طرح جو گھرے جانے سے پہلے ہی جڑ دی گئی ہو۔ گول مول مٹی کے تودے کی طرح۔

رات کی سیاہی کب صبح کے اجالے میں بدلی مجھے خبر بھی نہ ہوئی..... نہ میرے سکنے میں سرمو فرق آیا تھا۔ نہ بیٹھنے میں!!!

☆☆☆

فون کی گھنٹی کب سے بج رہی تھی لیکن کون سینٹا؟ میں اور شامہ دونوں کالج کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ اور دونوں میں سے کسی کی تیاری بھی کم اہم نہیں تھی۔ شامہ کا آج آخری پرچا تھا اور میں اسی کالج میں پرنسپل کی پوسٹ پر تھی۔ شامہ نے اپنی سب چیزیں سنہال گئے میرا پرس اور چادر بھی اٹھا لی۔ میں نے گھر کی چابیاں اٹھاتے ہوئے شامہ کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھا ہو کہ فون کی دہائی سنی جائے یا نہیں؟

”آپ سن کر آئیے، میں گاڑی نکالتی ہوں۔“
اس نے چادر میرے کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”السلام علیکم اچی فرمائیے۔“
”میں فرانس سے بات کر رہا ہوں۔ کیتی صاحبہ سے بات ہو سکتی ہے۔“

اس چند حرنی جملے نے مجھے وہیں بت بنا ڈالا تھا ساکت و جامد بت۔

”امی! امی جی، کیا ہو گیا ہے؟“ شامہ کی ابھی ہوئی آواز نے چھناکے سے اس سکوت کو توڑ دیا۔ میں نے چونکا فون پر رکھا اور سیاہ چشمے کو آنکھوں پر جمایا اور چادر اوڑھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ میں نے خود کو سنہال لیا تھا بظاہر۔
”کس کا فون تھا امی؟“

رکھا بیگ دکھایا۔ جس میں اس کے کپڑے تھے۔
 ”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ اجازت پر
 پروگرام طے ہونا تھا۔“
 ”ای جی! بیگ واپس گھر بھی تو جاسکتا ہے
 ناں۔“ کسی اور بچی کی طرح جھجھلائے بغیر شامہ
 نے کہا۔

”اوکے۔“

”شکر سہامی! وہ مسکرائی

”انیہ کو کہو، پاپا کو مت بلوائے۔ میں تم
 دونوں کو بھجوا دوں گی۔“

”جی امی!“ اس نے اسی وقت متوجہ کر دیا۔
 اس کی تیزی اور خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔
 تو بہت محسوس کرنے لگی ہے شامہ اب تنہائی
 کو۔ تو کیا شادی کر دوں اس کی؟ میں نے گاڑی روکتے
 ہوئے سوچا۔ لیکن اس کو اتار کر اپنی سہیلیوں کی طرف بھاگتا
 دیکھ کر خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔

”ابھی صرف سترہ سال کی ہے میری بچی۔
 صرف سترہ سال۔ کیا ہوتی ہے یہ عمر؟ سنیڈ ہادل پر

جا پڑا تھا اپنا ہی ہاتھ۔

سانے املتان کے پیڑ کے نیچے کھڑی لڑکیوں
 کے جھنڈ کو دیکھتی ہوئی میں اسنے آفس کی طرف چلی
 گئی۔ معصوم پریوں جیسی الہ لڑکیاں۔

”آفت لگ رہی ہیں میڈم کیتی! یہ سبز

ساری تو ان کو بہت بہت بہت سوٹ کرتی ہے۔“
 اس لڑکی کی سرگوشی اتنی اونچی ضرور تھی کہ میں
 نے ہاسانی سن لی۔ کوئی دن نہیں جاتا تھا جب میں
 ایسا جملہ بلکہ جملے نہ سنتی تھی۔ آفس میں پہنچ کر میں
 نے چادر اتاری جو فوراً سیکنہ نے تھام کر تہہ کر دی۔

”سیکنہ! اس ثروت کو بلاؤ۔“ سب کچھ بھلا
 کر اب وہ اپنے فرض کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

تیسری بار ہونے والی ڈور بیل پر میں چونک
 کر اٹھی۔ کالج سے واپسی پر میں ایلی تھی۔ شامہ تو

انیہ کے ساتھ جا چکی تھی۔ اور ماسی کو میں نے خود
 جلدی چھٹی دے دی تھی۔ ساری کو درست کرتے
 ہوئے میں نے دروازہ کھول دیا۔

اندر آنے والے کو میں نے بھی کہتی تیبھی وہ آ
 جاتا۔ جو یہاں تک آ گیا تھا۔

زبردستی آنے والے کو بھلا روکا جاسکتا ہے؟؟
 ”کیسی ہو؟“

گو کہ مہمان کی نظریں اتنی سادہ تو نہ تھیں
 لیکن میں اب سادہ نہ رہی تھی۔ نہ ہی سادہ اور نہ
 ہی کم عمر۔

”بالکل ٹھیک، چائے پوگے؟“ میں نے
 اس کے بے تکلف انداز کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

”آں!! چائے رہنے دو۔ میں کھانا کھاؤں
 گا۔ کھانے میں کیا ہے؟“ اس نے بے تکلفی میں نیا
 ریکارڈ بنانا چاہا۔

”ممن بریانی۔“ میں نے اپنے اطمینان
 سے اسے حیران کرنا چاہا بلکہ خائف بھی۔

”بانی باتیں موقوف، میں ہاتھ دھو کر آتا
 ہوں۔ تم کھانا نکالو۔“

راستہ اور سلاڈ بنانے میں، میں پندرہ سنٹ
 لگانے والی ہوں۔ میں نے اسے ٹی وی ریموٹ
 پکڑایا۔ مراد وہ چن میں نہ چلا آئے۔ وہ ہنس دیا۔
 ”یعنی کہ؟“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر ٹی وی کی
 طرف متوجہ ہو گیا۔

”دنیا بھر کی بریائیاں کھالیں، لیکن اس دم
 بریانی کا لطف نہیں آیا۔ کیا ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ
 میں لیتی۔“ اس نے دوبارہ پلیٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”شانو کھانا بہت اچھا بناتی ہے۔ خاص کر یہ
 دم بریانی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”یعنی کہ؟“ اس نے اپنا سر جھٹکا۔ ”یعنی کہ
 یہ بریانی شانو نے بنائی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا جیسے

بہت مزیدار لطفہ بنا ہو۔
 ”میٹھا؟“ اس نے ڈھیوں کی طرح چیخ بجا

کر کہا۔ میں نے قلعے کا پالہ سامنے رکھ دیا۔

”یعنی کہ؟ تم ابھی بھی قلعہ ہی کھاتی ہو؟“

”میں نے برسوں بعد کچھ دیر کے لئے آئے مہمان کو معاف کر دیا اور خاموشی سے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ آئی۔

”اب تم آرام کرو۔“ میں نے اسے لیونگ میں صوفے پر پڑتے دیکھ کر کہا۔

”آرام! یعنی کہ۔۔۔ میں یہاں آرام ہی کر رہا ہوں۔ بھئی میں اپنے گھر آیا ہوں۔ تم بلاوجہ مجھے مہمان نہ بناؤ۔“ اس نے صوفے پر پسر کرکشن سر کے چاروں طرف پھنسا لیے۔

مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ یعنی یہ رات کو بھی یہیں رہے گا۔ اس کا مطلب یہ آیا کہ کی طرف نہیں گیا۔ میں نے پوچھنا چاہا لیکن رک گئی۔ بلاوجہ بات نہیں ہو جاتی۔

رات شامہ کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ارسل انگل کسی ایمر جنسی کی وجہ سے گھر نہیں آ رہے تھے۔ سو اس کا واپس آنا مشکل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں کسی بھی حالت میں رات گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دینے والی تھی اس لیے وہ مجھ سے

گھاڑی لے کر آنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میرا اس وقت نکلنا ممکن نہ رہا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ بھابھی کا فون آ گیا۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ شامہ ان کے گھر ہی رک جائے۔ گھر میں کوئی لڑکا تو تھا نہیں۔ ”ٹھیک ہے بھابھی؟“

میرے کہتے ہی فون انیہ نے جھپٹ لیا اور ہزار ہزار شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں نے فون آف کیا تو دونوں کے بے شمار بوسوں والے آنیکون دھڑا دھڑا آئے۔ اچھا ہی تھا کہ وہ اس بلا کے جانے کے بعد آئی۔

”کیسے رہتی ہو اکیلی اتنے بڑے گھر میں؟“ اس نے جانے کا کب تھامتے ہوئے پوچھا۔ ”عمیوں! اکیلے رہنا کیا مشکل ہے؟“ میں

نے الٹا اسی سے پوچھا۔

”یار! میں تو اکیلے رہتے رہتے تھک گیا ہوں۔“

گزشتہ سترہ برسوں کی کہانی سنانے میں اسے سترہ منٹ بھی نہیں لگے۔ باہر سے ٹھوکر کھا کر آنے والوں کو اپنا ہوا چاہا گزارنے کے لیے اپنا وطن، اپنے لوگ ہی یاد آتے ہیں۔ جوانی کے زعم میں رشتوں کو محض ایک پھونک سے اڑا دینے والے نجانے کس آس میں لوٹ آتے ہیں۔

☆☆☆

اس کے سامنے اپنے بھرم کو مضبوطی سے قائم رکھنے کی کوشش تنہائی میں پھر رہی تھی۔

کیوں ظاہر کروں اس ظالم پر میں اپنی کمزوری؟ کیوں؟؟ عورت اکیلی رہ سکتی ہے۔ جب رہ کر دکھا دیا اس نے تو پھر تم ہوتے کون ہو پوچھنے والے کہ کیسے رہتی ہو؟ وہ جیسی ہے عورت جب اس کے سامنے ہی اس کے اپنے وجود میں نقب لگانے لگتے ہیں۔

کہاں جائے پھر وہ.....؟

بناموت آئے مر جائے.....؟

ایسی عورت مرد بن جاتی ہے..... بلکہ مرد سے بھی طاقت ور.....

شانو کے سلام سے میں چونکی۔ دروازہ کس نے کھولا ابھی میں پوچھنے ہی والی تھی کہ زور سے مردانہ سلام کی آواز آئی۔

”لو بھئی گیتی! تمھارا پسندیدہ حلوہ پوری۔“ کتنا ڈھیت تھا وہ۔ مجھے بے یقینی سی ہوئی۔

”شانو! دیکھو صاحب کے لیے تو یہ ناشتہ لے آؤ۔ اور میرے لیے سادہ تھوس اور آلیٹ۔“

میں نے حیران پریشان شانو کو کام بتایا۔ ناشتے کے بعد ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ شامہ آ گئی۔ اور آتے ہی پیچھے سے مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی نظر مہمان پر نہیں پڑی تھی۔ میں نے اس کو فوراً اس کی طرف متوجہ کیا۔

اماں کہتیں "زود ہیر! اتنا غصہ کیوں کرتے ہو۔ چھوٹی سی بچی ہے ابھی وہ۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔"

"چلو تم، تمہیں اماں بلارہی ہیں!" میں پھر اس کے سر پر جادو مگلتا۔

"اچھا بابا! آ رہی ہوں۔ اب کیا راستے میں ہی جبر رہو گئے بت بن کر باہو گئے بھی؟" وہ ذرا بھی تو نہ گھبراتا۔ الٹا مجھ ہی کو کھورتا۔

میں گراؤنڈ سے کھیل کر بسنے میں شراپور گھر پہنچتا تو کیتی نہائی دھوئی، رنگ برنگی پونیوں کا باغ سر پر سجائے منوآ پا کے پاس بیٹھی ہوتی۔ میں بھی اس کی پونیوں کا دشمن بن جاتا، بھی منوآ پا کی اوڑھنی چھینتا۔

"دیکھو تو زود ہیر! کیا اوٹ پٹانگ ساڑ کا ہے لیکن کیتی تو بہت سمجھ دار بچی ہے۔" منوآ پا کہتیں۔ اور کیتی فوراً منصورہ آپا کی پسندیدہ نظریں سنانا شروع کر دیتی۔ میں پاؤں پیچ کر چلاتا تو بابا میاں فوراً مجھے پٹنایا۔

"ارے میرا اسپورٹس مین آیا ہے۔ ضرور جیت کر آیا ہوگا۔ یونہی تو نہیں کپتان بنایا اسکول والوں نے اسے۔"

لیکن میرا غصہ ختم نہ ہوتا جب تک میں کیتی کی پونیاں نہ اجاڑ دیتا۔ سب روکتے رہ جاتے لیکن

میں اس کے بال کھینچ کر بھاگ جاتا۔ گھر بھر کو اچھی لگتی تھی وہ سرخ و سفید چابی والی گڑیا۔ اچھی تو مجھے بھی لگتی تھی۔ لیکن میں چاہتا تھا، وہ میری ہریات مانے لیکن اس کو تو ذرہ برابر بھی میری پرواہ نہیں تھی۔

پیاری خالہ اس مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں سے ذرا پہلے ہی آ گئی تھیں۔ وہ بہت بیمار تھیں۔ کیتی بھی اس بار بدلی بدلی سی تھی۔ نہ زبے پر کھڑی ہوتی، نہ محراب میں..... اگر ذرا کی ذرا کھڑی بھی ہوتی تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ کھڑی ہوتی۔

منوآ پا نے بتایا کہ اب کیتی اور پیاری خالہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔ کیتی کا داخلہ بھی میرے اسکول میں کروادیا گیا۔ ہم نے ایک ساتھ آنا جانا

"شامہ سلام کرو بیٹا! میری بیٹی شامہ اور یہ ہیں منوآ پا کے بھائی۔" کوئی سابقہ یا لاحقہ لگانے کو دل نہیں مانتا۔

شامہ نے سلام کیا۔
 "ولیکم السلام۔" کے ساتھ ہی آواز آئی،
 "یہ اتنی بڑی سی اپنی ہم شکل گڑیا کہاں سے لی تم نے کیتی؟"

"اومالی گاڈ! آئی کانٹ بلیووس۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مار کر اداکاری کی انتہا کر دی۔

شامہ نے قدرے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ یہ بالکل غلط نہیں تھا، ہماری شکلوں میں غیر معمولی مشابہت تھی۔ وقت نے میرے عکس کو مزید اجال دیا تھا۔ اب ہم معمولی سے عموں کے فرق کے ساتھ بہت کم معلوم ہوتی تھیں۔ ماں بیٹیاں نہیں۔ اگر کوئی اجنبی بھی ہمیں دیکھتا تو اسی طرح حیران ہوتا تھا۔ لیکن شامہ پر بڑی اس کی نظریں مجھے ماضی کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ ماضی جسے میں اپنے طور پر دفن کر چکی تھی۔ اپنے اوپر بڑی منوں مٹی کو جھاڑ کر باہر نکل رہا تھا۔ مجھے اس ماضی کو اب کسی طور بھی جگانے سے دلچسپی نہ تھی۔ میں اس کا سایہ بھی اپنی معصوم بچی پر پڑنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"یہ زبے پر، چوکھٹ میں تصویر کی طرح جم کر کھڑی کیا دیکھتی رہتی ہو کھنٹوں؟"

"جو بھی دیکھوں۔ تمہیں اس سے کیا؟" دو بدو جواب آیا۔

"ہمارے گھر میں کسی کو نہیں پسند لڑکیوں کا یوں کھڑا ہونا۔" میں دانت پیتا۔

"تو نہ ہو پسند۔ ہم تو مہمان ہیں اور مہمانوں سے کیسے بات کی جانی ہے اتنا بھی نہیں جانتے۔"

وہ ناک چڑھاتی اور میں آگ بگولہ ہو کر کبھی اباسے کہتا تھا کبھی منصورہ آپا جنہیں ہم سب منوآ پا کہتے تھے۔ لیکن سب ہنس کر نال دیتے۔

پیچھے گراؤنڈ چلی آئی اماں کا پیغام لے کر۔ میرا بس نہ چلتا تھا کہ اسے پھڑ لگا دوں۔ گھر پہنچ کر میں سب پر خوب برسا۔ تو اماں نے مجھے ہی ڈانٹا۔ مگر کیتی نے سوری کر کے مجھ پر پانی ڈال دیا۔ باقی سب سے زیادہ سمجھ دار تو وہ تھی۔

پیاری خالہ کی بیماری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اماں اور ابا ان کو ہسپتالوں میں لیے لیے پھرتے۔ کیتی بے حد افسردہ رہتی۔ بس منو آبا اس کو بہلائے رکھتیں۔ لیکن مجھ سے اس کی کبھی نہ بنی۔ میری تو وہ اگر پھل یا کالی کو ہاتھ بھی لگاتی تو میری اس سے جھڑپ ہو جاتی۔ سب مجھے ہی سمجھاتے، اس پر مجھے مزید غصہ آ جاتا۔ مجھے کبھی مل کر کھیلتا اچھا نہ لگتا تھا۔ مجھے اس سے اپنی چیزیں بانٹنا بھی پسند نہ آیا حالانکہ وہ بھی مجھ سے نہ لڑتی نہ الجھتی۔ بس وہ چاہتی تھی کہ ہر کام میں میری نسل کرے۔ محلے کی دوسری لڑکیوں کی طرح اسے کڑیوں کا کوئی شوق نہ تھا۔ ہاں میدان میں سائیکل چلانے، کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔

میں میٹرک میں تھا اور کیتی آٹھویں میں جب پیاری خالہ کی وفات ہو گئی۔ صدمہ تو سب کو بہت تھا لیکن کیتی کا حال تو بہت خراب تھا۔ وہ ہر وقت روتی رہتی۔ اگر کسی وقت خاموش بھی ہوتی تو اس کی

صورت سے لگتا کہ وہ رو رہی ہے۔ اور اسی بات سے مجھے اس پر غصہ آ جاتا۔ ٹھیک ہے اس کی امی فوت ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ ہر وقت غمستہ پھیلائے رکھے۔ میں نے اٹھ آنے والے غصے کو بھی دل میں نہیں رکھا تھا۔ ابا، اماں میرے اس رویے سے ٹالنا نظر آتے۔ لیکن اس کا ایک فائدہ ہوا کہ کیتی نے رونا بالکل بند کر دیا تھا اور بڑھائی میں جُت گئی تھی۔ اب نہ وہ روتی تھی نہ ہنستی تھی۔ بس ہمہ وقت کتابوں میں کم نظر آتی۔

اس نے انٹر کر لیا تو کہنے لگی کہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لی۔ جہاں سے میں بی ایس سی کر رہا تھا لیکن مجھے یہ برداشت نہیں تھا۔ بھلا

شروع کر دیا۔ ایک دن ہم واپس پہنچے تو کیتی کے ابا گھر آئے ہوئے تھے لیکن وہ بیٹھک میں ہی ابا کے پاس بیٹھے رہے اور واپس چلے گئے۔ ان کے اونچا اونچا بولنے سے کیتی سہم گئی تو منو آبا ہم دونوں کو محبت پر لے گئیں۔ مجھے سب معاملہ جاننے کا بے حد تجسس تھا۔ لیکن ابا نے منع کر دیا تھا کہ میں کیتی سے اس کے ابا کے متعلق کوئی بات نہ کروں۔ انہوں نے کہا۔

”بہت سی باتیں وقت کے ساتھ خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔“

لیکن میں نے اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر کیتی سے پوچھ لیا۔

”کیتی اس بار تمہارے ابا تم کو لینے کیوں نہیں آئے؟“ اس کا سر ایک دم جھک گیا۔ گالوں پر آنسو پھیل گئے۔ میں گھبرا کر بولا۔

”معاف کر دو کیتی! اب کبھی نہ پوچھوں گا۔“

”میرے ابا نے دوسری شادی کر لی ہے۔“ اس نے ایسے کہا جیسے ہماری راز کا بوجھ اٹھائے اٹھائے تھک گئی ہو۔

”جی جی جی۔ یہ کیسی بات کی کیتی تم نے کہیں بچہ بھی ایسی بائیں کرتے ہیں۔“

”تم نے پوچھا تھا تو میں کیا کہتی؟“

”اچھا اب کبھی نہ پوچھوں گا۔“ میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا اور پھر پوچھا۔

”ان کی دوسری شادی کا تاہم کو کیسے چلا؟“

”ابا! ایک دن جیلہ آنٹی کو لے آئے تھے گھر اور کہا تھا کہ یہ تمہاری بیٹی امی ہیں۔“

”پھر؟“ میں تو تجسس سے باؤلا ہو گیا۔

”وہ ہر روز امی سے لڑائی کرتی تھیں۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھے بھی پھڑ مارا۔“ کیتی کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے تھے۔

میں نے فوراً اپنا کچھ نہ پوچھنے کا عہد دہرایا۔ کچھ دن تو مجھے اس کی اداس صورت کا بہت خیال رہا۔ ہم مل کر کھیلتے رہے۔ لیکن ایک دن وہ میرے

گر لڑکا لہجہ کی کمی تو نہیں تھی کراچی میں۔

فرنیچر سے لے کر پہناؤ تک اماں نے ان ہی کے مشورے کو صائب جانا تھا۔ وہ بھی تو اپنی سلیقہ مند اور سمجھ دار۔ اور اماں کہتی تھیں کیتی کو کھٹی انہوں نے ہی دی تھی۔ مانو اپنا سارا سلیقہ اور سمجھ داری اس میں منتقل کر دی تھی۔ اب اسی نے مہمانوں اور باورچی خانے کا سارا انتظام بڑے سلیقے سے سنبھالا ہوا تھا۔ اماں کو تو مہمانوں سے ملنے ملانے سے فرصت نہ تھی۔

سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی کو چائے چاہیے تو کسی کو کھانا۔ کسی کو بستر درکار ہے تو کسی کے بچے کو گرم دودھ۔ ہر جانب سے کیتی ہی کو پکار پڑتی اور وہ چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو جاتی۔ مہمان تو مہمان تو کئی تک اس کے کن گار رہے تھے۔ منو آیا تو کہہ رہی تھیں کہ کیتی کی وجہ سے انہیں اماں اب کی کوئی فکر نہیں تھی۔

"حد ہوتی ہے لا پرواہی کی بوا۔ کب سے میں نے چائے کے لیے کہا ہوا ہے۔ کام چوروں سے بھرا ہوا ہے سارا گھر!" میں غصے سے بولتا اندر آیا تو کیتی فلاسک میں چائے چھان رہی تھی۔

"بس ذرا میں ان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔" اس نے گیت گائی ہوئی لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تو بیٹھی رہیں۔ میں بوا سے چائے لے جاتا۔" مجھے اپنی تیز آواز پر شرمندگی ہوئی۔ اس کا بھی تو دل چاہ رہا ہوگا کہ وہ بانی لڑکیوں کی طرح گیت گائے۔ اس نے کتنے اچھے کڑے پہن رکھے تھے لیکن اتنے اچھے کڑے پہن کر بھی وہ تو سارا دن کاموں میں ہی مصروف رہی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے مجھے چائے اور مٹھائی سے کجی کتنی تیار کر کے پکڑادی۔

ہر وقت مسکرانے والی کیتی، منو آیا کی وداعی کے وقت بے تحاشا رو رہی تھی۔ رونا تو مجھے بھی آ رہا تھا مگر میں ضبط کیے کھڑا رہا۔ دیر رات تک قاتوں والوں، کرسیوں والوں اور کیرنگ والوں سے پنپنا

ابا سب سے زیادہ اس کے حامی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک تو آنے جانے میں آسانی ہوگی۔ کیمپس ہمارے گھر سے بالکل قریب تھا۔ دوسرے ہمارے کیمپس ایک سے تھے۔ اسے میری وجہ سے بہت آسانی ہو جاتی۔ نمبر تو اس کے اتنے تھے کہ داخلہ ملنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ غرض تمام دلیلیں اس کے حق میں تھیں۔ جلتے کڑھتے میں اسے ساتھ لے جانے پر مجبور ہوا۔ بڑی سی چادر میں لپیٹی ہوئی وہ خوش خوش میرے ساتھ چل رہی تھی۔ یونیورسٹی کی پر شوکت عمارت پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ میں جو سخت کبیدہ خاطر تھا، کچھ نرم پڑ گیا۔

بعد میں اس کے بے حد محتاط رویے سے میں بھی قدرے مطمئن ہو گیا۔ البتہ اماں اب اسے میری لڑائیاں جاری ہی رہیں۔ مجھے جتنے حربے روٹھنے کے آتے تھے، منو آیا اور کیتی اس سے زیادہ طریقے مجھے منانے کے دریافت کر لیتیں۔۔۔

اماں کہتیں، "دوہیر! تمہارے غصے سے میری عمر کم ہوئی جاتی ہے۔" ان کی باتوں کو میں ہنسی میں اڑا دیتا ابا کے آگے دو بد و سوال جواب کرنے سے بھی میں نہ چوکتا۔ اکلوتا تھا، جوان تھا، خوب روئی میں بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ مجھے دبے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

خاندان بھر کے لڑکے لڑکیوں میں پہلی شادی تھی منصورہ آپا کی۔ اماں ابا کا سب سے ہی تعلق اچھا تھا۔ سوسب رشتہ داروں کی خوشی دیدنی تھی۔ ہمارے تینوں چچا مع اپنے اہل و عیال کے آچکے تھے۔ بڑے ماموں، ممانی جو نانا جان کی وفات پر بھی نہ آ سکے تھے امریکہ سے آئے تھے۔ چھوٹی ممانی سے تو اماں کا سہلا ہوا بہت گہرا تھا۔ سو ان کا قیام و طعام تو ہمینہ بھر سے ہمارے ہی ہاں تھا۔ جوڑوں کی خریداری سے لے کر زیور تک اور

رات ویسے سے واپسی پر اماں نے منوآ پاکی ساس سے آیا کو ساتھ لے جانے کے لیے اجازت طلب کی تو وہ کہنے لگیں۔
 ”جاوید کہہ رہے ہیں کہ وہ صبح خود منصورہ کو لے کر آ جائیں گے۔“

اماں نے میرے ذریعے بابا کو کہلا بھیجا۔ بابا جی پہلے ہی ان رسم و رواجوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، کہنے لگے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ ”ہم رخصت ہونے لگے تو جاوید بھائی کہنے لگے۔

”گیتی! تم رک جاؤ اپنی آپا کے پاس۔“
 یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس کی ناک دبا کی۔
 اماں نے فوراً سلیقے سے انکار کر دیا تو میرا بڑھتا ہوا فشار خون نیچے آیا۔

”آیا کو تو آنے نہیں دیا اور صاحب کہتے ہیں، گیتی! تم رک جاؤ۔“ ساری رات میں کڑھتا رہا۔

☆☆☆

”بہت راہ دکھائی تم نے۔ ہم لوگ تو اب نکلنے والے تھے۔“ جاوید بھائی بولے۔
 ”آج جانا ناگزیر تھا بھائی جان! شادی کے لیے پہلے ہی دس چھٹیاں لے چکا تھا میں۔ سو آج جانا پڑا۔“

”آپا! آپ رکیں گی نہیں آج؟“ میں نے ان کو چادر سنبھالتے دیکھ کر کہا۔

”نہیں۔ ابھی گھر میں بہت سے مہمان ہیں جو صرف منصورہ کی خاطر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ چلے جائیں پھر آ جائیں گی۔“
 ”اب ہمیں اجازت۔“

اتنی پرانی ہوئی تھیں آپا صرف دو دنوں میں۔
 ”تی! تم چلی چلو ہمارے ساتھ۔“ جاوید بھائی نے گیتی کی طرف جھک کے کہا۔
 ”گیتی نہیں جاسکتی۔“

میرا یوں بولنا سراسر غلط تھا۔ جاوید بھائی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ان کے جاتے ہی اس سے پہلے کہ اماں مجھ پر غصہ ہوتیں، میں گھر سے نکل گیا

میں بے تحاشہ تھک گیا تھا۔ اندر آیا تو گھر میں بالکل خاموشی تھی۔ یعنی سب مہمان سو چکے تھے۔ میں خاموشی سے اوپر چھت پر چلا آیا۔ جہاں آیا کا جھولا تھا۔ میں وہاں بیٹھ کر ڈھیر سا رونا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں تو پہلے ہی سے گیتی بیٹھی ہوئی تھی۔ چاند کی روشنی اتنی ضرور تھی کہ میں نے اسے پہچان لیا۔ آن کی آن میں میں اپنا غم اور اداسی بھول گیا۔
 ”بھلا اتنی رات میں چھت پر ایکی لڑکی کا کیا کام!“

میں نے اپنے بے قابو غصے کی آگ اس پر انڈیل دی۔ وہ اپنے کپڑوں سے ابھتی بگٹٹ نیچے بھاگی۔ وہ سڑھیوں کے قریب ایک دفعہ گری جی پھر اٹھ کر بھاگی۔ میں غصے سے کھوتا ہوا جھولے پر بیٹھا تو ملائم سا کپڑا ہاتھ میں آ گیا۔ جگہ جگہ سے غم۔ یہ گیتی کا دوپٹہ تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ میرے کڑوے الفاظ میرے آگے آ کر کھڑے ہو گئے۔ بے چاری ڈر گئی۔ اس کچے بور سے میرے دوپٹے نے میرے خیالات یکسر بدل دیے تھے۔ گیتی کا سراپا میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔

کمال ہے اتنی خوبصورت ہے گیتی میں نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔

میں دوپٹہ ہاتھوں میں جھینچے ہوئے وہیں

لیٹ گیا۔ وہ دوپٹہ نہیں تھا ایک نئے جہان کا دروازہ میرے لیے وا ہوا تھا۔ کچا کچا سا مہکتا وہ جہان بے حد دل پذیر تھا۔ اس نئے جہان کو دریافت کرتا جانے کب میں سو گیا تھا۔ صبح اٹھا تو دوپٹہ میرے ہاتھ پر لپٹا ہوا تھا۔ گہری سانس بھر کر اس مہنگ کو میں نے اپنے اندر اتار اور فوراً اٹھ کر اس کو اپنی الماری میں رکھا اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کے لیے چلا آیا۔

گیتی اور بوا سب کو ناشتہ کر رہی تھیں۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ سفید دوپٹہ اوڑھے روٹی روٹی سی آنکھوں والی گیتی۔ یہی ایک دوپٹہ نکلنے سے رہ گیا تھا۔ اور اچھا ہوا رہ گیا تھا۔ سفید دوپٹے میں لپٹا اس کا چہرہ کس قدر من موہنا لگ رہا تھا۔

تھا۔ آدھی رات کو میں واپس آیا تو لیتی جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بچن کی طرف بڑھی تو میں بولا۔
”رہنے دو۔ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“

”چائے؟“
”بنا دو تو بہت اچھا ہو۔“ وہ چائے بنانے لگی تو میں بھی بچن میں چلا آیا۔
”اماں کو تو آج بہت غصہ ہوگا۔“
”اچھا! تم کو ان کے غصے کی پرواہ ہے۔“
”بس، مجھے نہیں اچھا لگتا کہ تم کسی کے گھر جاؤ۔“
”بس اپنے ہی اچھا لگنے کی پرواہ ہے۔“ غصہ

جتانی ہوئی آج وہ پرانی لپٹ لگ رہی تھی۔
”اچھا بابا! معاف کر دو۔ غلطی ہوئی۔“ میں نے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔
میں اور معافی!!
لیکن میرے چہرے پر کچھ اور بھی تھا جو وہ کپ رکھتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے مسکرا کر چائے کا کپ منہ سے لگالیا۔
☆☆☆
”مانوس راہیں مانوس منزلوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ عشق مجاز کے راہی عشق حقیقی کی طرف جلد قدم مارتے ہیں۔ مجاز کی طلب اور جستجو ان کے

دلوں کا زنگ اور میل دھو کر ایسے مصفا اور اجلا کر دیتی ہے۔ ان کی آرزو واحد پر جمع ہو جاتی ہے اور ان کا دل جلد یا بدیر محبوب حقیقی کی مسند بن جاتا ہے۔“
”میتھی کے خاموش ہوتے ہی ابا اور جاوید بھائی کی واہ واہ، بہت خوب کی آوازیں آئیں۔ ابا اور جاوید بھائی کی نشست صبح سے جچی ہوئی تھی۔ اب جو میتھی چائے دینے گئی تو انہوں نے اسے بھی شریک گفتگو کر لیا۔
میں تو جاوید بھائی کے اصرار کے باوجود ان کی محفلوں میں کم کم ہی شریک ہوتا تھا۔ ان کے دوستانہ سلوک کے باوجود میرے دل کی گرہ نہ کھل سکی۔ میتھی کے لیے ان کا التفات مجھے سخت ناپسند

تھا۔ ظاہر اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن میرا بس چلتا تو میتھی کو ان کے سامنے آنے سے بھی منع کر دیتا۔
ابھی آپا کی شادی کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ جاوید بھائی کی امی میزبانیوں سے گریزیں۔ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ اب تو منصورہ آپا کا آنا ایک دم کم ہو گیا۔ زیادہ تر آپا فون پر بات کر لیتیں۔ کبھی کبھار امی ابا ملنے چلنے جاتے۔ لیکن جاوید بھائی ہفتے عشرے بعد ضرور چلے آتے۔ میں نے ایک دو بار اماں سے بھی براہی کا اظہار کیا تو وہ مجھے ہی باؤلا کہنے لگیں۔
جاوید بھائی ہمیشہ میتھی کو ساتھ چلنے کے لیے کہتے۔ کبھی کوئی بہانہ، کبھی کوئی بہانہ بناتے۔ آپا نے بھی میتھی کو بھیجنے کے لیے کئی پیغام بھیجے۔ تو میں نے اماں کو صاف منع کر دیا۔ بلکہ میتھی کو بھی تنبیہ کر دی۔ وہ خود بھی کہیں آنے جانے کی شوقین نہیں تھی۔ یوں بھی وقت کہاں تھا اس کے پاس۔ ہم اپنی پڑھائی میں مگن تھے۔ میرا ایم ایس سی کا فاسٹل سمسٹر تھا۔ اور میتھی ڈبل سمسٹر کے ساتھ بی ایس سی کر رہی تھی۔ صبح معنوں میں ہمارے پاس سر کھانے کی فرصت نہیں تھی۔
ادھر ہمارے امتحان شروع ہوئے ادھر ننھے ندیم صاحب نے آ کر مجھے ماموں اور میتھی کو خالہ کے منصب پر سرفراز کر دیا۔ گھر میں خوب رونق ہو گئی۔ ہر وقت کا آنا جانا۔ میرا کمرہ تو پہلے ہی اوپر تھا۔ میتھی نے بھی اوپر والے اسٹور میں اپنی کتابیں رکھ لیں۔ البتہ سوتی وہ اماں ہی کے ساتھ تھی۔
ظالم امتحان کے چکر میں ہم نے ابھی تک ندیم سے دل بھر کر کھیلا بھی نہیں تھا کہ جاوید بھائی آپا کو لے جانے کے لیے چلے آئے۔ ابا جی نے چھوٹے بچے کے خیال سے رات کو سفر کرنے سے منع کر دیا۔
یوں جاوید بھائی بھی رات رک گئے۔ روزانہ کی طرح بڑھتے بڑھتے چائے پینے کے خیال سے

مان گیا اور ہم نے شادی کر لی۔ ایک ایک سال کے وقفے سے مونا اور سومی اس دنیا میں چلی آئیں۔

بھولی بھالی مونا اور سومی میرے وجود کے گرد موجود لائقہ اور نفرت کے دائروں کو کاٹ کر مجھے گدگدانے لگی تھیں۔ انہیں پیار کرتے ہوئے مجھے اماں کے شفقت آمیز بوسوں کی، ابا کی محبت سے لبریز نگاہوں کی بے تحاشا یاد آتی۔ سومی تو بنی بنائی منصورہ آپا بھی۔ ویسے ہی نین نقش، ویسی ہی عادات۔ ان سب کے ساتھ ایک اور وجود بھی یاد آتا تھا۔ اور اس کی یاد ایسا بارود تھا جو دل و دماغ کے ریشے ریشے میں آگ لگا دیتا تھا۔ جلا کر راکھ کر دیتا تھا۔ اتنے برسوں بعد بھی یہ آگ ٹھنڈی نہ ہو سکی تھی۔ نہ ہی میں ایسا بھسم ہوا تھا کہ اس راکھ میں ماضی کے ساتھ دفن ہو جاتا۔

ان ہی دنوں میری ملاقات انظر سے ہوئی۔ ہم ایک ہی فرم میں نوکری کر رہے تھے۔ انظر بہت اچھا سلکھا ہوا نوجوان تھا۔ مجھے بھی اس کی صحبت بھاگنی، کچھ میں بھی بھٹک بھٹک کر تھک چکا تھا۔ میری اکثر شا میں اس کے اپارٹمنٹ میں گزرنے لگیں۔ وہ مزیدار پاکستانی کھانے بنانے میں ماہر تھا۔ میرا ڈنراب اکثر اس کے ساتھ ہونے لگا۔ کھانا بناتے بناتے وہ اسکا پپر گھر والوں سے باتیں کرتا جاتا۔

باتیں سن سن کر میں اس کے سب ہی گھر والوں سے متعارف ہو چکا تھا۔ اس کی فیملی بہت سی تھی۔ اور ان کے آپس میں بہت گہرے روابط تھے۔

اس کے گھر سے آنے والے فون اور میسجز مجھے ایک حسرت میں مبتلا کر دیتے۔ ایک دن وہ اسکا پپر غافلہ چھوٹی بہن سے بات کر رہا تھا۔ وہ کسی شامہ کا ذکر کر رہی تھی جسے وہ بھائی بنانا چاہتی تھی۔ شامہ کے حسن کی تعریف میں جس طرح وہ زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔ اس نے مجھے حسد کرنے پر مجبور کر دیا۔

کیا تھا انظر کے پاس جو میرے پاس نہیں تھا۔ کیا کئی تھی مجھ میں؟ اور اس کے لیے اس کی

ٹکلا تو سوچا، گیتی سے بھی پوچھ لوں۔ اسٹور کی لائٹ بھی جل رہی تھی۔ دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے آواز آئی۔

”میں بس یہی کہنا چاہتا تھا کہ منصورہ کی آبادی صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ اس کو صاف صاف کہہ دیا ہے میں نے۔ اگر وہ نہیں تو تم بھی نہیں۔“ یہ آواز جاوید بھائی کی تھی۔

”منصورہ سے تو میں پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ اس کو راضی ہونا پڑے گا۔“

☆☆☆

بس اس سے زیادہ سننے کی تاب کہاں تھی مجھ میں۔ ایک لمحے کے توقف کے بغیر ابا کے کمرے میں پہنچا کہ سیف سے ریو اور نکال سکوں۔ اتنے میں آپا کے کمرے سے آئی ندیم کے رونے کی آواز میرے لیے صور اسرافیل تھی۔ یہ میں کیا کرنے جا رہا تھا۔ میں نے سیف کی چابی وہیں پھینک دی اور کھن میں نکل آیا۔ دل چاہتا تھا اوپر چلا جاؤں اور اس احسان فراموش سے پوچھوں کہ کیا کئی تھی ہماری محبتوں میں؟

اور میری بہن اس قدر اندھی ہو چکی تھی کہ اسے اپنی سو کن بنانے پر تیار تھی۔ یقیناً اپنا گھر بچانے کے لیے وہ یہ قربانی دے رہی تھی۔

لیکن گیتی..... آخ تھو!!!!

☆☆☆

نفرت کی آگ میں جلا میں معلوم سے نامعلوم ہو گیا۔ میں نے اپنے تئیں قصہ پارینہ بن جانا چاہا میں نے گھر چھوڑ دیا۔ اس رات کی کچی نے میرے وجود کو کیکر بنا ڈالا تھا۔ خاردار کیکر جو صرف الجھنا جانتا تھا۔ میں ساری دنیا سے الجھتا ہی پھرتا رہا۔ پہلے میں نے وہ شہر چھوڑا پھر ملک مختلف ملکوں میں بھٹکتا رہا۔ کئی سال بھٹکتا میں فرانس میں ٹک گیا۔ یہاں مجھے ایک دور بار کے رشتہ دار سے گیتی کی شادی کی اطلاع ملی۔ میں جو میکی کی انتہائی کوشش کے باوجود شادی کے لیے راضی نہ ہوتا تھا فوراً

بہن کسی پری رو کو منتخب کیے بیٹھی تھی۔ میکی کی کم صورتی کا احساس اس سے پہلے مجھے بھی نہ ہوا تھا۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا اور میں بنا کھانا کھائے اٹھ آیا۔

مانو اور سومی سے کھیلتے ہوئے بھی کہیں الجھا رہا۔ دل ہی دل میں میں نے پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میکی کے سامنے میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں اس کو تو ساتھ لے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ مجھے بھی جانے سے منع کر رہی تھی۔ وہ ہوتی کون بھی مجھے روکنے والی۔ میں نے اپنا غصہ نکالنے کے لیے بڑی غلط جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔

وہ کون ہوتی تھی؟ اس نے مجھے بہت جلد بتا دیا۔ اسی وقت اس نے مجھے بیچوں کے ساتھ گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ صرف تین سال کی مانو اور چار سال کی سومی کو لے کر میں اظہر کی طرف آ گیا۔ ان کو منہالتے، ان کے کام کرتے مجھے تانی یاد آ گئی۔ بڑی مشکل سے چند دن گزار کر میں نے ان کا ویر حاصل کیا اور انہیں لے کر پاکستان آ گیا۔

☆☆☆

”زوہیر! زوہیر!“

میرے وجود کے ذرے ذرے نے اس آواز کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا تھا۔ اور آواز کے مالک پر نظر پڑتے ہی فضا میں منتشر ہرزہ یوں منجمد ہو گیا کہ اس کی کجالی ممکن نہ رہی تھی۔

”میرے بھائی! میرے بچے چھوٹے چاند۔“

یہ منو آ پائیں جو مجھے جوم جوم کر رہی تھیں۔

”کہاں چلے گئے تھے زوہیر ہمیں چھوڑ کر؟“

”اپا بایہ کون ہیں؟“ مانو اور سومی مجھے ہلا ہلا کر پوچھ رہی تھیں

”یہ تمھاری بیٹیاں ہیں؟“ منو آ پاؤ ہیں سڑک پر بیٹھ کر انہیں لپٹا لیا تھا۔

”میں تمھاری پھوپھو ہوں بیٹا۔“

وہیل چیمبر پر بیٹھے ہوئے جاوید بھائی نے مجھے لپٹانے کی کوشش کی تو نفرت کی لہر نے میرے ہر مسام کو بخ کر ڈالا۔ میں فوراً ان سے علیحدہ ہوا۔ زوہیر! بس تم ہمارے ساتھ گھر چلو۔ ”انہوں نے کیب کو روکتے ہوئے کہا۔ میں جو تین دن سے کراچی آ کر ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ منو آ پا کے ساتھ چپ چاپ چلا آیا۔

☆☆☆

میرا اگر اس گھر سے روح کا ناتا تھا تو اس گھر کے مکین بھی مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ خالہ جان مجھے بہو بنانا چاہتی تھیں۔ وہ تو کئی بار زوہیر کے سامنے اظہار کر چکی تھیں کہ وہ مجھے اپنی بہو بنائیں گی۔ کسی کو اس پر اعتراض نہیں تھا نہ مجھے نہ زوہیر کو۔ وہ ایسا نہ بھی چاہتیں تو میں ان کے احسانات بھول نہیں سکتی تھی۔ میں اس گھر کے مکینوں پر جان قربان کر دیتی تو کم تھا۔ بھلا میں اپنے محسنوں کو کوئی نقصان کیسے پہنچا سکتی تھی۔

جاوید بھائی کی مجھ پر نظر کیسی تھی؟ مجھے اس کا احساس بہت جلد ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اس طرح مجھے مجبور کریں گے میرے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ منو آ پا اس لیے اس قدر کمزور ہو چکی تھیں۔ انتہائی لاغر اور آرزو۔ ہر وقت اندھیرا کیے گھٹ گھٹ کر

روتی تھیں۔ رات دن مجھ سے معافیاں مانگتیں۔ ان کو اپنا گھر بجانے کی فکر بھی ہر عورت کی طرح۔ میں تو ان سے نظر ملانے کے قابل نہیں تھی۔ بات ابھی خالہ، خالو کے علم میں نہیں تھی۔ لیکن کب تک؟ جاوید بھائی نے منصورہ آبا کی واپسی اسی شرط سے مشروط کر دی تھی۔ زوہیر کے غصے سے ڈر کر اس کو سارے معاملے سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔

جس روز جاوید بھائی نے مجھ سے بات کی میں سخت خوف زدہ ہوئی تھی۔ وہ یوں میرے کمرے میں چلے آئیں گے، مجھے گمان بھی نہ تھا۔ ابھی وہ مجھ سے اصرار کر رہے تھے کہ منو آ یا اوپر آئیں۔

(غصہ) نے میری روح کو داغ دار کر دیا تھا۔

میں اب اس گھر میں کیسے رہ سکتی تھی!!
صبح زوہیر گھر میں نہیں تھا۔ میں نے اماں کی ڈائری سے ابا کا نمبر نکالا اور انہیں فون کر دیا۔
خلاف توقع ابا دو گھنٹوں میں آ چکے تھے۔ انہوں نے باہر ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ایک چھوٹے لڑکے سے اندر پیغام بھیجا۔ میں نے اپنا بیگ پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ خالو جان زوہیر کو ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ بہت بہتر ہوا۔ میں خالہ جان کو اطلاع دے کر وہاں سے نکل آئی۔ چچا کرنی آوازوں کے لیے میرے کان بند تھے۔ میں اس جہنم سے نکل آئی تھی۔ ساری دنیا اب جنت تھی میرے لیے، اس گھر کے سوا۔

ابا کا گھر توقع سے زیادہ پر ایسا ثابت ہوا تھا۔ میری آمد پر ابا کی بیوی نے نہ خوشی کا اظہار کیا نہ ناراضی کا۔ ایک مہینے میں میری شادی طے کر دی گئی۔ طالب میرے تایا کا بیٹا تھا۔ میں نے اپنے لیے ایک نئے امتحان کا انتخاب کیا تھا۔ یہ اندازہ مجھے شادی کی رات ہوا۔ طالب بہت چھوٹے ذہن اور سوچ کا بالکل اچھا اور گنوار شخص تھا۔

وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ نہ کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں تایا، تانی کے علاوہ دو چھوٹی بہنیں بھی تھیں۔

آمدنی کا واحد ذریعہ ایک رکشہ تھا جو تایا چلاتے تھے۔ طالب نے مجھ سے نوکری پر اصرار کیا تو میں نے گورنمنٹ جاب کے لیے اپلائی کر دیا لیکن وہ سب تو مجھے ایک دن بھی گھر بٹھانے کے روادار نہیں تھے۔ مجبوراً میں نے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی۔ شامہ گود میں آئی تو میں نے نوکری چھوڑی چاہی۔ مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا۔ نوکری تو مجھے کرنی ہی تھی۔ شامہ سال کی ہوئی تو مجھے گورنمنٹ جاب مل گئی۔

گھر سے اسکول کا راستہ ایک گھنٹے کا تھا۔ اپنا رکشہ ہونے کی بہت سہولت تھی۔ تایا، ہی مجھے لاتے، لے جاتے۔ شام چار بجے گھر پہنچتی تو بچی کا حال

”خبیث انسان! اتنی ہی ہمت کیسے ہوئی میری بہن سے ایسے بات کرنے کی۔“ منو آپا نے سچچ کے ان کے منہ پر پھنسا مارا۔

”مردود! تو کیا مجھے چھوڑے گا، میں ہی تجھ سے خلع لے لوں گی۔ تو اسی وقت ہمارے گھر سے نکل جا۔ بلاتی ہوں میں ابا اور زوہیر کو۔“

میں منو آپا کے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جاوید بھائی کو منو آپا سے اس بہادری اور جرأت کی امید نہیں تھی۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئے۔ منو آپا ان کے پیچھے نکلیں۔ ان کو ندیم کی فلم تھی۔ جاوید تو اسی وقت گھر سے نکل گئے۔ ان کی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی لیکن ابھی میں پوری طرح گھنٹھلا نہیں تھی کہ زوہیر کمرے میں چلا آیا۔ ہمیشہ کی طرح کسی کی نہ سننے والا، مشتاکار، مغلوب الغضب۔

وہ پاگل ہو گیا تھا۔ وہ ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔ وہ مجھ پر الزام لگا رہا تھا..... گھٹیا ترین الزام.....

”ارے مارا! ستین نکلی تو تو۔“ وہ کف اڑا رہا تھا۔

”بے غیرت بے حیا۔ اپنے بہنوئی کو بی۔۔۔۔۔“
”زوہیر! تم کو غلط فہمی ہوئی۔۔۔۔۔ اس میں اس کا کیا قصور؟“ منو آپا نے روکا مگر اس نے ہمیشہ کی طرح بات کا ایک حصہ سن کر فیصلہ کر لیا تھا۔

”بس اب کوئی ڈراما نہیں۔“

سچ میری روح اس کے الفاظ کے بھاری پتھروں تلے کچلی گئی تھی۔ وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ لہجے گھرانے کے وہ احسانات تنوار رہا تھا جو میں بھی بھولی ہی نہیں تھی۔ میں احسان فراموش نہیں تھی۔ اس نے کہا، میں اپنے ہی گھر میں سیندھ لگانے والا چور تھی۔ اس نے مجھے گالی دی..... بار بار دی.....

”ہاں بنا لیا دیوانہ پھر..... جاوید کو بنا لیا اپنا دیوانہ۔“ میں ڈٹ کر کھڑی ہوئی۔

اس نے مجھ پر تھوک دیا..... میں وہیں کھڑے کھڑے مر گئی..... رات کی سیاہی نے میری زندگی کے سارے رنگ نکل لیے تھے زوہیر کے حرام فعل

ڑیا دیتا۔ اس کا میلا جلیہ، لندے، فیدر۔ لندے کپڑے۔ وہ اس حال میں بھی واویلا نہ کرتی۔ میں نے اس کے رونے کی آواز بھی نہیں سنی۔ میرا سارا صبر اس میں ٹھٹھل ہو گیا تھا۔ اس کو نہلا دھلا کر دودھ پلانے تک سو بار تائی چکر لگا جائیں۔

”جلدی کرو۔ ٹیوشن کے بچے کب سے آئے بیٹھے ہیں۔“

باہر رجن میں چولہا رکھ کر کھانا پکاتے پکاتے بچوں کو پڑھائی۔ شامہ دو سال کی ہوئی تو میں نے میڈم سے بات کر کے اس کو ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ کم سے کم ہر دم انگی ہوئی سانس بجال ہوئی۔

میں نے اپنی موجودہ زندگی کا چھپی زندگی سے کبھی تقابلی جائزہ نہ لیا تھا۔ میرے محسوسات برف کی طرح سرد ہو چکے تھے۔ ایک اپنے وجود پر پڑا ہوا ٹھوک تھا جو دھوئے نہیں دھلتا تھا۔ اگر کسی روز کچھ گرد پڑی بھی محسوس ہوئی تو طالب تھاناں، اس کے طعنوں کا میں نے کبھی برا نہیں مانا۔ سچی بات وہ مجھے کبھی غلط لگا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جب اس نے مجھے اپنی ایک ساھی بچہ کی گاڑی پر گھر آنا دیکھ کر طلاق دے دی تب بھی مجھے لگا، اس نے ٹھیک ہی کیا۔ اس کا ہی حوصلہ تھا جو اس نے چار سال مجھے اپنے نام کی عزت دی۔ اگر وہ مجھ پر شک کرتا تھا تو جائز ہی کرتا تھا۔

بھلا کوئی لڑکی بے وجہ تو اپنی ماں کا گھر نہیں چھوڑتی ناں؟ میں اس کو وجہ بتاتی تو وہ ایک دن بھی مجھے اپنے گھر نہ رکھتا۔

☆☆☆

اب میں اکیلی نہیں تھی۔ میرے ساتھ میری بیٹی تھی۔ میرے پاس نوکری بھی۔ زندہ رہنا اگر آسان نہ تھا تو ویسا مشکل بھی نہیں تھا۔ کچھ تک دودھ کے بعد گرلز ہاسٹل میں کمرہ مل گیا۔ میری ساھی بچہ جرنے بہت مدد کی۔ ایک نے تو کمرہ ملنے تک اپنے گھر رکھا۔ شامہ اب اسکول جاتی تھی۔ میں نے دوبارہ پڑھائی شروع کر دی۔ تھیں میں ماسٹرز کرتا تھا مجھے۔ اسکول

لے میرے پیریزز آئیڈل سسٹم کر دیے تھے۔ بھائیوں کی چھٹیوں میں سارا ہاسٹل بھائیں ہو جاتی تو ہم ماں بیٹی سارا دن کی مصروفیت ایجاد کر لیتیں۔ میں دو وقت آکٹڈی میں پڑھانا شروع کر دیتی اور شامہ میرے ساتھ ساتھ رہتی۔ میرا ماسٹر زمل ہو گیا۔ مجھے کالج میں لکچرر شب مل گئی۔ ایک ایک دن مکن کر گزارتے بھی بارہ سال گزر گئے۔ مجھے کالج میں پرنسپل کا عہدہ مل گیا۔ گھر بھی ملا اور گاڑی بھی۔ ہمارا گھر..... میرا اور شامہ کا گھر..... جس میں میری شامہ اڑتی پھرتی تھی کی طرح.....

میشک کے بعد وہ میرے ہی کالج سے ایف ایس سی کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ اسی کی کلاس میں سارہ نے بھی داخلہ لیا۔ سارہ منوآ پا کی بیٹی۔ میں نے تو داخلہ فارم سے ہی پہچان لیا تھا۔ کالج بوی فارم میں دو جوئیاں کیے ہوئے سارہ جاوید۔ یعنی بس گیا منوآ پا کا گھر۔

اور ایک دن منوآ پا سارہ کو لے کر گھر تک آ پہنچی تھیں۔ جاوید کو فاج ہو گیا تھا۔ اور منوآ پانے اسے معاف کر دیا تھا۔ ان کے پاس اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔۔۔ خالہ جان اور خالو جان نہ رہے تھے۔ منوآ پا کے غم کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ان کا میکہ ختم ہو گیا تھا۔

لیکن میں! میرا نہ میکہ آباد تھا..... نہ سرال..... منوآ پا مجھے دیکھ دیکھ کے روتی رہیں۔ شامہ سے مل کر تو بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے بہت چاہا کہ میں ان کے گھر بھی جاؤں۔ لیکن میں نہ گئی۔ پھر ان لوگوں نے بھی اصرار نہ کیا۔ البتہ منوآ پا اور سارہ آ جاتے تھے کبھی کبھار ندیم کے ساتھ۔

☆☆☆

”یہ میری بیٹیاں ہیں کیتی۔“ ایک دن وہ دو پریوں کو ساتھ لے آیا۔

”یہ کہاں تھیں اب تک؟“ میں سخت حیران ہوئی۔ وہ ہزار رکھائی کے باوجود اکثر ہی آ جاتا تھا۔

میں بنا کوئی جواب دیے اٹھ کر چکن میں چلی گئی اس کے سیاہ پڑتے چہرے کو دیکھے بغیر۔ وہ بچپوں کو لے کر چلا گیا اور پھر نہیں آیا۔

☆☆☆

"گزرا وقت واپس نہیں آ سکتا کیتی! لیکن اسے معاف کر دے۔ وہ بہت شرمندہ ہے۔ دیکھ تیرا کیا بگڑا ہے ابھی میری گڑیا۔"

"منو! یا! آپ حقیقت جانتی ہیں۔ اب آپ کو اپنا بھائی نظر آ رہا ہے۔ آخر کیوں؟"

"مجھے معاف کر دے کیتی! جاوید کو تو سزا مل گئی۔ زوہیر کو بھی زندگی نے سبق سکھا دیا۔"

"دنیا بھری بڑی ہے لڑکیوں، عورتوں سے منو! یا۔ میں ایک طلاق یافتہ عورت۔"

"وہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"منو! یا! آپ آئندہ اس تعلق سے کوئی بات نہیں کر سکیں گی۔ آپ اس شخص کا نام بھی میرے گھر میں نہیں لیں گی۔"

میں نے منو! یا کے سامنے یہ لہجہ استعمال کرنے کا بھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"ارے اتنی عمر کی لڑکیاں اب شادیاں کرتی ہیں۔ کیسے گزرو گی ساری زندگی؟"

"زندگی بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ اور گزرے گی منو! یا!"

"تہا؟؟؟"

"میری بیٹی ہے منو! یا!"

"ارے بیٹی تو میری ہے۔ میں آج لے جاؤں گی اپنے ندیم کے لیے۔ تو اپنا سوچ میری گڑیا۔"

"ندیم کے لیے۔ منو! یا نے یہ سوچا بھی کیسے؟؟؟"

میں نے صاف انکار کر دیا۔

"بس آپ۔" میں نے بات ختم کر دی۔ منو! یا نے اپنی طرف سے مجھے سمجھانے کی بھرپور کوشش کی۔ انہیں صرف اپنا بھائی نظر آ رہا تھا لیکن میں اب وہ معصوم لڑکی نہیں رہی تھی جو بلاوجہ قربانی کا

بکرا بن جاتی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ

میں اب بیٹیاں! "یہ منو! یا کے پاس۔" "اوہ! تو منو! یا کو سب خبر تھی۔ اور یہ جھوٹ کہتا تھا کہ ہومل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

ایک دم سے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ بچیاں میرے سامنے کھڑی تھیں۔

"کتنی پیاری ہیں۔ میں نے ان پھول جیسی بچپوں کو پیار کیا۔"

"آئی! ہم کل بھی آ جائیں۔" ان کو انکار کرنا بہت مشکل تھا۔

"بیٹے! ہم تو کل کالج میں ہوں گے۔"

"آپ کی چھٹی کے بعد۔" ان کا اصرار بے حد معصومانہ تھا۔

"اوکے بیٹا۔" میرے کہتے ہی وہ شامہ سے لپٹ گئیں۔

شامہ کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میری رشتوں کو ترسی ہوئی بیٹی۔ ان کا آنا جانا غیر محسوس طریق پر بڑھ رہا تھا۔ یوں تو مجھے زوہیر سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زندگی اس کو بہت سبق دے چکی تھی۔ ستر سال کم نہیں ہوتے کسی کو سیدھا کرنے کے لیے۔ لیکن میں کچھ بھولی نہیں تھی۔ اس کا آنا مجھے الجھا دیتا تھا۔

"شامہ بہت معصوم ہے بالکل تمہاری طرح۔"

وہ رکا پھر بولا۔

"یوں لگتا ہے جیسے درمیان کا وقت نکل گیا ہے۔ میں اسی لپٹی سے دوبارہ مل رہا ہوں۔"

جس روز اس نے یہ کہا میں نے اسے آنے سے منع کر دیا۔

"زوہیر! آئندہ تم میرے گھر نہیں آؤ گے۔"

نہ تم نہ تمہاری بچیاں۔

"یعنی تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ ٹھیک ہے۔ میرا قصور ہی ایسا تھا۔ مجھ ملعون کو معافی نہیں ملنی چاہیے۔"

"میں سمجھتا تھا کہ میری بچپوں کو مارا مل جائے گی۔ خیر تمہارا شکریہ، اتنے دن برداشت کیا۔"

میں اس شخص کا نام بھی سننا نہیں چاہتی

☆☆☆

اچانک وہ ہو گیا جس کی توقع نہیں تھی۔ جاوید بھائی کی ناگہانی وفات نے صورت حال بالکل بدل دی۔ موقع ایسا تھا کہ میں بھی جانے سے رک نہ سکی۔ بچپاں لوگوں کے جہوم میں سخت گھبراہٹ تھیں۔ انہیں اس ماحول کی عادت نہیں تھی۔ میں نے ان کو شامہ کے ساتھ گھر بھجوا دیا۔ منوآ یا کی عدت تک میں گا ہے بگا ہے ان کی طرف جاتی رہی۔ رشتہ داروں کی بھیڑ دیکھتی تو بچپوں کو ساتھ لے آتی۔ شامہ کا ایف ایس سی کپلیٹ ہو چکا تھا۔ وہ جو ہمیشہ چھٹیوں میں پریشان ہوتی، اب بچپوں کی وجہ سے مگن تھی۔ کئی کئی دن وہ ہماری طرف رہ جاتیں۔ تینوں کو کھیلا دیکھ کر مجھے بھی اچھا لگتا۔ بھی گھبراہٹ پک اینڈ ڈراپ کے لیے زوہیر بھی آ جاتا۔ بچپوں کو لے کر دروازے سے ہی چلا جاتا۔ اس نے دونوں کا اسکول میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ سوتی کو بخار آ رہا تھا۔ وہ سخت چڑچڑی ہو رہی تھی۔ منوآ پا کا فون آیا کہ شامہ کو بھیج دوں۔ سوتی بہت رورہی ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بچی کی بیماری کا سن کر انکار کرنا مناسب لگا۔

”شامہ بیٹا! چلو، ذرا سوتی کا ہاتھ کر آئیں۔“ میں نے آئینے میں اپنی ساری کا چارزہ لیتے ہوئے کہا۔ سوتی کو تو جیسے شامہ کی جدائی کا بخار تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ دودھ بھی پی لیا۔ دونوں شامہ کے ساتھ کارٹونز میں مگن ہو گئیں تو میں منوآ پا کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں چلی آئی۔ ان کے پاس اب آنسوؤں کے سوا کوئی بات نہیں تھی۔ سارہ بچن میں مصروف تھی۔ اس کے چچا شام میں آ رہے تھے۔ زوہیر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا۔ کوئی بزنس شروع کرنا چاہتا تھا۔ آیا تفصیل بتانے لگیں۔ ”نجانے اس لڑکے کی قسمت میں کیا پھیر ہے۔“ ان کی تان اسی بات پر ٹوٹی۔

”ان بچپوں کو ماں چاہیے کیتی! زوہیر کچھ

بھی کر لے، ماں ہمیں بن سکتا۔ تم نے تو بہت چھوٹی عمر میں اپنی ماں کو کھو یا ہے کیتی! کیا تم بھی یہ بات سمجھ نہیں سکتیں؟ تم نے شامہ کے ساتھ ان کو کھیلنے دیکھا ہے نا!“ وہ کہتی جا رہی تھیں۔ میں خاموش سنتی رہی۔

”اپنی وجہ سے شامہ کو کیوں محروم کرتی ہو؟“ دل اس جملے میں اٹک گیا تھا۔

”آ یا! اب اجازت دیجئے، کافی دیر ہو گئی!“ میں شامہ کو لینے کے لیے بچپوں کے کمرے کی طرف آئی۔

لاؤنج میں موجود آئینے میں مجھے تینوں بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔ زوہیر بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ نجانے کس وقت کا آیا ہوا تھا۔ چاروں ہلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ زوہیر نے مانو کو گود میں بٹھایا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ پھیلا کر سوتی اور شامہ کے گرد پھیلا ہوا تھا۔ جب وہ ہنستے ہوئے پتا اس کی انگلیاں شامہ کے کندھے سے گزرتیں۔ میری محض حس نے الارم بجایا۔

”شامہ شامہ!“ میری آواز ایسی بلند تھی کہ شامہ، مانو اور سوتی ٹام اینڈ جیری بھول کر کھڑی ہو گئیں۔

”چلیں شامہ بیٹا!“ میں نے زوہیر کو نظر انداز کر کے شامہ کو پکارا۔ کچھ تعلق بھی نہیں بنا ہے نہیں جانے چاہیں۔ میں نے گاڑی کو گھر کی طرف موڑتے ہوئے سوچا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔

لیکن رات بھر آپا کی باتوں نے سونے نہ دیا کہ کیا واقعی شامہ کو باپ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اب جبکہ وہ خود شادی کے قابل ہے۔ کیا زوہیر میں شامہ کے باپ کا کردار نبھانے کی صلاحیت ہے؟

یہ وہی زوہیر ہے جس نے محض اوجھی بات سن کر مجھے دار پر لٹکا دیا تھا۔ اور آج کا وہ منظر۔۔۔ شامہ کے کندھے سے مس ہوتی۔ انگلیاں ڈھن میں پیوست تھیں۔

”اپنی وجہ سے اسے کیوں محروم کرتی ہو؟“ دل

اس جملے میں ایک گیا تھا۔ عجیب الجھن تھی جس کا کوئی حل نہیں سوچ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے منوآ پا کو فون کیا تو زوہیر بھاگا چلا آیا۔ شامہ نے مجھے ڈرائنگ روم میں بھیجے وقت میرا چشمہ اتار لیا۔

”اب ٹھیک ہے۔“ وہ میرا گال چوم کر بولی۔
☆☆☆

”مجھے پتا تھا کینے تم مان جاؤ گی۔ تم بہت عظیم ہو۔“ وہ کھلکھلا رہا تھا۔
”سنو، اب شامہ کو خود سمجھا دینا کہ آگے داخلہ نہ لے۔ چھوڑے اب یہ ڈاکٹری کا چکر۔ مجھے کون سا بیوی کی کمائی کھانی ہے۔ بہت پیسہ جمع ہے میرے پاس۔“

”لیکن شادی سے شامہ کی پڑھائی کا کیا تعلق؟“ میں حیران ہوئی۔
”تو کیا کالج سے دلہن بن کر آنا ضروری ہے۔“
”ارے تو میں چھٹی لے لوں گی۔ شامہ کو پڑھائی چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔“

”تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے کہیتی! دلہن کالج جائے گی اور دلہن کی اماں چھٹی لے کر بیٹھیں گی۔ یعنی کہ...“ وہ ہنسا، مردودی بھئی۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم سادگی سے بارات لے آؤ۔“ یہ نصیحت چکا دینا اب بہت ہی ضروری تھا۔
☆☆☆

میری زندگی میں موجود کن عوامل نے مجھے کیا نقصان پہنچایا۔ کس کا کتنا قصور تھا؟؟ کس کا زیادہ تھا کس کا کم؟؟ میں نے ان لا حاصل بحثوں پر کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ مجھے آج پر، ابھی پر سوچنے کی عادت تھی۔ میں اپنے فرض میں مگن تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو کبھی پھڑ جانے والوں کی سیاہ روٹی نہیں دکھائی تھی۔ میں نے اس کو محبت سے تعمیر کیا تھا۔ محبت کرنے والا انسان دوست وجود بنانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے زوہیر کو معاف کر دینے پر اسکا پی میری بیٹی بہت سی حقیقتوں سے واقف نہیں تھی۔ ضروری

منوآ پا واقعی سچ کہہ رہی تھیں۔ مجھے باپ کی چھاؤں نہیں ملی تھی۔ اسی لیے تڑپ تڑپ کے مرد رشتہ داروں کو اپنائی تھی۔ خالو اباطے تو وہ، جاوید بھائی طے تو وہ۔ طالب کو بھی شاید اس لئے ہی میں نے بھی قصور وار نہیں ٹھہرایا۔ میں اپنی شامہ کو محروم نہیں رکھوں گی۔ میں نے شامہ کو آواز دی۔
”بیٹا! ناشتہ کر لیا؟“ میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔
”آپ کے بغیر بھی کیا ہے امی؟“

وہ صبح کبہ رہی تھی وہ تو مجھ سے پوچھے بنا ایک قدم نہیں اٹھاتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سانس بھی مجھ سے پوچھ کر لیتی۔ میں نے اس کو لپٹا لیا۔ آنسو نہ جانے کہاں سے چلے آئے ڈھیروں۔
”امی کیا ہوا ہے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”امی! آپ ان کی بات مان لیں۔“ اس نے اکتے ہوئے کہا اور مجھے حیران کر دیا۔

”آپ رات بھر یہیں بیٹھی رہی ہیں۔ امی! آپ بہت پریشان ہیں؟“ اس نے میرے پاس بیٹھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

”امی اتنی دیر نہ ہو جائے کہ انتظار کرنے والا مایوس ہو جائے۔ دستک دینے والا ہاتھ تھک جائے۔

آپ ہی تو کہتی ہیں امی کہ معاف کر دینا بہترین بدلہ ہے جس سے دونوں فریق فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میری ماں کوئی عام عورت نہیں ہے۔ وہ کیسیا کر ہے۔ وہ تراشنے کا ہنر جانتی ہے ڈھالنے کا ہنر۔ اس کی انگلیاں اذہان پر دستک دیتی ہیں اور ان کی سمتیں متعین کر لیتی ہیں۔ آپ تو ماں ہیں ہزاروں بیٹیوں کی امی تو سوسی اور مونا کیوں نہیں؟“ اس کے لہجے میں فخر تھا۔

”آپ ان کی بات مان لیں امی۔۔۔“ اس نے میرے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔ اتنی بڑی ہو گئی میری بیٹی مجھ کو سمجھانے لگی

فیصلہ ہو گیا تھا..... یہ فیصلہ ایک عورت کا

نہ ہو۔ اس نے کہا ہے کہ صرف دو چار دوستوں کو لے کر میں آ جاؤں۔ عورتوں کو منع کر دیا ہے اس نے۔
 ”لو عورتوں کو کیوں منع کیا۔ ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔ میں ابھی فون کرنی ہوں۔“
 ”رہنے دیں آپا! رخصت ہو کر تو دولہن نے یہیں آتا ہے۔ پھر کر لینا اپنے سارے شوق پورے خوب دھوم سے کریں گے ولیمہ۔ آپ جس کو چاہیں بلا میں۔ کارڈ کا تو وقت نہیں۔ آپ فون کر دیں سب رشتہ داروں کو۔“ وہ جھوم رہا تھا۔

☆☆☆

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا ناں ارسل بھائی۔“
 میں گھبرا رہی تھی۔

”بے فکر ہو۔ یوں تو کوئی مسئلہ ہوگا ہی نہیں لیکن تمہاری نسل کے لیے بتا رہا ہوں میرے بے شمار جوان وردی میں بھی اور بنا وردی کے بھی بارات میں شامل ہیں۔“

نکاح ہو چکا تھا۔ میں نے اندر آ کر دولہن بنی شامہ کو پیار کیا۔ میری کولیگز اور اس کی سہیلیوں نے خوب رونق لگائی ہوئی تھی۔

جب زوہیر اپنے دوستوں کے ساتھ ہار پھول پہنے ہوئے پہنچا اور اس نے آج کی طرف بڑھنا چاہا تو راستے میں ہی وردی والے جوانوں نے دھڑکے ایک سائڈ پر بٹھا دیا۔

”کیوں؟ کیا؟“ پوچھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی اسے۔ فنکشن کے دوران نہ ان کو باہر نکلنے دیا گیا نہ ہی فون کرنے دیا گیا۔ وہ کھسکا نا بیٹھا گھبرا نو چتا رہا۔

بینڈ والوں نے انتہائی خوبصورت دھن چھیڑ دی تھی۔ میں نے اپنی بری کا ہاتھ اظہر کے ہاتھ میں دیا۔ اسے کار میں بٹھا کر میں پٹی تو ارسل بھائی کے جوان بڑی عزت سے زوہیر کو ہال سے باہر چھوڑنے جا رہے تھے۔ اس کے بانی ساسی تو پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ اللہ نے میری لاج رکھ لی تھی۔ زوہیر جیسے خود غرض مردوں کے سامنے میں سر بلند کھڑی تھی۔

نہیں تھا کہ وہ بھی کیتی کی طرح نقصان اٹھائی۔ اس لیے اس کو اب ہر بات کا علم ہو جانا بہت ضروری تھا۔ سو میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ بتا دیا کہ اس کے متعلق کیا خیالات تھے اس مردود کے، شامہ کا تو غصے سے برا حال تھا۔
 ”امی! اس مرد کو آئینہ دکھانا بہت ضروری ہے۔ کیا سمجھ کر وہ رشتہ مانگنے چلا آیا ہے؟ امی اس کو معاف نہیں کرنا۔ ہرگز بھی نہیں۔“
 اس کی تو حالت بدل گئی تھی۔ بار بار مجھ سے لپٹ کر مجھے پیار کرتی میری بیٹی۔

☆☆☆

ارسل بھائی کب سے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں اظہر سے نکاح کر کے شامہ کو اس کے ساتھ بھیج دوں۔ وہاں چاہے تو وہ آگے بڑھ لے، چاہے تو آرام سے گھر بیٹھے۔ اظہر کی نوکری بہت اچھی تھی۔ وہ اپنا گھر بھی خرید چکا تھا۔ شامہ کا ذہن تیار کرتے ہوئے ایک تذبذب تھا اتنی چھوٹی بیٹی کی شادی؟؟ لیکن زوہیر کے مذموم ارادوں نے مجھے سمجھا دیا کہ سب سے بہتر اور محفوظ راستہ اس کی شادی ہی تھا۔

ارسل بھائی ہمارے علاقے کے ایس پی تھے۔ اور صوفیہ بھابھی اسکول میں میری کولیگ رہ چکی تھیں۔ بہت سلحھے ہوئے محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اظہر پڑھائی مکمل کرنے کے بعد فرانس میں جا پ کر رہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو ساری بات بتا دی تھی۔ نئے رشتوں کی بنیاد صاف اور شفاف بنیادوں پر رکھی جانی ضروری تھی۔

☆☆☆

”میں نہ کہتا تھا منو آ یا کہ کیتی مجھے انکار کر ہی نہیں سکتی۔“ زوہیر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔
 ”اچھا! مجھے تو اس نے صاف منع کر دیا تھا۔“
 ”ماقتی ہیں ناں اپنے بھائی نو پھر۔ اس نے تو مجھے شادی کی تاریخ بھی دے دی۔ آپ بس اب بارات کی تیاریاں کریں۔ زیادہ ہی چوڑی بارات

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بال اکڑاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جری بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تجویزی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی فریڈا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھی کر سکتے ہیں اور اس سے منگوائیں، ہر جہزی سے منگوانے والے مٹی آؤ اس حساب سے سمجھائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز ہسٹریٹ، پیکٹور ہاؤس، جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگز ہسٹریٹ، پیکٹور ہاؤس، جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

یہ زندگی امتحانات سے معنون ہے۔۔۔۔۔
ہر کسی کا امتحان الگ۔۔۔ ہر کسی کی آزمائش جدا۔
نتیجہ اس کے ہاتھ جو مل بھی دیکھتا ہے۔۔
جس کی نظر دلوں کے ہاتھ تک۔۔۔
امتحان زوہیر کا بھی تھا، طالب کا بھی، جاوید کا بھی اور ریاض احمد کا بھی۔۔۔
ساری راہیں کھلی تھیں ان کے سامنے۔
ریاض احمد کی بیوی بیمار تھی۔۔۔ دوسری شادی کا جائز راستہ اپنا لیا گیا۔ کیا ہی اچھا راستہ تھا۔
لیکن بیمار بیوی، کمسن بچی کو چھوڑ دینا۔۔۔
کہاں کا انصاف تھا؟؟
دوسرا امتحان جب بیٹی نے پناہ طلب کی۔۔۔
منا دیکھے بھالے بیاہ دیا اس کو۔ بوجھ تو اتر گیا۔۔۔
جان تو چھوٹ گئی۔۔۔ مگر!!
ایک امتحان جاوید کا تھا۔ اس نے اسفل راستہ اختیار کیا۔۔۔ افسوس اپنی راہ کھوئی کر لی۔۔۔
زوہیر پر تو دو لفظ بھی ضائع کرنے کو جی نہ چاہا۔۔۔
ایک امتحان طالب کا بھی تھا۔۔۔ بیوی کی کمائی کو حق جان کر کھانے والا۔۔۔ ہر بل اس سے اس کے کردار کی گواہی مانگتا۔۔۔
پھر اس کے ماتھے پر طلاق کا جھومر سجا دینے والا۔۔۔ قابل رحم مرد۔۔۔
امتحان صرف مردوں کا ہی نصیب نہیں۔۔۔
گیتی آرا کو دوسروں کے گھر رہنا پڑا دامن بچا کے۔۔۔ رہ گئی۔۔۔
تنہا جینا پڑا۔۔۔ جی گئی۔۔۔
مرد بننا پڑا۔۔۔ بن گئی۔۔۔
اسے زندگی کی تمام دھوپ چھاؤں اپنے تو اس وجود پر اٹھانی پڑی۔۔۔ اٹھانی۔
قطرہ قطرہ سکتی۔۔۔ کندن بن گئی۔
زندگی تو گزر رہی۔۔۔ ہر طور گزر رہی جانی۔
فی۔۔۔ اس کی بھی اور ان کی بھی!!



ہے۔ نفع قلیل، خسارہ طویل، خوشی کم، آنسو بیشتر۔
میری فلسفی ماں اپنا گمان اور دوبارہ سے ساری پیاز میری
گود میں گرا کے چلی گئیں۔

ان میں لکھنے پڑھنے کے جراثیم وافر مقدار تھے اور
صفائی پسند دادی اور ابا کو ان جراثیموں سے الرجی۔
میں نے امی کو اپنے خواب، کھانوں میں یکاتے دکھا دیا
اور ان کے سارے گن تو مرج مسالوں کے ڈبوں میں
صاف دکھائی دیتے تھے۔ یہ میرا روز کا احتجاج تھا جس پر
دادی جان فرماتیں کہ گھر کے چھوٹے بچے چھوٹے کام
ہی کرتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے، پیاز کاٹنا کوئی چھوٹا
کام ہے بھلا؟ خون پسینہ نہ سہی آنسو تو بہانا ہی پڑتے
ہیں۔

دادی اور آپنی کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ یہ میری
بے سبکی چلتی ہوئی زبان تھی جو دادی کو لاناں اور آپنی کو
جھانڈا اٹھانے پر مجبور کر دیتی۔ میں بھی کیا کرتی، وہ روز
بروز نصیحتوں کی پیڑی پر چڑھتی تھیں تو میں بھی بد تمیزی پر
اتر آتی۔ بس یہ سین بھی کچھ دیر ہی چلتا۔ میرا غصہ
ٹھنڈا ہوتا تو ندامت کے ابل آئے لگتے۔ تب یہ پیاز
ہوتی اور افسوس کے آنسو کیونکہ معافی مانگنا تو میری
سرشت میں تھا ہی نہیں۔

وقت بدلا تو سمجھ میں آیا کہ ابھی تو پیاز کی ایک پرت
اتری ہے۔ آپنی اور دادی دونوں کا ٹھکانہ بدل چکا تھا۔
آپنی کا شوہر کبھی کبھی ملے دیتا اور دادی سے ملاقات کی تو

کوئی سبیل ہی نہیں نکل سکتی تھی۔ امی کالی بی اب
زیادہ رہنے لگا تھا اور ابو کے اعتراضات کم۔ کونے میں
رکھی بوڑھی سی لاناں، میز پر بجتی اگلوٹی سلاوا کی پلیٹ،
تھا کمرے کا سناٹا اور سر پر پڑتے ڈھیروں کام، اکثر دادی
کی کمی اور آپنی کی اہمیت جتانے لگے تھے۔

مجھے رونا پسند تھا۔ اسے میں مضبوط شخصیت کی
توہین سمجھتی تھی۔ بس جب بھی دل بھر آتا میں پیاز
سے ٹوکری بھر لیتی۔

ایف ایس سی کارلٹ آیا اور میں فیل ہو گئی۔ ابو کا
سر پاپہ امی کے سپنے اور میرے بوئے بول میں نے ہر



حمیرا فضا

سارے سارے

”آپ سارے صاف ستھرے کام اپنے اور آپنی
کے لیے رکھ لیتی ہیں اور میری جھولی میں گراتی ہیں
سب کٹوے کام۔“ میں نے روتے ہوئے لال پیاز
فرش پر پٹی۔

”زہر کو زہر مارتا ہے، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، تم جیکھی
ہو اس لیے تم سے ایسے کام لیتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں
یہ پیاز تمہاری ضد اور نافرمانی کی ساری کڑواہٹ نچوڑ
لے۔ پیاز کھانے کا لازمی جز ہے۔ اس کی افادیت تو تم
سمجھتی ہی ہوگی۔ تمہاری دادی اور ابو کو پیاز بڑی
مرغوب ہے۔ کھانے کی میز سے دو پلیٹیں سلاوا کی کبھی
غیر حاضر نہیں ہوئیں۔ ان کی پرت در پرت میں زندگی

جذرا کام پاز کی آڑ میں ہوا۔

تھے شفقت کے، سرزنش کے، مصلحت کے۔
”ہوئے آپ سے دل کا تعلق بھلایا اور آپ کی
ساری خوب صورت کمائیاں بے معنی کر دیں، مگر آپ
کی رسائی تو دل کی دنیا تک ہے جہاں جذبات کے
اصول چلتے ہیں۔ جہاں محبت کا راج ہوتا ہے۔ آپ تو
اتنی حساس ہیں ای کی کہ فرضی کمائیوں کے کرداروں کو
بھی جدا نہیں کر سکتیں پھر یہ تو میری اصل کمائی ہے۔“
دلائل کے ہتھیار کے سامنے میں بھی سینہ تن کر
کھڑی ہو گئی۔

”مجھے محبت سے نہیں غلط محبت سے خوف آتا
ہے۔ میں لکھ نہ سکی مگر تقدیر نے مجھے بڑھنے پر لگا دیا۔
ان آنکھوں نے خواب مار کر چہرہ شناسی سیکھی ہے۔
اس لڑکے کے چہرے پر وفا کا رنگ نہیں ہے بیٹا۔ وہ
اور ان کے آنسو ایک ساتھ بول رہے تھے۔
”یا تو آپ میری محبت سے نظریں چڑھیں یا پھر
رسوائی کا سامنا کریں۔“ میں نے بھی لحاظ کا آخری پردہ
گر کر انہیں تنہا چھوڑ دیا تھا۔



آج اس کے والدین کو آنا تھا۔ سب ناخوش تھے مگر
میرے ساتھ تھے۔ آج کی دعوت کی پیاز بھی میٹھی
لگی۔ باریک باریک پیاز کاٹتے ہوئے گہری خوشیوں کا
احساس دل میں اتر رہا تھا۔ دسپر کا وعدہ تھا شام تک دیر
کا گمان ہوا، رات تک مجبوری کا اندیشہ گزرا اور اگلی
صبح تک یقین کا اندھیرا چھا گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا
ہے۔

”صحن وقت پر والدین مکر گئے کچھ نہیں
کر سکتا۔“ بس یہ جملہ گونجا اور سارے رابطے منقطع
ہو گئے۔

میں دلدن شرمندگی کے مارے کمرے میں بند رہی،
مکرمی ابو خاموشی کے اس خول میں قید ہو چکے تھے
جہاں سے نکلنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔

زندگی پیاز کی طرح لگی اور پیاز کی یہ برت بڑی
حیکمی تھی۔ آنکھ روٹی تو جلن دل کو شینگی ہوئی روح کو

”کوئی خواب اگر شکست کھائے تو مر نہیں جاتا، نہ
کئی شے ناکام ہو کر انتقام پذیر ہو جاتی ہے۔ جہاں
سے خواب ٹوٹتے ہیں وہیں سے امید انہیں پھر سے جوڑ
سکتی ہے۔ جب بھی نہیں احساس ہو کہ غم غلط سمت
لگ چلا آئی ہو تب یقین رکھو کہ اس پیاس سے ہی کوئی
لحیک رستہ بھی نکلتا ہو گا۔ تم ذرا نادان ہو اور کچھ خود
رستہ بھی۔ تم درست سواری میں سوار ہو میں
لوہاں خریدنے صبح دکان پر بھی اتریں، مگر تمہارے
رستے آزاد تھے اور سارے سکے کھولے۔ اب کی بار
لحیک رستوں سے گزرنا اور محنت کے سکے ساتھ لے
کر ماننا بھولنا۔“ وہ صرف ایک عظیم مل نہ تھیں بلکہ
ایک چھپی ہوئی کمال کی لکھاری بھی تھیں۔ یہ نامکمل تھا
کہ وہ پیاز اور ناکالی کے آنسوؤں کا فرق نہ پہچان
تیں۔

میں اکثر اشیاء سے کہتی کہ پھر سے لکھنا شروع کر دیں
ب بھلی مسکراہٹ کا ایک ہی جواب ہوتا۔
”پہلے جوش تھا۔ تنہا بھی تھی، مگر اجازت نہ تھی۔
اب آزادی ہے، خواہش بھی ہے، لیکن ہمت نہیں
ہی، جیتے جاگتے کرداروں نے اتنا تھکا دیا ہے کہ اب
م سے فرضی کرداروں کے غم نہیں اٹھائے جائیں
گے۔“

یاسیت کی میسا کھیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں امید کے
مارے سامنے بھی ہوں تو نظر نہیں آتے۔ امی کا حال
میں کچھ ایسا ہی تھا۔ کمائیاں ان سے بولتی رہتی تھیں،
رانہوں نے کان بند کر لیے تھے۔

پھر مجھ سے وہ ہو گیا جو میری اپنی شان کے بھی
اف تھا۔ میرے اڑیل دل میں پر بھائی کی شمع روشن
ہوئی تھی کہ ارد گرد محبت کا روانہ کھونٹے لگا۔ محبت
الف بے اتنی بھلی لگی کہ ڈاکٹری کا خواب خود ہی
پے رہ گیا۔ وادی ہو تیں تو لاٹھی اٹھا لیتیں اور آبی
میں تو بھاؤ۔ ابو کو جانے صدمہ تھا یا غصہ، وہ بالکل
چپ ہو گئے، مکرمی نے سارے ہتھیار اٹھائے

میں نے گزرے ہی تھے کہ ایک دن ساس نے کہا۔
 ”بسو! باقی کام تم سنبھال لو۔ کچن میں بس اتنا ہی
 لسن اور کچھیل کر پاز کاٹ دیا کرو اب تمہارے
 ہاتھ کاڑا لقمہ کسی کو نہ بھائے تو مجھے ہی کھانا ہو گا۔“
 میں جس کام سے چرتی تھی، بھاگتی تھی وہی زندگی
 کے مشابہ تھا۔ وہی ایک بار پھر مجھے سو نہ دیا گیا۔



میں آج بہت خوش تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار
 آپنی ملنے آئی تھیں۔
 ”تم خوش ہوئیں؟ سسرال والے کیسے ہیں؟ زیا
 کام تو نہیں کراتے؟“ وہ شرم سے پیتے ہوئے سوال
 کرنے لگیں۔

”بہت خوش ہوں آپنی! سب بہت خیال کرے
 والے، بہت عزت کرنے والے ہیں اور کام تو آہ
 کر داتی تھیں مجھ سے“ اور تو کوئی کام ہی نہیں۔“
 نے بھی ہنستے ہوئے دو سزا گلاس ہونٹوں سے لگا کر دل
 ٹھنڈک پہنچائی۔

”ارے واہ! اور شوہر کیسا ہے تمہارا؟“ وہ چہ
 ہوئے پھر بولیں۔

”دن کی تعریف میں کیا کیا کہوں اب“ یوں سمجھیے
 کہ رانیوں والے ناز و انداز ہیں میرے۔ ہر خواہش
 پوری کرتے ہیں میری۔ گھر پر بھی میری بادشاہت
 ان پر بھی میری حکمرانی۔

آپ نے بھی کن باتوں میں لگا دیا ہے مجھے،
 جا کر کھانا بنانے میں امی جی کی مدد کرتی ہوں۔ اس
 دنوں بعد تو میرا کوئی اپنا آیا ہے۔ آپ کی آؤ بھگت
 میرے سسرال والے کوئی کمی نہ چھوڑیں گے۔“ ان
 خوش ہوتا چھوڑ کر میں کچن کی طرف بھاگی۔

برسوں کے ضبط نے ہمارا دل بھی۔ میں نے جلد
 سے پاز کی نوکری اٹھالی۔ وہ سارے جھوٹ جوس نہ
 بولے تھے وہ آنکھوں سے بس چھلکنے ہی والے تھے۔



جلانے پہنچ جاتی۔ یہ تو چھپ چھپ کر رونا تھا پھر وہ دن
 آیا جب میں سب کے سامنے روتی۔ بے دھڑک، بے
 خوف، سچ و پکار کے ساتھ۔ محبت سے سمجھانے والی
 امی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ چھوٹا گھرا تا بڑا ہو گیا تھا
 اور بڑا دل اتنا خالی۔ سارے بلب جلانے پر بھی اتنی
 روشنی نہ ہوتی کہ من کا اندھیرا چھٹ سکتا۔ جیتے جی ابو
 نے امی کی کم ہی مانی، مگر اب وفا خوب نبھائی۔ دو تین ماہ
 میرا ساتھ دیا پھر وہ بھی ان کے پاس چلے گئے۔

ماموں نے سر پر ہاتھ رکھ دیا پر دل پہ مہم کون
 رکھتا۔ ماموں کے گھر میں بہت سارے افراد تھے مگر اپنا
 کوئی نہ تھا۔ سب کے ذمے ان کے من پسند کام تھے
 اور میرے ذمے بکھری چیزیں سمیٹنا، جھاڑ پونچھ کرنا،
 سب کے حکم پر دوڑنا اور پاز کاٹنا تھا۔ روزانہ بہت زیادہ
 کھانا بنتا اور ڈھیروں پاز نکلتی۔ ایک کاتنی تو داوی کی
 نصیب تھیں یاد آئیں۔ دوسری کاتنی تو آپنی کی نوک
 جھونکے۔ تیسری کاتنی تو امی کا پیار لراتا۔ چوتھی کاتنی
 تو ابو کی جھڑکیاں۔

بس کاتنی جاتی اور روتی جاتی۔
 پاز زندگی بھی اور کس قدر غنیمت تھی۔ اپنی
 کڑواہٹ میں میرے آنسو پی رہی تھی اور میرا بھرم
 رکھ رہی تھی۔



حکومت اپنوں پر چلتی ہے۔ کسی کے ماتحت زندگی
 میں بس غلامی ہی ہوتی ہے۔ صبح، دوپہر، شام وہی ایک

جیسے کام تھے۔ زندگی گول گول گھوم رہی تھی اور گول
 گول نکلتی پاز میں میری ضد اور بد تمیزیاں جانے
 کب کی کٹ چکی تھیں۔ جو مجھے پہلے نہیں جانتا تھا وہ
 اب دیکھتا تو اسے میں فرما رہی ہوتی۔ ایک ایک
 کر کے ماموں کی پانچ بیٹیاں رخصت ہوئیں تو میری
 بھی باری آگئی۔ زندگی کی ایک اور پرت سامنے تھی۔
 بس ڈر تھا کہ یہ باتیوں کی طرح ٹٹوئی نہ ہو۔

میں ہر کام خوش اسلوبی اور نفاست سے کرتی۔ دو

سہری

دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں، ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ عمر ایک بگڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد، تھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایک سڈنٹ میں معذور ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی مرحاتی ہے وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

مکمل ناول





انعم اور احسن ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی میں ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کروا تا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے، احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازینو آتی ہیں، وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے اور اپنے بھتیجے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بسن بھائی دعا کو اس کی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بسن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھاتی، وہ اسے ہر وقت ذیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کالالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔ الیاس احمد، عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں، جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمران سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر بیوشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے۔ اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، کیونکہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہوگئی تو باپ، بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔

ریاض احمد، عمر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں، مگر رابعہ دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کے اچھے تعلقات کو جتاتی رہتی ہیں۔ دعا کے رویے سے عمر کھٹک جاتا ہے۔ رابعہ احمد کی کوششوں سے عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آ جاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد رانچ کا چارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال رہا ہے۔ دعا بھی ممائی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے، مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں جہاں دعا، عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامن پر یقین ہوتا ہے، وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں، جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامن ثابت نہیں کر پاتی، اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصور وار نہیں مانتا۔

الیاس احمد، مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔ الیاس احمد اپنی چھ دار باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد اور نوال کے کہنے پر عمیر، دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چنگل سے چھڑا لیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلہ بھائی ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دعا گھرنون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو گولی مار دی ہے۔ نوکرانی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

ہمارے متعلق رابعہ کے اصل خیالات اور عمر کے کروت جان کر ریاض احمد ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ آصفؒ

انعمؒ دعا کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔ انعمؒ کی ساس کینڈا سے ملنے آتی ہیں۔ انیس یہ بات پسند نہیں آتی۔ وہ انعمؒ اور دعا کا موازنہ کرتی ہیں۔ یہ بات دعا کو ابھمن میں ڈال دیتی ہے۔ وہ انعمؒ کو اس کی بے اولادی کا احساس دلاتی ہیں۔ عمیرؒ کا تعلق حملے میں بیچ جاتا ہے۔ ریاض احمدؒ عمیرؒ اور نوال کی بے رخیؒ رابعہ احمدؒ کو اپنی غلطیاں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مرلے کی حالت میں ماں سے بھی بد تمیزی کرتا ہے اور الیاس احمدؒ سے بھی پیسوں کا تقاضا کرتا ہے اور سارا راج مریمؒ کے ماتھے اگل دیتا ہے۔ دونوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور عمرؒ الیاس احمدؒ پر فائر کھول دیتا ہے۔ عمیرؒ الیاس احمدؒ کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مریمؒ عمیرؒ کو عمر اور الیاس احمدؒ کے گٹھ جوڑ اور سازش کا بتاتی ہے۔ عمرؒ کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ تھانے میں اس پر تشدد ہوتا ہے۔ عمیرؒ اور ریاض احمدؒ تھانے جاتے ہیں جہاں سے رہائی پانے کی خاطر عمرؒ انیسؒ بیچ جتا دیتا ہے۔

چھٹی قسط

انعمؒ ہائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے خاموش لیٹے امنؒ کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ یہ چپ اس کے ساتھ آفس سے ہی آئی تھی۔ اس نے دل آرا کو بھی رات نہیں دیا تھا۔ کھانا کھا کے سیدھا بیڈ روم میں آکے لیٹ گیا تھا۔ انعمؒ کی فکر بجا تھی۔ کچھو انار کے کھلے بالوں میں برش پھیر کے وہ رات روم میں چھینچ کرنے چلی گئی۔ دس منٹ بعد وہ راکوڈر شرٹ میں باہر نکلی تو وہ منہ پر کشن رکھے ہوئے

آتا۔
”فار گاڈ سیک انو“ میں شاپنگ پہ جانے کو کہہ رہا ہوں مری نہیں۔ ملا جالی تمہارے ساتھ جائیں گی۔ وہ تمہارے لیے مجھ سے زیادہ بہتر چیزیں پسند کر سکتی ہیں۔“ احسن نے خفگی سے نہیں سنجیدی سے کہا۔ انعمؒ جیسی نازک مزاج کے دل میں یہ جملے اور لہجہ گڑ گیا۔

”آپ خفا ہوئے بغیر قتل سے بھی کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے فوراً احساس دلایا۔

”میں چند روز کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔“ اس نے اگلا قدم ہتایا۔

”کیا؟ اسلام آباد؟ یوں اچانک۔“ وہ حیرت سے چلاتی ہوئی فوراً اٹھ بیٹھی۔

”پر سوں جا رہا ہوں، اچانک نہیں۔“ احسن نے رخ موڑ لیا۔

”میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ ٹھنکی اور ٹکیہ اٹھا کے احسن کو مارا۔

”ملا جانی اتنی دور سے، ہم سے ملنے آئی ہیں اور ہم انہیں تنہا کر دیں۔“ اس نے نرمی سے احساس دلایا۔

وہ روز مو کے لہجے میں بول رہا تھا، لیکن انعمؒ کو سب بہت چھہ رہا تھا۔

”تم کچھ اب سیٹ ہو، اپنی راپلم احسن۔“ اس نے قریب بیٹھ گئے نرمی سے اس کا کندھا ہلایا۔

”آئی ٹھنک، کل تمہارا جان کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جاؤ۔“ اس نے کشن ہٹا کے، سر کے نیچے ہانڈ

پڑھا کر کے رکھا۔

”آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔“ اسے حیرت ہوئی۔ وہ ہمیشہ اس کی ہر طرح کی شاپنگ خود پوری دیکھی سے کرتا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گا، ابھی تھوڑا بڑی ہوں، ملا کو آئے اتنے دن ہو گئے ہیں، میں وقت ہی نہیں نکال پا رہا۔“ احسن نے وجہ بتائی۔

”بٹ یو نو احسن! مجھے آپ کے بغیر بالکل مزا نہیں

”کیا ہے احسن؟“ اس نے کندھے سے پکڑ کر کھنچا۔
 ”کچھ نہیں یار سو جاؤ، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ پھر بات کریں گے۔“ جمائی روکتے ہوئے اس نے بیچ میں پڑا کفن اٹھا کے منہ پر رکھ لیا۔



الیاس احمد کو ہوش آگیا تھا۔ ریاض احمد کے گھر سے کوئی اسپتال نہیں آیا تھا۔ تمبرز ملک نے مریم کو بتا دیا تھا۔ انہوں نے عمر کو جیل بھجوا دیا ہے۔ مریم کو بھائی صاحب سے اتنی جلد بازی اور یک طرفہ فیصلے کی توقع نہیں تھی۔ ان کا دل بہت سے دوسروں میں گھر گیا تھا۔ تمبرز ملک ڈاکٹر سے اجازت ملنے پر آئی سی یو میں الیاس کے پاس آئے تھے۔

”الیاس کیسے ہو؟“ انہوں نے ان کے قریب ہو کر خیریت پوچھی۔ ”بہتر ہوں۔“ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ڈونٹ وری الیاس، میں اس لڑکے کو اچھی طرح سبق سکھاؤں گا۔ اس لڑکے کو رشتوں کا احترام اور تمیز بھول گئی ہے۔“ تمبرز ملک بہت غصے میں تھے۔

الیاس احمد نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ان کی آنکھوں کے آگے دھند سی چھائی۔

”تم ذرا ٹھیک ہو جاؤ تو پولیس کو اپنا بیان قلم بند کروا دینا، بعد کے سارے معاملات میں دیکھ لوں گا۔“ انہوں نے اطمینان دلایا۔

”کاش! مجھے ہوش ہی نہ آتا۔“ الیاس احمد نے دل میں کہا۔

”مریم بٹیا! تم کیوں خاموش اور اداس کھڑی ہو؟ تمہارا شوہر خطرے سے نکل آیا ہے۔ اب تم بھی ہلکی پھلکی ہو جاؤ اور شکرانے کے نقل پڑھو۔“ بھائی تو میں نے کوہو یا مگر شکر ہے میرے رب کا کہ میری بہن کا گھر برباد ہونے سے بچ گیا۔“ انہوں نے پھر قریب کھڑی مریم سے کہا۔

”تم الیاس کے پاس رکو، میں فیکٹری کا چکر لگا جا رہا ہوں، ڈاکٹر نے اطمینان دلایا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے کال کر لیتا۔“ انہوں نے چھوٹی بہن کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور نکل گئے۔ الیاس احمد بیوی کو بغور دیکھتے ہوئے چپ تھے، مریم کا آنکھوں میں غصہ اور نفرت صاف پڑھی جاسکتی تھی ان کی زبان تالو سے جا لگی۔

”سن لیا، بھائی صاحب کیا کہہ کر گئے ہیں۔ عمر جیل میں جسمانی ریمانڈ پر ہے۔ ریاض بھائی اور عمو ام سے دو گھنٹے کی ملاقات بھی کر کے آئے ہیں، ان دو گھنٹوں میں اس نے کیا بات کی ہوگی، یہ تم جیسا شاط اور چالاک انسان بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اس ملاقات بعد، ان کے گھر سے کوئی بھی اسپتال نہیں آیا۔“ مریم نے تلخ الفاظ چبا چبا کرے۔

”پلیز مریم، مجھے یہ رحم کھاؤ، میں بہت پریشان ہوں۔“ وہ اس لب و لہجہ پر پڑ گئے۔

”تم جانتے ہو الیاس احمد، ان تین دنوں میں میں نے ایک بار بھی تمہاری صحت و سلامتی کی دعا نہیں مانگی۔ شدت سے ایک ہی دعا کی ہے کہ تمہیں کبم ہوش نہ آئے، تم مر جاؤ تاکہ تمہارے نام کی ذلت میرے سر سے ہٹ جائے۔ تمہیں ڈنٹے کو میرا بھائی ملا تھا۔“ مریم نے غصے سے ان کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”بھائو! تم نے اتنی گھٹیا حرکت کیوں کی؟ ایک معصوم یتیم و بے آسرا لڑکی کو گھر سے بے گھر کیا۔ وہ بے چاری نہ جانے کہاں کہاں دھکے کھا رہی ہوگی اور میرا عقل دیکھو کہ میں نے تمہاری ساری بکواس پر بغیر کر کے تمہارا ساتھ دیا۔ تمہارے ساتھ اتنے سال گزار کے بھی میں تمہارے اندر کی بے ایمانی کو پکڑ سکی۔ تم کتنے گرے ہوئے انسان نکلتے۔“ مریم انہیں جھنجھوٹی ہوئی خود بھی رونے لگی تھیں۔ انہیں کو بل چین نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بار بار کاچرا آتا اور جو انہوں نے اس معصوم کے ساتھ کیا

ملوک کیا تھا۔ یقیناً اس کا حساب بہت سخت ہونے والا تھا۔

الیاس احمد کے چہرے پر تکلیف کے آثار گہرے ہو گئے۔ ان کے پاس صرف خاموشی تھی۔

”جب بھائی صاحب کو ساری حقیقت معلوم ہوگی تو اپنی صفائی میں ان سے کیا کوئے میں نے تمہارا ماتھ دیا۔ میں نے اپنے شوہر اپنے مجازی خدا پر اندھا اظہار کر کے کتنا بڑا دھوکا کھایا۔ کتنی شرم کی بات ہے الیاس کہ تم نے بھانجی کے ساتھ ہی زیادتی کر ڈالی، تمہیں نقب لگانے کو اپنا ہی گھر ملا تھا۔ کیا بھائی صاحب اور بھانجی جان میرا یقین کر لیں گے کہ اس سارے کھیل میرا کوئی حصہ نہیں تھا۔ میں بے تصور ہوں۔“

وہ دلی جاری تھی۔ بولتی جاری تھی۔ الیاس احمد نے تکلیف سے آنکھیں میچ لیں۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ان کی اصلیت کا پول اتنے بڑے طریقے سے کھلے گا کہ وہ اپنی ہم سفر سے ہی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

”تمہیں رشتوں کی قدر اور احترام تھا ہی کب یہ تو میں ہی بھائی جان اور بھانجی جان کے ساتھ مل جل کر لڑتی تھی، مگر اب وہ جو ہمارے ساتھ کریں گے شاید تمہیں بھی ٹھیک سے اندازہ نہ ہو۔ ورنہ تمہیں۔“

”پلیز مریم۔ پلیز۔“ ان سے مزید کچھ بڑا اشت میں ہوئی۔ وہ اسے چپ کرواتے کبے کبے سانس ہارنے لگے۔

”ڈاکٹر۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ ان کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

وہ اپنے گل صاف کرتی ہوئی بڑے آرام سے ڈاکٹر کو بلانے چل دی۔

عمیر نے عمر کا بتایا ہوا ایک ایک لفظ رابعہ احمد اور نوال کے گوش گزار دیا۔ رابعہ احمد کا رنگ زرد تھا وہ صحت بیٹھی تھیں۔ نوال بے آواز روئی ہوئی سب سن رہی تھی۔

”میرادل تو پہلے ہی نہیں مانتا تھا کہ وہ اتنی بچ حرکت کر سکتی ہے۔ وہ چند دن پہلے تک بہت اپ سیٹ تھی، میں نے وجہ پوچھی تو صاف ٹال گئی۔ اس نے عمر کی حرکتیں کسی سے شہر نہیں کیں۔ اتنا گھٹیا الزام سہ کے بھی منہ سے اف تک نہ کی۔“ نوال کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اس کی ہچکچاہٹ سنہ گئی تھی۔

”میں نہیں جانتی تھی کہ عمر اتنا گر جائے گا۔ اس نے کتنی دیدہ دلیری سے یہ سب کر لیا، تمہارے پیلا جان کہتے تھے کہ یہ لڑکا بہت بے رحم اور سنگ دل ہے۔ کسی کا بڑے سے بڑا نقصان کرتے ہوئے بھی نہیں چوکتا، اس نے جان بوجھ کر اپنے باپ کو تڑپانے کے لیے دغاوار کیا تاکہ وہ اپنے باپ کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر سکے۔“ رابعہ احمد نے ماتھا مسلتے ہوئے اپنا مشاہدہ بیان کیا۔

اس سارے کھیل کا مرکزی کردار تو پکڑا جا چکا تھا، اب اپنے حصے کا تصور بھی اس کے کھاتے میں ڈال دینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اپنے بچاؤ کافی الحاح یہ ہی سب سے آسان رستہ تھا۔

”بہت معذرت کے ساتھ، لیکن ماما جان! آپ غلط بیانی نہ کریں، آپ نے ہی زبردستی عمر کو دعا کے ساتھ تھپی کیا، آپ نے بڑھ چڑھ کر ان کی فریڈ شپ کر ڈالی۔ ان کی انڈر اسٹینڈنگ کی بہت بڑی حامی تھیں آپ، میں نے تو بہت پہلے آپ کو باور کروایا تھا لیکن تب تو آپ نے برامانے ہوئے مجھے ڈانٹ کے خاموش کروادیا تھا۔ عمر کو اتنا گھٹیا اسٹیپ اٹھانے میں، آپ کی واضح مدد حاصل رہی ہے۔“ عمیر نے بغیر ہلکی ٹپٹی رکھے بول دیا تھا۔

اس کے لیے ماں قابل احترام تھیں، لیکن وہ

اتنی بڑی غلطی بلکہ گناہ کر کے، ایک یتیم و بے آسرا لڑکی کو دبدر کر کے، خود کو اتنے آرام اور سہل الفاظ میں بری نہیں کر سکتی تھیں۔ رابعہ احمد کا سر جھک گیا۔ ان کی زبان تالو سے چپک گئی سب جانتے تھے۔

”ہم دونوں بھی اس کے مجرم ہیں بھائی! ہمیں

احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ کڑیو ہے، لیکن ہم نے اس کے مسئلے پر توجہ نہیں دی۔ ہم دونوں کی لاپرواہی کا لہر اور عمر نے فائدہ اٹھایا۔ ”نوال نے کہا تھا۔ ”شاید وہ ہمارے گھر اور رشتوں کو بچانا چاہتی تھی۔ اس نے اس گھر کے کھائے نمک کا حق ادا کر دیا۔ عمر کی ہر زیادتی تناسف کر بہت بڑی قربانی دی ہے۔“ روتے ہوئے نوال سے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

عمیر کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ پڑ چکا تھا۔ رابعہ احمد ابھی تک سر نہیں اٹھائی تھیں۔ اس فورٹ مام، آئیڈیل بیوی، سکھر باسیلقہ گرہستن پہ کتنا برا وقت آیا تھا۔

”وہ لڑکی محبت سے گندھی تھی۔ اسے احترام اور رشتوں کی قدر رکھنی میں گھول کے پلا دی گئی تھی۔ اسے لاما اور بیلا جان سے محبت تھی۔ مجھ سے اور نوال سے محبت تھی اور اسی محبت میں وہ اپنا نقصان کر بیٹھی۔ جس کا ازالہ ہم سب مل کر بھی نہیں کر سکتے۔“ عمیر کے بچے میں کرب تھا۔ اس کے دل میں ہلکا سا درد مسلسل رہنے لگا تھا۔ جس میں دعا نام کی لہریں اٹھتی رہتیں۔

”مجھے معاف کرو، میرے اللہ۔ مجھے معاف کرو۔ میں نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ بہت برا کیا۔ مجھے معاف کرو۔“ رابعہ احمد کے آنسو رواں ہو گئے۔ عمیر کی برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر پھیلی دکھ کی گہری تحریر کو چھپانے کے لیے تیزی سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

دل آرا صوفے پر بیٹھی تھیں۔ انعم کا ہٹ پر پھسکا مارے ان کی گود میں سر رکھے ہوئے تھی۔

”مہی! یقین کریں، میں احسن پر شک نہیں کر رہی۔ وہ مجھے واقعی چہنچہ سا لگنے لگا ہے۔ مجھ سے اپنے آپس کی روئین تک شیر نہیں کرتا۔“ انعم نے منہ بسور کے کہا۔

دل آرا کینڈا میں بھی ہوئیں، وہ تب بھی ان سے اپنے دل بھر کی روئین اور احسن کی ہر چھوٹی سے چھوٹی شکایت ضرور کرتی تھی۔

”سے لی، اس کی کوئی آفیشل پرابلم ہو، جو تم سے شیرنگ والی نہ ہو۔“ وہ اس کی شکایتوں پر صرف مسکراتی تھیں۔ کیونکہ وہ اس کے بچنے کو جانتی تھیں۔

”وہ کل اسلام آباد جا رہا ہے، مجھے ساتھ چلنے کا کہہ ہی نہیں۔“ اس نے اپنا اصل دکھ بیان کیا۔

”شاید اس نے میری وجہ سے نہیں منع کر دیا ہو۔ فرض کرو، اگر وہ تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا تو کیا تم مجھے جھوڑے چلی جاتیں۔“ دل آرا نے اس کا دھیان مٹانے کو نکتہ پکڑا۔

”نیور میں کبھی نہیں جاتی۔“ اس نے نور سے لپو میں سر ہلایا۔

”میری جان، میری گڑیا، چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل نہیں لیتے۔“ دل آرا نے اس کا سر جوا۔

”جو بھی ہے، لاما جی، آپ اس کے کان ضرور کھینچو گا۔“ اس نے مجھ سے مس لی ہو کیا ہے۔“ اس نے

خندی بچے کی طرح منہ بسور کر کہا۔ ”اچھا۔ میں اسے ڈانٹوں گی۔“ وہ مسکرا دی تھیں۔

☆☆☆

ریاض احمد بیڈ پہ دو تکیوں سے ٹیک لگائے ہاتھ میں موبائل پکڑے، کسی سوچ میں گم تھے۔ عمر سے ملاقات کے بعد ان کے دل و دماغ کو کسی بل چین نہیں تھا۔ ایک لمحے کی لغزش نے ان کی عمر بھر کی محنت پر پالا پھیر دیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ بڑی آپا کا احترام کیا۔ مگر

کے بعد انہیں ماں کا وردہ دیا۔ ان کی یتیم بچی کے سر ہاتھ رکھا۔ اس بچی کے معاملے میں ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہے، اپنے بچوں پر اسے فوقیت دی۔ لیکن

لیکن کیا ہوا؟ ان کے ہی بیٹے اور بھائیوں پر برا رویہ کی ان کی ساری محنت اور ریاضت پر سپاہی پھیر دی۔ عمیر نے دروازہ کھول کے دیکھا، انہیں جاگتاپا کے

سید جانور آلیہ۔

”سوری۔ میں سمجھا شاید آپ سو رہے ہیں اس لیے ناک کر کے، آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا۔“ اس نے معذرت کی۔

”نیند۔“ وہ استنہاسیہ ہنسی نہیں۔ ”نیند تو جیسے آنکھوں سے روٹھ ہی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت عرصہ غفلت کی نیند سو رہا ہوں، اب آنکھیں بند کرنے کو دل نہیں چاہتا اور ڈسٹربنس۔ اب یہ ہی تو میری زندگی کی بقا یا حیات ہے۔“ تب ہی رابعہ احمد بھی دودھ کا گلاس لیے آنکھیں۔

عمیرہ پانچ بیٹھ کے باپ کے پیروا بنے لگ۔ دلاسا دینے والے سارے الفاظ کھو کھلے تھے۔

”یہ لیس میڈیسن۔“ رابعہ احمد نے ان کی دوائیں اور پانی کا آدھا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔ فی الحال درد سے یہ ہی نجات کا طریقہ تھا۔

”نہیں، مجھے نہیں کھانی کوئی دوا۔“ انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔ انہیں شریک حیات کی اپنے ارد گرد موجودگی بھی ٹھکنے لگی تھی۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ وہ اپنا کمرہ بھی علیحدہ کر لیں۔ پھر ملازمین کا سوچ کر خاموشی اختیار کر لی۔

”آپ دوا نہیں لے رہے اسی لیے نیند نہیں آتی اور فرسٹریشن بھی بڑھنے لگی ہے۔ پلیز پاپا جان! ہمارے لیے، اپنا اپنی صحت کا خیال رکھیں، پلیز۔“ اس نے منت کے انداز میں باپ کے پیرواں کو دباؤ بڑھایا۔

”میری دماغ تکلیف میں ہے۔ کوئی بھی دوا میرے درد میں افادہ نہیں کر سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ نور نور سے نفی میں ہلاتے ہوئے، ہسٹریائی ہو رہے تھے۔

عمیرہ اور رابعہ احمد ایک دوسرے سے نظریں چڑا گئے۔ اس نے ماں کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑ کر باپ کو پکڑ دیا، تاکہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو۔ وہ گلاس پکڑ کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگے۔ رابعہ احمد بیڈ کے

دوسرے کونے پر سہمی ہوئی سی جا نکلیں۔ وہ پانی پی چکے تو عمیرہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ عمر کے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے، جو بھی کہیں گے، ہم اس سے اختلاف نہیں کریں گے۔“

”عمر جیل میں ہی سڑے مرے گا، یہ ہی میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میری بے گناہ بیٹی اتنی بڑی سزا کی مستحق تھی۔ اس نے ایک یتیم و معصوم لڑکی کے ساتھ زیادتی کی۔ اس کی ذات سے، مجھے آج تک ایک لمحہ کا سکھ نہیں ملا۔ وہ سزا جو آج تک ہم اسے نہیں دے سکے، وہ میرے غور و الٰہیم رب نے خود اس کے لیے منتخب کر دی ہے۔ اب وہ اس سزا کو بھگتے۔“ ان کا لہجہ نفرت بھرا تھا۔

ماں کا دل لمحہ بھر کو ٹھٹھکی میں جکڑ گیا۔ عمیرہ اس کی حمایت کرنے کی ذرا سی بھی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

”آپ تم آرام کرو عمیرہ! اور اس ٹایک کو ہمیشہ کے لیے کلوز کر دو، صبح سے میں بھی ریگولر تہوارے ساتھ آفس جایا کروں گا کافی عرصہ ہو گیا ہے یہ نہ ہو کہ بے تو جہی کسی بڑے نقصان سے دوچار کر دے۔“ وہ بڑے نارمل لہجے میں بزنس ڈسکسین کرنے لگے۔ جیسے انہیں کسی اور چیز کی پروا نہیں تھی۔

”نہیں۔“ کے پاپا جان! گڈ نائٹ۔“ عمیرہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

”آپ کا اگر رونے کا شغل کرنے کا پروگرام ہے تو برائے مہربانی آپ اٹھ کے کمرے سے باہر جاسکتی ہیں۔ کیونکہ ایک خوش آئند فیصلہ کرنے کے بعد مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“ انہوں نے — سر جھکائے بیٹھی رابعہ احمد سے کافی سنجیدگی سے کہا۔

وہ ست روی سے انھیں، ٹھٹھکی میں دبی ٹیلیٹ دراز میں ڈالی اور جتنی بچاؤی۔



انعم سلائیڈ مٹا کے گیٹ سے باہر نکلتی ہوئی گاڑی کو نظروں کی زد میں لیے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر از حد حیرت، دکھ، بے یقینی اور غصے کے ملے جلے

تاثرات تھے۔



تمیز ملک اپنے آفس میں تھے جب انہیں ایس پی کے آنے کی اطلاع موصول ہوئی۔ ایس پی نے انہیں عمر سے تقشیش کے بعد ساری کہانی حرف بہ حرف بتا دی۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ عمر بچ بول رہا ہے“ تمیز ملک کو یقین نہیں آتا تھا۔

”معدرت کے ساتھ وہ لڑکا بچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ؟ یہ تو آپ ہی بہتر جانتے ہوں گے کیونکہ یہ آپ لوگوں کا گھریلو معاملہ ہے۔ آپ کا ہنوی الیاس احمد بھی اس جرم میں برابر کا شریک ہے بلکہ اس پلان کی منصوبہ بندی ہی اس نے کی ہے۔ عمر نے تو صرف ایک کروا دیا کیا ہے۔ وہ بھی پیسوں کے لالچ میں“ اس نے اتنے شاطرانہ انداز میں بیک گراؤنڈ میں رہ کے ساری ڈائریکشن دی ہے کہ کسی کا ذرا سا بھی شک اس کی جانب نہیں جاتا یہ تو بد قسمتی سے معاملہ اقدام قتل تک جا پہنچا اس لیے سارے راز افشا ہو گئے ورنہ سب کی نظر میں عمری مجرم رہتا۔“

ایس پی نے اصل بات بتادی تھی۔ ”ٹھیک ہے“ میں ایک دودن میں آپ کو کال کروں گا۔“ انہیں اس طرح گھریلو معاملات کسی غیر کے سامنے کھلنے پر از حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر انہیں اس معاملے کی ذرا سی بھی بھنگ پڑ جاتی تو وہ عمر کو جیل بھجوانے کے بجائے بالا ہی بالا دونوں سے خوب نبٹ لیتے۔

”بٹ سر! میرا مشورہ ہے کہ الیاس احمد کو بھی سزا ملنی چاہیے۔ یہ انصاف کا تقاضا ہے اور اصل میں مستحق بھی وہی ہے۔ باقی جو آپ کو بہتر لگے۔“ ایس پی نے ٹیبل سے موبائل اور چابی اٹھا کے مصافحہ کیا۔ اس کے الفاظ تمیز ملک کے دل و دماغ میں گڑ گئے تھے۔



چرخے دے ہر ہر پھیرے

دل آرائے ہلکی سی دستک دے کر دروازہ کھول دیا“ انہیں اس موقع پر اس کے پاس ہی ہونا چاہیے تھا۔ ”نہو۔“ انہوں نے قریب جا کے نرمی سے اسے بلایا۔ اس کا دماغ اتنا حاضر نہیں تھا کہ مڑ کے دیکھتی یا فوراً جواب دیتی۔

”تہنی ہانہد مت ہوانو۔“ انہوں نے کندھوں سے تھام کے اس کا سر اپنی طرف کیا۔

”آئی کانٹ امیجین کہ احسن میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے۔“ وہ ہند گیت کو گھورے جا رہی تھی۔

”آئی نو کہ وہ آج اسلام آباد جانے والا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح گھر آکے‘ فریش ہو کے جاتا‘ اس طرح تو کبھی بھی ڈرائیور کو بھیج کے لکھج نہیں منگوایا۔ ایون اس نے مجھے کال کرنے یا میسیجج چھوڑنے کی بھی زحمت نہیں کی۔“ وہ رو دینے لگی۔

”مے لی اسے ار جٹ جانا پڑ گیا ہو یا بڑی ہو‘ ڈیٹ کرو‘ وہ کال کرے گا‘ اگر زیادہ بے چینی ہے تو خود کال کرلو۔“ انہوں نے رساں سے مشورہ دیا۔

”میں کیوں کروں اسے کال یا میسیجج‘ جب اسے میری پروا نہیں۔“ وہ اپنے آنسوؤں پر بڑے ضبط سے پرے بٹھائے ہوئے تھی۔

”تہنی جلدی بد گمان نہیں ہوتے میری جان‘ وہ شوہر ہے تمہارا‘ پیچور بنو‘ تم دونوں کوئی سیونٹین اتج میں نہیں ہو۔“ انہوں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے بڑے مناسب الفاظ کا استعمال کیا۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ رائی کا پہاڑ تار ہی ہے۔

”بلیوی وہ بدل رہا ہے۔ کیا آپ اس کی میرے لیے دوا لگی سے واقف نہیں‘ اس کا رویہ سنجیدہ‘ خاموش‘ روکھا پھیکا سا ہو کے رہ گیا ہے‘ ہر گھنٹے بعد کال اور دو گھنٹے بعد میسیجج کرنا“ اس کی برسوں پرانی عادت ہے اور اب۔۔۔“ نعم نے سسکی بھری۔

”نعم کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہیں خود پر کافیڈنس نہیں رہا۔“ دل آرا اس کی سوچ پر تاسف سے سر ہلاتی رہ گئیں۔

مانی میں تینوں یاد کراں

یاد کراں میں تینوں

یاد کراں مانی ہوئے

نہیں ہوا تھا۔

”اور اچھا اے تے دس (پتا) تو کہندا (بتاتا) سی
کہ تیرا باپ، ایک دو دن وچ مجھے چھڑانے آئے تو تے
وڈا آدمی اے، تیرا باپ۔“ اس کے دونوں ہاتھ اوپر لے
جاسکے وڈی چیز کا حدوار بعد بتایا۔

”ہاں بہت وڈا۔“ ہے میرا پو، اسی لیے سلا ابھی
تک، مجھے چھڑانے نہیں آیا، جب مرجاؤں گا تب
جنازے کو کندھا دینے آئے گا۔“ عمر اس ذکر پر اچھا
خاصا چڑ گیا۔ اس نے انجانے میں اس کی دھتی رگ کو
چھیڑ دیا تھا۔

”اب اگر تم نے مزید ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو
میں تمہارا منہ توڑ دوں گا، تمہاری بکواس سے میں
ڈسٹرب ہو رہا ہوں، خاموش رہو۔“ عمر نے اتنی تلخی اور
غصے سے اسے دھمکایا کہ وہ واقعی سہم کر خاموش
ہو گیا۔ عمر نے لباساں خارج کرتے ہوئے، سروپوار
سے نکال لیا۔



رات کو کھانے کی میز پر حسب معمول چار نفوس
موجود تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چمچے اور
پلیٹ کا شور ابھرتا، ملازم، ریاض احمد کی کرسی کے پاس
آرکا۔

”سرا! آپ کے مہمان کو میں نے گیسٹ روم میں
بٹھا دیا ہے، ملازم کھانے کے اوقات میں کبھی بھی
کسی مہمان یا کال کامیسیج لے کر نہیں آتے تھے۔
سوائے چند خاص لوگوں کے۔“

”کون مہمان؟“ ان کا ہاتھ رک گیا۔
”تمیز ملک آئے ہیں، آپ کو اور بیگم صاحبہ کو بلا
رہے ہیں۔“ سب کے کھانے کی طرف بڑھتے ہاتھ
رک گئے۔

”چلو ہم آرہے ہیں۔ ان کا کھانے سے دل اچاٹ
ہو گیا۔ وہ نشو و پیر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ
گئے۔ رابعہ احمد اور عمیر نے بھی ان کی تقلید کی۔
تمیز ملک صوفے کی پشت پر بازو پھیلائے، ٹانگ پر

انتہائی بھدی اور موٹی آواز کو بڑا سر لگا کے گلے کی
کوشش میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ عمر دیوار سے ٹیک
لگائے، آنکھیں موندے بیٹھا تھا، اس نے جھٹکے سے
آنکھیں کھول دیں۔ شوکت علی، عارف لوہار اور عطا
اللہ تک اسے برداشت تھا، لیکن نصرت فتح علی خان کا
وہ بہت بڑا مداح تھا۔ کھا جانے والی نظروں سے اس
پہنے اسپیکر کو گھورا۔

”اسٹاپ اٹ، اسٹوپ، ایڈیٹ، اگر تم نے اپنی یہ
بھال بھال بند نہ کی، تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔“ اس
نے انتہائی ناگواری سے اسے ڈانٹا۔

”سورے سے خاموش ہی بیٹھے ہیں، تجھے تو میں
نے کوایا (بلا یا) بھی نہیں۔ میری مرضی میں جو کوں
تینوں کی تکلیف اے۔“ دوسرا قیدی جو پچھلے تین روز
سے اس کے ساتھ تھا۔ اس نے عمر کے انگریزی لہجے
سے ذرا بھی ڈرے یا جھجکے بغیر اڑیل گھوڑے کی طرح
منہ اٹھایا۔ وہ بھی عمر کی خاموشی سے تنگ آکے بے سرا
گاہا تھا۔

”جو مرضی کے بچے، سر نیچے رکھ کے ٹانگیں اوپر
لگاؤ، اپنا سر پھوڑو، میرے سر میں درد نہ کرو، یہ تمہارے
چاچے کا چائے کا ڈھابا نہیں ہے۔ یہ قید خانہ ہے۔“ عمر
مزید بکڑا۔ اسے اس شخص سے شدید چڑ ہو رہی تھی۔

”وئے اک گل (بات) تے بتا۔ چپ رہ رہ کے
تیرا دل نہیں اوب دا، زبان منہ وچ رہ رہ کے تھک دی
لہی۔“ چل نیا (نانا) کہ تیرے اور میرے وچ تھوڑا
فرق اے، پر ہمیں اک دوجے کی بولی کی تو سمجھ آندی
آئے۔“

اس نے برا سنبھل کے بولتے ہوئے عمر کے دل کا
چور پکڑ لیا۔ وہ دل ہی دل میں اس شری بابو سے دوستی کا
طواہل تھا۔

”تم بلا وجہ میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش نہ
کرو باسٹرو۔“ اس نے وارننگ دی۔ اس کا غرور کم

ٹانگ چڑھائے اپنے مخصوص انداز میں براہمن تھے۔
 ”اسلام علیکم“ وہ ریاض احمد کی تعظیم میں کھڑے
 ہوئے مصافحہ کے ساتھ دونوں گلے ملے اور سب
 نے نشستیں سنبھال لیں۔

”ریاض احمد! مریم میری چھوٹی، اگلی اور لاڈلی
 بہن ہے، جو پورے سترہ برس مجھ سے چھوٹی ہے۔
 اسے میں نے اپنی بیٹی سمجھا اور بیٹی کی طرح ہی پالا
 ہے۔“ تمبرز ملک نے بغیر کسی تمہید کے اپنا مدعا بیان
 کرنا شروع کر دیا۔ ان کا لب و لہجہ خطرناک حد تک
 سنجیدہ تھا۔

”بے شک آپ کے والدین، خدا انہیں غریق
 رحمت کرے، میری بہن کا رشتہ لے کر آئے تھے،
 لیکن جب میرے علم میں آیا کہ الیاس احمد آپ کا
 بھائی ہے تو میں نے اسے دیکھے بغیر ہی رشتہ پکا کر دیا۔“
 انہوں نے انگلی اٹھا کر اپنی بات میں وزن پیدا کیا۔

”یہ رشتہ آپ کے والد صاحب یا الیاس کی وجہ
 سے نہیں، بلکہ آپ کی شرافت، ایمان داری اور
 اصول پسندی جس کا پورا شہر معترف ہے اسے مد نظر
 رکھ کے میں نے اپنی لاڈلی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ کیا
 تھا۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ
 اپنے گمراہ معاملات میں انصاف سے کام نہ لے سکے۔

آپ ایک یتیم و مسکین لڑکی کی دو چار ماہ سے زیادہ
 حفاظت نہ کر سکے۔“ ریاض احمد کا سر سینے تک جھک
 گیا۔

”ایک معصوم لڑکی کی پاک و امنی اور پاکیزگی کو آپ
 کے بیٹے اور بھائی نے عمل پلانے کے ساتھ داغ دار
 کیا اور آپ آنکھیں بند اور کلن لپیٹے بے خبر رہے۔“
 تمبرز ملک نے ذرا توقف کیا۔

ریاض احمد نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنی شریک
 حیات کو دیکھا، جو ان کا اٹھتا سردیکھ کے فوراً نظریں
 چڑا سکیں۔

تمبرز ملک نے راجہ احمد کا گریز اور ریاض احمد کی
 آنکھوں میں ہلکورے لیتے دکھ اور شکوے دیکھے۔

”راجہ یتیم، مریم نے ہمیشہ آپ کی سمجھ داری اور
 معاملہ فہمی کی تعریف کی، آپ کیسی ماں ہیں جو اپنی ہی
 اولاد کا جھوٹ اور اس کی بدکرداری نہ پکڑ سکیں، وہ بچی
 جو آپ کی بیٹی کی طرح تھی، آپ نے جان بوجھ کر اس
 لڑکی کو اپنے درندہ صفت بیٹے کے سپرد کر دیا۔“

راجہ احمد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ان
 کا خور و ضبط ٹوٹ گیا۔

”یہ آنسو عمر کی ماں کے ہیں، دعا کے لیے نہیں،
 آپ نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ایک لڑکی کی مجبوری
 سے فائدہ اٹھا کے، اپنے شوہر کو دھوکے میں رکھ کر اور
 اپنے آوارہ اور بدچلن بیٹے کی پشت پناہی کر کے۔“
 تمبرز ملک نے مرکزی کردار کو ٹھہرا۔ ان کا فہم سب
 سے زیادہ قصور وار اس عورت کو ہی ٹھہرا تھا۔

”کیوں عہد! سنا ہے تمہاری تو اس سے بہت
 اچھی دوستی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہاری ماں
 اور بھائی کے خوف سے، تم سے کچھ شیئر نہ کیا ہو، لیکن
 کیا تم اس کی آنکھوں میں جما خوف نہ پڑھ سکے۔ تم
 سب کے دلوں سے خدا کا خوف ختم ہو گیا ہے۔ خدا کی
 قسم۔ جب سے مجھے اس یتیم لڑکی سے ہوئی زیادتی کا
 علم ہوا ہے، میرے دل سے جو ان بھائی کی موت کا دکھ
 جاتا رہا ہے۔“ انہوں نے لباس اس خانہ کیلے زخم پھر
 سے ہرے ہو گئے تھے۔ ان کا یہاں آنے کا مقصد ان
 سب کو شرمندہ کرنا نہیں بلکہ آئندہ پیش آنے والے
 حالات سے آگاہ کرنا تھا۔

”میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرا بھائی
 اور بیٹا مل کر اپنے ہی گھر میں نقب لگائیں گے۔ میں ہی
 اس کا گناہ گار ہوں اور اس ظلم کے لیے میں خود کو بھی
 معاف نہیں کر پاؤں گا۔“ ریاض احمد کی آواز گلوگیر
 ہو گئی۔ انہوں نے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے آنکھوں
 کو دبایا۔

”اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں عمر کے ساتھ
 ساتھ الیاس احمد کو بھی۔“ آگے جو کچھ تمبرز ملک نے
 کہا، وہ وہاں بیٹھے سب لوگوں کے ہوش اڑانے کو کافی
 تھا۔ وہ انصاف کے لیے اس حد تک جاسکتے ہیں۔ یہ ان

کے وہو گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

احسن نے اسلام آباد جانے کے اگلے روز اپنی خیریت کا مہیج بھیجا تھا۔ تین روز گزر جانے کے بعد انعم کی بھیجی ہوئی صورت اور نم آنکھوں کو دیکھ کر دل آرانے خود اسے کال کی تھی۔ احسن خاصی جلدی میں تھا۔ اس نے اپنی مصروفیت گنا کے معذرت کر لی اور انعم کو گڈوشز کا مہیج بھیج دیا۔ دل آرا کو اس سے زیادہ بات کرنے یا تفصیل میں جانے کا وقت ہی نہ مل سکا۔

چوتھے روز انعم نے دل برا کر کے اسے کال کی تھی۔ اتنے برسوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ اس خود ساختہ لڑائی کو اس نے خود ہی ختم کیا۔ احسن کا نمبر ملایا۔ ”ہیلو انعم۔“ احسن کی ٹھکی ماندی آواز انعم کو خاصی سنجیدہ اور روکھی سی لگی۔ ”احسن۔“ وہ رو بڑی۔ اس کے اتنے روز کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

”انعم۔“ انو میری جان۔ کیا ہوا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ کچھ خدا نخواستہ برا ہو گیا ہے۔ سب خیریت تو ہے، پلیز انو رو فست۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ پلیز ٹیل می۔“ احسن کی جان اس کے رونے سے کھنچی جا رہی تھی۔

”کک۔ کک۔ کچھ نہیں ہوا۔“ اس نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ ”تم نے تین دن سے کانٹھکٹ نہیں کیا اور جاتے ہوئے مل کر بھی نہیں گئے۔ میرا دل بہت بھرا ہوا ہے۔“ اس نے آنسوؤں کی شدت پر قابو پا کے سسکتے ہوئے گلے کیا۔

”تھینک گاڈ۔“ اس نے لمبا شکرانے کا سانس لیا۔ ”تمہارے رونے نے تو مجھے پریشان کر دیا تھا۔“

”تم کب آرہے ہو؟“ انعم نے پوچھا۔ ”شاید کل۔“ احسن نے ماتھا ملا۔ ”شاید۔“ اس نے شاید کو حلق پر زور دے کر

دہرایا۔ ”یعنی پرسوں بھی ہو سکتی ہے۔“ اس کے لہجے میں حقیقی در آئی۔

”پلیز انو جان ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ میں یہاں ضروری کام سے ٹھہرا ہوں، تفریح کرنے کے لیے نہیں، میرا دل بھی اتنا ہی ادا اس ہے جتنا تمہارا، تمہارا یہ رونا مجھے کسی بل چین نہیں لینے دوے گا۔“

احسن کا دل بھی ادا اس ہو گیا تھا۔ وہ اس سے اتنا دور تھا کہ اسے خود سے لگا کے تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ نہ ہی اس کے آنسو پونچھے جاسکتے تھے۔

”یو نو، میرا دل تمہارے بغیر بالکل نہیں لگتا، مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا، کسی لمحے قرار نہیں، پلیز احسن، جلد لوٹ آؤ۔“ اس کی بے بس آواز میں پھر سے نمی ٹھلنے لگی۔

”صوری یار، میں اپنی مصروفیت میں تمہیں کال نہیں کر پایا، تم اپنی آئی ڈی چیک کرو، میں نے تمہارے لیے بہت سے مہیج جوڑے ہیں۔“ ”ہم رات کو آن لائن بات کریں گے۔“ انعم نے کہا۔

”او کے مائی لارڈ، اب اکثر اسلام آباد آنا جانا لگا رہے گا۔ بلکہ میں تو اسلام آباد میں ہی اپنا نیا گھر بنانے کا سوچ رہا ہوں۔“ اس نے انعم کی حالت سے حفظ اٹھاتے ہوئے اسے چھیڑا۔ انعم کے ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی۔ اس سے مزید کچھ بولایا پوچھنا نہ گیا۔

”اچھا یار بند کرو، مجھے ایک ضروری کال آرہی ہے۔ بعد میں رابطہ ہوگا۔“ اس نے روائی سے کہہ کر دوسری طرف چھائی خاموشی کا نوٹس لیے بغیر کال بند کر دی۔

انعم کا موبائل والا ہاتھ اس کے پہلو میں آگرا۔ اس کے ذہن میں احسن کے الفاظ تیز آندھی کی مانند چکرارہے تھے۔

”اسلام آباد میں ہی اپنا نیا گھر بنانے کا سوچ رہا ہوں۔“

☆ ☆ ☆

الیاس احمد پہلے سے کافی بہتر تھے لیکن وہ بغیر

گناہوں کی فرست بہت لمبی ہے۔ اب تمہیں ایک ایک کر کے ہر گناہ اور زیادتی کا حساب دینا ہو گا۔“ تمبرز ملک نے اسے گھورتے ہوئے چبا چبا کے کہا۔

”تم ہوتے کون ہو مجھے سزا دلوانے والے۔“ الیاس احمد کا ضبط بھی جواب دے گیا۔ انہوں نے سالے صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

”آصف ملک کا بڑا بھائی، جو تمہاری اس گھٹیا منصوبہ بندی کی بیعت چڑھا۔“ تمبرز ملک کی آنکھیں سرخ آنگارہ ہو گئیں۔

”آپ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے بھائی صاحب۔ اس سب کا نتیجہ آپ کی بہن کو بھگتنا پڑے گا۔“ الیاس احمد کے دھمکی آمیز لہجے میں دم خم باقی نہیں تھا۔ مریم بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

”میری بہن تو دس سال سے بھگت رہی ہے۔ اب تم جیسے گھٹیا شخص کی باری ہے۔ جلدی رہائی نہیں ملے گی تمہیں بھی۔“

تمبرز ملک نے ان کے کندھے پر ہاتھ کا زور سے دباؤ ڈالا۔ سامنے کھڑا شخص ان سے حیثیت و مرتبے میں بہت بلند تھا۔ قوی و صوبائی اسمبلی تک اس کے تعلقات تھے۔ وہ اسے مزید چڑا کے اپنے لیے کوئی بڑی مصیبت نہیں کھڑی کر سکتے تھے۔

تمبرز ملک کے — اشارہ کرنے پر ڈی ایس بی الیاس احمد کی طرف بڑھا۔ انہوں نے آخری غصیلی بھری نگاہ خاموش آنسو بہاتی مریم پر ڈالی۔

وہ ہاتھ مسلتی، پکپکا رہی تھی۔ ایک طرف ا کا شوہر اور بچوں کا باپ تھا تو دوسری طرف جان سے بڑھ کر عزیز بھائی اس کا واحد مہکمہ نال، باپ دونوں کی جگہ تھا۔ وہ ان دونوں کے بیچ خاموشی اختیار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔



دل آرا اور دعا، انعم کے بیڈ کے پاس کھڑی تھیں۔ جبکہ وہ پچھلے دو گھنٹے سے ہوش و خرد سے بے گانہ بڑی تھی۔ ملازمہ کی اس پر نظر پڑی تو اس نے اوڑھ بچا کے

سارے کے چل پھر نہیں سکتے تھے۔ مریم بھی بغیر ضرورت انہیں مخاطب نہیں کرتی تھی۔ عمر کے جیل جانے کی خبر اور مریم کے بدلے تیوروں نے انہیں خاصا چہرہ اکر دیا تھا۔

مریم پریشان تھی، تمبرز ملک جو کل شام آنے کا کہہ گئے تھے واپس نہیں لوٹے تھے۔ اس نے کال کی تو وہ منقطع کر دی گئی۔ بعد میں موبائل مسلسل بند تھا۔ اس کا دل کسی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ جس انسوئی سے وہ ڈرتی تھی شاید وہ ہونے والی تھی۔

”یہ ایس میم۔“ نرس نے ڈسچارج کارڈ مریم کو تمہایا۔

”یہ کیا؟“ وہ اپنی گہری سوچوں سے چونکی۔

”یہ ان کا ڈسچارج کارڈ ہے۔“ اس نے ہاتھ سے الیاس احمد کی طرف اشارہ کیا۔

”ڈسچارج کارڈ، لیکن ہسپتال اس کنڈیشن میں نہیں ہے کہ ہم۔“ مریم الجھ گئی۔

”میم! کسی تمبرز ملک صاحب کے کہنے پر انہیں ڈسچارج کیا گیا ہے۔“ نرس اُدھوری معلومات فراہم کر کے جا چکی تھی۔ مریم بے دلی سے سامان سمیٹنے لگی۔ الیاس احمد سوائے دل ہی دل میں کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مریم نے لبوں پر چپ کی مہر لگا رکھی تھی۔ وہ ان کے کسی غیر ضروری سوال کا جواب نہیں دیتی تھی۔ الیاس احمد بغیر کسی سارے کے ست روی اور نقاہت سے قدم اٹھاتے ہوئے پارکنگ ایریا تک آئے تھے۔

”ویکم مسٹر الیاس احمد، تمہیں صحت یابی بہت۔ بہت مبارک ہو۔“

تمبرز ملک باوردی پولیس آفیسر کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ الیاس احمد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مریم کی رنگت متغیر ہو گئی۔

”یہ سب کیا ہے بھائی صاحب؟“ وہ ہلکائی۔

”مکافات عمل، سزا وہ نہیں جو عمر نے تمہیں دی ہے۔ سزا تو اب شروع ہوگی، کیونکہ تمہارے اور عمر کے

کے بیٹھ گیا ہے۔

ڈاکٹر کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ بیت گیا تھا۔ انعم کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ دعا سے ان کی پریشان صورت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ انہیں تسلی دلا سے دے کے باہر لے آئی۔ اب وہ ان کے سامنے اپنا تجزیہ بیان کر رہی تھی۔

”تمہارا مطلب وہ احسن پر شک کرنے لگی ہے۔ اس کی محبت سے بدگمان ہو گئی ہے۔“ دل آرانے حیرانی سے کہا۔

”حیرت ہے، آپ اس سے اتنا قریب ہیں پھر آپ نے اس کے رویے میں یہ منفی تبدیلیوں محسوس نہیں کی۔“

دل آرا کے چہرے پر ابھرنے والی شکون کا پرموج جلال دعا کو ابھار گیا۔

”یہاں کیسے ہو سکتا ہے۔ احسن اس کا شوہر ہے۔ شک تو اس نے تب بھی نہیں کیا تھا جب وہ ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ احسن کو فارن کنٹری

اسٹڈیز کی پر مشن اسی نے دلائی تھی۔ میں تو احسن کی اس خواہش کے تحت خلاف تھی۔ میرے دل میں سو طرح کے دوسو تھے۔ اگر اس نے وہاں جا کے اپنا

عہد توڑ دیا تو میں انعم کو کیسے سنبھالوں گی؟ تب اس نے میرا حوصلہ برعیا تھا۔ اسے اپنی محبت کی سچائی پر پختہ

یقین تھا اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ احسن لاسٹ پیپر دے کے اگلے روز میرے پاس تھا۔ انوکے لیے اس کی دار فتنگی پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ان دونوں نے بچپن

سے لے کر آج تک کسی تیسرے کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ ان دونوں کی دنیا ایک دوسرے کے قرب سے ہی مکمل ہے۔“

دل آرا اس سچائی کو ماننے میں تامل کا شکار تھیں۔

”یہ سب میں بھی جانتی ہوں آئی جی وہ احسن سے محبت کم اور اس پر اعتماد زیادہ کرتی تھی اور بڑے غم سے گردن اڑا کے کہا کرتی تھی کہ احسن میرے اعتماد کو توڑ ہی نہیں سکتا۔ آپ شاید ٹھیک سے میرا پوائنٹ آف ویو سمجھ نہیں پا رہیں۔ بظاہر جو ہمیں انعم کا شک

لگ رہا ہے وہ دراصل کچھ اور کیفیت ہے۔“

اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا تاکہ دل آرا کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ اتنی بڑی بات کہنے سے مل سکے۔

”کچھ اور کیا ہے؟“ ان کے تجسس کو ہوا لگی۔

”انعم کی وہ کمزوری۔ احساس کمتری ہے۔ وہ کی جو اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ اب اسے اپنے محبوب سے ہٹ کر صرف شوہر کے روپ میں دیکھنے لگی ہے۔ جس کو اولاد اور وارث کی چاہ ہو سکتی ہے۔ ایسے میں وہ

اس سے چھپ چھپا کے غمے دھوکے میں رکھ کے کہیں دوسری شادی نہ کر لے۔“

دعا نے اتنے دن اس کے ساتھ گزارنے پر جو کچھ محسوس کیا تھا وہ تھوڑی جھجک کے ساتھ ان کے گوش گزار دیا۔ دل آرا سکتے کی حالت میں بیٹھی تھیں۔ وہ اپنی فیملی میں بہت سمجھ دار اور زیرک خاتون سمجھی جاتی تھیں، ان کی عقل میں اتنے نزدیک کی بات کیوں نہ

آئی۔

وہ کینیڈا میں تھیں تب بھی انعم احسن کی ذرا ذرا سی شکایت پر رونے لگتی اس کا یہ رویہ پچھلے چند ماہ سے تھا اور ان دونوں شدت پکڑتا جا رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دن بھر اکیلی ہوتی ہے اس کے پاس احسن کو سونے کے علاوہ اور کوئی ایکٹیوٹی نہیں۔ اس لیے معمولی باتوں کو بھی دل سے لگا لیتی ہے۔

احسن میچپور اور بریٹیکل ہو گیا تھا۔ اس میں تھوڑی بہت تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اب پہلے سے زیادہ مصروفیت تھی اور بزنس وسیع ہو گیا تھا۔ اپنے باپ دادا کے حوالے سے اسے سیاست دانوں میں بھی اٹھنا

بیٹھنا پڑتا تھا۔ سو طرح کے جھیلے تھے لیکن انعم بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ اس کی مجبوری اور ذمہ داری کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی تھی۔ انعم کی سوچ اس اسٹوڈنٹ لائف میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔ اب انہیں دعا کا کہا ہر لفظ جھجک لگ رہا تھا۔

”میں۔ میں تو انوکھی ماں ہوں پھر میں اس کے اندر آئی ہوئی اتنی بڑی تبدیلی کیوں نہیں پہنچاتی۔“

نمنا دیتیں۔ اور کبھی عمیر یا ریاض احمد کو چائے کا ایک کپ بھی بنا کر دینے کی روادار نہ ہوتیں۔ ابھی بھی عمیر نے خود ملازمہ کے سر پر کھڑے ہو کر چائے، ٹائلس بنوائے تھے۔ اب وہ رابعہ اور ریاض احمد لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”میرا خیال ہے تم کراچی جا کے دعا کو واپس لے آؤ۔“ ریاض احمد نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اچانک مشورہ دیا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“ عمیر کے کپ سے چائے چھلک گئی۔

”سم۔۔۔ مگر کیوں پایا جان۔“ ایک بے ٹکاسوال اس کے منہ سے پھسلا۔

”کیا مطلب کیوں؟ میں چاہتا ہوں کہ ہم نے جو اس کا اعتماد توڑا ہے وہ اپنے دشمنوں کو جیل میں دیکھ کے بحال ہو۔ اسے پتا چلے کہ ہم سب واقعی دل سے اس کا برا نہیں چاہتے تھے ہمیں گمراہ کیا گیا تھا، ورغلا یا گیا تھا۔ ہم سب اس سے معافی مانگیں گے۔“

ریاض احمد نے کپ میز پر رکھ دیا۔

”تمہارے پایا جان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، تم مجھے بھی ساتھ لے جانا عمیر، میں اسے منالوں گی۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑوں گی کہ مجھے معاف کر دے وہ بہت اچھی اور نرم دل ہے وہ ضرور ہماری عزت و دلچ رکھے گی۔ مجھے لے جاؤ عمیر اس کے پاس، پلیز عمیر۔“ رابعہ احمد اس کا بازو جھنجھوڑ کر منت کر رہی تھیں۔ عمیر اس اچانک افتاد پر بھونچکا رہ گیا۔ وہ انہیں کیا جواب دے، کیسے ٹالے۔

”اگ۔۔۔ اگر اس کے بھائی نے انکار کر دیا، نہ بھیجا، اب صرف دعا کے متعلق نہ سوچیں۔ پچھلی بار بھی حماد کا رویہ بہت اکھڑا اور سخت تھا۔ نجانے اسے دعا نے کیا بتا کر مطمئن کیا ہے۔ اگر اس نے کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا تو۔۔۔“

عمیر نے بہت سارے سوالات ان کے سامنے لا کھڑے کیے تاکہ ان کا ذہن الجھ کے اس فرمائش سے ہٹ جائے۔

”اس کی وجہ آپ کی وہ بے تحاشا محبت ہے جو آپ انعم سے کرتی ہیں۔ آپ اس سب کو اس کی ذہنی باتری کے بجائے اس کا پچھنا خیال کرتی رہیں۔“ اسے ان کی عقل پر قطعاً ”انسوس“ نہیں تھا۔

”اس سب کا کوئی حل بھی تو ہونا چاہیے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ اگر ان کے درمیان غلط فہمیاں طول پکڑ گئیں تو۔۔۔“ دل آرا کے دل میں نئے خوف نے سر اٹھایا۔

”حسن ایک سمجھ دار اور پریکٹیکل انسان ہے۔ آپ کو اس سے ڈیٹیل میں بات کرنا ہوگی۔ وہ یقیناً سمجھ لے گا۔ انعم کو سمجھانا فی الحال مشکل ہے۔ احسن وقتاً فوقتاً اسے اپنی محبت کا یقین دلائے۔ آفیشل ورک سے ہٹ گئے ان کی ایک ڈومیسٹک لائف بھی ہے۔ جس میں ایک معصوم اور تھوڑی سی لگی سے لڑکی ان سے خود ہی لڑتی اور اس کے لیے روٹی رہتی ہے۔ انعم کو بھی تھوڑا گاڑی کریں کہ وہ شوہر کی ذمہ داریوں کو سمجھے اور اپنا پتلے جیسا بھروسا قائم رکھے۔“ دعا نے کسی ماہر نفسیات کی طرح اس مسئلے کا حل بھی بتا دیا۔

دل آرا کو اس کی سمجھ داری پر رشک آ رہا تھا۔ ان کا ذہن کسی اور طرف لیٹ گیا۔

”سنو تم احسن کو بھائی کیوں نہیں کہتیں۔“ دل آرا نے اچانک بہت عجیب اور بے ٹکاسوال کر ڈالا۔

”جی۔۔۔“ دعا کا دماغ جھنجھنکا رہ گیا۔ یہ کیسا بے موقع سوال تھا؟ وہ جواب دینے کے بجائے دل آرا کا منہ ہمتی رہ گئی۔



رابعہ احمد کو بالکل چپ لگ گئی تھی وہ دن بھر اپنے بیڈ روم میں اور کبھی کھر کے کسی کونے میں پڑی رہتیں۔ خلاؤں میں گھورے جاتیں اور کبھی سر جھکائے آنکھیں موندے، ذرا سی آہٹ پر چونک جاتیں۔ گھر کا سارا نظام ملازموں پر چھوڑ دیا تھا۔ دل چاہتا تو بچن میں آجاتیں اور سارے کام خود ہی

سے کوئی مدد کرے۔“ الیاس احمد بڑے دور کی کوڑی لائے تھے۔

”برے وقت کا ساتھی کون ہوتا ہے“ عمر نے مایوسی سے کہا۔

”اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے لالچ میں آکے کتنی غلطیاں کی ہیں۔“ عمر نے آخر اعتراف کر ہی لیا تھا۔

”جو بھی ہوا، لیکن ہمیں کم از کم دعا کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ الیاس احمد نے بھی ہلکا سا اعتراف جرم کیا۔

”چاہا اب سو جائیں چاچو جان! صبح پھر اٹھ کے مزدوری پر جانا ہے۔ میری تو ٹانگوں میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ عمر کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے بازو دہرا کر کے سر کے نیچے رکھ لیا۔



دعا کا حرف بہ حرف سچ نکلا تھا۔ وہ دل آرا کے گلے سے لگی پھوٹ پھوٹ کے روتے ہوئے احسن کے آخری الفاظ دہرا رہی تھی۔ سادگت وصامت بیٹھی دل آرا کا یقین پختہ ہو گیا تھا۔ وہ پہلی بار سنجیدگی سے سوچنے لگی تھیں۔

”تم جانتی ہو انعام! تمہارا ایک بار پہلے بھی نروس بریک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ کل بھی تمہارا لی پی اتنا ڈاؤن تھا۔ اگر کوئی سیریس نقصان ہو جاتا تو میں احسن اور جنید آفندی کو کیا جواب دیتی۔ تم کیوں اپنی جان کی اور ہماری دشمن بن گئی ہو۔“ دل آرا نے سنجیدگی سے کہا۔ انہوں نے اسے تسلی نہیں دی تھی۔

”آئی ایم سوری ملاجی، آئی ریلی ڈونٹ نو کہ میری طبیعت اتنی کیسے بگڑی۔ میں آپ کو پکارنے والی تھی لیکن مجھے ہوش ہی نہیں رہا۔“ انعام نے منمنائے اپنی کمزوری صفائی دی۔

”تم سب کچھ خود ہی فرض کر لیتی ہو۔ احسن کی ہر بات اور عمل کا غلط مطلب نکالتی ہو۔“ دل آرا انج ہو گئی تھیں۔

”تم بھی درست کہہ رہے ہو لیکن ہمیں ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ دعا ضرور مان جائے گی۔“ چپ سا دھمے رابعہ احمد بھی بولنے لگی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو ابھی اڑکے پہنچ جاتیں۔

”مگر ہم اس طرح اچانک سے گئے اور اس نے ہمارے ساتھ لڑائی جھگڑا کیا، دے دے ہی آنے سے انکار کر دیا تو بلاوجہ معاملہ بڑھ جائے گا“ پھر ابھی میرے پاس اس کا ایڈریس بھی نہیں ہے۔“ عمید کے ذہن نے تھوڑی پھرتی دکھائی۔

”عمید کی سوچ بھی درست ہے، ہمیں کال کرنی چاہیے۔“ ریاض احمد جلد ہی متفق ہو گئے جبکہ رابعہ احمد کے چہرے پر مایوسی چھائی۔ وہ اپنے کیے پر از حد شرمندہ اور معافی مانگنے کو بے تاب تھیں۔

”میں کل شام ان کے گھر جاؤں گا۔ کرایہ داروں سے ان کا ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر لوں گا۔“ عمید اتنا کہہ کر مزید سوالات سے بچنے کے لیے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔



الیاس احمد کی حالت عمر سے بھی زیادہ بری تھی۔ انہیں سیدھا اسپتال سے میاں لایا گیا تھا۔ ان کا جسمانی ریمانڈ بھی پورے تین دن کا تھا۔ ان کی عقل بھی ٹھکانے آ گئی تھی۔ وہ جو عمر کو جیل سے باہر جانے کے بدلہ لینے کی باتیں سوچتے تھے وہ جوش بھی ماند پڑ گیا تھا۔

”لگتا ہے ہم دونوں کو چھڑانے کے لیے کوئی نہیں آنے والا۔“ الیاس احمد کے دل میں ابھی بھی خوش فہمی باقی تھی جبکہ عمر اپنی ہر امید ختم کر چکا تھا۔

”ہم دونوں یہاں آپ کے سالے صاحب اور میرے لابی کی ملی بھگت سے قید ہیں وہ ہمیں کیوں چھڑائیں گے۔“ عمر کی شکل خاصی بے چاری لگ رہی تھی۔

”تمہارا کوئی یار دوست ملے نہیں آیا۔ وہ جن کے باپ، بیس اور اکیس گریڈ کے آفیسر تھے شاید ان میں

”کوئی خاص بات ہے۔“ اس کی زبان لڑکھرائی۔

”میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قسمت میں خواری لکھی۔ نجانے میں اتنی خود غرض کیسے ہو گئی کہ عمر کی بھلائی کے لیے اس معصوم لڑکی کو ٹارگٹ بنالیا۔ بخیرا عمیر، میرا خدا آگواہ ہے کہ میری نیت خراب نہیں تھی نہ ہی میں چاہتی تھی کہ عمر اس کے ساتھ کچھ برا کر دے۔ میں تو عمر کے اندر کسی مثبت تبدیلی کی خواہش تھی۔ مجھے اپنی اس چھوٹی سی خواہش یا غلطی کا تدارک بخیرا خدا بخشنا پڑا ہے۔ میرا گھر، میری اولاد، مجھ سے بدظن ہو گئی۔ مجازی خدا نے تو اس دن کے بعد سے پلٹ کے نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی۔ نہ گلہ نہ شکوہ، بس ہر سو خاموشی، یہ خاموشی مجھے اندر سے کاٹی ہے۔ میری غلطی مجھے گناہ لگنے لگی ہے۔ میرا ضمیر مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ میں سب کے پیچھے بھاگ بھاگ کے تھک گئی ہوں۔ ٹوٹ گئی ہوں۔ مر رہی ہوں عمیر۔“ ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ رکے آنسو بڑی تیزی سے رواں ہوئے تھے۔

عمیر سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو نکتے گیا۔ اب وہ ہمیشہ کی طرح انہیں خود سے لگا کے بیٹھ سہلا کے سر چوم کے دلا سے نہیں دیتا تھا۔ پھر وہ کن الفاظ میں ان کی تسلی و تشفی کروانا۔

”آپ پریشان مت ہوں، سب بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ آخر وہ مل تھیں۔

”یہ سب تب ہی ٹھیک ہوگا، جب وہ اس گھر میں لوٹ آئے گی، ہم سب کو معاف کر دے گی۔“ انہوں نے اپنے آنسو خشک کیے عمیر کو ان کے یہاں آنے کی وجہ اب معلوم ہوئی تھی۔

”میں کوشش کر رہا ہوں نا اسے واپس لانے کی، لیکن وعدہ نہیں کرتا۔“ اس نے آس و نراس کے درمیان معاملہ لٹکایا۔

”تم مجھے۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار اس کے پاس لے جاؤ۔“ وہ منت ساجت پر اتر آئیں۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں ملا جان، جتنا آپ نے

”آپ کو میں اور میری لہلہنگو جھوٹ لگتی ہیں۔ اس دن اگر آپ نے مجھے اس کے ساتھ اسلام آباد بھجوا دیا ہوتا تو میری یہ حالت نہ ہوتی۔ آپ تو اب بھی مجھے غلط اور اسے ٹھیک کہہ رہی ہیں کیونکہ وہ آپ کا اکلوتا اور چھپتا بیٹا ہے۔ میں کسی کی کچھ بھی نہیں۔“ انہم ایک دم زور زور سے بول کر رونے لگی۔

دل آرا کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ وہ اسے ہکا بکا دیکھ رہی تھیں۔ انہم ہاتھ سے گل رگڑتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ اسے احسن کے ساتھ ساتھ ان کی محبت پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ ان کی — آنکھوں میں آنسو جلد ہو گئے تھے۔



اس نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کے ہاتھ سر کے نیچے رکھ لیے اور آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت تھک گیا۔ نیند اس کی دکھتی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ دعا کو بھلا کے، جتنا خود کو عملی زندگی میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتا، وہ اسے مزید شدت سے سیاد آتی۔ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اپنے انہماک سے چونک کے سیدھا ہو گیا۔ بھلا اس وقت کون ہو سکتا تھا۔

”طیس کم ان! اس نے آنے کی اجازت دی۔ راجہ احمد آہستگی سے دروازہ دھکیل کے اندر داخل ہوئیں۔

”میں سمجھی، شاید تم سو رہے ہو گے۔ اس لیے احتیاطاً“ دستک دی۔“ اسے ابھی تک جاگتا دیکھ کے انہیں حیرت نہیں دکھ ہوا تھا۔

”ذہن پر سکون ہو تو نیند خود بخود مہیاں ہو جاتی ہے۔“ اس نے گلہ نہیں کیا تھا، غیر ارادی زبان پھسل گئی۔

”میں تمہارے پیلا جان کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ کرسی کھینچ کے اس کے دائیں طرف ٹک گئیں۔

سے بے فکر ہو کے چند ماہ بعد ہی دوسری شادی کر لی۔ یوں وہ ہمیشہ کے لیے دل آرا اور جنید آفندی کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی بن گئی۔ وہ اسے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھوں سے او بھل نہ کرتے۔

چھ سال کا احسن، جوان کا اکلوتا، جائیداد کا وارث تھا۔ اس کا کمرہ گورنس کے ساتھ الگ کر دیا گیا تھا جب کہ انعم پورے گیارہ برس کی عمر تک اپنے والدین کے ساتھ سوئی رہی تھی۔ دل آرا اور جنید آفندی کو اسے خود سے الگ کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا تھا۔

احسن اور انعم میں بہت دوستی تھی لیکن کھیل کے دوران ان کی لڑائی ہوتی تو ڈانٹ احسن کے حصے میں آتی اور وہ بخوشی اس ڈانٹ کو سن کر تھوڑی دیر بعد پھر سے اس پھولے گالوں والی لڑکی کو سوری کر کے منا لیتا۔ اس نے کبھی اپنے والدین کے رویے میں اس فرق کو محسوس نہیں کیا تھا۔ انعم اس کی بھی عادت بن گئی تھی۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ محبت وصول کرنا اس کا حق ہے اور وہ بھی اپنے والدین کی طرح اس کو گریبا سے محبت کرتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محبت مضبوط ہوتی گئی۔ وہ دونوں بھی ایک بل دور رہنے یا الگ سے کوئی ایکٹوٹی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہ دل آرا کی انعم سے شدید اور بچی محبت تھی کہ انہوں نے اسے بیٹی سے بہو بنا لیا تھا۔ انعم جس کی ہر خواہش زبان پر آنے سے قبل پوری کی گئی تھی۔ جسے زندگی میں بھی مگر م و سرود ہوائے چھو اتک نہیں تھا وہ انعم اس وقت پہلی بار روئی تھی جب شادی کے تین سال بعد، میڈیکل چیک اپ میں اس کی نیکٹو رپورٹس آئی تھیں۔

اب انعم میں ایک اور واضح اور منفی تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ جو انعم کے متعلق سوچنے سے تیز رہی تھیں، وہ دعائے صاف اور واضح لفظوں میں انہیں بتا دیتا تھا۔ دل آرا نے بہت سوچ سمجھ کے اس کا حل سوچ لیا تھا۔



سوچ لیا ہے اتنا بڑا اور گھٹیا الزام اس کے کردار پر لگا ہے۔ وہ بھی ان لوگوں کے ہاتھوں جو آنکھ کھانے سے لے کر اب تک ہمیشہ سے اس کے سب کچھ تھے۔ نہ تیا، نہ چچا، نہ پھوپھی نہ خالہ۔ ماں کے بعد اس کے سب رشتے ہم سے ہی تو منسوب تھے، ہم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بے شک ہم نے زبان سے کچھ بول کے اس کی کردار کشی نہیں کی، لیکن ہم نے اس کے حق میں آواز بھی تو بلند نہیں کی۔ اگر آپ اس وقت آگے بڑھ کر عمر کے منہ پر پھپر مار کے اسے بتی کہہ کر سینے سے لگائیں تو شاید آج آپ کو یہ خلش نہ ستا رہی ہوتی۔ جب اسے اس گھر سے تھکھٹ کے لے جایا جا رہا تھا تب بھی کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نہ روکا۔ حالانکہ وہ کتنے ماں سے سر اٹھا کے اس گھر میں آیا کرتی تھی۔ اس کا وہ زخم۔ وہ گھاؤ جو ہم نے لگایا ہے۔ وہ بہت گہرا ہے۔ ابھی اسے سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ اس پر زور زبردستی کرنا مناسب نہیں، اب کی بار اسے خود فیصلہ کرنے دیں۔ پلیز ماما جان۔۔۔ پلیز۔۔۔

اس نے بڑے صاف اور واضح الفاظ میں سب کچھ ان کے سامنے کھول کے رکھ دیا۔ رابعہ احمد کی زبان تالو سے لگ گئی۔ وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ صبر نے لباس اس خارج کر کے خود کو ہلکا کیا۔ ان کے ذہن و دل پر بوجھ بڑھنے لگا تھا۔



دل آرا رات کے کھانے پر بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھیں۔ انعم کی بدگمانی اور شکوک بھرے الفاظ ان کے دل میں کھب سے گئے تھے۔ احسن کی پیدائش کے دوران ایسی پوچھ گچھیں ہو گئی تھیں کہ دل آرا پھر سے ماں نہ بن سکیں۔ ان کے دل میں بیٹی کی شدید خواہش تھی جو وہ بچے کے رہ گئی لیکن انعم کی ماں کی وفات کے بعد انہوں نے خود بخود اس معصوم بچی کو اپنی ممتاز بھری آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ ان کے ساتھ اس قدر کھل مل گئی تھی کہ اس کے باپ نے اس کی طرف

نفی میں سرہلایا اور دل آرانے اتنے ہی پر زور طریقے سے اثبات میں سرہلا کے اس کے وہم کو یقین میں بدل دیا۔



ریاض احمد نے عمیر کو حماد کے برائے گھر کا رابطہ نمبر اور پتہ لینے بھیجا تھا۔ عمیر شام کا گیارہ گئے تک واپس نہ لوٹا۔ وہ سڑکوں پر بلاوجہ گاڑی دوڑاتا، دعا کو ڈھونڈتا رہا۔ شاید کسی بازار یا سڑک کے فٹ تھپر پر چلتی نظر آجائے اور اسے کئی ایک جگہوں پر وہ نظر ابھی گئی۔ اس کے پاؤں یک دم بریک پر جا پڑتے۔ ایسا تو اکثر ہوتا تھا۔ چونکتا، رکتا، ٹھٹھکتا اور بھونڈا ٹوٹ جاتا۔

اس کا خیال تھا ریاض احمد دعا کھا کے سو گئے ہوں گے۔ اس نے مرکزی دروازہ کھول کے اندر قدم رکھا وہ دونوں لاؤنچ کے صوفوں پر براہمن رات کے سوا بارہ بجے بھی چاق و چوبند عین مرکزی دروازے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ وہ جس لمحے بجنے کے لیے رات گئے گھر آیا تھا وہ تکلف و مح سامنے گھڑا تھا۔

”عمیر! نمبر مل گیا؟ تم نے کال کی؟“ اتالیٹ کیوں آئے ہو؟ میں کب سے انتظار میں بیٹھا ہوں۔“ ریاض احمد کی بے تابی میں بہت سی سوال چھپے تھے۔ ”تمہارا سیل فون بند کیوں جا رہا تھا۔ ہم نے کئی بار ٹرائی کیا۔“ رابعہ احمد کی پریشانی متا بھری تھی۔

”وہ بھٹی۔ ڈاؤن تھی۔ آپ لوگ بلاوجہ پریشان ہو رہے تھے اور پیاجان، آپ نے دو ایکوں نہیں لی۔“ اپنے حواسوں پر قابو پاتے ان کے سوالوں کو نظر انداز کر کے اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔

”میں نے تمہیں حماد کی طرف بھیجا تھا۔ میڈیسن کھا بھی لیتا تو نیند تب بھی نہ آتی۔ اب بتاؤ کہ کیا بنا؟“ ریاض احمد کو اس کی بے وقت کی فکر ذرا نہیں بھائی تھی۔

”پیاجان نمبر مل گیا ہے۔ میں نے کال کی تھی، لیکن حماد۔ حماد میری آواز سننے ہی تھکے سے اٹھ گیا۔ بہت ناراض ہو رہا تھا، دعا نے اسے سب سچ بتا دیا ہے۔“

چند گھنٹے رونے دھونے کے بعد جب انعم کے ذہن و دل کا تمام غبار دھل گیا تو اسے دل آرا کے ساتھ اپنے الفاظ اور کلچر روپیہ یاد آیا۔ وہ از حد شرمندگی میں گھری کمرے سے نکلی تھی۔

”مامی۔ ماما جی، پلیز دروازہ کھولیں، پلیز ماما جی۔“ وہ روتے ہوئے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی۔

”آم ریلی سوری ماما جی۔ آپ ہی میری ماں ہیں، آپ میرا سب کچھ ہیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا، آپ مجھے ماریں، ڈانٹ لیں، لیکن مجھ سے ناراض مت ہوں۔“ اس کی گریہ زاری بڑھتی جا رہی تھی۔

”میرا دل بند ہو جائے گا ماما۔“

اس کے دل کا بند ہونا متوقع تھا اور دل آرا کا دل بند ہو گیا تھا۔ انعم کے آنسوؤں نے ان کا کلیجہ مسل ڈالا تھا۔ انہوں نے پھرتی سے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ انعم سیدھی ان کے سینے سے آگئی۔

”پلیز ماما جی، مجھے معاف کر دیں۔ چاہے دس جوتے لگائیں لیکن ناراض مت ہوں۔“ وہ ان کے سینے سے چٹی زار و زار سسکتی منت کر رہی تھی۔

دل آرا نے اس کے گرد دونوں بازو لپیٹ کے اسے خود میں مزید سمیٹ لیا، جیسے وہ اسے بچپن میں خوف زدہ ہو جانے پر خود میں چھپا لیا کرتی تھیں۔ ”میں نے تمہاری زندگی سے جڑے اس اہم مسئلے کا حل سوچ لیا ہے۔“ ان کی آواز میں سنجیدگی نمایاں تھی۔

”سچ ماما جی! آپ احسن کو سمجھائیں وہ واپس آئے تو اچھی طرح اس کی کلاس لیں۔“

”نہیں۔“ دل آرا نے یک لفظی جواب دیا۔

”تو پھر؟“ انعم کی سرخ آنکھیں ان کی جانب اٹھیں۔

”احسن کی دوسری شادی، میں احسن کی دوسری شادی کروا رہی ہوں۔“

دل آرا نے اتنا بڑا دھماکا اتنے آرام سے کیا کہ انعم کو لگا کہ اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس نے زور سے

کہہ رہا تھا آپ لوگوں نے میری بہن پر الزام لگا کے اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت معصوم عیدھی سا دی اور پاکیزہ ہے۔ اس نے دعا سے رابطہ کر اے سے صاف انکار کر دیا۔ دعا کی ذہنی حالت بہت اہتر تھی۔ ابھی وہ بہت مشکل سے سنبھل پائی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب وہ اس پر، ہم لوگوں کا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گا، پہلے ہی اس نے ہم پر اعتماد کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے دعا کا باہری یونیورسٹی میں انڈیشن کر دیا ہے۔ وہ اب پاکستان نہیں آئے گی۔ وہ کل بزنس فور پریڈی جا رہا ہے۔ دعا بھی ساتھ جا رہی ہے۔ اس نے اپنا بزنس بھی دینی میں سپنڈل کر لیا ہے۔ اس کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔“

اس قدر مبالغہ آرائی کے بعد اس نے شکر کا لمبا سانس خارج کیا کیونکہ ان دونوں کے چہرے کے تاثرات واضح کر رہے تھے کہ وہ اس کے کئے الفاظوں پر یقین رکھتے ہیں۔

”عمیر۔ پلیز عمیر، اس سے کہو کہ ایک بار۔ صرف ایک صرف مجھے دعا سے مل لینے دے“ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کے، سینے سے لگا لیں گا تو میرے جلتے سینے اور بوڑھی آنکھوں کو سکون مل جائے گا۔“ ریاض احمد کے لہجے میں التجا در آئی تھی۔ وہ روہانے ہو رہے تھے۔ راجہ احمد ساکت بیٹھی تھیں۔

”پلیز پاپا جان، مجھے وہ دونوں حق بجانب لگ رہے ہیں۔ مجھے مناسب نہیں لگ رہا کہ ہم دعا کو مزید پریشان کریں، پھر آپ کا بھی تو خواب تھا کہ وہ باہری یونیورسٹی میں پڑھنے جائے۔ اب وہ راضی ہو گئی ہے تو پلیز اسے جانے دیں۔ اس نے بھی خود کو بھلانے اور سب کچھ بھلانے کے لیے اتنا بڑا اسٹیپ لیا ہو گا۔ پاپا جان وہ بہت سادہ اور معصوم دل ہے۔“

وہ بولتے ہوئے صوفے سے اٹھ کے باپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ کسی کے لیے بھی اپنے دل میں کینہ اور بغض نہیں پالتی، آپ تو پھر اس کے پاپا جان ہیں۔ میں نے آخری ملاقات میں اس

کے سامنے سب کلیئر کر دیا تھا کہ میں یہ سب پاپا جان کے کہنے پر کر رہا ہوں۔ اس کا دل آپ کی طرف سے صاف ہے، اسے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے باہر جانے دیں، وہ لوٹ آئے گی۔ بس تھوڑا سا انتظار۔“ اس نے باپ کے ہاتھ تھام لیے۔

اسے جب بھی اپنی کوئی بات منوانی ہوتی۔ وہ یوں ہی ان کے ہاتھ نرمی سے تھام کے سر جھکا کے تھپکنے لگتا، جہاں وہ باپ کا اتنا فرماں بردار اور مان رکھنے والا تھا۔ انہیں بھی اسے انکار کرتے ہوئے جھجکا آتی۔ اب بھی آنسو بوڑھی آنکھوں میں جم گئے تھے۔ آنکھ سے باہر نہیں گرے تھے۔

انہوں نے سر اثبات میں سر ہلا دیا۔ عمیر کے دل سے بہت بڑا بوجھ سرک گیا۔ راجہ احمد خاموش رہیں۔ کل رات عمیر نے انہیں بھی اچھی طرح سب سمجھایا تھا۔ انہیں بھی یہی بہتر لگ رہا تھا۔



تمیز ملک، اپنے کمرے سے نکل سک سے تیار آفس جانے کے لیے نکلے۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اچانک ان کی نگاہ گلاس وال سے نظر آتے وسیع لان پر پڑی تو وہ ٹھنک کر رک گئے۔ ان کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ مریم کے بچے لان میں بلیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور وہ خود لان میں پڑی کرسی پر مقنوم صورت لیے ایک نقطے پر نگاہیں ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ وہ کتنی دیر رک کے اسے بغور دیکھتے رہے۔ ان کے دل پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی یہ ان کے گھر کی بلبل ہوا کرتی تھی۔ سارے گھر میں اس کی چکار، تھنقوں اور شرارتوں سے ہر دم رونق رہتی۔ اس کے چہرے پر اپنی دور سے بھی صدیوں کی ٹھکن واضح پڑھی جا سکتی تھی۔

”راشدہ۔ راشدہ۔“ انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔ وہ بھاگتی ہوئی ان تک پہنچی۔

”جی سر۔“ وہ مودب تھی۔

”مریم کو بلا کر لاؤ۔“

بھر دو بارہ اس کی شکل نہ دیکھتے۔ اس کے پاس بھائی کے علاوہ کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ پھر وہ جھوٹ بھی نہیں بول رہی تھی۔

”تم جو کہہ رہی ہو۔ وہ بالکل سچ پر مبنی نہیں ہے مریم! تم نے اس لڑکی کو اپنے گھر کے کمرے میں قید کر کے، اس کی آئندہ کی پوری زندگی کے لیے اپنے معذور اور ذہنی مریض بھائی کا انتخاب کر کے، کیا اچھا کیا تھا؟ اس نے تمہارا کون سا بڑا نقصان کیا تھا جو تم اس سے بدلے میں، پوری زندگی مانگ رہی تھیں۔ اس یتیم و مسکین لڑکی کو سزا دینے کا اختیار تمہیں کس نے دیا تھا؟ تم خود بھی ایک ماں تھیں مریم! میں نے تمہاری تربیت اس سچ پر تو نہیں کی تھی کہ تم ظالم اور سفاک بن جاؤ۔ تمہارے اندر سے رحم و ہمدلی ختم ہو جائے اور تم دوسروں کی تقدیر کے فیصلے کرتی پھو۔ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے قبل تمہارا دل نہیں کلپا۔ تم اس لڑکی کو گناہ گار سمجھ کے سزا دے رہی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ تم خود سزیاں لوگی۔“

وہ اتنی آسانی سے مریم کو چھوڑنے والے نہیں تھے اور نہ ہی اس کے آسوان کے دل کو موم کر کے سچ کہنے سے روک سکتے تھے۔

”اب تم سر جھکائے روتی رہو۔ مریم! اب تم نے ایک بار بھی نہ سوچا کہ تم نہ صرف اس یتیم لڑکی کے ساتھ زیادتی کرنے جا رہی ہو بلکہ اپنے باپ جیسے بھائی کو بھی دھوکا دینے جا رہی ہو۔ الٹا تم صفائیاں دے رہی ہو کہ تم بے گناہ ہو، تم نے کچھ نہیں کیا، بے خبر تھیں۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مجھے مزید دھوکا دے رہی ہو۔ میری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ سزا کی مستحق تو تم بھی ہو۔ چونکہ میں تمہاری طرح خود کو خدا نہیں سمجھتا، اس لیے تمہارے لیے کوئی سزا منتخب نہیں کروں گا۔ تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ تم اپنے شوہر اور گھر سے دور رہو بالکل اس معصوم کی طرح جو در بدر ہو رہی ہے۔“

تیز ملک سے مریم کا رونابرداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس پر کلکیلی نگاہ ڈال کے اٹھے اور لمبے لمبے ڈگ

وہ ابھی بھی اسے نگاہوں کی زد میں لیے ہوئے تھے۔ جو خود پر مرکوز ان دو نگاہوں سے بے خبر تھی۔ ملازمہ فوراً حکم کی تعمیل میں باہر دوڑی۔ انہوں نے چند لمحوں بعد دیکھا کہ پیغام ملنے ہی مریم اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ وہ بھی صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

”جی بھائی صاحب! آپ نے بلوایا تھا۔“ وہ ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھیں۔

”بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے ٹھوڑی پر انگلی پھیری۔ مریم ڈراسی ہوئی سمٹ کر بیٹھ گئی۔

”جو کچھ الیاس نے کیا، اس سب میں تم کتنی شامل تھیں؟“ بغیر تمہید باندھے اچانک پوچھ لیا گیا۔ مریم کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

”آپ کی قسم بھائی صاحب! میں عمر اور الیاس احمد کی منصوبہ بندی اور چالوں سے بالکل بے خبر تھی۔ میرا خدا گواہ ہے جس رات وہ عمر کے کمرے سے برآمد ہوئی، میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ہم سب لاعلم تھے کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور اس نے

بھی اپنی صفائی میں زبان تک نہ کھولی۔ جب وہ میرے کمرے آئی تب میں نے ضرور اس سے زیادتی کی کیونکہ مجھے غصہ تھا کہ اس معصوم صورت نے ہم سب کو اتنا

بڑا دھوکا دیا۔ ریاض بھائی کا مان اور گھر توڑ دیا۔ میں بد بخت اور بے وقوف عورت اپنے مجازی خدا کے دل کا چور اور آنکھوں پہ چڑھی لالچ کی پٹی نہ پکڑ سکی۔ اس نے جب بھی رقم کا مطالبہ کیا، آپ نے اسے دے دی

اور میں واقعی یہ سمجھتی رہی کہ اس کے برائے میں کرائسٹس چل رہے ہیں۔ اس نے کبھی رقم واپس نہیں کی۔ اس لالچی کی نظر میرے حصے کی جائیداد پر لگی

ہے۔ یہ تو میں تب جان پائی جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ جب وہ پورچ میں گولیاں کھا کے مر رہا تھا۔ بخدا میں کچھ نہیں جانتی تھی۔“

مریم زاد زار رونے لگی۔ وہ بھی کمرے میں کھڑی تھی۔ بھائی صاحب سخت اصول پسند اور خدا ترس تھے۔ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ اس پر شک کی صورت میں اسے فوراً یہاں سے چلا کر تے۔ زندگی

محل سے پوچھا۔

”میں اپنی ماں کی محبت اور خلوص پر شک کرنے کا گناہ نہیں کر سکتی، لیکن آپ احسن کو مجھ سے جدا کرنے اور میری محبت کی تقسیم۔۔۔“ انعم بولتے ہوئے زور زور سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اس کے لیے مزید بولنا دشوار تھا۔

”احسن بھی تم سے اتنی ہی شدید محبت کرتا ہے۔ تم دونوں کو کبھی جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ انعم نے جلدی سے اپنے گلے سے آنسو پونچھے۔

”پہلے تو تم یہ ایڈمٹ کر لو کہ تم ہر رشتے سے بدگمان ہوتی جا رہی ہو، یہی سوال دونوں قبل اتنا روئے دھونے سے پہلے بھی کیا جاسکتا تھا۔“ دل آرا نے ذرا مسکراتے ہوئے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔

”پلیز سب کھل کے بتائیں ملاجی۔“ اس نے بے تابانہ ان کا ہاتھ تھاما۔

”دیکھو بچوں کی مانند بنی ہو کر تپا چھوڑو۔ سمجھ داری سے سوچو اپنے حالات، مستقبل اور پوزیشن کا جائزہ لو۔ احسن تم سے بہت محبت کرتا ہے، لیکن اس کا بدلتا رویہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ محبت اولاد کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہے۔ شاید مستقبل قریب میں وہ وقت آجائے کہ وہ اس کلمی کو شدت سے محسوس کرنے لگے، تب وہ ہمیں دھوکا دے، جھوٹ کا سہارا لے،

فی الحال جنید آفندی بھی فارغ نہیں ہیں۔ کافی بڑی ہیں۔ شاید نہیں یقیناً“ وہ چند برس بعد خود ہی احسن سے دو سری شادی کا کہہ دیں، تم سے محبت اپنی جگہ، مگر حقیقت پندی سے سوچو تو یہ اتنی بڑی اسٹیٹ ہے، فارن کنٹریز تک پھیلا وسیع بزنس، اس سب کے وارث اور سنبھالنے والے کا نام و نشان نہیں۔ جب یہ دونوں مردوں کے کوئی فیصلہ کر لیں گے تب ہم دونوں عورتیں ان کے آگے پر بھی نہیں مار سکیں گی۔ اسی لیے والٹ مندی اسی میں ہے کہ خود آگے بڑھ کے اپنا نفع و نقصان دیکھ کے، کوئی قدم اٹھالیں۔“ دل آرا

بھرتے لاؤنچ سے نکل گئے۔ روٹی ہوئی مریم پر سوچ کے بہت سے درواہ ہو گئے۔ اسے اپنا وجود سوچ اور عمل واقعی بہت گھٹیا اور ارزاں لگا۔

☆ ☆ ☆

دل آرا کے الفاظ نے انعم کو اس قدر بدظن اور بدگمان کیا تھا کہ وہ دونوں سے کمرہ نشین تھی۔ دل آرا اس کی فطرت سے واقف تھیں، اس لیے خاموش رہیں۔

”دونوں تم نے کمرے میں بند رہ کے کیا ڈسھون لیا ہے۔“ دل آرا نے جگ میں سے جوس کا گلاس بھر کے انعم کے سامنے رکھا۔

”آپ اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہیں۔ میرا احسن مجھ سے چھین لیں گی، آپ کے ذہن میں اتنی بڑی بات آئی کیسے؟ میں اس کے بغیر ایک پل بھی جینے کا تصور نہیں کر سکتی۔ مرا جاؤں گی میں، سو سائڈ کر لوں گی۔“ انعم، مسٹر بانی انداز میں سر پر ہاتھ مار مار کے دوڑنے لگی۔ وہ سمجھی تھی کہ اس کی دونوں کی ناراضی نے انہیں اپنی غلطی کا احساس دلایا ہو گا۔

دل آرا کرسی گھسیٹ کے اٹھیں اور اسے دونوں کندھوں سے تھام کے اٹھایا۔

”اٹھو، آؤ باہر بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“ وہ باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ انعم روٹی ہوئی کھستی ہوئی ان کے پیچھے تھی۔

”تم کیوں اپنی حالت خراب کر رہی ہو؟“ وہ اسے بٹھا کے خود بھی برابر میں آ بیٹھیں۔ اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو سمیٹا۔

”آپ نے میرا دل مٹھی میں لے کر بھیج دیا اور میں جشن مناؤں۔“ اس نے انہیں شکایتی انداز سے دیکھا اور اپنی سرخ بڑی ناک زور سے رگڑی۔

”کیا میں تمہارا برا سوچ سکتی ہوں۔ میں کبھی تمہارے اور احسن کی محبت یا دل کے بیچ میں دیوار بنی؟ ہمیشہ اپنے پیٹ پر، تم کو فوجیت دی اور آج تم یوں رو دھو کے، مجھ پر شک کر کے، ٹھیک کر رہی ہو؟“ دل آرا نے

یقین تھا کہ دل آرا اس کا کبھی برا نہیں چاہ سکتی۔
اس کی ماں تھیں اور ماں اپنی اولاد کی بھلائی ہی سوچتی
ہے۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

”ماما جی! آپ احسن سے سب خود ہی ڈسکس کیجئے
گا، میری زبان سے یہ سب سن کے وہ سوتے سے اکھڑ
جائے گا۔ مجھے خود غرض اور برا بھلا کئے گا۔ میں آپ
کے ساتھ ہوں۔“

انعم نے بڑی ہوشیاری سے بندوق ماں کے
کندھوں پر رکھ دی۔ دل آرا اس کے آخری جملے پر
کھلکھلا گئے ہنس پڑیں۔

”ڈونٹ وری، تم اتنا اسٹریس مت لو، میں سب
سیٹ کر دوں گی، احسن کو ابھی انفارم کرنے کا وقت
نہیں، پہلے ہمیں لڑکی کا انتخاب کرنا ہے۔ اس لڑکی کو
احسن سے شادی اور بچہ دینے پر راضی کرنا ہو گا تب ہی
اسے خبر کریں گے۔“ دل آرا اور لڑکی کو ٹی لائیں۔

”لیکن ماما جی، سب سے بڑی پرابلم لڑکی ڈھونڈنا
ہے۔ ایسی کون سی عورت ہوگی جو سراسر ہمارے
فائدے کی خاطر کھو جائے کرے اور اپنی اولاد خوشی و
رضا میری گود میں ڈال کے احسن کی زندگی سے نکل
جائے۔ اس سب کے لیے بہت حوصلہ چاہیے۔“
انعم کی بات غلط نہیں تھی، لیکن دل آرا نے کچھ سوچ کر
ہی بات منہ سے نکالی تھی۔

”مجھے اپنی نسل کا وارث چاہیے، ظاہر ہے ماں
نسلی ہوگی تو اولاد بھی نسلی دے گی۔ کوئی ایسی عورت جو
بہت مجبور و بے بس ہو جس کے آگے پیچھے کوئی
مضبوط سائبان اور سپورٹر نہ ہو۔ اس کے ساتھ وہ
انتہائی معصوم، خالص اور نیک دل بھی ہو۔ جو تمہاری
خالی گود بھروے، پلٹ کر کبھی سوال نہ کرے، بدلے
میں ہم اس کی آئندہ سات پختوں تک کے لیے روپے
میپے کی ریل پیل کر دیں گے، مگر یہ سب بہت ہوشیاری
اور احتیاط سے کرنا ہو گا۔“

دل آرا فو معنی الفاظ میں کس طرف اشارہ کر رہی
تھیں وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”آتی خویوں والی عورت کہاں سے ملے گی ماما جی!“

جتنے سہل الفاظ میں اسے سمجھا رہی تھیں، انعم کے
تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔

”کیسا قدم ماما جی؟“ انعم نے استفسار کیا۔

”حسن کی دوسری شادی کروا دیتے ہیں۔“ دل آرا
نے پھر سے اپنا مطالبہ دہرایا۔

”کیا ہم بے بی ایڈاپٹ نہیں کر سکتے ماما جی۔“ انعم
نے بے چارگی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ دل آرا نے سختی سے منع کیا۔ ”بچوں
والی بات مت کرو انو، اتنی وسیع جائیداد ہماری وراثت
کسی غیر کو سوپ دیں۔ ہمارے بیٹے احسن کا ہماری
نسل کا اس دنیا سے نام و نشان ہی دنیا سے مٹ جائے۔
یہ مجھے ہرگز کوارا نہیں۔ جبند آئندہ کو پتا چلا تو وہ ہمیں
کھڑے کھڑے فادر کریں گے۔ میں جو بھی کروں گی،
بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کروں گی۔“ دل آرا نے
اسے سختی سے ٹوک دیا۔

”لیکن ماما جی دوسری شادی، یہ سوچتے ہی میرا
سانس رکنے لگتا ہے۔“ وہ پھر سے رونے کی تیاری
پکڑنے لگی۔

”تم اپنے دل کو مضبوط رکھو، میں کوئی ایسی لڑکی
تلاش کروں گی جو صرف احسن کو اولاد دے سکے، اس
سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ بچہ تمہاری گود میں پلے بڑھے،
کھیلے اور تمہیں ہی اپنی ماں پکارے، ہم اپنی نسل کی
پرورش تمہاری گود اور ہاتھوں سے ہی کروائیں گے۔“
دل آرا نے اپنی ساری پلاننگ انعم کے گوش گزار
کی۔ جسے سنتے ہی اس کی آنکھیں خوشی و مسرت سے
پھیلتی چلی گئیں۔ دکھ، حیرت اور آنسوؤں کی جگہ
مسکراہٹ نے لے لی۔ دل آرا بچی کے چہرے پر
مسرت و انبساط دیکھ کے خود بھی مسکرا رہی تھیں۔ یہ
جانتے ہوئے بھی کہ منصوبہ بندی کا اختیار صرف اسی
ذات کے قبضے میں ہے۔



انعم بہت خوش و مطمئن آدمی آڑی پھر رہی تھی۔ اس
کے دل میں شک کی انگی پھانس نکل گئی تھی۔ اسے

جان چھڑانے لگے۔

عمر نے جیسے سے ایک اور راز کی بات بتائی۔
الیاس احمد کا منہ کھلا اور نوالہ ہاتھ سے چھوٹ کے
پلیٹ میں گر گیا۔

”چھتی چھتی کھانا کھاؤ اوئے“ کلا کلوٹا
سپاہی موٹا سا ڈنڈا پکڑے، عمرانی کے لیے چکر لگاتے
ہوئے ان کی سر پر کھڑے ہو کے چیخا۔

”جلدی سے کھانا کھاو چاچو جی! ورنہ بھوکا سونا
برے گا۔“ اس نے الیاس احمد کی توجہ ان کی پلیٹ کی
طرف مبذول کروائی۔ وہ اثبات میں سر ہلا کے بے ہوش
سے لقمہ توڑنے لگے البتہ ان کی سوچیں الجھ کے رہ گئی
تھیں۔

☆ ☆ ☆

دعا اور انعم دونوں بیڑھیوں پر بیٹھی چائے سے
لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان دنوں انعم کا موڈ بہت
خوش گوار تھا۔ وہ بات بے بات مسکراتی، وہ پھر پہلے کی
طرح اپنا بہت سا وقت دعا کے ساتھ گزارنے لگی
تھی۔ دل آرا بھی اکثر ان کے ساتھ گپ شپ کرنے
بیٹھ جاتیں۔ گھر کا ماحول پہلے سے زیادہ خوش گوار ہو گیا
تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دعا بغور انعم کے بالوں کو
چرے سے اٹکھیلیاں کرنا دیکھ کے مسکرا دی۔
”یہ کیا دیکھ رہی ہو؟“ انعم نے فوراً اس کا دیکھنا
اور مسکراتا ٹوٹ کر لیا۔

”دیکھ رہی ہوں، تم مسکراتی ہوئی کتنی کیوت لگتی
ہو۔“ اس نے بالکل سچ بولا۔
”تھینک یو، تم دعا کو، میں ہمیشہ یوں ہی مسکراتی
رہا کروں۔“ انعم نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے
درخواست کی۔

”آمین۔“ اس نے بے آواز بلند کہا۔

”نو! کیا تم اور آنتی ہمیشہ سے یوں ہی لڑتی ہو۔
خاموش لڑائی۔“ دعا کو ان کی لڑائی نے ورطہ حیرت میر
ڈالا ہوا تھا۔ اسے ایک گھر میں رہتے ہوئے کالوں کلز
خبر بھی نہیں ہوتی کہ آخر جھگڑا کب اور کس ٹاپک کو

”ڈونٹ وری اباوٹ اپنی تھنگ، تمہاری ماما نے
سب اریج کر لیا ہے۔ اور لڑکی بھی فاسٹ کر لی ہے۔“
دل آرانے اس کا گلن پیٹھیا۔
اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کون ہے وہ
لڑکی؟“

”اسے تم جانتی ہو، بلکہ آگے کا سارا کام تمہارا ہی
ہے۔“ دل آرانے اس کا تجتس برہایا۔

”پلیز ٹیل می لما جی۔“ اس کے ماتھے پر ہل پر گیا۔
”دعا۔ دعا ہے وہ لڑکی۔“ انہوں نے غبی تجلی سے
نکلی جس نے سیدھی انعم کے منہ پر جھلا ننگ ماری۔

☆ ☆ ☆

الیاس احمد اور عمر بہت سے دوسرے قیدیوں کی
طرح، زمین پر پھسکڑا مارے لمبی لائن میں لنگر کھانے
بیٹھے تھے۔ پلیٹ میں پتلا سا شوربہ اور دو بڑے بڑے
آلو تھے۔ اور دوسری پلیٹ میں پٹی اور چھوٹی چھوٹی
دوٹیاں تھیں۔ ست روئی سے نوالہ توڑا۔
”عمر! یہ آلو شوربہ کب تک ہماری قسمت میں
رہے گا۔“ الیاس احمد رو دینے کو تھے۔
”چھوڑیں چاچو جی، بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع
کریں۔“ عمر نے ایک اور لقمہ توڑا۔ خود کو تسلی دینے کا
یہی رستہ چننا تھا۔
”عمر تیرا دل نہیں گھبراتا۔“ انہوں نے اپنے دل کی
تسلی کے لیے سوال کیا۔

”دل کا کیا ہے چاچو جی! پہلے بھی اس کعبت کی سن
سن کے ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ جو کچھ ایک معصوم
لڑکی کے ساتھ کیا اس کی سزا دیا میں ہی مل جائے تو بہتر
ہے۔“ عمر کی سوچ کاں خد جا رہا تھا۔
”تو اتنی دور کی کب سے سوچنے لگا عمر۔“ انہیں

حیرانی ہوئی۔

”چاچو تم بھی اللہ سے توبہ کرلو۔ میری لما جی کہتی
ہیں کہ اللہ جی سچے دل کی توبہ و استغفار ضرور قبول
کرتے ہیں۔ میں نے سچے دل سے مانگنا شروع کر دیا
ہے۔ شاید یہی ایک ذریعہ ہے اس کل کو ٹھری سے

لے کر ہوا۔

”نہیں تو، لیکن اس دفعہ پر سٹل میٹر تھا۔“ انہم نے ہات ٹالے۔

”مجھے بھی یہی فیمل ہوا تھا، اس لیے میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔“ اس نے اپنی سوچ بتائی۔

”میتا بھی پر سٹل نہیں تھا، ملاجی احسن کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے میں خفا ہوئی پھر انہوں نے مجھے اچھے سے سمجھایا، اس کی دوسری شادی کی تمام وجوہات، مستقبل کے اندیشے، میری بے اولادی اور احسن کا بھگ جانا وغیرہ وغیرہ، وہ یقیناً درست سمت میں سوچ رہی ہیں۔“ انہم اتنے نارمل لہجے میں سب بتا رہی تھی۔ جیسی کسی نول یا ڈرائے کی مکملی چھیڑ بیٹھی ہو۔

”آئی کانٹ بلیو اور تم سیو سلی مان گئیں، سب قبول کر لیا۔“ دعا کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ اسے انہم کی ذہنی حالت پر شبہ گزرا۔ وہ کتنے نارمل موڈ میں سب بتا رہی تھی۔

”ہاں، کیونکہ ملاجی کبھی میرا اور احسن کا برا نہیں چاہ سکتیں، انہوں نے میرے بچپن سے لے کر آج تک مکمل رضامندی سے اپنا لاڈلے اور اکلوتے سپوت کو مجھے سوپنے رکھا، اب میں ان کی نیت پر شک کر کے گنہ گار نہیں ہو سکتی۔“ انہم اس کی طرف رخ موڑے اسے سب تفصیل سے بتا رہی تھی۔

”جب احسن تمہارے ساتھ کچھ برا کر لے گا تب سوچنا ابھی سے یہ سب کیوں سوچ رہی ہو۔“ دعا اس کے مطمئن انداز پر جھنجھلا گئی۔

”وہ کبھی اپنی زبان سے اولاد کی خواہش کا اظہار کر کے میرے لیے دکھ کا سبب نہیں بنے گا لیکن اگر آئندہ چند برسوں میں، اس نے چھپ چھپا کے کسی سے شادی کر لی تو؟“ اس نے جملہ اور اچھوڑ دیا۔

”اس دنیا میں بہت سے جوڑے بغیر اولاد کے ایک دوسرے سے محبت کے سہارے زندگی گزارتے ہیں، کیا وہ بے وقوفی کرتے ہیں یا ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔“ دعا نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی کروڑوں کا مالک احسن آئندہ نہیں ہو گا۔ اپنے پیرئس کی اکلوتی اولاد اور خود بے اولاد، اگر اس کا کوئی ایک اور بھائی ہو تا تو مجھے اتنی ٹینشن پالنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی، ہم ان کا بے بی ایڈ اپٹ کر لیتے۔ لیکن ایسا بھی نہیں اتنی وسیع اسٹیٹ کا احسن کے بعد کون وارث ہو گا۔ اس کے پیرئس کو صرف احسن کی اولاد چاہیے۔ اپنی نسل کا وارث، اگر ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہ کیا۔ بلکہ احسن کو اپنے پلوے مضبوطی سے باندھے رکھنے کی غلطی کی تو اس کی سزا مجھے عمر بھر بھگتنا پڑے گی۔“ انہم اپنے اندر کے محسوسات سب اس کے سامنے کھول کے بیان کرتی، بڑے محتاط انداز سے، اس کی بھی برین واشنگ کر رہی تھی۔

”ان شارٹ تم نے فیصلہ کر لیا ہے اور اپنا ذہن بھی بنالیا ہے۔“ دعا نے دو ٹوک پوچھا۔

”بالکل۔ اب یہی لاسٹ آپشن ہے۔“ اس کا لہجہ حتی تھا۔

”اللہ سب کی سیدھے رستے کی طرف راہنمائی کرے۔“ اس نے صدق دل سے دعا کی لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔

موم کرے کا دروازہ کھول کے اندر آئی۔ دونوں بچے بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ موم اپنی جیتی مٹلے کودیکھ کے مسکراتی ہوئی، زین کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ الٹا لیٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کے انہیں سنوارنے لگی۔

”میری چان، میرا بیٹا اٹھ جاؤ، اسکول نہیں جانا۔“ اس نے بڑے دلار سے اسے پچکارا۔ زین ذرا سا کسمسلیا۔

”معوو۔! تم بھی اٹھ جاؤ، ورنہ تم دونوں لیٹ ہو جاؤ گے۔“

اس نے دوسری طرف لیٹی عروہ کا بھی بانڈ ہلایا۔ وہ بھی بل جل کر کے رخ موڑ گئی۔

”پلیز زین اٹھ جاؤ، لیٹ ہو گئے تو میم فوراً“ مجھے کہہ لینی کال کر دیں گی، تم دونوں کو ہنش بھی کیا جائے گا اور تم دونوں کو فائن بھی ہو گا۔“ وہ ان دونوں کو اٹھانے کے ساتھ دھمکا بھی رہی تھی۔ ان دونوں نے کروٹ بدل کے منہ پر کٹن رکھ لیے حالانکہ وہ دونوں پہلی پکار پر ہی فوراً اٹھ کے بیٹھ جانے والے بچے تھے۔

”کیا بد تمیزی ہے، چلو جلدی سے اٹھو، ابھی تم لوگوں نے ناشتے پر بھی دس خیرے کرنے ہیں۔“ مریم کا خیال تھا کہ ان کا چمچی کرنے کا موڈ ہے۔ اس لیے کالی سخت لہجہ اختیار کیا۔

”ہمیں نہیں جانا اسکول۔“ بیک وقت آواز بلند ہوئی۔

”کیوں۔۔۔ کیوں نہیں جانا۔“ وہ سمجھ گئی کہ آج وہ ضد کے موڈ میں ہیں۔

”مجھے اپنے پایا جان کے پاس جانا ہے یا پھر ان سے ہماری بات کروائیں۔“ زین کٹن پھینک کے اٹھ کے بیٹھا اور ٹھنک کے بولا۔

”اور مجھے اپنے گھر واپس جانا ہے۔ میرا ماموں کے گھر بالکل دل نہیں لگتا۔“ عروہ بھی فوراً اٹھ بیٹھی۔ اس کا منہ بھی خاصا پھولا ہوا تھا۔

”عروہ میری بچی، تم پایا کی جینس بیٹی ہو نل، بیٹا ابھی کچھ مجبوری ہے۔“ اس نے زین کے گل پر ہاتھ پھیرا۔

”ہم بہت جلد تمہارے پایا سے ملیں گے بلکہ وہ خود آئیں گے، ہمیں لینے، ہم بہت جلد اپنے گھر لوٹ جائیں گے، پلیز تم مجھے شک مت کرو۔“ اس نے بڑے پیار سے ہلاتے ہوئے ان دونوں کو اس ذہنی کیفیت سے نکالنا چاہا۔

”لما جان! آپ سے ایک بات پوچھوں، آپ جھوٹ تو نہیں بولیں گی۔“ زین نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ تاکہ ماں اس کی معصوم محبت کے سامنے نرم پڑ جائے۔

”پوچھیں لاما کی جان، میں بھلا کیوں اپنے بیٹے سے

جھوٹ بولوں گی، پھر جھوٹ بولنا تو بری بات ہے۔ اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور سخت ناراض ہو جاتا ہے۔“ مریم نے اپنے پیروں پر آپ کھماڑی مارتے ہوئے نصیحت کی۔

”تو پھر سچ بتائیں، پایا جان کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ جیسے عمر بھائی کو پولیس نے ارسٹ کر لیا ہے۔“ زین نے مریم کی سماعت میں دھماکا کیا، وہ آنکھیں پھاڑے باری باری دونوں کو دیکھتی رہی، جن کی سوالیہ نظریں ماں کے چہرے پر جچی تھیں اسے اس لیے محسوس ہوا تھا کہ وہ اتنے بھی بچے نہیں رہے جتنا وہ سمجھ رہی ہے۔

”تم لوگوں کو یہ سب کس نے بتایا۔“ مریم نے زین کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”ہم نے سروٹس کو باتیں کرتے سنا ہے۔“ عروہ ماں کے چہرے پر غصہ محسوس کر کے بھٹکتی ہوئی۔ ”جھوٹ ہے، بکو اس ہے یہ سب، میں سروٹس سے بھی سنٹ لوں گی، تم دونوں پانچ منٹ میں تیار ہو کے ناشتے کی ٹیبل پر آ جاؤ ورنہ میں دونوں کا سر پھاڑ دوں گی۔ ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر اسکول دفع ہو جاؤ۔“

مریم نے اختیار انہیں ڈانٹتی چلی گئی۔ اس کے حواس گم ہو گئے تھے۔ زین اور عروہ ایک ہی جست میں بستر چھوڑ کے واش روم میں گھس گئے۔

☆☆☆

آج کل انعم اور دل آرا ہر وقت سروٹے نجانے کن باتوں اور منصوبہ بندی میں مصروف رہتیں۔ دعا کا سبب معلوم ہو چکا تھا۔ وہ ان کی ذاتیات میں گھسنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

بچن کا ٹھیکہڑا سینے کے بعد اس نے ملازمہ کو پر تن دھونے کا کہا اور خود بہت دن بعد سبز چائے پینے لگی۔ خشک میوہ جات اس نے کٹ لیے تھے۔ انعم اور دل آرا کو اس کے ہاتھ کی بینی چائے بہت پسند تھی۔ دونوں پچھلے کوریڈور میں بیٹھی تھیں۔ دعائان کے

بھی ٹرے لگانے لگی۔

آرانے قطعی لہجہ میں کھوپرن سے کہا۔
دعا کے حواس مختل ہو رہے تھے اور سر گھوم رہا تھا۔

”اُنہ۔ احسن کو مٹانے کی ذمہ داری میری، لیکن دعا کو تمہیں راضی کرنا ہو گا۔“ دل آرانے گیند اس کے کورٹ میں پھینکی۔

”کوئی زبردستی تھوڑی ہے ملاجی، دعا کی اپنی زندگی ہے اسے پورا اختیار ہے ڈسپوزیشن لینے کا، اگر اس نے ہمیں ریفوز کر دیا تو ہم کیا کر لیں گے؟“ انعم نے خدشہ ظاہر کیا۔ وہ ہر رخ سے سوچ رہی تھی۔
”مگر تم اسے فورس کرو، مٹاؤ تو وہ کبھی ریفوز نہیں کرے گی۔ بس تم سلیقے سے اسے سمجھانا۔“ دل آرا نے اسے گھر کا۔

”اس نے مجھ پر اعتبار کیا ہے، مجھے بہت آگورڈ لگ رہا ہے کہ۔۔۔“ انعم متزلزل تھی۔

”پلیز انو، یہ تمہاری مجبوری ہے۔ تم اسے شادی کے لیے راضی کرو اور احسن کو میں۔۔۔“

دعا کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گئی۔ سارے پرتن چھنا کے سے ٹوٹے اور دعا دھم سے زمین پہ آگری۔ اس کے جسم میں برداشت کی سکت نہیں تھی۔ ان دونوں نے مرکز کردیکھا۔ انعم چیختی ہوئی اس کی طرف بھاگی۔ دل آرا اس کے پیچھے تھیں۔
”دعا۔ دعا۔“ انعم دیوانہ وار چیخ رہی تھی۔
دعا اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ دل آرا باہر ملا زمین کود کے لیے بلانے دوڑیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

”یہ چیپٹنگ ہے ملاجی، احسن کو تو آپ نے صرف انفارم کرنا ہے۔ رضامند تو وہ میری ہاں کے بعد ہی ہوں گے اور رہی دعا کی بات تو ملاجی سچ پوچھیں تو میرا دل نہیں مانتا۔ وہ بہت معصوم، نیک دل اور مجبور لڑکی ہے۔ میں اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ میری بہترین اور اتنی پرانی دوست ہے کہ میں اسے کیسے ایکسپلاٹ کروں، مجھے شرم آتی ہے۔ اس سے یہ سب کہتے ہوئے، پلیز ملاجی، ڈونٹ مائنڈ آپ اس پر ایلیم کا کوئی اور حل سوچیں، کوئی اور لڑکی پلیز۔۔۔“ انعم نے جھجکتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔

دل آرا کی مضبوط پلاننگ یہاں آکر کمزور رہ جاتی تھی۔ وہ ان کی ہر بات اور حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتی، لیکن یہاں آکر دل و دماغ کمزور پڑ جاتے۔
دعا نے تین گھنٹے میں سچائے اور پچھلے کورینڈور کی طرف آگئی۔

”انعم! میں عورت کے نسلی ہونے پر کچھ وائز نہیں کر سکتی۔ جنید آفندی ہم دونوں کے پرچھے اڑا دیں گے۔ جی ہوئی اولاد کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبا دیں گے، جس روز تم نے مجھے فون پر دعا کا بتایا۔ میں نے تب ہی لہلہ کر لیا تھا۔ یہی وہ لڑکی ہے جو ہماری خواہشوں اور مراءوں کو پورا کر سکتی ہے۔“

دعا کے قدم اپنے نام پر رک گئے۔ اس سے قدم اٹھانا دو بھر ہو گیا۔

”اسی لیے۔ تو میں یہاں اتنے دلی ٹھہری ہوں، جس روز تم نے اس لڑکی سے دوستی کی تھی۔ تب ہی میں نے اس کے خاندان کی جانچ پڑتال کر دالی تھی۔ مگر وجہ تھی کہ میں نے تمہاری اس سے دوستی اور اس کے گھر آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں کی تھی۔ مگر لڑکی ہمارا خاندان کو وارث دے سکتی ہے۔“ دل

دوستی کی بات

مشہور بخاری

300

کچھ خواہشیں ان اکھڑوں میں

آج کل ڈراموں میں شادی کرانا بہت آسان ہے چاہے لڑکا اور لڑکی کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ”اشتہارات کا وقفہ ہوا تو آواز آہستہ کرتے ہوئے اس نے تفصیلاً ”جواب دیا۔
”کھانے میں کیا ہے؟“ بھوک محسوس ہونے پر اسے خیال آیا۔

”چنے کی دال بنوائی ہے۔“ دال کا سنتے ہی اس کا منہ بن گیا۔ وہ کیسے بھول گئی، آج تو دال ڈے تھا۔
”دال؟ امی! جب سے والد صاحب کی پوسٹنگ یہاں ہوئی ہے میں اس مینہو سسٹم سے تنگ آگئی ہوں۔ ہر ہفتے وہی مینہو۔ مجید چاہا سے کہیں میرے لیے تو کباب مل دیں۔“
”بری بات اقدس! ایسے نہیں کتے۔ باپ ہیں

دونوں ہتھیلیاں ٹھوڑی کے نیچے جمائے، جو کڑی مارے وہ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ نظریں لیوی کی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ اسناک قاتل دید تھا۔ گویا ایک ڈانٹلا لگ بھی مس کرنا گناہ ہو۔
”کیا بنا؟“ بیکم شباب نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

”بڑی کمرٹیکل پجوشن چل رہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ نظریں ابھی بھی لیوی پر مرکوز تھیں۔
”شادی ہوئی یا نہیں؟“ انہوں نے اپنے مطلب کا سوال پوچھا۔

”نہیں کہاں، سچ پوچھیں تو شادی ہونا مشکل ہی لگ رہا ہے مگر یقین سے کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا، ویسے بھی

مُکمل ناول





”آخر ہوا کیا ہے؟“

”نکل دیا ہے یونورسٹی والوں نے۔ فون کر کے ہلا تھا مجھے۔ شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا میں تو۔ یہ نومبر بھی آئی تھی۔ پوچھیے اپنی اس تالاق اولاد سے؟“ آخر کرنا کیا چاہتی ہے اپنی زندگی کے ساتھ۔ ہمیں تو ذلیل کروائی رہی ہے۔“

”یعنی رزلٹ آگیا۔“ اقدس نے لب کاٹے۔
”ایسے کیسے نکال دیں گے۔“ بمشکل بیگم شباب کے منہ سے نکلا۔

”چچا کی یونورسٹی نہیں ہے جو مجبوراً ایسی اسٹوڈنٹ کو رکھیں۔ یونورسٹی کی پالیسی کے مطابق تین بار ایک کورس میں فیل ہونے پر نکال دیا جاتا ہے اور ماشاء اللہ سے آپ کی صاحبزادی اس معیار پر پوری اتری ہیں۔ نہ پڑھنے کی تو انہوں نے ویسے ہی قسم کھا رکھی ہے لہذا اس خبر پر خوش ہی ہوئی ہوں گی کہ اب یونورسٹی جانے کی فارمیلٹی سے بھی جان چھوئی۔“

اس کے سوا کت وجود سے نظر ہٹا کر انہوں نے اپنی بیگم کو دیکھا۔ ”میرے کمرے میں بلیک کافی بھجوا دیں۔ کھانے پر میرا انتظار مت کیجیے گا۔“ سپاٹ لیجے میں دو ٹوک بات کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

تکیے سے ٹیک لگائے، پرسکون انداز میں لیٹی ہوئی موبائل پر ٹیکم کھیل رہی تھی جب زوردار آواز سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ مہرنا کو اندر آتے دیکھ کر اقدس نے یہ کم کی طرف متوجہ ہوئی۔

”چچ میں یونورسٹی والوں نے تمہیں نکال دیا۔“
”تصدیق کرنا چاہی۔“

”اچھا تو مل گئی تمہیں خبر۔ خیر میرے فیل ہونے کی خبر تو بریکنگ نیوز کی طرح نشر ہوئی ہے تاکہ جو بے خبر رہ گیا ہو وہ بھی جان سکے کہ اقدس شباب فیل ہو گیا۔“

تمہارے میں نے تو شکر کیا ہے، کتنے سال وہ ہم سے دور دوسرے شہروں میں رہے ہیں۔ اکیلے رہنا آسان نہیں ہے اور پھر کون سا وہ منع کرتے ہیں۔ تم اپنے لیے کچھ اور بنو۔ بس عادت ہے انہیں ہر کام کا قاعدہ کی سے کرنے کی۔“ ان کے خفگی سے کہنے پر اقدس تھوڑی شرمندہ ہوئی۔

”چھاسوری ناامی۔ کباب تو بنوا دیں۔“ ڈراما ختم ہونے سے پہلے اس کا اپنی جگہ سے ہلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”کہتی ہوں۔ کرٹل صاحب بھی ابھی تک نہیں آئے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔“ انہوں نے فکر مندی سے گھڑی دیکھی۔

”اوریہ ثانیہ اور مہرن کمال غائب ہیں؟“
”دونوں اس وقت اسٹڈی میں ہیں۔ مہرن آبی کی کل پر پرنٹیشن ہے اس کی تیاری کر رہی ہیں اور ثانیہ آبی اپنی میڈیکل کی کتابوں میں سر دیے بیٹھی ہیں۔“ اقدس نے مزے سے اطلاع دی۔

”اللہ جانے ان کی بڑھائیاں کب ختم ہوں گی، کھانے پینے تک کا ہوش نہیں ہے۔“ بیگم شباب نے گہرا سانس لیا۔

”اور ان کے بارے میں کیا خیال ہے جو بڑھنا ہی نہیں چاہتے بلکہ گناہ سمجھتے ہیں پڑھنے کو۔“ چرخت آواز سن کر اقدس حقیقتاً اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔
”بوکھلا تو بیگم شباب بھی گئی تھیں۔ ان کے چہرے پر غصہ تھا یقیناً“ کوئی بات بھی جب ہی وہ اتنے غصے میں نظر آ رہے تھے۔ اقدس اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔ جس طرح وہ اسے دیکھ رہے تھے، اس کے دل نے خطرے کا الارم بجانا شروع کر دیا تھا۔

”ارے آپ آگئے۔ دیر کر دی آج۔ آپ فریش ہو جائیں تو میں کھانا لگوا دوں۔“ بیگم شباب نے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی۔
”بھوک تو کب کی آؤ گئی بلکہ آڑا دی آپ کی صاحبزادی نے۔“

لیٹس سلیپیٹ یار آخر اس یورنگ پڑھائی سے
جان چھوٹ گئی۔“
اقدس مزے سے کہتی کرے سے نکل گئی۔
”اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔“ مہر نے گہرا سانس لیا۔



”شکر ہے گانگی وارڈ سے جان چھوٹی۔ اب کل
سے میڈیسن وارڈ شروع ہو جائے گا۔“ حنا نے
ریلیکس ہو کر کہا۔ ڈیوٹی آورز ختم ہو چکے تھے اور اب
وہ تینوں کچھ کھانے کے لیے کینے کی طرف جاری
تھیں۔

”ہوں مجھے تو ویسے بھی میڈیسن وارڈ میں جانے کا
شوق ہے۔ ہاؤس جاب کے بعد میڈیسن میں ہی جانے
کا ارادہ ہے۔“ ثانیہ نے جواباً اپنی خواہش بتائی۔ وہ
اس وقت لیمن کلر کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ دودھیا
رنگت پر یہ رنگ بہت ستیج رہا تھا۔ لمبے بالوں کو چوٹی میں
مقید کر رکھا تھا۔ سیاہ آنکھوں میں غمگن کے باعث
سرخی اتر آئی تھی۔
وہ کوئی دور سے گزر رہی تھیں۔ سامنے سے آتی
مباہنے انہیں روکا۔

”تم لوگ کہاں جا رہی ہو۔ ہاؤس آفیسرز روم میں
سب جمع ہیں۔ صدف نے کیک منگوایا ہے اپنی برتھ
ڈے کی خوشی میں۔“

”گرسٹ ہم بھی کچھ کھانے ہی جا رہے تھے۔“
فرح خوش ہوئی۔

ہاؤس آفیسرز وارڈ میں اچھا خاصا میلہ لگا ہوا تھا۔
سب ہی کو لیکز جمع تھیں۔ صدف کو دوش کرتے ہوئے وہ
بھی ایک صوفے پر ٹک گئیں۔ سینئر میبل پر ایک
بڑے سائز کا چاکلیٹ کیک رکھا تھا۔

”ثانیہ! بڑا افسوس ہوا مجھے شاکنگ نیوز تھی
میرے لیے تو۔“ حنا سے بات کرتی ثانیہ نے اس آواز
پر سر اٹھا کر دیکھا۔

اسٹافٹنٹس کپڑے پہنے اور آکل دائیں بازو پر لٹکائے
فریال سراج اس کے سامنے کھڑی تھی۔ براؤن بالوں

اور اب کی بار تو بالکل یونیک خبر ہے۔ بتایا کس نے
”اب کی بار اقدس نے سوائیہ نظروں سے اسے
لکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔
”فریجہ ملی تھی ابھی آتے ہوئے لان میں کھڑی تھی
اسی نے مزے لے لے کر بتایا ہے۔“ مہر کو وہ رہ کر اس
کے طنزیہ لبوں پر تاؤ آ رہا تھا۔

”ہوں میں کیسے بھول گئی، آخر دشمنوں کی دیوار
سے دیوار ملی ہوئی ہے۔ وہ تو میرے حلق میں اترے
والے تک لگن لیں۔“ اقدس نے منہ بنایا۔
فریجہ سراج کرٹل شباب کے دوست کرٹل سراج
کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ اقدس کی ہم عمر ہونے

کے باوجود اس سے کبھی نہینی تھی۔
”تھوڑی سی محنت کر لیتیں تو پاس ہو ہی جاتیں۔ ہر
بھم سے پہلے تو تم سووی دیکھتی پانی جاتی تھیں۔“
”ہاں تو فریش ہونا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔“ اقدس
الیز شرمندہ ہوئے بولی۔ ”ایک منٹ، مجھے شرمندہ
کرنے سے پہلے یاد کرلو۔ ایف ایس سی میں دو سہلی
کے پیپر تم بھی میرے ساتھ دے چکی ہو۔“ اقدس کو
مدد یاد آیا۔

”میں کون سا اتنی ذہین ہوں۔ مگر پاس ہونے کی
کوشش ضرور کرتی ہوں۔“ مہر بھی اسی کی دوست تھی
فٹ سے جواب دیا۔

”نکل تو بہت ناراض ہوں گے۔“ مہر کو خیال آیا۔
کرٹل شباب پڑھائی کے معاملے میں بہت سخت
تھے۔

”وہ تو میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے ہمیشہ کی
طرح۔ بس ایک ہی مسئلہ ہے۔ اس بار ابی بھی خفا
ہے۔“ اقدس کو ان کی فکر تھی جو کل سے ٹھیک سے
امت نہیں کر رہی تھیں۔

”فریجہ کی طرح وہ خوش ہونے سے تو رہیں۔“ مہر کو
لڑکھ کی طنزیہ مسکراہٹ یاد آئی۔

”چھوڑو اسے۔ میں مجید چاچا کو کہہ کر آتی ہوں
کچھ اچھا سناں۔ اتنے میں تم اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔

کی آبشار کمر تک جارہی تھی۔ خوب صورت بڑی بڑی
آٹھویں ٹائیپ پر مرکوز تھیں۔ وہ بلا کی حسین تھیں۔ کالج
سے اسے بیوی آف دی ایئر اور موسٹ اسٹائنڈنٹ گرل
کا اپوارڈ بھی مل چکا تھا۔ اس کی آواز پر سب ہی متوجہ
ہوئی تھیں۔

”کس شاکنگ نیوز کی بات ہو رہی ہے۔“ صدف
نے پوچھا۔

”اے آپ لوگوں کو نہیں بتاؤ۔ ڈاکٹر ٹائیپ کی سب
سے چھوٹی، بن کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔
تیسری بار پیل ہوئی تھی ایک کورس میں۔“ سب کو بتا
کر وہ ٹائیپ کی طرف مڑی۔

”فریڈ نے بتایا تو مجھے تو یقین ہی نہیں آیا بھلا جس
کی بن میڈیکل کالج کی ٹاپر رہ چکی ہو وہ اتنی تلافی
کے ہو سکتی ہے۔“ فریڈ کے چہرے پر طنز
مسکراہٹ تھی جو ٹائیپ کو اچھی طرح محسوس ہو رہی
تھی۔

”واقعی ٹائیپ! حیرت کی بات ہے تمہاری تو دوسری
بن بھی ٹاپر ہے۔“ بین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
”گلف میجکٹ تھا بس اسی لیے کلیئر نہیں
کر سکی۔“ ٹائیپ نے بات مٹائی۔

فریڈ مسکراہٹ اچھاتی صدف کے ساتھ بیٹھ
گئی۔ جتا کو تو بہت آیا مگر وہ فریڈ کے منہ نہیں لگتا
چاہتی تھی سو خاموش ہی رہی۔ مثل، صبا اور فضا کے
آنے سے ماحول پھر سے تبدیل ہو گیا۔



”ہی! لیان جا میں نہ میں اور مردوں اسٹے کورس
کرنا چاہتے ہیں۔ اسے تو اجازت بھی مل گئی ہے۔“
افدس نے منت کرنے والے انداز میں کہا۔

”میرا نہیں خیال، گرل صاحبہائیں گے۔ سخت
ناراض ہیں تم سے۔“ بیگم شہاب نے مصروف سے
انداز میں کہا۔ وہ اس وقت اپنے کپڑوں کی لمبائی ٹھیک
کر رہی تھیں۔

”خوش کب ہوئے ہیں اور ویسے بھی وہ ہمیشہ ہی

مجھے آپ کی بیٹی کہتے ہیں۔ ان کی تو بس وہی بیٹیاں! ٹائیپ
ٹائیپ اپنی اور مہرین اپنی۔“ افسانہ کے شکوے پر
اس کی طرف مڑیں۔ چہرے پر خفگی تھی۔
”بری بات افسانہ! باپ ہیں تمہارے بھی۔“
کرتے ہیں اسی لیے چاہتے ہیں کہ تم زندگی میں بگھڑ
جاؤ۔“

”چھا۔ نا ہی باری امی، پلیز ان سے بات کر
نا۔ میں نے کوکنگ کورس ضرور کرنا ہے۔“ اس نے
خوشامدی لہجے پر وہ مسکرائیں۔

”چھا۔ بات کروں گی کیا نام ہے انسٹی ٹیوٹ کا
افدس پر جوش سی تفصیل بتانے لگی۔ ”پیشہ الہ
ٹیوٹ آف کلبیری آرٹس بہت بڑا انسٹی ٹیوٹ ہے۔“

چند سال ہی ہوئے ہیں کھلے ہوئے۔ مرد کچھ کر آ
ہے۔ تیار ہی تھی بہت شان دار ہے اندر اور باہر سے
اس کے آواز کا اپنا ریٹورنٹ بھی ہے۔ کیا نام تھا۔
”لامور“ وہی جس سے ہم نے کھانا منگوایا تھا پچھلی
کتنے مزے کا کھانا تھا۔ جس طرح ان کے ریٹورنٹ
میں مختلف ملکوں کے کونڈیز ملتے ہیں۔ ویسے ہی
ڈفرنٹ کورسز بھی کرواتے ہیں۔ خود بھی بڑے
کو ایفائنڈ ہیں باقاعدہ پڑھ کر آئے ہیں امریکہ سے۔
”بڑھائی کس چیز کی۔“

”اوہو امی کوکنگ کی ہی۔ شیفت جو ہیں اور
اسٹوڈنٹس ہائی اسکور لیتے ہیں ان سب کورسز میں
ہائی کشیکوی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جن کو لو
خود کلاسز دیتے ہیں بلکہ آگے ہیون ملک سپینارڈ
بھی لے کر جاتے ہیں اور کیریئر بنانے میں بھی ان کی
کرتے ہیں۔“ افسانہ کی باتوں سے وہ اچھی خام
متاثر ہوئی تھیں مگر آخری بات سن کر ہنسن۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے شیفت بننے کی۔ کرا
صاحب کے کالوں میں بھگ بھی پڑ گئی تو طوفان کا
کدیں گے۔“

”اوہو امی! میں بڑا ہائی اسکور لے رہی ہوں
بڑھائی میں تو لے نہیں سکی۔ اس میں کم لے لے لے



”تھک گئی آج تو“ اوہی ڈی تھا۔ اتنے مریض تھے اب جا کر فارغ ہوئی ہوں۔“ فضا گرنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھی۔ سامنے والے صوفے پر فریال بیٹھی تھی۔

کچھ یاد آنے پر فریال سیدھی ہوئی۔ ”ڈاکٹر فیصل جارہے ہیں سب ان کو کوئی پارٹی دینے کا سوچ رہے ہیں۔“ ”اس سے تو اچھا تھا ڈاکٹر حملو چلے جاتے کیس۔“ اف، مجھے تو وہ خامے خطرناک لگتے ہیں۔ گائی وارڈ میں ڈاکٹر سنبل تھیں اور یہاں یہ حضرت ہیں۔ توبہ، ہر چیز پر کڑی نظر ہوتی ہے۔ ذرا سی کوتاہی پر اتنی بے عزتی کرتے ہیں۔ نرس بتا رہی تھی کوئی کیس مجھ کو کیا تھا کسی ڈاکٹر کی وجہ سے۔ چلو ہوگی غلطی اس کی بھی پرہاوس حجاب کرنے والا تو سیکھ ہی رہا ہوتا ہے خود بھی۔ مگر یہ جو کمینٹی میں تھے نکلو اگر ہی دم لیا اسے۔“ ”ڈاکٹر حملو کام کے معاملے میں کوئی کوتاہی معاف

گی۔ میں صرف آپ کو اسٹی ٹیوٹ کے بارے میں انٹارکشن دے رہی تھی۔“ اقدس بد مزاج ہوئی۔ ”چھا ٹھیک ہے، کہوں گی بات مگر کچھ کہہ نہیں سکتی ہو سکتا ہے نہ مانیں۔“ ”الماری بند کرتے ہوئے اہلوں نے ہاں بھری۔

وہ مہر کو بہ خیر سامنے کے لیے چل دی۔ ایک خوشی کی بات اس کی پرہائی سے جان چھوٹا بھی چاہے کچھ عرصے کے لیے ہی ہو۔ دوسری خوشی مہر اور اس کا اکٹھا ہونا تھا۔ ہمیشہ سے وہ ساتھ پڑھی تھیں۔ اب مہر کی اسے کچھ بھی تھی اور اقدس یونیورسٹی سے نکل دی گئی تھی۔ مہر کا ہی آئیڈیا تھا کہ مل کر کوکنگ کورس کر لیں۔ وہ بھی پرہائی کی اتنی شوقین نہیں تھی۔ لہذا کچھ عرصے کے لیے پرہائی سے دوز رہنے کا یہی طریقہ دونوں کو ٹھیک لگ رہا تھا۔



ٹائیپ وارڈ سے نکل رہی تھی۔ دروازے کے قریب کھڑی فریال نے اسے روک رکھا۔ ”نیں تم لوگوں کی طرف سے انوی نیشن کی منتھری رہی۔“

”کیا انوی نیشن۔“ ٹائیپ ابھی۔ ”تنی جلدی بھول گئیں۔“ ”بھی اقدس کی ہر فارمنس پر کوئی پارٹی تو ہونی ہی چاہیے۔ ویسے بھی اگلے کو سلیپیٹ کرنے کا بلا شوق ہے۔ سلیپیٹیشن تو جتنی ہے ورنہ زیادتی ہو جائے گی اس بے چاری کے ساتھ۔“

فریال کا طعنے انداز اسے چبھا تو مگر وہ خاموش ہی رہی۔ اکثر وہ اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

”ڈاکٹر ٹائیپ! آپ کو ڈاکٹر حسان بلارہے ہیں، بیڈ نمبر چھ کی فائل لے کر جائیے۔“ نرس کے بلانے پر وہ سر ہلائی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ فریال بھرپور انداز میں مسکراتی ہوئی وارڈ نمبر آٹھ کی طرف چل دی۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہوں کے لیے ایک اور ناول

محبت میں محرم

سمیرا حمید



قیمت - 300 روپے

نہیں کرتے۔ ضرور کوئی بڑی بات ہوئی ہوگی۔“ فریال نے کہتے ہوئے میگزین اٹھایا۔

”کل تم چھٹی پر تھیں نا۔ ڈاکٹر جنید سے ملاقات ہوئی۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔“ فضا نے بتایا۔ ڈاکٹر جنید میڈیکل کالج میں ان کے سینئر رہ چکے تھے۔ اب کسی دوسرے اسپتال میں جاب کر رہے تھے۔

”آئے ہوں گے، دوست بھی تو کافی ہیں ان کے یہاں۔“ فریال نے بے نیازی سے میگزین کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔

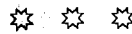
”ایسی انجان مت بنو، تمہیں پتا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔“

”سو واٹ اور بھی بہت سارے لوگ مجھ میں انٹرسٹڈ ہیں پھر کیا کروں، ہر ایک کا پروپونل ایکسیپٹ کر لوں۔“ فریال کے لہجے میں اپنی خوب صورتی کا زعم تھا۔

”تمہیں کوئی پسند نہیں آیا کبھی اور ڈاکٹر جنید میں کیا کمی ہے، مجھے تو وہ بڑے پُر خلوص سے لگتے ہیں۔ اچھے خاصے ڈیشننگ بھی ہیں۔“ فضا نے اسے کریدنا چاہا۔

”ہوں گے مگر جس سے میں شادی کروں گی وہ بہت شاندار شخصیت کا مالک ہوگا سب سے الگ۔“

”چلو، تمہارا وہ گھر نایاب بھی دیکھ لیں گے وقت آنے پر۔ ابھی تو اٹھو بھوک سے جان نکل رہی ہے۔ ان دونوں کو بھی لے لیتے ہیں ساتھ۔“ فضا کے اٹھنے پر فریال بھی بینڈ بیگ اٹھاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھوک تو اسے بھی لگ رہی تھی۔



”کیا ہوا یا راجہ! چہرے پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں۔ کسین محبت و محبت تو نہیں ہو گئی۔“ قمر نے پیروپٹ کھماتے ہوئے جاچتی نظروں سے گھر کو دیکھا جو قریبی کرسی پر منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

”تم سے اسی قسم کی چہرہ شناسی کی امید کی جاسکتی

”ہے۔“

”شکل پر مست جاؤ۔ فیل ہو جانے والوں کی شکلیں بھی ایسی ہی ہو جاتی ہیں۔ اے ایم سی کے اینٹرویو ٹیسٹ میں فیل ہو گیا ہے۔“ ڈاکٹر حماد مسکرائے۔

”ہمیشہ سے آری ڈاکٹر پڑنا چاہتا تھا پر اب۔۔۔“ گوہر نے افسوس سے لب کاٹے۔

”یہ بھی کوئی بات ہے منہ پھلانے کی، اس کے ساتھ رہ رہ کر تم بھی ہسکتے جا رہے ہو۔“ قمر کے شوخ انداز پر گوہر مسکرا دیا۔

”قمر، ڈاکٹر حماد کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں کے مزاج میں خاصا فرق تھا۔ ڈاکٹر حماد کم گو اور سنجیدہ مزاج کے تھے جبکہ قمر فطرتاً شوخ طبیعت کا حامل تھا۔ اس فرق کے باوجود وہ بہترین دوست تھے۔“

”میری بات چھوڑیں قمر بھائی۔ فی الحال آپ بھائی کو راضی کریں شادی کے لیے۔“ آخری بات دھیمی آواز میں کہتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گوہر کے آنسو سے نکلتے ہی قمر اس کی طرف مڑا۔

”کیا ارادے ہیں۔“

”کس بارے میں؟“ ڈاکٹر حماد نے الجھ کر پوچھا۔

”شادی کے بارے میں۔ اب تو شادی کر لے یا ر۔“

”تمہیں کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے میری شادی کی۔“

”مجبوری ہے، میرے دوست جو ہو۔ اپنا نہیں تو انکل اور گوہر کا ہی خیال کر لو۔ دونوں ہی کی خواہش ہے اور پھر آئی کی ڈیٹھ کے بعد تمہارے گھر کو کسی عورت کی ضرورت ہے۔“ قمر نے سنجیدگی سے اسے سمجھانا چاہا۔

”پی کو گئے بہت سال ہو گئے ہیں۔ اب تک جیسے گزارا چل رہا ہے آگے بھی چل ہی جائے گا۔ فی الحال میں اس جھجھکٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔“

”بہر حال۔ تم اس پر سوچنا شروع کر دو کیونکہ انکل اب تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

افس پر سے سامنے متوجہ ہوئی۔ وہ ایک بڑے اور شاندار ہال میں جمع تھے۔ اس وقت یہاں سارے نئے آنے والے اسٹوڈنٹس جمع تھے جو کہ مختلف کونہز سیکھنے کے لیے آئے تھے۔

”کھانا بنانے کا طریقہ، چیزوں کی مقدار، کون سی چیز کیا فائدہ دے گی۔ کیسے فیلوزرز بنتے ہیں، مختلف چیزوں کو ملانے سے کوئی ایک آرٹ بھی ہے۔ آپ خود بھی کچھ بنانا سکتے ہیں۔ کری اینٹی ویٹا لاسکتے ہیں اپنے کھانے میں، ہم آپ کو ہیسکس سے شروع کرواتے ہیں۔ روز کی کلاس میں سب سے پہلے انسٹرکٹر آپ کے سامنے بنائے گا۔ آپ لوگ ہسپی کوٹ کریں گے۔ سامنے ملٹی میڈیا پر ڈسپلے بھی ہو رہی ہوگی۔ آپ سب کو اپنا کلائنٹ دیا جائے گا۔ وہاں پر آپ لوگ روز کی وہوش بنائیں گے جو کہ سکھائی جائے گی۔ انسٹرکٹر آپ کو مانیٹر کرے گا اور بھی کچھ ساتھی ہوں گے ان کے جو آپ کو مانیٹر کریں گے کوئی بھی مسئلہ ہو، آپ انسٹرکٹر سے پوچھ سکتے ہیں۔ انگریڈینٹس (اشیاء) کچھ ہم دیں گے، کچھ آپ کو لانی ہوں گی۔ روز کی لسٹ لگ جایا کرے گی۔

ہر دو ہفتے بعد آپ کا ٹیسٹ لیا جائے گا۔ مارکنگ کی جائے گی۔ آخر میں جب آپ کا کورس اینڈ ہو گا تو ہائی اسکور والے اسٹوڈنٹس کو ہم کولینزی آرٹس آف آل کونہز آفر کرتے ہیں جو کہ اس اسٹی ٹیوٹ کے اونر روحان تیمور بڑھاتے ہیں۔“

”یہ مارکس کیس پر بھی جان نہیں چھوڑیں گے۔“ افس کو مارکنگ پر اعتراض تھا۔

”ہیسٹ آف لک۔ ان شاء اللہ آپ سب یہاں سے بہت کچھ سیکھ کر جائیں گے۔ بس محنت کریں اور پورے انٹرسٹ سے کام کریں۔ جتنا آپ دل سے اور خوشی سے کھانا بنائیں گے، اتنا ہی اچھا کھانا بن کر سامنے آئے گا۔ کوئی سوال اگر آپ کرنا چاہتے ہیں تو کہیے۔“ انہوں نے ایک سوالیہ نظر ہال میں موجود اسٹوڈنٹس پر ڈالی۔

دائیں طرف بیٹھے ایک لڑکے نے ہاتھ کھڑا کیا۔

”میرے خیال سے تم اب جاؤ۔ مجھے وارڈ کا چکر لگانا ہے۔“ ڈاکٹر حنا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
”میں بھی تو جا رہا ہوں، ایک سائٹ وزٹ کرنی ہے،“ میرا بس بھی پیچھے والا ہو گا۔ پھر ہوگی اس ٹاپک پر تفصیلی بات۔“ جاتے جاتے بھی وہ باور کرانا نہیں بھولا تھا۔



”کولینزی آرٹس گروپ میں ویل کم۔ آج پہلی کلاس ہے اس لیے چند باتیں میں آپ سب سے کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے تعارف ہو جانا چاہیے۔ میرا نام سرمد ہے۔ بائے پروفیشن میں شیفت ہوں۔ کئی ممالک کے بڑے ہوٹلوں میں کام کرنے کا تجربہ ہے۔ اب آپ کے سامنے موجود ہوں۔ کولینزی آرٹس دراصل ایک ٹرم ہے جو کھانے کو بنانے سے لے کر اس کی پرفیکشن تک کو ڈیفائن کرتی ہے اور یہی ہم آپ کو سکھاتے ہیں۔ کوئی کنگ کا تعلق سائنس سے بھی ہے اور آرٹس سے بھی۔“

ہال کے اسٹیج پر کھڑے شیفت سرمد کی بات توجہ سے سنتی افس بد مزہا ہوئی۔ ”یہ سائنس بیچ میں کہاں سے آئی۔“ وہ ساتھ بیٹھی مہر کے کان میں مسمی۔
”کچھ تو تقریر میں کہنا ہی ہے۔ تم بس ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دو۔“ مہر نے لکھی دی۔

”میں نے امی کو نہیں بتایا کہ ہم نے پروفیشنل کورس کے لیے اپلائے کیا ہے۔“ افس نے سامنے دیکھتے ہوئے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔
”کیوں نہیں بتایا؟“

”وہ ابو کو بتائیں اور وہ کبھی اجازت نہ دیتے پروفیشنل سنتے ہی۔“ افس نے منہ بتایا۔
”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی۔“ مہر پریشان ہوئی۔

”نہیں ہوتا کچھ ویسے بھی جتنا میں گھر میں کم نظر آؤں گی، انہیں لگے گا، میں کچھ کر رہی ہوں۔ کم از کم مہرے بارے میں سوچیں گے تو کم۔“

شیفٹ سرور کے اشارے پر مائل اسے دیا گیا۔
 ”سر! ایسا ہائی اسکور والے اسٹوڈنٹس کے علاوہ باقی
 بھی کو لیری آرٹس آف آل کونفرنس میں اپلائے کر سکتے
 ہیں؟“

مول کیل
 ”ٹائی کو بیگ پیک کرتے دیکھ کر حیران ہوئی۔“ آہ
 کہاں جا رہی ہیں۔“

”ٹائٹ ڈیوٹی ہے، اسپتال جانا ہے۔“ ٹائی نے
 مصروف سے انداز میں کہا۔

”اپنی آج تو نہ جائیں۔“
 ”کیوں بھی۔ ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے نا، جانا تو پڑے گا
 نا۔“ ٹائی بیگ کی زپ بند کر کے مڑی تو اقدس ناگ
 سیٹھ بے کھڑی تھی۔
 ”کیا ہوا؟“

”میں نے اور مہرین آبی نے آپ کی برتھ ڈے
 پلان کی ہوئی تھی۔ بارہ بجے دس کرنا تھا۔ ایک بھی
 منگوا لیا تھا۔“

ٹائی مسکراتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ ”کلی
 بات نہیں چند! اکل کٹ لوں گی یا پھر ابھی کٹ لیں
 ہوں اسپتال تو جانا ہے نا۔“

”سارا سر براؤز خراب کر دیا آپ کے اسپتال والوں
 نے۔“ اقدس کاموڈ خراب ہوا۔

”کوئی خراب نہیں ہوا۔ ابھی کانٹے ہیں۔ کھینچو
 نکلتا ہے مجھے ابھی بہت ٹائم ہے۔“ ٹائی نے پیار سے
 اس کی پونی ٹیل ہلائی۔

”کل آپ کی ٹائٹ ڈیوٹی تھی اور آپ جانتی تھیں
 کہ روم نمبر جوہ کے مریض کی حالت نازک تھی۔“
 ڈاکٹر حملو کی سنجیدہ آواز آفس میں گونج رہی تھی۔ ان
 کے سامنے والی کرسی پر ٹائی سر جھکا کر بیٹھی تھی۔
 ”آپ کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے اس کی حالت
 مزید بگڑی ہے۔“

”سر! مجھے نرس نے انفارم نہیں کیا۔“ ٹائی نے
 سر اٹھایا، مگر زیادہ دیر ڈاکٹر حملو کی سرنگاہوں کو دیکھ نہ
 سکی لہذا انظرس اپنی ہتھیلیوں پر جمائیں۔

”ڈیوٹی پر موجود نرس آپ کو بتانے لگی تھی مگر آپ
 نے دروازہ لاک کر رکھا تھا اور اندر سے شور کی آوازیں

”جی بالکل کر سکتے ہیں مگر اس کا بھی کرائفٹو یا ہے جو
 کہ ہماری سائٹ پر بھی دیا گیا ہے، ہائی اسکور والوں کو
 ہم خود آفر کرتے ہیں۔ باقیوں سے میسٹ لیا جاتا ہے
 ان کا ایکسپریس دیکھا جاتا ہے۔ کتنی ان کے پاس بلج
 ہے یہ سب دیکھا جاتا ہے کیونکہ سر روحان ایڈوائس
 لیول سے شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کو
 ہسکمکس (بنیادی باتیں) کا آٹا ضروری ہے۔“ اس کو
 جواب دے کر انہوں نے ہل پر نظر دوڑائی مگر کسی اور
 نے کوئی سوال نہ کیا۔

وہ دونوں اپنی مطلوبہ کلاس کا پوچھ کر چل
 پڑیں۔ انشی ٹیوٹ کی نہ صرف عمارت خوب صورت
 تھی بلکہ اس کا انٹیریئر فرنیچر اریبل ہر چیز شان دار تھی۔

”آبی! اتنے شان دار کلاس رومز ہیں اور سارے
 کے سارے ایر کنڈیشنڈ ہیں۔ مجھے تو سوچ کر ہی مڑا آ رہا
 ہے۔ ٹھنڈک میں پکانے کا کیا مڑا آئے گا۔ ورنہ اس
 گرمی میں چولہے کے آگے کھڑا ہونا تو عذاب ہے۔“
 اقدس نے چپس کھاتے ہوئے کہا۔ سارے دن کی
 روداد تو وہ سنا ہی چلی تھی۔

”آجھی بات ہے کسی چیز میں تمہیں مڑنا تو آیا۔“
 ٹائی مسکرائی۔ ”میں نے سنا ہے ہمارے رومز تو کچھ
 بھی نہیں ہیں، ٹائپ فلور پر اس سے بھی شان دار رومز
 ہیں۔ وہاں روحان ایڈوائس ٹیوٹ کے مالک ہیں،
 وہ پڑھاتے ہیں۔ ان کا آفس بھی اسی فلور پر ہے۔“

”تم بھی ہائی اسکور لو پھر ان تک بھی پہنچ جانا۔“
 ٹائی نے الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے اقدس کا
 پر شوق چہرہ دکھا۔

”ہنہ ہائی اسکور۔“ اقدس کے چہرے کے زاویے
 بگڑے۔ خلی چپس کے پیکٹ کو اس نے ہاتھ میں گول

مٹی تھی ضرور فریال نے نرس سے یہ سب کرا لیا تھا۔
 ”سوچو اگر اس وقت ڈاکٹر نشانہ ہوتیں تو تم تو
 اسپتال سے باہر ہوتیں۔“ فریال نے مڑا لیتے ہوئے
 کہل۔

”تمہیں کیا ملے گا یہ سب کر کے۔“
 ”بھول گئیں، ڈاکٹر سنٹیل نے کتنی بے عزتی کی
 تھی میری، وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے۔“ فریال نے
 ایک پرانی بات کا حوالہ دیا۔

”میری اس میں کوئی غلطی نہیں تھی نہ میں نے
 جان بوجھ کر کچھ کیا تھا۔ اس وقت میری بھی ہانٹ ڈھونڈ
 تھی۔ میں کیسے چھپاتی کہ تم دوستوں کے ساتھ باہر جی
 ہو۔ میرے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ اگر میں تمہارا
 پردہ رکھ سکتی تو ضرور کرتی۔“ ثانیہ نے اس کی بدگمانی
 ختم کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے کچھ نہیں سننا یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔
 تم میرے راستے میں ضرور آتی ہو۔“ فریال نے اس کی
 آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہل۔
 ”فریال میں نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا۔“ ثانیہ
 نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔

”سنو شیٹ۔“ پھر بھی تم ہمیشہ میرے لیے بری ہی رہی
 ہو۔ ہمیشہ میرے مقتل آتی ہو۔ تمہاری کامیابیوں نے
 ہمیشہ میری خوشیوں کو ٹٹکا ہے پر اب میری باری ہے
 اور فریال سراج کبھی ہار نہیں مانتی اور جو کرنے کی ٹھان
 لے، وہ کر کے چھوڑتی ہے۔ سو ہیٹ آف لک
 ثانیہ! اس کے کندھے پر جھکی پڑتی ہوئی اپنی مخصوص
 مسکراہٹ کے ساتھ وہ آگے بڑھ گئی۔

پہلے ہی سر میں درد تھا اوپر سے یہ ساری باتیں سن
 کر مزید بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکتی ہاؤس
 آفیسر روم میں آگئی۔



اقدس ترکیب پڑھنے میں مگن تھی۔ سر سود کی
 آواز سن کر ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔ نوٹ پیڑھا تھا سے
 چھوٹے چھوٹے پچا تھا۔

”کی آہی تھیں۔“
 ”سرا یہ غلط ہے۔“ ثانیہ نے احتجاج کرنا چاہا، مگر
 ڈاکٹر ملکی سرد آواز نے اسے بولنے سے روک لیا۔

”کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ کل اپنے ڈیوٹی
 ہنگ میں اپنی دوستوں کے ساتھ برتھ ڈے
 منیور کر رہی تھیں۔“
 ”سرا مجھے نہیں معلوم تھا وہ سر پر از دینے آگئی
 تھیں ایک ویسولے کر۔“

ڈاکٹر حملو نے سخت لہجے میں اس کی بات کلن۔
 ”ڈاکٹر ثانیہ! یہ اسپتال ہے۔ آپ یہاں کام کرنے آتی
 ہیں، ہائی کرتے نہیں۔ یہاں انہی کسی ایکٹوٹی کی
 اجازت نہیں دی جاسکتی۔ میرا خیال تھا کہ آپ ایک
 ڈاکٹر ہیں، پوری طرح انوالو ہو کر کام کرتی ہیں مگر
 اہم سواری؟ میری رائے بدل گئی ہے۔ آپ نے بہت
 دن بد فیشنل اپنی ٹیوڈ شو کیا ہے۔ شکر سمجھیے کہ وہ
 ماسک کیا دہانہ آپ کی اس کو مٹی پر آپ کو فائز بھی
 کیا۔ جاسکتا تھا۔“ اسے سی کی ٹھنڈک اسے اپنی
 لمباں میں تھکتی محسوس ہوئی تھی۔

”آپ جاسکتی ہیں۔“ ڈاکٹر حملو کے کہتے ہی ثانیہ
 لہکے اس سے باہر نکل آئی۔

فرمنگی سے اس کا چوسر خ ہو رہا تھا۔ ایک بات
 اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ آخر نرس نے
 جھوٹ کیوں بولا۔ اس کی دوستیں آئی ضرور تھیں۔
 وہ اسے بھی سلیپیٹ کی مٹی گرد دہانہ کی نے
 لاک نہیں کیا تھا اور پھر کھانا کھا کر وہ چلی گئی تھیں۔
 اس کو بھی خود اس نے اس مریض کے حوالے سے
 اس ہدایت کی تھی کہ اس کی طبیعت ذرا سی بھی
 اگے تو اسے بلا لے۔

موسیڈ ثانیہ شباب! کل تک تو ہم تمہاری
 لڑائیں ہی سن رہے تھے، مگر تم نے جو غیر ذمہ داری کا
 اہم دیا ہے تو بہت افسوس ہوا مجھے۔“ لیوں پر خوب
 مسکراہٹ سجالے، خوشبو میں لٹائی فریال اس
 کھانے کھڑی تھی۔

ثانیہ نے گہرا سانس لیا۔ سارا معاملہ تو وہ سمجھ ہی

”چوہے کی آج آہستہ نیچے پیا زجل رہی ہے۔“
اقدس نے جلدی سے آج کلکی کی پہلے ہی اتنی مشکل
سے ڈھیر ساری پیاز کالی تھی۔

”اس قدر چیزیں پھیلا رکھی ہیں۔ ان سب کو
سمیٹیں۔“ سرسبد نے کاؤنٹر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ پھر
نظر اس پر پڑی۔ ”اور یہ آپ کا اپرن کہاں ہے؟“
”وہ سرگاہ میں پہننا بھول گئی۔“ اقدس نے بوکھلا
کراپرن اٹھایا اور جلدی سے پہن لیا۔

”صفائی کا خیال رکھا کریں۔ چیزوں کو مت پھیلایا
کریں۔ جو عادتیں آپ آج ڈالیں گی، وہی زندگی بھر
ساتھ چلیں گی۔ آپ کا کاؤنٹر سب سے گندا ہوتا ہے۔
بلکہ مجھے آپ کے آس پاس والوں کی شکایت بھی آئی
ہے کہ آپ ان کا کاؤنٹر بھی گندا کر دیتی ہیں، چیزیں
گرا دیتی ہیں اور یہ بات میں نے بھی نوٹ کی ہے۔“

اس سے پہلے کہ اقدس کوئی جواب دیتی ساتھ
والے کاؤنٹر پر موجود نورین بول پڑی۔ ”جی سر! میرا
کاؤنٹر روزیسی گندا کرتی ہے جو مجھے جاتے ہوئے صاف
کرنا پڑتا ہے ورنہ میں تو بہت صفائی رکھتی ہوں۔“
اقدس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا پھر
سر کی طرف مڑی۔ ”سر! غلطی سے ہو گیا ہو گا۔ روز
تھوڑی ہوتا ہے۔“ سرسبد کو جائزہ لیتے دیکھ کر اقدس
نے جلدی سے کہا۔

دونوں کے کاؤنٹر پر مسالے اور سبز یوں کے چھلکے
وغیرہ گرے ہوئے تھے۔

”سر! کوئی سزا تو ملنی چاہیے۔“ نورین نے پھر سے
ٹانگ اڑائی۔

”ہوں، ٹھیک ہے پھر اقدس، آپ جانے سے پہلے
سب کے کاؤنٹر صاف کر کے جا میں گی۔“ اس سے
پہلے کہ اقدس کچھ کہتی سر نے سب اسٹوڈنٹس کو
متوجہ کیا۔

”آج سے آپ سب کے کاؤنٹر اقدس صاف
کر کے جایا کریں گی۔“ کچھ اسٹوڈنٹس کے چروں پر
مسکراہٹ آئی۔ سمجھ تو سب ہی گئے تھے کہ آج بھی
اقدس شہاب سے کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ اکثر ہی اسے

پوائنٹ آؤٹ کیا جاتا تھا۔

”سر! سب کے کاؤنٹر صاف کروانا کچھ زیادتی نہیں
ہے۔“ احمد کے کہنے پر اقدس نے تشکرانہ نظروں سے
اسے دیکھا۔ کسی کو تو اس کی شکل دیکھ کر ترس آیا تھا۔
”چلیں پھر آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ اقدس آپ
کی رو میں جتنے کاؤنٹریں، وہ آپ کی ذمہ داری ہیں۔
جانے سے پہلے آپ ان سب کو صاف کریں گی۔“ سر
سبد نے مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”جی سر!“ بشکل اس کے منہ سے نکلا۔ سر آگے
بڑھ گئے۔

ایک گھبراہٹ لیتی وہ پیاز کی طرف متوجہ ہوئی
اب جلتے لگی تھی۔



وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ سامنے سے آگے
ڈاکٹر سلمان کو دیکھ کر ان سے سلام دعا کرنے رک گیا۔
وہ اس کے دوست کے بھائی تھے۔
”گوہر، کیسے ہو یا ر؟“

”جی ٹھیک ٹھاک۔ آپ اپنی سانس۔“
ڈاکٹر سلمان نے سر آہ بھری۔ ”رگڑا کھا رہے ہیں
ہم بے چارے۔“ ان کی مصنوعی بے چارگی پر گوہر
مسکرایا۔

”پھر ملیں گے۔ میں حماد بھائی کے پاس آیا تھا۔“
گوہر نے اجازت چاہی۔

”وہ تو اس وقت میٹنگ میں ہیں۔“
”وہو، میں تو ان سے ٹاپک سمجھنے آیا تھا، میرا
ٹیسٹ ہے۔“ گوہر پریشان ہوا۔ ”آپ پڑھادیں گے
اگر فری ہیں تو۔“ گوہر کے پوچھنے پر ڈاکٹر سلمان نے اہا
سر کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ میں کتابیں دیکھیں۔
”میں!“ ابھی وہ کوئی جواب دینے ہی دلتے تھے کہ
قریب ہی نظر پڑ گئی۔

”ڈاکٹر ثانیہ! بات سنیں۔“ اپنے دھیان میں آگے
جاتی ثانیہ کو روک۔ ثانیہ نے رک کر سوالیہ نظروں سے
دیکھا۔ اب وہ قریب آچکی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کے

اڑے کے اور اور آل پنہے گلے میں اسٹیکس کوپ
 لائے بالوں کی چٹیا بنائے وہ اپنے عام سے چلے
 میں تھی۔ گوہر بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”ٹانیہ! یہ گوہر ہیں۔ ابھی فرسٹ ایئر میں آئے
 ہیں۔ آپ اگر فری ہوں تو انہیں ایک ٹاپک سمجھا
 دیں۔“

ٹانیہ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”ابھی تو فارغ ہوں۔
 وارڈ سے ہی آرہی ہوں۔“
 ”نہیں میں مینج کر لوں گا۔“ گوہر نے انکار کرنا

”ہا۔“
 ڈاکٹر سلمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”کچھ نہیں ہوتا یا ر۔ ڈاکٹر ٹانیہ پڑھاؤں گی۔ یہ ہماری
 گلاس کی ٹاپریں۔ بہت اچھا سمجھا میں گی۔“
 ”ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوگی۔“
 ان کے جاتے ہی ٹانیہ نے گوہر کو دیکھا جو شرمندہ
 ماکہ اٹھا۔

”کیفے چلتے ہیں وہیں میں آپ کو ٹاپک پڑھاؤں
 گی۔“ ٹانیہ نے نارمل انداز میں کہا۔
 ”جی ٹھیک ہے۔“ وہ بھی سر جھٹکتا اس کے ساتھ
 ہولہ آخر ٹاپک تو اسے پڑھنا ہی تھا۔
 ”کیفے میرا میں زیادہ تر نیبل خالی تھے کیونکہ لچ بریک
 ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ ایک نیبل کے گرد بیٹھتے
 ہوئے ٹانیہ نے اسے ٹاپک نکالنے کا کہا۔ گوہر نے
 کتاب کھول کر مطلوبہ ٹاپک نکالا۔ آدھے گھنٹے میں
 اس نے گوہر کو پورا ٹاپک سمجھا دیا۔

”ٹھیک یو، آپ بہت اچھا سمجھاتی ہیں۔ ورنہ
 میں تو اس ٹاپک میں محض ہی گیا تھا۔“ گوہر اس کے
 پھانے کے انداز سے متاثر ہوا تھا۔
 ”کچھ اور پوچھنا ہے۔“ ٹانیہ مسکرائی۔
 ”ابھی تو تمہیں مگر اب برائے نامیں تو میں آپ سے
 کبھی بھی پڑھ لیا کروں۔“ گوہر نے جھجکتے ہوئے
 کہا۔

”مذہب میں فری ہوئی تو پڑھاؤں گی۔“ اسی وقت
 دروازے سے ڈھونڈتی ہوئی آئیں۔ ٹانیہ نے گوہر

کا تعارف کروایا۔

”ابھی تو فرسٹ ایئر ہے۔ آگے آگے دیکھیں کن
 بلاؤں سے پالا بڑنے والا ہے۔“ حنا نے اپنی گرسی
 سنبھالتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔
 ”کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہے آپ سینئر کی پتلی حالت
 دیکھ کر۔“ گوہر مسکرایا۔

”کچھ ہوا ہے۔“ ٹانیہ نے فرح کے بگڑے
 تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ڈاکٹر جہاد کے ہوتے ہوئے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
 صبح سے جھاڑیں پڑ رہی ہیں۔ اب میٹنگ میں گئے ہیں
 تو سکھ کا سانس نصیب ہوا ہے۔ ان کے پشمنٹ کو
 دیکھنا عذاب ہے۔“ فرح پھٹ پڑی۔
 ”ڈانٹنے تو وہ کسی غلطی پر ہی ہیں۔“ ٹانیہ کا یہ کہنا
 حنا کو سونے کی طرح چبھا۔

”رہنے دو۔ ان کا چہرہ ہی دیکھ کر کچھ نہ کچھ غلط
 ہو جاتا ہے۔ بلکہ ان کا تصور کر کے ہی غلطی ہو جانا
 نارمل بات ہے۔ عجیب خطی سے ڈاکٹر ہیں۔ ہر وقت
 کام سوار رہتا ہے ان پر۔ میرا خیال ہے گھر میں بھی ہر
 وقت مریضوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہوں
 گے۔“ حنا نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ گوہر نے اپنی
 مسکراہٹ دبائی۔

”پیدا انٹی ڈاکٹر لگتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی
 اسٹیکس کوپ پکڑ لیا ہوگا اور مسکراتے تو صرف
 مریضوں کے ساتھ ہی ہیں۔ ہمارے لیے تو ہر وقت
 جلا دینے رہتے ہیں۔“

”اب رہنے دو اس ٹاپک کو۔ کیوں گوہر کو ڈار رہی
 ہو اپنی باتوں سے۔“ ٹانیہ نے فرح کو ٹوکا۔
 ”ہوں، بھوک لگی ہے۔ کھاتے ہیں کچھ۔“ حنا
 ریلیکس ہو کر بیٹھی۔

”تم کچھ لوگے؟“ ٹانیہ نے خاموش بیٹھے گوہر کو
 متوجہ کیا۔

”نہیں۔ آپ لوگ لچ کریں، میں چلتا ہوں۔ مجھے
 ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔ آگین تھمبکس آپ نے
 بڑی مدد کی۔ اصل میں بھائی کے پاس اتنا نام نہیں

لینی چاہی۔

ہوتا۔ ان سے پڑھنے کا موقع کم ملتا ہے۔ ”گوہر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

”تمہارے بھائی ڈاکٹر ہیں؟“ فرح نے سوال کیا نکالتے ہوئے پوچھا۔

”جی میں ڈاکٹر حملو منیر کا چھوٹا بھائی ہوں۔“ گوہر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ سن کر وہ تینوں بی بی سن ہو گئی تھیں۔ حنا اور فرح کی زبان تو تالو سے چپک گئی تھی۔

”اچھا! آپ لوگوں سے مل کر۔“ گوہر کتابیں اٹھا کر جانے لگا مگر ان کے ہونٹ چہرے دیکھ کر رک گئے۔

”پریشان نہ ہوں“ آپ کے خیالات کسی سے شیر نہیں گروں گا“ بھائی سے بھی نہیں۔ ویسے بھائی مریضوں کے علاوہ گھر والوں کے ساتھ بھی بڑے

سوہیت ہیں۔“ شرارتی انداز میں کتاہ وہاں سے چلا گیا۔

”تو سب کہنے کی کیا ضرورت تھی اس کے سامنے۔“ ثانیہ انہیں ڈنڈا۔

”اب ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ ڈاکٹر حملو کا بھائی ہے۔“ حنا بولی۔

”مزلج سے تو ڈاکٹر حملو کا بھائی کہیں سے نہیں لگ رہا تھا۔“ فرح نے اپنی رائے دی۔

”اب تو ہو گیا جو ہونا تھا۔ چلو لچ کرتے ہیں، موڈ ٹھیک کرو۔“ ثانیہ نے ان کے سر پر چہرے دیکھ کر

موضوع تبدیل کیا اور وہ تینوں لچ کی طرف متوجہ ہوئیں جو ابھی ابھی ویٹر رکھ کر گیا تھا۔

”یہ برائی ہے؟“ سر سمد نے چچہ واپس رکھتے ہوئے سنجیدگی سے اقدس کو دیکھا۔

”یہ سر۔“ اقدس نے اعمکو سے کہل۔ سمد نے خستہ حال چاولوں پر نظر ڈالی۔

”مجھے تو یہ پچھڑی کی چھوٹی بہن لگ رہی ہے۔ برائی تو دور دور تک نظر نہیں آ رہی۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟“ انہوں نے ساتھ بیٹھے سر جلودی کی رائے

کوئی فیصلہ کرو۔“ بیگم سراج نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ڈیڈی میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے اور میں کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کر سکتی جسے میں جانتی تک نہیں ہوں نہ کبھی ملی ہوں اور پھر وہ لوگ بھلو پور میں رہتے ہیں اور ہم اسلام آباد میں۔ ہمارا کوئی منہ نہیں ہو سکتا کبھی بھی۔“ فریال نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے می کو دکھا جس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

”می! آپ ریلیکس ہو جائیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں ویسا نہیں ہونے والا، میں جاری ہوں دوستوں کے ساتھ، شاپنگ کا پلان ہے۔“ فریال انہیں تسلی دیتی تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔



سب معمول کی طرح اپنے کام میں مصروف تھے۔ اقدس بھی مگن سی سبزیاں کاٹ رہی تھی۔ آج کس سبزی بھائی تھی، مگر بیشک کی طرح اس کا ذہن ادھر ادھر کی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کاونٹرز کی صفائی کا آج آخری دن تھا چونکہ جتنے دن سرسود نے صفائی کے لیے اسے دیے تھے، وہ پورے ہو گئے تھے۔ رات سے وہ اسی بات پر خوش تھی۔

”آج ٹورنٹ ہوئی چاہیے اقدس! تمہاری سزا جو ختم ہو رہی ہے تمہارے آنے سے پہلے سر آج کے دن کو اسی لیے اسوشل دن کہہ رہے تھے۔“ تانیہ نے برتن میں پچھہ ہلاتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

”ٹریسٹ ضرور یہ کس سبزی بن جائے۔“

اقدس کے جھٹ سے کہنے پر نورین بول اٹھی۔

”تمہارے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے سے اچھا ہے کہ بندہ

بھوکا ہی رہ لے۔“ اس سے پہلے کہ اقدس کچھ کہتی سر

سود نے انہیں پوائنٹ آؤٹ کر کے چپ کر دیا تھا۔

چوہے پر فراتی بین کلنی دیر سے بڑا تھا اور خود وہ

ترکیب بڑھنے میں مصروف تھی۔ آج بھی کلنی تیز

تھی۔ ترکیب اچھی طرح ذہن نشین کر کے جیسے ہی

”می پلیز، مجھے کوئی شادی واوی نہیں کرنی فی الحال۔“ فریال نے بے زاری سے کہا۔

بیگم سراج نے صوفے پر بیٹھی میگزین کی ورق گردانی کرتی اپنی بیٹی کو غور سے دیکھا جو گھر کے عام سے

حلیے میں بھی بہت خاص لگ رہی تھی۔ اس کی

خوبصورتی کی وجہ سے نو عمری سے ہی اس کے رشتے آنا

شروع ہو گئے تھے۔ تب وہ دونوں میاں بیوی خود ہی منع

کر دیا کرتے تھے۔ مگر اب جب کہ اس کی پرمٹائی مکمل

ہو چکی تھی وہ چاہتی تھیں کوئی اچھا رشتہ قبول کر لیں۔

”اتنی جلدی کیا ہے می! ابھی میں ہاؤس جا پ

کر رہی ہوں پھر اسپیشلائزیشن بھی کرنی ہے۔“

انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر فریال نے بالوں کی لٹ کو

کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ سب تو ہمارے گلہ یہ دو پروپوزلز بہت اچھے

ہیں۔ تم ان میں سے کوئی ایک فائنل کر لو تو کم از کم

لنگج جمنٹ ہی کر دیں۔“

”مجھے یہ دونوں ہی پروپوزلز نہیں پسند اور جب تک

مجھے کوئی پسند نہیں آئے گا، میں شادی نہیں کرنے

والی۔“

فریال کے اٹل لمبے پر بیگم سراج نے مگر اسانس

لیتے ہوئے پہلو بدلا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ میں جلدی

فیصلہ کیوں کرنا چاہتی ہوں۔“

”اوہ، می آپ کو پتا ہے میں بچپن کے اس سو کاڈ

رشتے کو نہیں مانتی جو تانا نے آپ کو اپنے سوتیلے بھائی

سے جوڑنے کے لیے کیا تھا اور پھر ان سالوں میں ہمارا

ان سے تعلق رہا ہی کتنا ہے یقیناً۔“ وہ اس رشتے کو معمول

چکے ہوں گے بلکہ ہمارا رویہ دیکھتے ہوئے وہ خود یہ رشتہ

نہیں جوڑنا چاہیں گے۔“

”مگر میں چاہتی ہوں پہلے ہی تمہاری انگریجنٹ

کردوں کیونکہ تمہارے ڈیڈی نے کہا ہے کہ اگر وہ

لوگ رشتہ جوڑنے آئے تو وہ اس رشتے پر غور ضرور

کریں گے۔ ویسے بھی تمہارے ماموں کا رابطہ ہے

فون پر۔ میں چاہے ان سے نہ ملوں پر سراج ان سے

ملتے ہیں جب بھی وہ آئیں۔ اسی لیے تو چاہتی ہوں تم

اس نے پن میں آئل ڈالا۔ اس نے آگ پکڑ لی۔ جلدی سے اسے ہینڈل سے پکڑ کر کاؤنٹر پر رکھا، مگر لکڑی کے کاؤنٹر نے بھی آگ پکڑ لی۔ سب سے پہلے نظر نورین کی پڑی تھی چونکہ اس کے کاؤنٹر نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔ اس کے چہنچے پر اقدس نے بدحواس ہوتے ہوئے جلدی سے پن کا ہینڈل پکڑ کر سامنے پھینکا جو کہ سامنے موجود شیشے کی کھڑکی سے ٹکرایا۔ اس پار شیشہ ٹوٹنے کی آواز میں اقدس کی چیخ بھی شامل تھی۔

مزید نقصان سے پہلے ہی سرسید ایمر جنسی ہینڈل دبا چکے تھے جس کے باعث ان دونوں کاؤنٹرز کے اوپر لگے سواخوں سے پانی آنا شروع ہو گیا تھا۔ آگ کے بجھتے ہی اقدس کی جان میں جان آئی۔ دل کی تیز ہوتی دھڑکن بھی معمول پر آئی، مگر نورین کی بری حالت تھی۔ اس کے بال نیچے سے جل گئے تھے۔ روز تو وہ بال باندھ کر ہی آتی تھی پر آج کیلئے ہونے کی وجہ سے اس نے کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ سران سب نے ہی کیپ سے ڈھانپ رکھا ہوا تھا اور جس رخ سے وہ اس وقت کھڑی تھی۔ اس کے کمر سے نیچے تک آتے بال کاؤنٹر کو چھو رہے تھے جس کے باعث وہ آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔

باقی سب پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ نورین کو فوراً بھجوا دیا گیا جب کہ اس کی سرسید نے اچھی خاصی کلاس لی تھی۔



مسیح ٹون برٹانیہ نے موبائل اٹھایا۔ وہ اس وقت اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ کوئی انجان نمبر تھا۔ شروع میں اپنا نام دیکھ کر وہ مسیح پر ہنسی چلی گئی۔ ”ڈاکٹر برٹانیہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس مسیح کو کتنی اہمیت دیں گی، مگر میں خود کو روک نہیں پایا۔ معلوم نہیں کب آپ اس قدر اچھی لگنے لگیں کہ اس دل میں اتنی جلی گئیں، میں حیران ہوں۔ پہلی بار میں کسی معاملے میں اس طرح سے بے بس ہوا ہوں۔ خود

سے محبت کرنے پر آپ کو مجبور نہیں کروں گا، مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنی ذہانت سے آپ مجھ جیسے گھرے انسان تک پہنچ جائیں گی اور میری محبت اس میں سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوں کیونکہ میری محبت کی خوشبو آپ تک ضرور پہنچے گی۔“

مسیح پڑھ کر ثانیہ کے چہرے پر ہر سوچ لکیریں ابھر آئیں۔ بھلا ایسا کون تھا جو اسے نام اور پتے سے جانتا تھا۔ زیادہ دیر وہ سوچ نہیں سکی اور سر جھٹکتی ہوئی تیار ہونے لگی۔ امی پہلے ہی ناشتے کے لیے آوازیں دے رہی تھیں۔ رات دیر تک پڑھنے کی وجہ سے اس کی آنکھ صبح دیر سے کھلی تھی۔



”ڈھونڈ کیا رہی ہو؟“ مہر نے کویت سے اسے دیکھا جو گھٹنے بھر سے لیپ ٹاپ پر جھکی ہوئی تھی۔

”انٹرنیٹ پر سرچ کر رہی ہوں۔ کوئی ایسی دسیسی جو جھٹ پٹ بنے اور مزے کی بھی ہو بلکہ ایسی سویٹ ڈش جو آدھی ریڈی میڈ ہو۔ جس میں مکسچرڈ وغیرہ ڈالنے سے نیٹ آجائے۔“ اقدس نے تفصیل سے بتایا نظر میں ابھی بھی لیپ ٹاپ اسکرین پر ہی تھیں۔

”ضرورت کیا تھی سویٹ ڈشز کے کمپیٹیشن میں حصہ لینے کی۔ پھر کچھ ٹائید ہانہ ہو جائے۔“ مہر نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

ابھی آگ لگنے والے واقعے کو چھ دن ہی گزرے تھے کہ سویٹ ڈش کے کمپیٹیشن کاسن کر اقدس نے فوراً نام لکھوا دیا جب کہ مہر نے روکا بھی کہ اس بار رہنے دو، اگلی مرتبہ لیں گے، مگر اقدس کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو اسے کون روک سکتا ہے۔

”ارے واہ، ضرورت کیوں نہیں تھی۔ مانا کہ میرے ستارے ہر وقت گردش میں رہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ کروں ہی ناں۔“ اقدس نے نوٹ پیڈر پر تیزی سے لکھتے ہوئے کہا۔

”کل سرسید اور سر جاوید دونوں ہی تمہاری تعریف کر رہے تھے۔ تم نے بہت اچھا بنانا شروع کر دیا

ہے۔ ”اقدس نے یاد آنے پر ہاتھ روک کر پوچھا۔
 ”گھر میں بار بار بتاتی ہوں۔ بریانی تو کوئی پانچ چھ دفعہ
 بنا چکی ہوں۔ ایک دو بار کوئی چیز غلط بنتی بھی ہے تو اگلی
 بار اچھی بننے لگتی ہے۔ تم گھر میں کیوں نہیں
 بناتیں۔“

”ہی اور مہرین آپ نے تو اتنی بار کہا کہ کچھ بنا کر ہی
 کھلا دو، ہر میں نے ٹال دیا۔ مجھ سے گڑبڑ ضرور ہوتی
 ہے۔ ایسے ہی بے عزتی ہو جاتی اور اگر ابو نے کچھ بھی
 لیا تو کہیں گے یہ وقت ضائع کر رہی ہے کچھ پڑھنے پر
 لگاؤں اسے۔“ اقدس نے منہ بنایا۔

”کیا لکھ رہی ہو۔ ملی کوئی مہسی۔“ مہرین
 موضوع بدلا۔

”بس دیکھتی جاؤ تم، ایسی زبردست سوئیٹ ڈش
 بناؤں گی کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔ دو
 مہسیہ کو کس کر کے ایک سوئیٹ ڈش بنائی ہے۔“
 ”کس کرنے کی کیا ضرورت ہے، ایک ہی بناؤ۔“
 مہرین حیران ہو کر پوچھا۔

”بھئی زیادہ اچھا اور یونیک ٹیسٹ آئے گا۔ اس کا
 نام ہو گا کریمی کیوہل ڈیٹائیٹ ونڈل اینڈ کریم کیک۔“
 اقدس نے نوٹ پیڈ دیکھتے ہوئے مزے سے کہا جیسے
 یقین ہو کہ کوئی زبردست چیز ہی بنے گی۔

”اللہ ہی خیر کرے۔“ مہرین خود کلامی کی۔



وہ کیفے میں بیٹھی گوہر کو ٹاپک سمجھا رہی تھی جب
 مہسیہ ٹون کی۔

”کوئی پوائنٹ سمجھ میں نہ آیا ہو تو پوچھ لو۔“ ٹاپک
 ختم کر کے ثانیہ نے گوہر سے پوچھا۔ ”سمجھ میں تو
 آگیا۔ رات کو پڑھوں گا پھر اگر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کل
 آپ سے پوچھ لوں گا۔“

”بالکل پوچھ لینا۔“ ثانیہ نے کھلے دل سے کہا۔
 تب ہی حنا اور فرح آگئی تھیں۔

”ہو گئی پڑھائی؟“ حنا نے پیٹھے ہوئے پوچھا۔
 ”میں تو سمجھا، میری وجہ سے آپ لوگ اپنی دوست

کو چھوڑ گئی ہیں۔“ گوہر کے لہجے میں شرارت تھی۔
 ”کیوں بھئی، تمہاری وجہ سے ہم اپنی دوست کو
 کیوں چھوڑیں گے۔“
 ”تم اپنے بھائی سے خاصے مختلف ہو۔ وہ کچھ سنجیدہ
 ٹاپ کے ہیں اور تمہاری طبیعت بہت جلی ہے۔“
 فرح نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”تمہارے بھائی سنجیدہ ضرور ہیں، سخت طبیعت کے بھی
 لگتے ہیں مگر میں بہت اچھے انسان۔“ گوہر مسکرایا۔
 ”تمہارے سامنے تو ہم انکار کر ہی نہیں سکتے۔“ حنا
 کی بات کو گوہر نے انجوائے کیا۔

ثانیہ نے مسکراتے ہوئے موبائل اٹھا لیا۔ اجنبی
 نمبر سے مہسیج تھا جسے وہ دونوں میں بھول بھی چکی
 تھی۔

”ثانیہ! آپ نے سوچا ہو گا کوئی سر پھرا تھا جو مہسیج
 کر کے بھول گیا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ
 میں اپنے پروفیشن کے لحاظ سے ایک بے حد مصروف
 بندہ ہوں، مگر یہ سچ ہے کہ بے حد مصروفیت میں بھی
 میرے دھیان میں آپ ہی تھیں، کسی خوش کن
 خیال کی طرح جو دل میں سکون سالے آئے۔ اس
 معاملے میں، میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا
 ہوں۔“

میری ذات میں بس اتنا حصہ ہے تیرا
 کہ تجھے خود سے نکالوں تو میرے پاس کچھ نہیں رہتا
 ”ثانیہ! تم کیا لوگی؟“ فرح نے اس سے پوچھا۔

”ہوں۔ کچھ بھی۔“ اس کی پیشانی غم آلود تھی اور
 دل کی دھڑکن تیز۔ پہلے کبھی اسے ایسی پجوشن کا سامنا
 نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کا مزاج ایسا تھا کہ وہ سب سے
 ہنس کر ملتی تھی، مگر صنف مخالف سے حدود میں رہتے
 ہوئے خوش مزاجی سے پیش آتی تھی۔ ایک بار
 میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں ایک سینئر نے
 اسے پروپوز کیا تھا۔ اس نے سیدھے بھاؤ سے انکار
 کر دیا تھا کیونکہ اسے پڑھنا تھا، اپنے پیروں پر کھڑا ہونا
 تھا جو اس کا اور اس کے والد کا خواب تھا، مگر پہلے کبھی
 اسے ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

”ساری چیزیں رکھ لی تھیں نا اور وہ دوسری ہے پاس؟“

کمپینیشن شروع ہونے سے پہلے مہربار اس سے یہ سوال پوچھتی رہی۔ اقدس محض سر ہلا کر اس کی تسلی کرواتی رہی۔ جب اس کا نام لے کر کاؤنٹر کی طرف بلایا جا رہا تھا تو مہربار نے اسے روک دیا۔

”اقدس پلیز! ارد گرد کا دھیان رکھنا۔ اس بار کہیں چوہا نہ بھاڑ آئے۔“ مہربار جیسے یقین تھا کہ اس بار بھی وہ کوئی گریڈ ضرور کرے گی۔

”ہو۔ ہوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس بار سیکنڈ یا تھرڈ تو اتنی جاؤں گی۔“ اقدس نے خود احمکی سے کہا اور اپنے کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

شیف گلزار اور شیف صابر کا نام سن کر اقدس نے چونک کر بجو کی گرسیوں پر بیٹھے افرلو کو دیکھا تھا۔ وہ انہیں فوراً پہچان گئی تھی۔ اکثر وہ ای کے ساتھ ان کے کوکنگ شوزدیگتی تھی۔

”آخر میں جا کر خود ان سے آؤ گراف لیں گی۔“ اقدس نے سوجھ بوجھ خوش تھی کہ ای کو تانے کے لیے اس کے پاس ایک زبردست نواز تھی۔

”ہمارے تیرے حج ابھی پہنچ نہیں سکے۔ وہ ہمارے انٹی ٹیوٹ کے آنر وہاں تیمور کے ساتھ آؤ گئے تھے میں پہنچیں گے۔ ان کی ہدایات کے مطابق سب پارٹنرسمنٹ سے گزارش ہے کہ وہ اپنا کام شروع کر دیں کیونکہ ان کا وقت شروع ہو رہا ہے۔“

کمپیئر کے خاموش ہوتے ہی تیل بجی تھی۔ تیل کے بجتے ہی اقدس نے ہاتھ چلانے شروع کر دیے تھے۔ دوسری اس نے یاد دہانی کی ہوئی تھی اور نوٹ پیڈ بھی چھپا کر ساتھ لے آئی تھی تاکہ اگر کچھ یاد نہ آئے تو مدد لے سکے۔ آدھا کام وہ کر چکی تھی جب رضا اس کے کاؤنٹر کی طرف آیا۔

”سر جلدی کی ہدایت ہے کہ پی ٹی ٹی ہوا پالی ٹس

کوئی اسٹوڈنٹ استعمال نہ کرے۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اگلے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

”سر جلدی کو کیا مسئلہ ہے اور اب تو میں ڈال ہی چکی ہوں۔ خیر وہ ٹیل اسپون سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“ اقدس نے سر جھٹک کر پہلے ہی بسکٹس کے چورے میں پی ٹی ٹی ہوا شامل کر چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کمپیئر نے شیف سکندر رضا اور روحان تیمور کے آنے کا اعلان کیا۔

اقدس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تجزہ کی کرسی پر کوئی بزرگ سی شخصیت بیٹھ رہی تھی۔ اقدس کو وہ بہت کیونٹ لگے تھے۔ سرخ و سفید سا چوہا اور لیوں پر دھبی سی مسکراہٹ جو اپنے ساتھ تجزہ سے بات کرتے ہوئے ان کے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کمپیئر نے بیس منٹ وہ جلنے کا اعلان کیا تو اقدس نے ان پر سے نظر ہٹا کر جلدی جلدی اپنی سویٹ ڈش مکمل کرنے کی کوشش کی۔ ابھی اسے اپنی سویٹ ڈش کو ڈیکورٹ بھی کرنا تھا۔ بیس منٹ میں اس نے جلدی جلدی سب کیا تھا۔

آخری تیل بجتے ہی سب نے ہاتھ روک لیے تھے۔ کمپیئر بجو کو ٹینٹنگ کارنر کی طرف جارا رہی تھی جہاں پہلے سے ہی سارے امیدوار اپنی ڈشیز سمیت موجود تھے۔ دس منٹ بعد اس کی باری آئی تھی۔

”ڈرینگ آپ نے کونج اور چاکلیٹ سے کی ہے۔“ شیف صابر نے بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”یس سر۔“ اقدس نے خود احمکی سے جواب دیا۔

”ہوں۔ ڈرینگ تو بہت اچھی ہے اس کے تو مارکس ملنے چاہیے۔“ شیف سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا پھر شیف گلزار کی طرف مڑے۔ ”گلزار صاحب ٹیسٹ پیچھے۔“ شیف گلزار نے ایک چمچہ منہ میں ڈالا پھر دوسری بار چمچہ بھر کر منہ میں ڈالا۔

”لگتا ہے سویٹ ڈش مزے دار ہے۔“ شیف صابر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کچھ مختلف ساذاقہ ہے۔ آپ دونوں بھی ٹیسٹ کیجئے۔“
 اقدس کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔ کیا معلوم اس بار کوئی پوزیشن ہی آجائے اس نے نکل میں سوچا۔
 ”سر! پہلے آپ۔“ شیفت صابر نے شیفت سکندر رضائے کہا۔
 انہوں نے سر ملاتے ہوئے ایک چمچہ بھر کر منہ میں ڈالا۔

”ہوں آپ بھی لیجئے صابر صاحب۔“ شیفت صابر آگے آئے اس سے پہلے کہ شیفت صابر کچھ کہتے، شیفت گلزار کی برشلی سی آواز پر مڑے جو شیفت سکندر کے قریب کھڑے تھے۔ اقدس نے بھی ان کی طرف دیکھا۔ ان کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ پورا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے نیچے کر رہے تھے۔ شیفت گلزار نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ کرتے چلے گئے۔ شیفت صابر نے جلدی سے انہیں دوسری طرف سے پکڑ کر زمین پر لٹایا۔
 ”اسپیڈ لیس کل کریں جلدی۔“ شیفت صابر نے زور سے آس پاس موجود لوگوں سے کہا تھا۔

سکندر رضائے کی طرح تڑپ رہے تھے اور ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی طرف اشارہ بھی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ دونوں شیفت حضرات کچھ سمجھتے، کوئی ہماگتا ہوا قریب آیا تھا۔ اس نے سکندر رضا کے قریب بٹختے ہی ان کی جیب سے کچھ نکالا اور ان کے بازو میں خمیر ڈرا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اسٹوڈنٹس اور نیچر کا جمع ہانکل خاموش بیٹھا تھا۔

اقدس اپنی جگہ ہونق سی کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سکندر رضا کی طبیعت بہتر ہونا شروع ہوئی تھی۔ اس شخص نے ان کو اٹھایا، اقدس کی طرف اس کی پشت تھی وہ ٹھیک سے دیکھ نہ پائی۔ ان کا سارا بوجھ اپنے کندھے پر لیتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ سر سودے دوسری طرف سے انہیں تھام لیا تھا۔
 سرجلوید کی تیز آواز پر وہ بری طرح چوکی تھی اور

جھٹکا کھا کر ان کی طرف مڑی۔
 ”سر! میں نے کچھ نہیں کیا۔ منہ میں نے کوئی زہر وغیرہ ملا یا ہے، مجھے تو پتا بھی نہیں کہ ایسی چیزیں ملتی کھلی سے ہیں۔“ جو اس کے منہ میں آیا وہ بولتی چلی گئی۔
 ”میں آپ سے پوچھ رہا ہوں آپ نے سوئیڈش میں پی ٹی ٹی ہٹو یا پی ٹی یو کیا کیا تھا نہیں۔“ سرجلوید نے سخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔
 ”پی ٹی ٹی ہٹو۔“ اقدس نے معصومیت سے ان کو دیکھا، مگر ان کے غصیلے تاثرات دیکھ کر فوراً بولی۔
 ”جی سر یو کیا تھا۔“

”کیوں؟ جب میں نے منع کیا تھا پھر آپ نے کیوں استعمال کیا؟“
 ”سر میں نے تو وہ چیخ ہی ڈالے تھے۔“ اقدس نے منمناتے ہوئے اپنی صفائی دینا چاہتی۔
 ”سر سکندر کو پی ٹی ٹی ہٹا رہی ہے اسی لیے آپ سب کو منع کیا تھا۔ دیکھا آپ نے؟“ ان کی طبیعت کیسے خراب ہو رہی تھی۔ اگر ان کی حالت زیادہ بگڑ جاتی پھر۔“
 اقدس نے سر جھکا لیا اب وہ کیا کہتی۔



”سر! میں نے بیڈ نمبر چھ کے ہیشنٹ کی، ہسٹری نوٹ کر لی ہے۔ آپ چیک کر لیں۔“ اس نے فائل آگے بڑھائی جس کو ڈاکٹر حلو نے تھام لیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھا قمر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے خوب صورت نقوش، حسین بل، سحر انگیز آنکھیں، شہزادیوں جیسی اٹھان بلاشبہ بعد حسین تھیں۔

”ٹھیک ہے آپ جانیں میں دیکھ لوں گا۔“
 ”اوکے سر۔“ وہ سر ہلا کر دفتر سے نکل گئی۔

ڈاکٹر حلو نے فائل کو ایک نظر دیکھ کر سائیڈ پر رکھا اور خود کو مورتے قمر کو دیکھا۔ ”کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”یہ کون تھیں؟“
 ”کون۔“

اور کے ساتھ کہاں۔“ قمر نے اس کے لمھن لگانے پر سر دھتا۔

☆☆☆

”سر سرمد تمہارا پوچھ رہے تھے۔“ مہر کے کہنے پر اقدس مزید پریشان ہوئی۔
 ”ایک تو یہ سر سرمد بھی نا‘ یقیناً“ میرے خلاف پلاننگ کر کے بیٹھے ہوں گے۔“
 ”ہاں تو منع کیا تھا نا کہ نہ لوحہ، تمہیں ہی شوق تھا کچھ کرنے کا۔ تمہیں پتا ہے سکندر رضا بچہ ہیں سر روحان کے۔“ اس نئی اطلاع پر اقدس کا حلق تک کڑوا ہوا۔

”ٹیچر کو بھلا کون بلاتا ہے۔ خواہ مخواہ انہیں تکلیف دی دعوت دے کر۔“

”شکر کرو ای وقت ان کو اینٹی الرجی انجکشن لگا دیا گیا ورنہ ان کو کچھ ہو جاتا۔“

اقدس نے مہر کی بات کاٹی۔ ”اب رہنے دو نا۔ پہلے ہی میں پریشان ہوں۔ گھر میں بمانہ کیا ہوا ہے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اوپر سے ثانیہ آپلی جو چیک کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ میں تو بری پھنسی ہوں۔“

”کل چلو بہت ہو گئی چھٹی۔ کچھ نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ کیا ہو جائے گا۔ ڈانٹ ہی پڑے گی نا۔“ مہر کے کہنے پر اس نے پرسوںچ انداز میں سر ہلایا۔

”ہوں۔ اب جو ہو گا دکھا جائے گا۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈس۔ میں بھی اقدس شہاب ہوں، ڈرنے والی تو میں بھی نہیں۔“ اس کی انہی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

وہ تینوں ہاؤس آفیسرز دم میں موجود تھیں۔ آج او پی ڈی تھا اس لیے سارے دن مریضوں کو دیکھ کر کھکی بیٹھی تھیں۔ حنا تو ٹانگیں سیڑ کر کے صوفے پر لیٹ ہی گئی تھی۔

”ثانیہ! تم فریال کا کچھ کرتی کیوں نہیں ہو۔ آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ تمہارے لیے کھڑا کر دیتی ہے۔“

”جو ابھی یہاں سے گئی ہیں۔“

”چھا ڈاکٹر فریال کا پوچھ رہے ہو۔ ہاؤس جاہلین

ہیں۔“

قمر ٹیبل پر بازو پھیلا کر آگے ہوا۔ ”پھر بات کروں شادی کی۔“

”تم ڈاکٹر فریال سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو کچھ جانتے بھی نہیں ہو اس کے بارے میں۔ اس کی فیملی کے بارے میں۔ ذرا صبر سے کام لو۔“ ڈاکٹر حماد نے بنجیدگی سے اسے سمجھانا چاہا۔
 ”میں کہاں سے آگیا بچہ میں۔ میں تمہاری اور ڈاکٹر فریال کی شادی کی بات کر رہا ہوں۔“ قمر نے اپنا سر پیٹا۔

ڈاکٹر حماد نے گہرا سانس لیا۔ ”میری شادی!“

”جی ہاں آپ کی شادی جناب! آج کل تو میرا یہ حال ہے کہ ہر حسین بچی آپ کی دلہن کے روپ میں ہی نظر آتی ہے۔“ اس کے انداز پر ڈاکٹر حماد کو ہنسی آئی۔ جس پر قمر کو مزید تاؤ آگیا۔

”منسوخت، غور کرو میری بات پر۔ اچھی بھلی خوب صورت بچی ہے شادی کرو۔“

”اور تم سے کس نے کہا کہ میری بیوی کا خوب صورت ہونا ضروری ہے۔ ویسے بھی ظاہری خوبصورتی سے زیادہ اندرونی خوب صورتی مجھے اٹریکٹ کرتی ہے۔“

قمر مد مڑا ہوا۔ ”او بھائی تیری یہ جو فلاسفی ہے نا، لے ڈوبے گی ایک دن۔ بھی اب ایسی ٹینسنگ کیسے کریں جو اندرونی خوب صورتی بتا سکے۔“

”تم رہنے دو۔ میں خود ڈھونڈ لوں گا۔“

”تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔ چلو اب اٹھو۔ کبھی اس اسپتال کی جان چھوڑ بھی دیا کرو۔ کسی اچھی جگہ بیٹھ کر ڈنر کرتے ہیں۔ کوئی لڑکی تو تمہاری زندگی میں ہے نہیں جو تمہارے ساتھ ڈنر کر سکے۔ لہذا یہ شرف آپ مجھے ہی بخش دیں۔“ قمر کے جلے کٹے انداز پر ڈاکٹر حماد نے مسکراتے ہوئے دفتر کی چابیاں اٹھائیں۔

”جو مڑا تمہارے ساتھ ڈنر کرنے میں ہے وہ کسی

صبح والا واقعہ یاد کر کے فرح نے سرے سے تپ اٹھی۔
”کیا کروں؟“ ثانیہ نے سیدھا ہو کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”کچھ تو کرو۔ آج بھی اس کی وجہ سے ڈاکٹر حسام سے تم نے ڈانٹ کھائی ہے۔“
ثانیہ نے گہرا سانس لیا۔

کل وہ ہیشنٹ کی، سٹری ہٹا کر فائل ڈاکٹر حسام کے ٹیبل پر رکھ کر آئی تھی۔ وہ اس وقت ایک کیس ڈسکس کرنے ڈاکٹر اسماعیل کے پاس جا رہے تھے۔ ان کی ہدایت کے مطابق وہ فائل رکھ کر آگئی۔ صبح انہوں نے بلا کر اچھی خاصی بے عزتی کی اس بات پر کہ ابھی تک آپ کو ہیشنٹ کی، سٹری لیتا نہیں آئی۔ وہ جیران سی سنتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا غلطی ہوئی تھی جو ڈاکٹر حسام اس قدر آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ دوبارہ سٹری بنانے کے لیے انہوں نے فائل واپس کر دی۔

دفتر سے باہر آکر جیسے ہی اس نے فائل کھولی سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ فائل میں لگا بیج جس پر اس نے سٹری نوٹ کی تھی تبدیل کر دیا گیا تھا اور یہ کس نے کیا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ فریال کی رائٹنگ کو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

”ایسا کرو اس کے والدین کو بتا دو ورنہ اس طرح سے تو کسی دن وہ کوئی بڑا نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔“
”فرح ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ حنا نے بھی ثانیہ کی طرف دیکھا۔

”نہیں، میں انکل سے کچھ نہیں کہہ سکتی وہ بہت اچھے دوست ہیں ابو کے۔ میں انہیں دھکی نہیں کرنا چاہتی۔ اللہ مالک ہے۔ آئندہ میں محتاط رہوں گی۔“
”اف ایک تو تمہاری فریال سے ہمدردی میری سمجھ سے باہر ہے۔“ فرح نے اسے گھورا۔

”چھوڑو اس بحث کو کچھ منگواتے ہیں باہر سے، مجھے کچھ اچھا سا کھانا ہے۔“ ثانیہ نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے موبائل نکالا۔



آئی تو اسی عزم سے تھی کہ سارا معاملہ سنبھال لے گی، شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر سر سرہ کو دبے کے لیے بہت سے دلائل بھی اس نے جمع کیے تھے مگر سر سرہ کے سامنے آتے ہی وہ سارے جواز جو اس نے پوری رات لگا کر ڈھونڈے تھے دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ روحان تیمور نے اسے بلایا ہے اور اب وہ ہی فیصلہ کر سکیں گے۔

”سر اودھ میری ایک چھوٹی سی غلطی تھی۔“ اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

”اور آپ کی یہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں مل کر ادارے کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ یہ معاملہ میں نے روحان صاحب کے حوالے کر دیا ہے، وہی اب آپ سے بات کریں گے۔“ سر سرہ اسے دو ٹوک الفاظ میں کہہ کر کلاس لینے چلے گئے تھے۔

اب وہ ایک گھنٹے سے روحان تیمور کے آفس میں بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ آفس بے حد شان دار تھا۔ شیف سے زیادہ یہ کسی بزنس مین کا آفس لگ رہا تھا۔ بڑی اور شاندار سی روالوینک چیئر سامنے رکھی گئی ٹیبل جس کی ٹاپ گلاس کی تھی۔ اس کے ایک سائیڈ پر سلیقے سے رکھی گئی چند فائلز، پیپر ویٹس اور لیپ ٹاپ۔ ٹیبل کے دوسری طرف خوب صورت ڈیزائن کی گئیاں۔

بائیں طرف سنگ ایریا سا بنایا گیا تھا۔ جہاں سینئر ٹیبل کے ساتھ آرام دہ صوفے رکھے گئے تھے۔ سامنے ایل سی ڈی ٹی وی دیوار پر لگا گیا تھا۔ اس ایرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا فرنیچر پڑا تھا اور اس ایک گھنٹے میں وہ فرنیچر کو بھی اندر باہر سے اچھی طرح دیکھ چکی تھی جس میں مختلف جوسز، فروٹس، پانی کی بوتل اور دودھ کے ڈبے پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے آگے آئے پتھر پردے۔ غرض ہر چیز خوب صورت اور شاندار تھی۔

”اب آجھی جائیں، لگتا ہے اپنے بیوی بچوں کو بھی ناشتا دے کر ہی آئیں گے۔“ اس نے آکٹا کر سوچا۔
”بچے تو یقیناً بڑے ہی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے

چند منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ پھر وہ اس کی طرف مڑا۔

”آپ کی رپورٹ میں نے دیکھ لی ہے۔ ابھی تک اس انسٹی ٹیوٹ میں اتنی لوہار فاف منس کسی نے نہیں دی۔“ اس نے سامنے بیٹھی ابھی سی لڑکی کو دیکھا۔

”سر پرفار منس تو آہستہ آہستہ ہی بہتر ہو گئی۔“

”پرفار منس میں تو بہتری آ سکتی ہے، مگر جو نقصانات آپ کی وجہ سے ہمارے انسٹی ٹیوٹ نے اٹھائے ہیں، ان کی وجہ سے سرسود اور سرجلوید کا کتنا ہے کہ آپ کو مزید موقع نہ دیا جائے۔“ یہ سنتے ہی اچانک سے اس کے اندر کی خود اعتمادی لڑکی بیدار ہوئی تھی۔

”سر پلیز، مجھے اس انسٹی ٹیوٹ سے نہ نکالیں اور دیکھیں میرا تو نقصان ہو گا ہی۔ آپ کی بھی بدنامی ہوگی، نام خراب ہو گا آپ کے انسٹی ٹیوٹ کا۔ مجھے تو کتنا بڑے گاہک صحیح سکھایا نہیں گیا۔“

روحان نے دلچسپی سے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ لیسن کلر کا ڈریس اس نے پہن رکھا تھا جس پر وائٹ پرنٹ تھا۔ شانوں پر لیسن ڈیوٹیا پھیلائے وہ لب خود اعتمادی سے اپنا دفاع کر رہی تھی۔

”اور وہ جو شیے توڑے،“ آگ لگی اور اتنا بڑا ایونٹ برہلو ہوا۔ اس سب کا کیا؟“ روحان نے اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

”سر! آپ خود سوچیں، ڈرائیوے کا ٹوٹنا زیادہ بہتر تھا یا پورے کلاس روم میں آگ لگنا۔ ابھی تو نورین کے بل ہی جلتے تھے اگر اسے مزید نقصان پہنچ جاتا پھر؟“

”ہی بات ایونٹ کی تو میری ان بزرگ شخصیت سے کوئی ذاتی دشمنی تو تھی نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا انہیں نیٹ الری ہوگی۔ سرجلوید کو بھی تو بتانا چاہیے تھا صحیح سے، میں پہلے ہی بی بی نیٹ ہشو ڈال چکی تھی اس وقت۔“ اقدس نے اپنی ساری غلطیوں کا جواز پیش کیا۔ اس کی پونی ٹیل اس کے سر ملانے کے ساتھ ساتھ ہولے ہوئے ل رہی تھی۔

”ہوں مگر سرسود کے خیال میں تو آپ کچھ سچے

شادی شدہ بھی ہوں۔“ وہ ان سوچوں میں غرق تھی جب دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونک کر کھڑی ہوئی۔

”آئیوے! نے ایک نظر اسے دیکھا۔

”السلام علیکم۔ آپ کس سلسلے میں آئی ہیں۔“

”وہ میں۔۔۔ سر روحان سے ملنا تھا۔“ اقدس گڑبڑائی۔

”میں ہی روحان تیمور ہوں بیٹھے۔“

اسے بیٹھے کا اشارہ کر کے وہ موبائل پر تیزی سے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اقدس نے حیرت سے سر سے پاؤں تک اس شخص کو دیکھا۔ بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ وائٹ شرٹ پہنے، ایک ہانڈ پر بلیک کوٹ لٹکائے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر مصروف وہ کہیں سے ویسا نہیں لگ رہا تھا جیسا اس نے سوچ رکھا تھا۔ وہ تو ایک ادھیڑ عمر شیفت سے ملنے آئی تھی، مگر سامنے موجود بیک سے بندے کی پر سنائی سے وہ متاثر ہوئی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، وجیرہ نقوش، چہرے پر پھیلی سنجیدگی، اس کی شخصیت سے چھلکتا سحر جو سامنے والے کو مرعوب کر دیتا تھا۔

”پلیز بیٹھیں۔“ اپنا کوٹ ریو الونگ چیئر پر پھیلا کر وہ بیٹھ چکا تھا۔ اس کا جائزہ لیتی اقدس اس کے دیکھنے پر سٹپٹائی اور جلدی سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی۔

”بتائیے کیا کام ہے آپ کو۔“

اس کے پوچھنے پر اقدس نے اپنے ٹھنڈے ہونے ہاتھوں کو ملا۔ اب تو اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا نام سننے ہی سامنے بیٹھا شخص اسے اپنے انسٹی ٹیوٹ سے فارغ کرنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگائے گا۔

”میں اقدس ہوں۔ سرسود نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ اقدس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”اقدس شباب! رائنڈ۔“ اسے یاد آ گیا تھا۔

”جی! اقدس نے سر ملایا۔

”آپ کی پرفار منس رپورٹ مجھے فاروڈ کی گئی ہے۔ لیٹ می چیک۔“ اس نے اپنا لپ ٹاپ آن کیا۔

اقدس کو سرسود پر نئے سرے سے ناؤ آ رہا تھا۔

میں انٹرسٹ ہی نہیں ہیں۔“ سر سمد کے نام پر اس کا طلق تک کروا ہوا۔

”سر سمد تو ویسے ہی میرے سخت خلاف ہیں۔ آپ تو آئیں، خود فیصلہ کریں۔ اب چند غلطیوں کی بنا پر ایک اسٹوڈنٹ کو تو آپ ضائع نہیں کریں گے نا۔“ وہ اپنا پورا زور لگا دینا چاہتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر یہاں سے بھی نکال دی گئی تو بے عزتی تو ہوئی ہی۔ اب اسے پھر سے رہائی پر لگا دیتے اور یہ جو اطمینان اور سکون کے دن وہ گزار رہی تھی سب ختم ہو جاتے تھے۔

”چلیں ٹھیک ہے۔ پھر آج سے آپ میری اسٹوڈنٹ ہیں۔ میں خود آپ کی کلاسز لوں گا۔“ اس کے نرمی سے کہنے پر اقدس کو شاک لگا۔ اسے لگا شاید خنے میں غلطی ہوئی ہو۔

”سر آپ؟“

”جی میں لوں گا۔ شام کو چار سے سات عین کلاسز لیتا ہوں۔ آپ تین پچاس پر میرے آفس آجائیے گا ایڈمنسٹریشن کچھوئل۔“

”اے کو کے سر اینڈ تھینک یو سر۔“ اس کا دل ہلایا اچھل رہا تھا۔ کہیں تو سر سمد اور سر جلیوید اسے لکھانے پر تلتے تھے اور کہیں روحان تیسور اسے کلاسز دینے پر آگاہ تھے۔ اس سے اچھا آپشن بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ اسے جانے کا اشارہ کر کے وہ لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گیا تھا اور وہ خوش ہوتی ہوئی آفس سے نکل گئی۔

”سوئیٹ ڈش کمیٹیشن میں میری اتنی تعریف مل کر آنر نے بلالیا آج آفس میں۔ بہت حوصلہ بالکل کی انہوں نے۔“ اقدس صبح والے والے فتنے کو اپنی مرضی سے تبدیل کر کے سنارہی تھی۔ سامنے بیٹھی امی، مہرین اور ثانیہ آپنی دلچسپی سے جب کہ مہرے سے منہ ہاتے ہوئے سن رہی تھی۔

”ہم لوں نے کہہ دیا کہ آپ اب ہائی اسکور اسٹڈنٹس میں شامل ہیں اس لیے کل سے میں آپ

کی کلاسز لوں گا۔“ اقدس نے اپنی بات مکمل کر کے نخریہ انداز میں ان سب کو دیکھا سوائے مہرے کے جو اس سفید جھوٹ پر اسے بری طرح گھور رہی تھی۔

”واپس بھی۔ مطلب چھانگنی ہماری بہن۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی وہ کرو جس میں تمہارا انٹرسٹ ہو۔“ مہرین آپنی خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا خیال ہے آپنی! اس کو رس کے بعد اسے ہوم اکنائکس پڑھنا چاہیے نا۔“ مہرے اس کی خوشی پر پانی پھیرا۔ اقدس نے لکھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں تو شیفت بنوں گی۔ ویسے بھی روحان تیسور مجھے ماسٹر شیفت تو یقیناً بنا کر ہی چھوڑیں گے۔“

”بس رہنے دو۔ اپنے ابو کا پتا ہے نا، پہلے ہی کون سا خوش ہیں۔“ امی کو ناگوار گزارا۔

”ابو جن پروفیشنل کو قاتل عزت سمجھتے ہیں امی“

میں ان میں سے کچھ بھی نہیں کروں گی۔“ اقدس نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہمیں بھی اب کچھ بنا کر کھلا دو۔“ اتنی دیر سے خاموش بیٹھی ثانیہ نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

”بالکل آپ سب کی دعوت کروں گی۔“ اقدس کے جھٹ سے کہنے پر مہرے اپنی ہنسی دیا۔

”جی دعوت تو یہ ضرور کرے گی مگر خواب میں۔“

آخری الفاظ مہرے آہستہ سے ادا کیے تھے جس پر اقدس چپ گئی۔ امی وچکن میں چلی گئیں۔ مہرین نے ٹیسٹ کی تیاری کرنا بھی وہ بھی اٹھ گئی۔ ثانیہ بھی انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ابھی اس نے کتاب کھولی ہی تھی کہ مہرے ٹوننج آگئی۔

اس نے مہرے کو کھولا۔

میری آنکھوں کو سوجھتا ہی نہیں

یا مقدر میں راستہ ہی نہیں

پھر وہی شام ہے وہی ہم ہیں

ہاں مگر دل میں حوصلہ ہی نہیں

”تو سرا اصل میں ہمارے گھر میں لگ کھانا بناتا ہے
ورنہ شوق تو مجھے بہت ہے۔ کوئنگ شوژ میں نے بہت
دیکھے ہیں اپنی امی کے ساتھ۔“ اس کی دلیل پر وہ ہنس
پڑا۔

”آج آپ ان ڈشز میں سے کچھ بھی بنالیں جو
یہاں پر آپ نے سیکھی ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں آپ
کیسا پکاتی ہیں اور آپ کے ویک پوائنٹس کیا ہیں۔“
”اوکے سرا“ اقدس نے سر ہلایا۔ یہ اور بات تھی
کہ وہ ٹینشن میں آگئی تھی۔
”آرام سے سوچ کر اشارت کریں۔ میں راونڈ
لے کر آتا ہوں۔“

وہ مسکرا کر کہتا ہوا اپنے اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔
اس کے جاتے ہی اقدس نے سکون کا سانس لیا اور اپنا
نوٹ پیڈ کھول لیا جس پر وہ اب تک روسپیج لکھتی
آئی تھی۔

☆ ☆ ☆
اس نے آنکھیں گھما کر سامنے بیٹھے اپنے دوست
کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کے نا سمجھی سے کہنے پر قمر نے
مسکراتے ہوئے دوبارہ اس کے موبائل کی اسکرین پر
دیکھا۔

”دیکھ رہا ہوں، کس لڑکی سے بات چیت چل رہی
ہے تمہاری۔“

”میں نے ویڈیو دیکھنے کے لیے تمہیں موبائل دیا
تھا نہ کہ پوری فیس بک آئی ڈی کا جائزہ لینے کے
لیے۔“ ڈاکٹر صادق نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھینا۔
”اوہو“ اس قدر غصہ ڈاکٹر صاحب! لگتا ہے وال
میں کچھ کالا ہے۔“ قمر نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”تمہارے دماغ کا فوٹر ہے بس۔ اگر مہسج پڑے
ہوں جو کہ یقیناً تم نے پڑھ ہی لیے ہوں گے تو یہ بھی
معلوم ہو گیا ہو گا کہ صرف کام کی بات کی گئی ہے ڈاکٹر
ثانیہ پارٹ ون کی تیاری کر رہی ہیں۔ اسی کے بارے
میں پوچھتی رہتی ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں

وہ بھرے شہر میں کسی سے بھی
میرے بارے میں پوچھتا ہی نہیں

میں تو اس کی تلاش میں گم ہوں
وہ کبھی مجھ کو ڈھونڈتا ہی نہیں
اس نے سر جھٹک کر اپنی توجہ کتاب پر مبذول
کرنے کی کوشش کی، مگر ذہن بھٹک کر بار بار اس
مہسج والے کی طرف چلا جاتا تھا۔ بے تحاشی اس نے
کبھی جولائی مہسج نہیں کیا تھا، مگر وہ نمبر ہلاک بھی
نہیں کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اپنے اسٹوڈنٹس کو وہ ایک ایٹلین ڈش بنانا سکھا رہا
تھا جب کہ اقدس اس کے کاؤنٹر کے پاس اسٹول رکھے
بیٹھی تھی۔ نظریں ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ
کلاس روم باقی سارے کلاس رومز سے بڑا اور شاندار
تھا۔ کوئنگ اتنی زیادہ تھی کہ پکاتے ہوئے بھی گرمی کا
احساس نہ ہو۔ اپنا کام مکمل کر کے وہ اس کی طرف آیا
تھا۔

”جی تو اقدس۔ آپ کیا کیا بنا لیتی ہیں۔“ اسٹول پر
بیٹھے ہوئے اس نے پوچھا۔

”میں۔“ اقدس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس چیز کا نام
لے

”چلیں، یہ بتادیں۔ اچھا کیا بنا لیتی ہیں۔“
”سرا! اچھا تو ہوتا نہیں بس چند چیزیں ہیں جو میں بنا
سکتی ہوں۔“

”یہاں آنے سے پہلے آپ کیا کچھ بناتی تھیں۔
شوق میں کچھ نہ کچھ تو بندہ بناتا ہی رہتا ہے۔“ اس کے
اگلے سوال پر اقدس سٹپٹائی۔ جھوٹ بھی نہیں بول
سکتی تھی۔ کیا خبر وہ بنوائی لیتا۔

”ناستہ۔ میرا مطلب ہے اینڈ۔“ اقدس کے بے
چارگی سے کہنے پر وہ ہنس دیا کرولا۔

”اینڈ! واؤ، مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ کو
کوئنگ میں انٹرنسٹ نہیں ہے۔“

باقی اسٹوڈنٹس کو ٹاسک دے کر وہ اس کی طرف مڑا
جواطمینان سے اسٹول پر بیٹھی تھی۔

”میں نے آپ کو اچھی طرح آبرو کیا تھا۔ دیکھی
آپ بالکل فالو نہیں کرتیں بلکہ مسالے آگے پیچھے
ڈال دیتی ہیں۔ کھانا پکانا بھی ایک آرٹ ہے کہ کب
کون سی چیز ڈالنی ہے، کون سا مسالا کس مقدار میں
ڈالنا چاہیے اور کون سے مسالے مل کر میسٹ دیں
گے۔ اسی وجہ سے آپ کی کس سبزی میسٹ لیس سی
تھی۔ ایک اور چیز کی بھی کمی تھی انٹرسٹ کی۔“

اقدس محویت سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔
اپنے مخصوص نرم لہجے میں وہ کسی اچھے استاد کی طرح
اس کی خامیاں بتا رہا تھا۔ اس کا انداز اتنا اچھا تھا کہ
اسے کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔

”کھانا شوق سے اور دل سے پکانا چاہیے۔ یہ وہ فیکٹر
ہیں جو کھانے کو مزید ذائقے دار بناتے ہیں۔ میرا خیال
ہے اب باقاعدہ آغاز کرتے ہیں۔ پہلے تین دن صرف
میں پکاؤں گا اور آپ مجھے دیکھیں گی۔ چوتھے دن سے
آپ بھی اشارت کریں گی۔“

اقدس سر ملاتی کاؤنٹر کے دوسری طرف آگئی جہاں
وہ ایمرن باندھے کھڑا تھا۔ شرٹ کے کف بیسٹ کی طرح
فولڈ کر رکھے تھے۔

”پہلے ہم چکن سے شروع کریں گے۔ چکن بنانا
آسان سمجھی ہے اور جلد ہی بھی بن جائے اس لیے پہلے
چکن کی زیادہ تر ڈشیں سکھاؤں گا۔ چکن پسند ہے؟“
اس نے چکن کا پیکٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”لیس سر۔“
”کون سا بنا میں پھر؟“ وہ اب تل کھول کر اچھی
طرح سے چکن دھو رہا تھا۔

”چکن کرنا ہی۔“
”اوکے آپ یہ اسٹیک چکھیں ساتھ میں ہنی
باربی کیو ساس ہے اور فرائڈ وینجی ٹیمپلز۔“ اس نے
اسٹیک کی طرف اشارہ کیا جو وہ ٹھوڑی دیر پہلے اپنے
اسٹوڈنٹس کو سکھا کر ڈش آؤٹ کر چکا تھا۔ خوب
صورت ڈریسنگ کے ساتھ وہ دیکھنے میں تو اچھا لگ رہا

نے وضاحت کی۔
”السلام علیکم۔ تم بھائی کیسے ہیں۔“ گکو ہر لاؤنج میں
داخل ہوا۔ سامنے ہی وہ دونوں بیٹھے تھے۔
”وعلیکم السلام۔ میں تو ٹھیک ہوں۔ اپنی سناؤ کہاں
فائب رہتے ہو۔“ قمر سے مل کر وہ قریبی صوفے پر بیٹھ
گیا۔

”بس کچھ نہ پوچھیں، میڈیکل کی پڑھائی کا تو آپ کو
پتا ہے کس قدر فف ہے اور ساتھ میں میرا کرکٹ کا
شوق۔ روز شام کو میچ کھیلنے چلا جاتا ہوں۔ آج سنڈے
تھا تو میچ رکھ لیا۔“

”یہ تمہارا بھائی کس دن کام آئے گا۔ اسے پکڑ لیا
کر پڑھنے کے لیے۔ ویسے بھی مدد کرنے کا اسے بڑا
شوق ہے۔“ قمر کی بات سمجھتے ہوئے ڈاکٹر حماد
مسکرائے۔

”بھائی سے پڑھنے کے لیے ان کے دفتر کے چکر
لگانے پڑتے ہیں اور اکثر تو یہ ملتے ہی نہیں ہیں۔ اس
لیے میں نے اپنے لیے نیا پیچر ڈھونڈ لیا ہے اسپتال
میں۔“

”مسلمان سے تو نہیں پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے تو
اپنے کوئی حالات نہیں تھے پڑھائی میں۔“

”قمر کے کہنے پر گکو ہر ہنسنا۔ ”میں ہمارے کالج کی ٹاپر
ہیں۔ ہاؤس جاب کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر ثانیہ“ ان سے
پڑھتا ہوں۔“

”اچھا تو ڈاکٹر ثانیہ سے بڑھ رہے ہو۔ واؤ! پڑھو
بھائی ضرور پڑھو۔“ قمر کے مسکرائے پر گکو ہر چونکا۔

”آپ جانتے ہیں انہیں۔“

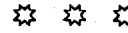
”ہوں تھوڑا بہت۔ اچھی ڈاکٹر ہیں ماشاء اللہ۔
شاید مستقبل میں مزید جاننے کا موقع ملے۔“ اس نے
شرارتی انداز میں کہتے ہوئے خود کو گھورتے ڈاکٹر حماد کو
دیکھا۔

”جاؤ بھی کپڑے تبدیل کر کے۔ آؤنج پر چلتے
ہیں۔“ ڈاکٹر حماد نے متذبذب سے بیٹھے گکو ہر سے کہا۔
قمر سے کچھ بعید نہ تھا کہ مزید کچھ التامیہ سدا کہہ دیتا۔



تھا خوشبو بھی اچھی اری۔ اقدس نے کائنات سے
لشٹیک کا ایک ٹکڑا اس میں ڈبو کر منہ میں ڈالا۔
”سراسر می۔ بہت ہی مزے کا ہے۔“
بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ وہ واقعی اچھا شیٹ تھا۔
اس کا یقین بگڑتا ہوا۔

”عقرب آپ بھی ہمیں مزے دار سنا کر
کھلائیں گی۔“ روحان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
”مشکل ہے۔“ اقدس نے محض سوچا۔ پھر سارا
وقت وہ اس کو غامت سے کام کرتے ہوئے دیکھتی
رہی۔ ساتھ وہ اسے بھی سمجھا تا جا رہا تھا۔ اقدس کو بے
چین روح کہنے والی مگر اس وقت اس کی محبت دیکھ
لتی تو شاید یقین ہی نہ کرتی۔



”ہاں نہیں آپ میرے بارے میں کیا سوچتی ہیں۔
سوچتی بھی ہیں یا نہیں؟“ مگر میں آپ کو اپنی سوچوں سے
بھل نہیں پاتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کا اور میرا گہرا
تعلق ہے۔ معلوم نہیں آپ میرے بارے میں
جانیں گی تو آپ کے احساسات کیا ہوں گے مجھے
فہم کر پائیں گی یا نہیں۔“

میسج پڑھ کر اس نے موبائل میز پر رکھ دیا۔ ہاں
نہیں کیوں وہ یہ میسج پڑھتی تھی۔ اس نے قریب
رکھی کتاب کھول لی۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا مگر اس
نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے پڑھنے کی کوشش کی۔



وہ بغور اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی جو اس کا بتایا
ہوا آلمنڈ چکن (Almand Chicken)
ٹیسٹ کر رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پھر مسکرایا۔
”ٹیسٹ تو اچھا ہے۔ امپروونٹ آرہی ہے۔“
”سرا! آپ جیسا تو میں بھی نہیں بنا سکتی۔“ اقدس
کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

روحان نے اپنے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر رکھ کر تھوڑا سا
جھکتے ہوئے اس کیوٹ سی لڑکی کو دیکھا جواب جھوٹے
برتن ہونے کے لیے سنک میں رکھ رہی تھی۔

”بالکل صحیح اہل فی اہل تو میرے جیسا میں بنا
سکتیں۔ مگر کل آپ مجھ سے بھی اچھا بنائیں گی۔ اچھا
بننے لگے گا۔ آج میں نے آپ کو شوق سے پکاتے دیکھا
ہے اور یہ اچھی بات ہے۔“ اس کی باتیں اس کی
شخصیت کی طرح سحر انگیز تھیں۔

”جب آپ ایکسپرٹ ہو جاتے ہیں تو ایک لیول
کر ڈیویوٹی کا آتا ہے۔ جب شیٹ خود سے مسجج
بننے لگتا ہے۔“

”اقدس سے تو ہم آخر میں دعوت کھائیں گے
سر۔ یہ ہم سب میں چھوٹی ہے۔“
ان کے قریب آئی منتاشا نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں
ٹرے تھے جس میں سویٹ ڈش کے پالے رکھے
تھے۔

”ٹریٹ تو بنتی ہے ویسے بھی۔ اقدس میری پہلی
سب سے چھوٹی اسٹوڈنٹ ہے۔“
روحان کے اپنی طرف دیکھنے پر اقدس نے فوراً
ہائی بھری۔ ”ضرور سر۔“

یہاں پر سارے ہی اسٹوڈنٹس میچور اور ڈینٹ
تھے اسی لیے اسے کسی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سب
ہی خوشی سے ملتے تھے۔

”منہ کس خوشی میں میٹھا کر رہی ہیں۔“ روحان کا
اشارہ پیالوں کی طرف تھا۔

”سرا! آج آپ سب کے لیے مینگو سوپے بنایا
ہے، اپنے بیٹے کی صحت پیالی کی خوشی میں۔“ منتاشا
خوش تھی اور یہ اس کی آنکھوں کی چمک سے ہتا چل رہا
تھا۔

”بہت مبارک ہو آپ کو۔“ روحان نے ایک پیالہ
اقدس کے سامنے رکھا اور دو سرا خود اٹھالیا۔ منتاشا
ٹرے لے کر دوسرے کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

مینگو سوپے کا پہلا چمچ لیتے ہی اسے اچھا لگا تھا۔
یہاں اسے ایسی ایسی چیزیں کھانے کو مل رہی تھیں جن
کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔



اندور کی طرف بڑھتا گوہر ٹھٹھک کر رہا تھا۔

اسپتال کی داخلی میزبھیوں کے بائیں کونے پر ثانیه چیمبی تھی۔ وہ تیز جیز چلتا اس کی طرف آیا۔ اس کے سلام کرنے پر ثانیه نے سر اٹھایا۔
”میل کیوں پچھی ہیں؟“ وہ اس سے فاصلہ رکھ کر ایک استنباط نچے بٹھ گیا۔
”بس ایسے ہی۔“

”اواس ہیں؟“ گوہر نے اس کی اداسی محسوس کی تھی۔
”تھوڑی سی ہوں۔“
”کیوں؟“

”دل خراب ہو رہا تھا وارڈ میں۔ ایکسپینڈنٹ کا کیس آیا ہے۔ اسکول بس الٹ گئی۔ صبح سے اتنی اموات دیکھ چکی ہوں کہ اب وارڈ میں کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اوپر سے اتنا خون دیکھ کر مٹلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی ڈاکٹر حسام سے ڈانٹ کھا کر آ رہی ہوں۔“

”چلیں چھوڑیں۔ سینئر ڈاکٹر کو تو ڈانٹنے کے علاوہ کوئی کام نہیں اور پھر ان کی ڈانٹ سے ہی تو جو نیئر یکستا ہے۔“ گوہر نے اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا۔
”ہوں یہ تو ہے۔ میرے ساتھ ایسے بھی نہیں ہوا۔ بس آج صبح سے ٹھیک کام کر رہی تھی۔ اچانک سے ہی طبیعت ایسی ہو گئی۔“ ثانیه نے شرمندگی سے وضاحت کی تھی۔

گوہر نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لنچ ٹائم ہونے والا ہے، چلیں کیفے سے اچھی سی چائے پلانا ہوں آپ کو ساتھ میں کچھ کھاتے ہیں۔“
”چائے تم پلاؤ۔“ لنچ میں کراتی ہوں کیونکہ آج میں لنچ بھی لائی ہوں۔ میری امی کے خیال میں ان کی بیٹی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ”وہ بھی خود کو سنبھالتی اٹھ گئی تھی۔“

”واؤ! کیا لائی ہیں لنچ میں۔“
”سینڈوچ ہیں شاید۔“ دونوں باتیں کرتے کیفے کی طرف جا رہے تھے۔

”آج کلاسز نہیں ہو رہی ہیں؟“ کلاس روم کے دروازے بند دیکھ کر وہ اس کے آگے آئی تھی۔ روحان لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔
”آئی ایم سوری۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا۔ آج کلاسز نہیں ہو رہی ہیں۔“ وہ شرمندہ سالس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی گاڑی تو واپس چلی گئی ہوگی؟“
”کوئی بات نہیں سراسر! میں ڈرائیور کو کل کر لیتی ہوں۔“ اقدس نے مہیا کل نکال کر ڈرائیور کو کل کی۔
”سوری امین۔ مجھے آپ کو انفارم کرنا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے آپ کا ٹائم ضائع ہوا۔“ روحان نے اپنا ماتھا سلاتے ہوئے ایک بار پھر معذرت کی۔
”میرا ٹائم ضائع نہیں ہوا سر۔ میں تو فارغ ہی ہوتی ہوں۔“ روحان تیور کا شرمندہ ہونا اسے اچھا نہیں لگا تھا اور اس کا معذرت کرنا اسے خود شرمندہ کر رہا تھا۔
روحان چونک۔ ”کیوں آپ کچھ پڑھتی دوڑتی نہیں ہیں۔“

”آں نہیں۔ میں بس گھر میں ہوتی ہوں۔“ اقدس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا کہے، سچ تو یہی تھا۔
”کمل تک پڑھا ہے؟“
”ایف ایس سی کیا ہے۔“ اقدس نے تھوک نھتے ہوئے کہا۔

”آگے کیوں نہیں پڑھا۔ پڑھنے کا رواج نہیں ہے خاندان میں یا کوئی اور مسئلہ ہے۔“ وہ حیران سا اسے دیکھ رہا تھا۔
”ایسی بات نہیں ہے۔ میری ایک بہن ڈاکٹر ہے۔ دوسری انجینئرنگ پڑھ رہی ہے۔ بس مجھے کوئی خاص شوق نہیں پڑھنے کا۔“ اقدس نے اسے مزید حیران کیا۔

”گھر میں کسی نے فورس نہیں کیا؟“
”یونیورسٹی جوائن کی تھی۔ تین سیمسٹر پڑھے بھی، مگر پھر چھوڑ دیا۔ میرا انٹرسٹ نہیں تھا۔“ اقدس نے اصل بات چھپاتے ہوئے بات بنائی۔ آخر کس منہ سے کہتی کہ یونیورسٹی سے نکال دی گئی تھی۔ کل

تک جس بات کو وہ خاطر میں نہیں لاتی تھی آج اسی کا بتانا اسے اپنی بے عزتی لگ رہا تھا۔

”اسٹرینج۔ سارا دن گھر میں کیا کرتی ہیں۔“

روحان کے اس سوال پر وہ سٹپائی۔ اب کیا بتاتی کہ سارا دن ٹیبلٹ، رسالے پڑھ کر اور ڈرامے دیکھ کر گزارتی تھی یا پھر اپنے کپڑے ڈیزائن کر لیتی۔

”حیرت ہے۔ میں تو فارغ رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ روحان حیران ہوا۔

”میرے کرنے کے لیے کوئی کام ہوتا نہیں ہے اسی لیے اور میں اکثر کام خراب بھی کر دیتی ہوں۔“ اقدس نے شرمندگی سے لب کاٹے روحان نے بغور اسے دیکھا۔ وہ اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”مصروفیت انسان کو خود تلاش کرنی پڑتی ہے اور کوئی کام کرنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ نہیں ہوگا بہت غلط ہے اور پھر میری اسٹوڈنٹ ہو کر آپ ایسی باتیں نہیں کر سکتیں۔ چلیں ایسا کرتے ہیں کہ آپ کل سے میرے ساتھ کام کرنا شروع کر دیں۔ میں اپنے دوست کے ساتھ مل کر مختلف ایوٹس ارنج کرانا ہوں۔ فوڈ ایوٹس اور یونیورسٹیز میں کمپینیشنز وغیرہ۔ مزاحیہ اے گا اور سیکھنے کو بھی ملے گا۔ اپنے گھر والوں سے پوچھ لیں، وہ اجازت دیں تو کل سے آجائیں۔“ اس کی آفر نے اقدس کو حیران کیا تھا۔

”سر! میں کیسے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

روحان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”تو میں کس لیے ہوں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ اس کی فکر مت کریں۔ اجازت ملے تو صبح آجائیں بلکہ ایسا کریں پہلے ریسٹورنٹ آجائیں، صبح میں وہیں ہوتا ہوں۔“

”اوکے سر!“ وہ ہامی بھر کے اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ اب وہ ہرجوش کی، امی کو منانے کے لیے ذہن میں الفاظ اکٹھے کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وارڈ میں معمول کی پابلیں تھیں۔ سینئر ڈاکٹر زراؤنڈنگا

کر جا چکے تھے۔ وہ بیڈ نمبر چھ کے ہیشنٹ کو چیک کر کے فارغ ہوئی تھی کہ میسج ٹون بج اٹھی۔ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے میسج پڑھنے لگی۔

”آج آپ پر نظر پڑی تو دل کیا کہ بس دیکھتا ہی رہوں، مگر یہ مصروفیت۔ سوچا آپ کو ہٹاؤں اور بج کر آپ پر بہت سوٹ کرتا ہے۔ ویسے تو ہر رنگ آپ پر اچھا لگتا ہے، مگر آج آپ مجھے ایک معصوم سی پری لگیں جو سب سے بے خبر اپنے آپ میں مگن ہو۔ وقت کی کمی ہے ورنہ میں بہت کچھ کہتا۔ ٹیک کیئر ٹانیہ۔“

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی ایسا یوں تھا جو اتنے قریب تھا اور وہ تو صبح سے وارڈ میں ہی تھی۔ کیا یہ کوئی کولیک تھا یا۔ اس نے تمام سوچوں کو اپنے ذہن سے جھٹکنا چاہا۔

”مجھے ایسا کچھ نہیں سوچنا یہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا چاہیے۔ میں ٹانیہ شہاب ہوں میری اپنی پسند ناپسند ہے۔ کوئی بھی مجھے یوں جکڑ نہیں سکتا چند جملے بول کر۔“

ٹانیہ نے اپنے اندر کی آواز پر خود کو کمپوز کیا اور قدم آگے بڑھائے۔

☆ ☆ ☆

گھر میں اس نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ روحان تیور نے اسے خود ایونٹ مینجمنٹ میں آنے کی آفر کی ہے۔ کرنل شہاب کے خیال میں ان بے کار کاموں کا کوئی فائدہ نہیں تھا، مگر انہوں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اگلے دو ہفتوں میں وہ روحان تیور کے معمولات دیکھ کر حیران بھی ہوئی تھی اور مرعوب بھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک محنتی شخص تھا۔ قائد اعظم کی ”کام کام اور کام“ والی تھیوری پرفٹ بیٹھتا تھا۔ صبح ریسٹورنٹ جاتا، نہ صرف سپروائز کرتا بلکہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑس تب ہی چلتا ہے جب انسان اس میں انٹرسٹ لے اور اس کے لیے محنت کرے۔

☆ ☆ ☆

ریگورس میں ہی ایونٹ پلاننگ پر کام شروع کرتا۔
 اقدس کو بتاتا کہ کیسے ایونٹ پلان کرنا ہے کون سے
 پوائنٹس پہلے نوٹ کرنے ہیں۔ پھر اسے سائٹ پر
 لے جا کر جاتا۔ وہاں اسے بجٹس کرواتا، وہ پوائنٹس
 نوٹ کروانا جو پلانز میں شامل کرنے ہوتے۔ باقی کے
 کام انسٹی ٹیوٹ جا کر بناتے۔ انسٹی ٹیوٹ کی دن بھر کی
 رپورٹ بھی اسے چیک کرائی جاتی۔ ایک آدھ راکونڈ
 پورے انسٹی ٹیوٹ کا لگاتا۔

وہ مختلف ایونٹس پر بھی مدعو ہوتا جن پر اب اقدس
 کو بھی ساتھ لے کر جاتا تاکہ وہ سیکھ سکے کہ کس طرح
 ایونٹس آرینج کیے جاتے ہیں۔ دن بھر کی اس تھکا دینے
 والی روئین میں تین کب کافی کے تھے جو اسے فریش
 کر دیا کرتے تھے۔ کافی ختم کرتے ہی ایسے فریش نظر
 آتا جیسے ابھی اس نے دن کا آغاز کیا ہو۔

صرف محنت ہی اس کی خوبی نہیں تھی جو اقدس کو
 متاثر کر رہی تھی۔ اس کا سب کو عزت دینا چاہے وہ عام
 ور کر ہی کیوں نہ ہو۔ شروع میں اقدس کو لگتا وہ اس کا
 مذاق اڑائے گا، مگر وہ ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا،
 کبھی ڈی گریڈ نہیں کرنا ایک بات جو اقدس کو سب
 سے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ اس کا فاصلہ رکھ کر بیٹھنا تھا۔
 جب بھی وہ بیٹھتے، روحان ہمیشہ اپنے اور اس کے
 درمیان فاصلہ رکھتا۔

وہ روحان تیمور کی سحر انگیز شخصیت کی گرویدہ ہوتی
 جاری تھی۔

اقدس اس کے آفس میں بیٹھی میگزین پڑھ رہی
 تھی۔

”کیسا لگا آر ٹیکل۔“ روحان نے اپنی کرسی
 سنبھالتے ہوئے پوچھا وہ ابھی انسٹی ٹیوٹ کا راکونڈ لے
 کر آیا تھا۔

”زبردست سر۔ آپ کا آر ٹیکل دلچسپ بھی ہے
 اور انفارمیٹو بھی۔“ اقدس نے برملا تعریف کی۔
 روحان مسکرایا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اسی میگزین میں میرے ٹیچر کا
 آر ٹیکل چھپتا ہے، وہ پڑھیں گی تو میرا فوڈ کارز بھول
 جاسکیں گی۔“

”یاد تو ہوں گے سکندر رضا آپ کو۔“ اس کے
 مسکراہٹ دبا کے پوچھنے پر وہ بیٹھیں۔
 ”بالکل سارا وہ مجھے اور میں انہیں نہیں بھول
 سکتی۔“

”ہوں پھر تو ایک سرسبز ملاقات ہونی چاہیے۔“
 روحان نے کہتے ہوئے کچھ اور میگزینز اس کے
 سامنے رکھ دی تھیں۔

”یہ پچھلے کچھ مہینوں کے میگزینز ہیں اگر پڑھنا
 چاہو۔“ اقدس نے سر ہلایا پھر بچھکتے ہوئے بولی۔
 ”ایک بات پوچھنا چاہ رہی تھی سر آپ سے۔“
 ”جی ہاں پوچھیں۔“ روحان نے نرمی سے اسے دیکھا۔
 ”آپ کو شیفت بننے کا خیال کیسے آیا۔ ہمارے ہاں
 اس طرح کے پروفیشنز کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی
 جاتی۔“

روحان کے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ
 پھیل گئی۔ ”یہ سوال بہت سے لوگوں نے شروع
 شروع میں مجھ سے کیا تھا۔ اصل میں میری کوئی بہن
 نہیں ہے تو میں اکثر اہمی کی مدد کرنے کے لیے کچن میں
 ان کے ساتھ لگا رہتا تھا اور اچھا کھانا اور اچھا پکانا دونوں
 ہی مجھے فیسٹی نیٹ کرتے تھے۔ پھر اہمی ایک مہینہ بیمار
 رہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں بیڈ ریسٹ بتایا تھا۔ بس پھر میں
 تھا اور کچن اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کوکنگ میرا
 پیشہ بننا چاہتا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد میں سیدھا
 پایا کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ مجھے ایک ریسٹورنٹ
 کھولنا ہے۔ میرے پایا بڑے فرینڈز سے ہیں۔ بڑی
 نرمی سے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بنا آپ کے پاس
 پیسے کتنے ہیں۔ میں شرمندہ ہو گیا کیونکہ اس وقت تو
 بس پانچ مئی پر ہی گزارا چلتا تھا۔“

اقدس دلچسپی سے اس کی روداد سن رہی تھی۔ وہ
 مسکراتے ہوئے پرانے وقت کو یاد کر رہا تھا۔
 ”میری شرمندگی پر وہ مسکرائے اور پاس بٹھا کر
 سمجھایا کہ بزنس کے لیے پیسہ اور تجربہ دونوں ضروری
 ہوتا ہے اور فی الحال مجھے اپنی پڑھائی پر توجہ دینی

چاہیے۔ اس وقت تو میں خاموشی سے اٹھ گیا، مگر کچھ اور کرنے پر دل نہیں مانتا تھا۔ پھر میں نے سرچ کرنا شروع کیا کہ پروفیشنل شیف کیسے بنا جاسکتا ہے۔ بس پھر بابا کے سامنے پہنچ گیا کہ مجھے امریکا سے کوئی نیری آرٹس اور ہوٹل میجمنٹ پڑھنا ہے اور شیف بننا ہے۔

صرف ایک گہری نظر انہوں نے مجھ پر ڈالی تھی اور کہا تھا کہ آج یہ فیصلہ کر رہے ہو تو آئندہ کبھی اس پر پچھتا نہیں۔ فیملی میں سب نے روکنے کی کوشش کی مگر بابا نے یہی کہا جو روحان کرنا چاہتا ہے کرے، میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ بس محنت کرے اور کچھ بن جائے۔ میں نے امریکہ میں پڑھا بھی اور پارٹ ٹائم جاب بھی کی اور اپنے شوق کو اپنا پروفیشن بنالیا۔ اب میں محنت سے گھبراتا نہیں کیونکہ اس کام سے مجھے سکون ملتا ہے۔ بس یہی ہے میری کہانی۔ ”روحان نے اپنی طرف دلچسپی اور حیرت سے متنی اقدس کو دیکھا۔ ”آپ کے فلور بہت سپورٹو ہیں۔ آپ کی باتوں میں اکثر ان ہی کا ذکر ہوتا ہے۔“

”سب کے پہلے ہیرو تو فلوری ہوتے ہیں اور یہ بات لڑکیوں سے بہتر کون جان سکتا ہے۔“ روحان نے مسکراتے ہوئے لپ ٹاپ آن کیا تھا۔ ”میری تو ابو سے سرد جنگ ہی چلتی رہتی ہے۔“ اقدس کے منہ سے بے ساختہ نکلا کیونکہ وہ اکثر اپنے خیالات کا اظہار مہر کے سامنے کرتی رہتی تھی۔ روحان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ایسا کیوں؟“ ”ان کا مزاج بہت سخت ہے۔“ اقدس نے بات بتائی۔

”سخت ہوتے تو آپ یوں پڑھائی دڑھائی سب چھوڑ کر فارغ نہ ہوتیں۔“ ”وہ مجھ پر زیادہ توجہ نہیں دیتے اور اگر آپ پانچ منٹ ان کے پاس بیٹھ جائیں تو آپ کو لگے گا کہ ان کی صرف دو بیٹیاں ہیں وہ بھی قتیل اور لائق۔“ میری امیں ذرا بھی پروا نہیں۔ ”اس نے ناک

سیکڑی۔

”اقدس! وہ تمہارے فادر ہیں اور ماں باپ کے لیے ساری اولاد ایک جیسی ہوتی ہے۔“ روحان نے اس کے اندر کی تلخی کو محسوس کیا تھا۔ ”آپ میرے ابو سے ملیں گے تو خود ہی دیکھ لیجے گا۔ چلیں چھوڑیں اس قصہ کو۔ یہ میگزینز لے جاؤں، سارے آرٹیکل پڑھنے ہیں مجھے۔“ اقدس نے موضوع بدلا۔ وہ اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ روحان نے گھر سانس لیتے ہوئے سر ہلایا۔



آج اتوار تھا اور وہ صبح سے کچن میں مصروف تھی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ ایسے میں مہرین آپنی کچن میں آئیں۔ ”ہوں۔“ خوشبو تو بہت اچھی آ رہی ہے۔ شکر ہے ہم معصوموں کا بھی کچھ خیال آیا تمہیں۔ بہن کو کنگ سیکھ رہی ہو اور گھر والے مستفید نہ ہوں یہ تو بڑی زیادتی ہے۔“ مہرین نے سارے کچن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کریں، اب یہ سخلوت میں ہر سنڈے کو دکھایا کروں گی۔ آخر آپ کی بہن ماسٹر شیف جو بنتی جا رہی ہے۔“ اقدس نے مسکراتے ہوئے کہا، ساتھ ساتھ وہ سلاڈ کی پلیٹ تیار کر رہی تھی۔ ”بیٹا! میں نے تو کہا تھا مدد کروادیتا ہوں، مگر اقدس بیٹی نے کچن میں کھڑے ہونے کی بھی اجازت نہیں دی۔“ ”مجید چاچا کی آواز پر دونوں مڑیں۔“ ”سنڈے کو چاچا آپ کی چٹنی کھانا میں بنایا کروں گی، آپ آرام کرنا۔“

برتن لگاتے مجید چاچا شفقت سے مسکرائے۔ وہ اس گھر میں برسوں سے کام کرتے آ رہے تھے۔ اس گھر سے انہی اپنائیت ملی تھی کہ بڑھتی عمر کے باوجود وہ کام چھوڑ کر نہیں گئے۔ حالانکہ اب ان کے اپنے بچے کمانے لگے تھے۔

سکھاتے ہوئے بتاتا، وہ روز آدھا کھا جاتی تھی۔ سوچ کر ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

مسیح ٹون برٹانیہ کا وہاں بیٹا تھا۔ حنا کو مسیح جوں کرتی وہ موبائل کھانے کے ٹیبل پر ہی لے آئی تھی۔ نمبر دیکھ کر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی مسیح پر حنا شروع کر دیا۔

کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوجھتا نہیں

ہوتی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود ہے چاند تیری یاد کا جو ڈھلتا نہیں



روحان نے فوڈ فیسیول کرانے کی ذمہ داری اقدس کو دے دی۔ سر سرمد نے بے لفظوں میں روحان کے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی، مگر روحان نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ انہیں کہا کہ اقدس ہی یہ ایونٹ اریج کروائے گی اور یقیناً ”یہ ایک اچھا ایونٹ ثابت ہوگا۔“

اقدس کو جب سے یہ ٹاسک ملا تھا، وہ خوشی سے پھولے نہیں سارہی تھی۔ سال کا اتنا بڑا فوڈ فیسیول وہ اریج کرنے جا رہی تھی، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ خوش تھی اور خوشی اس کے چہرے سے چمک رہی تھی۔ ایونٹ کا کلغذی منصوبہ وہ پہلے ہی بنا چکی تھی۔ آج وہ سائٹ پر موجود تھے جہاں یہ فیسیول منعقد ہونا تھا۔

روحان اپنے دوست اسامہ سے کچھ باتیں ڈسکس کر کے اس طرف آیا تھا۔ جہاں اقدس گھڑی مینجمنٹ کے بندے سے بحث کر رہی تھی۔

”دیکھیں مس! کچھ میں۔“

اقدس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”آپ کچھ کو چھوڑیں میں جب آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ صرف سنگ اریجمنٹ کروائیں، باقی ڈیکوریشن وغیرہ میں دیکھ لوں گی۔“ اس بندے نے

”کچھ بنا بھی ابھی تک۔“ ثانیہ نے پچن میں جھانکا۔ اس کے لہجے میں شرارت پنہاں تھی۔

”شیف اقدس نے سب ریڈی کر دیا ہے۔ آپ دونوں خوب صورت لڑکیاں جا کر ٹیبل پر بیٹھیں اور اپنی حسین والدہ کو بھی پکڑ کر بٹھائیں، تاکہ وہ اس تاریخی دعوت کا حصہ بن سکیں۔“ اقدس نے شوخی سے کہتے ہوئے کھانا ڈشوں میں نکالا شروع کیا۔

وہ دونوں محفوظ ہوتی پچن سے چلی گئیں۔

اقدس نے جلدی جلدی مجید چاچا کے ساتھ مل کر لہلہ لگایا۔ کرنل شہاب کسی دعوت میں مدعو تھے۔ اس لیے اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے۔

”کیا کیا بنایا ہے۔“ سب سے پہلے مہرین آبی نے

پوچھا۔

”المنڈ چکن، ایک فرائڈ رائس، میکسیکن سیلڈ اور یہ سوئیٹشش میں لین ڈیلاش۔“

”جلس شروع کریں۔“ ثانیہ نے چالوں کی ڈش اہی کے سامنے رکھی۔

”بہت مزے کا ہے چکن۔“ مہرین نے تعریف کی۔

”اچھا ہونا کہ تمہارے ابو بھی گھر پر ہوتے۔“

”تعریف پھر بھی نہ کرتے۔“ اقدس کی زبان ہمیشہ کی طرح پھسکی تھی۔

”کیوں نہ کرتے، اتنا مزے کا ہے سب کچھ۔“ اہی کے لہجے میں خفگی تھی۔

”کیونکہ ان کے منہ میں کرواہٹ ہی بہت ہے وہ

اہی میرے لیے۔“ یہ صرف اس نے سوچا تھا۔ ثانیہ اہی کی تنبیہی نظریں وہ پہلے ہی محسوس کر رہی تھی۔

”ابو کے لیے میں نے رکھ دیا ہے۔“ اقدس کو اہی کو لہلہ دینی پڑی۔

”مستقبل کی ماسٹر شیف تو بنی نظر لہی ہو۔“ مہرین نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

اس کے خوش گوار لہجے پر اقدس بھی پرجوش ہو کر ہلنے لگی۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں، سر روحان اتنے مزے

کا کھانا بناتے ہیں کہ آپ بس انگلیاں چاہتے رہ

ایک۔“ میں روز ان کی بنائی ہوئی مزے مزے کی

میں کھاتی ہوں۔“ روحان جو اپنے اسٹوڈنٹس کو

روحان کو دیکھ کر اسے مخاطب کیا۔
 ”سر! مس بات سمجھ نہیں رہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔ آپ جا میں جیسا میڈم کہہ رہی
 ہیں ویسا ہی کریں۔“ روحان نے نرمی سے بات ختم
 کی۔ وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اقدس اس کی طرف مڑی۔
 ”حد ہے سر! اتنی دیر سے سمجھا رہی ہوں مگر سن ہی
 نہیں رہا۔ ڈیکوریشن کے لیے میں نے سرچ کیا ہے،
 الگ سے اچھا سا ڈیکور کروائیں گے۔ باقی رہا شیفس
 وغیرہ کو انوائسٹ کرنا تو میں لسٹ آپ کو دوں گی۔ انہیں
 آپ خود کال کر لیں۔“

روحان کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر وہ بولتے بولتے رک گئی۔
 ”کیا ہوا سر! کچھ غلط ہو گیا ہے۔“ وہ ٹھٹکی۔
 ”ایسا تو کچھ نہیں کہا میں نے۔“ روحان نے
 مسکراہٹ روکی۔ ”بس آپ کا جوش و خروش دیکھ رہا
 ہوں۔“

”روحان یار! الگ سے ڈیکوریشن کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ہیکج میں ہے۔ اس طرح تو ہمارا بجٹ آکٹ ہو جائے گا۔“

”خیر ہے اس بار الگ سے کروا لیتے ہیں۔“ روحان نے ٹرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اقدس حیران سی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”سرڈیکور تو اچھا ہونا چاہیے۔ آخر اتنا برا فیسٹیول ہے اس سال کا۔“ آندس نے اپنی رائے دی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، مگر ہم ہمیشہ ان ہی سے سب کرواتے ہیں، جیسا بھی کروانا ہو اور پھر ابھی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کا انتظام بجٹ میں رہتے ہوئے کرنا ہے۔“ سامہ نے اسے سمجھایا۔

افسوس کہ وہ ایونٹ میجنمنٹ والا کیوں بار بار کچھ کہنا چاہ رہا تھا اور وہ اپنی دھن میں اسے خاموش کراتی رہی۔

دخان نے مسکراتے ہوئے لسٹ اس کے ہاتھ سے لی
میں پر شیفیس کے نام اور فون نمبر درج تھے۔
☆ ☆ ☆
☆ ☆ ☆

کوریڈور سے گزرتی وہ کیفے کی طرف جا رہی تھی۔
”آپ کا نام تھا اور کیفے میں مثال اور صبا اس کی منتظر تھیں۔
اپنے دھیان میں جا رہی تھی کہ سامنے سے کسی
”کیسی ہو فریال؟“ باوقار سے ڈاکٹر جنید اس کے
ماننے تھے۔
”میں ٹھیک ہوں۔ آپ آج یہاں کیسے؟“ فریال
نے عام سے انداز میں پوچھا۔
”دل چاہا پرانے دوستوں سے ملنے کا تو آگیا۔ تم بتاؤ
فلوری کب کر رہی ہو۔“
”ہوں“ مجھے چھوڑیں۔ آپ شادی کب کر رہے
ہیں۔ اب تو اسپیشلائزیشن بھی ہو چکی۔“
انہوں نے فریال پر گہری نظر ڈالی جو انجان نظر آنے
کی کوشش کر رہی تھی۔ ”جب تم بیان جاؤ گی تو شادی
بھی کر لوں گا۔“ ان کے یوں کھل کر کہنے پر وہ اندر سے
دھڑبھڑا رہی تھی مگر ظاہر نہ ہونے دیا اور بے نیازی سے
اپنے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے بولی۔
”نہیں یہاں کیا ڈاکٹر۔“
”کسی اور کا تو ذکر ہو نہیں سکتا۔“ وہ بھی آج موڈ
میں تھے۔
”یعنی آپ کنوارے ہی رہنا چاہتے ہیں۔“ فریال
نے اعتماد سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ ایسے
سکرائے تھے جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی بات پر مسکراتا
ہو گیا تھا۔
”ایٹ سی۔“
”آپ مجھے چیلنج کر رہے ہیں۔“ فریال تی۔
”اپنا موڈ مت خراب کرو فریال، ویسے بھی آج میں
اپنے پروپوز کرنے نہیں آیا۔ جاؤ اپنا لچ انجوائے
فری سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ فریال ان

”بچ بتاؤں تو تمہاری یہ خاموشی بھی مجھے اچھی لگتی
ہے۔ یہ تمہارا مضبوط کردار ہی ہے جس نے کسی ان
جان شخص سے بات کرنا گوارا نہیں کیا۔ مگر اب ثانیہ،
میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھے جانو۔ پھر تم مجھے قبول کرنی
ہو یا نہیں یہ تمہارا حق ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہو۔
میں اسپتال میں ہوں، اتنا اندازہ تو تمہیں ہو گا۔ آج
میں نے گہرے نیلے رنگ کی شرٹ پہن رکھی ہے۔
تھوڑا بچکانہ طریقہ ہے، مگر کبھی کبھی بچہ بننے میں کوئی
خرج نہیں۔“

یہ میسج اسے تب موصول ہوا تھا جب صبح وہ اپنی
اینڈرٹس (حاضری) لگا رہی تھی۔ اس وقت تو اس نے
سوچا تھا کہ وہ اسے تلاش نہیں کرے گی، مگر وارڈ میں
غیر ارادی پر اپنے صاحبی ڈاکٹر کی طرف اس کی نظریں
اٹھتی رہیں۔

ڈاکٹر مسلمان کو گہرے نیلے رنگ کی شرٹ میں دیکھ
کر اس کی سانس اٹکی تھی۔ مگر پھر ڈاکٹر خرم اور ڈاکٹر
قدیر کو نیلی شرٹس پہنے دیکھ کر اس نے خود کو سرزدش کی
کہ وہ کیوں ایک انجان شخص کی باتوں میں آ رہی ہے۔
سارے دن کی تھکا دینے والی مصروفیات اور ایک بے نام
سی بے سکونی نے لچ بربیک تک اسے نہ ڈھال کر دیا تھا۔
وہ خود کو کتنا ہی روکتی، مگر سارے دن وہ سب میں اس
اس انجان شخص کو تلاش کرتی رہی۔ جتنس سا پیدا
ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں۔

بچ بربیک میں گوہر کو اسی رنگ کی شرٹ میں دیکھ کر
وہ مزید پریشان ہوئی تھی۔ صد شکر کہ وہ بڑھنے نہیں آیا
تھا۔ ثانیہ کا اندازہ بن اچھا ہوا تھا، بڑھائی گیا خاک۔ وہ
کتاب واپس کرنے آیا تھا۔ نارمل انداز میں چند باتیں
کر کے چلا گیا۔ حنا اور فرح نے بھی اس کی غائب دماغی
محسوس کی تھی۔ مگر وہ کیا بتائی۔ سر درد کا کہہ دیا جواب

”ارے“ تیمور علوی کے بیٹے تو نہیں ہو۔“
چونکہ

”جی۔ آپ جانتے ہیں ابو کو۔“ روحان حیران
ہوا۔

”بہت اچھی طرح۔ مری میں ہم ساتھ تھے
بہترین دوستی رہی، پھر شفقت ہوئے تب بھی کچھ عرصہ
رابطہ رہا۔ بس اچانک ہی غائب ہو گیا تیمور۔ اب کمال
پوچھ رہے۔“

”سیالکوٹ میں تھے۔ اب اسلام آباد پوسٹنگ
ہو گئی ہے۔ دو تین ہفتوں تک آجائیں گے۔“

”بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ وہ آجائے تو ام
سے بھی دو دو ہاتھ کھول لگا۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں
مسکرائے۔

روحان کے چہرے پر بھی دھیمی مسکراہٹ پھیل
گئی۔

”گھر چلو۔ تمہاری آنٹی سے ملو تا ہوں اور ناشتا
ساتھ کرتے ہیں۔“ جاگنگ کے بعد انہوں نے کمال

”میں کسی اور دن چکر لگاؤں گا۔ ناشتے کا تکلف
کریں۔“

”تکلف کیا؟ تم تو اپنے بیٹے ہو۔“ اسے پھر
منہ کھولتے دیکھ کر انہوں نے ڈنڈا۔ ”میں کچھ نہیں

سنوں گا۔ تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔ اتوار کے
تمہاری آنٹی بڑے مزے دار پرائے بناتی ہیں۔ وہ تم

اپنے ہاتھ سے۔“

ان کے بڑے خلوص انداز پر وہ مزید انکار نہیں کر سکا
ان کے ساتھ چل پڑا۔

اتوار کے دن ان کے گھر میں صبح نو بجے ناشتا لگا
جاتا تھا اور سب کا ناشتے کی ٹیبل پر موجود ہونا بھی

ضروری ہوتا۔ بیس منٹ پہلے وہ عسست سے اٹھ
تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر بالوں کو مخصوص انداز میں

میں مقید کر کے وہ کچن میں آئی تھی۔ جمل ای پر لگا
بناری تھیں۔ مجید چاچا چائے اور انڈے بنانے میں

واقفی۔ ہو رہا تھا۔ وہ چائے پی کر اٹھ رہی تھی جب
مسیح پھر آیا۔

”سوری ثانیہ! مجھے پتا نہیں تھا کہ آج اتنے لوگ
نیلا رنگ پہن آئیں گے۔ وقت ملا تو سوچا معذرت

کر لوں۔ کہیں یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں تنگ کر رہا تھا“
یا الجھا رہا تھا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میرے

لیے بہت اہم ہو اور ایک دن اچانک سے میں تمہارے
سامنے آ جاؤں گا جیسے تم میرے دل میں آ گئیں۔“

ثانیہ ایک گہرا سانس لیتی اٹھ گئی۔

بیچ سے اٹھ کر وہ جاگنگ ٹریک کی طرف آئے
تھے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے پارک

میں آکر جاگنگ کیا کرتے تھے۔ ابھی وہ کچھ فاصلہ ہی
طے کر سکے تھے کہ کسی نے سلام کرتے ہوئے انہیں

روکے۔ انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس خوش
شکل نوجوان کو دیکھا۔

”کھل! آپ اپنی ٹینک اور اخبار بیچ رہے ہیں۔“
تھے۔ اس کے شانسی سے کہنے پر وہ مسکرائے اور

اس کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے لیں۔
”شکریہ! نئے آئے ہو؟ پہلے بھی دیکھا نہیں

ہیں۔“

”جی، میں اپنا گھر تعمیر کروایا ہے۔ ابھی فیلٹی نہیں
آئی اور میں بھی مکمل نہیں سکا کہ اس پاس کسی سے

ملاقات ہو یا نہ۔“

”والد کیا کرتے ہیں؟“

”آری میں ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کس رنگ پر؟“

”مکرتل ہیں۔“

”یہ تو بڑا اچھا اتفاق ہے، میں بھی آری میں ہوں“
کرل شلب۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا پھر خیال

آیا۔
”برخوردار! تمہارا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔“
”روحان تیمور۔“ وہ بھی مسکرایا۔

مصروف تھے۔

”ہی! آپ سے یہ پرائے میں بھی سیکھوں گی۔“
 اقدس نے نل وارختہ پر انھوں کو دیکھا۔
 ”مذکور سیکھو۔“ میں تو ثانیه اور مہرن کو بھی کہتی
 ہوں، مگر وہ دونوں پر دھاتی سے سر نکالیں تب نہ۔“
 اسی اس کی بات پر خوش ہو میں۔ وہ آج کل اس
 کے اچھا لپکے پر بڑی خوش تھیں۔ اب وہ ہر اتوار کو
 کچھ نہ کچھ بنا کر گھلاتی تھی۔ وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔
 لی دی لگنے کی غرض سے ریوٹ اٹھایا، مگر ابو کو
 اور انگ روم سے نکلتے دیکھ کر حیران ہوئی۔

”اس وقت کون آگیا۔“ اس نے دل میں سوچا۔

اور ڈرائنگ روم کے دروازے سے اندر جھانکا۔
 ڈرائنگ روم میں روحان تیمور کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ
 گئی۔ وہ تین قدموں سے آگے بڑھی۔

”سرا! آپ یہاں کیسے؟“ اقدس کو سامنے دیکھ کر
 اس کے چہرے پر بھی حیرت نمودار ہوئی، مگر اس کے
 کھلے منہ اور حیرت زدہ تاثرات دیکھ کر روحان اپنی
 ہمانیت مسکراہٹ روک نہ پایا۔

”یہ سوال تو میں بھی کر سکتا ہوں۔“

”یہ میرا گھر ہے۔“ اقدس جلدی سے بولی۔ اچانک
 ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ ”نہیں آپ ابو
 سے میری شکایت کرنے تو نہیں آئے لیکن اب تو
 میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ کوئی گڑبڑ کوئی نقصان کچھ
 بھی نہیں۔“ پریشانی اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہی
 تھی۔

اس کے بولنے کی رفتار پر روحان دھیمے انداز میں
 ہلکا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تو آپ کے گھر اچھا سا
 دیکھ کر آ گیا ہوں۔“

”ناشتا۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی۔ ابو
 اسی کو لیے اندر آئے تھے۔

”ابنی آئی سے ملو۔“ روحان اب کھڑے ہو کر ان
 سے محل احوال پوچھ رہا تھا۔

”تیمور سے شکل بھی بہت ملتی ہے اس کی۔ تب ہی
 مجھے لگا کہ کہیں دیکھا ہے اسے۔“ کرنل شہاب خوشی

سے اسی کو تیار ہے تھے۔ اقدس ان تینوں کو باتیں کرتے
 ہوئے دیکھ رہی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی کرنل شہاب نے اسے گھورا
 جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ اس سے
 پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹتی، روحان کی بات سن کر وہ
 وہیں جھک گئی۔

”آئی! آپ لوگوں سے تو اب ملاقات ہو رہی
 ہے۔ اقدس کو تو میں جانتا ہوں۔ بڑی اچھی اسٹوڈنٹ
 ہے میری۔“

کرنل شہاب اور اسی کے چہروں پر حیرت در آئی۔
 ”کیجنگ کرتے ہو۔“

جواب میں روحان نے بتایا کہ وہ شفقت ہے اور
 اقدس اسی کے انٹرویو سے کوئنگ فورس کر رہی
 ہے۔

اسی تو یہ سن کر ناراض ہو رہی تھیں، مگر کرنل شہاب
 کے چہرے پر اس کاہریشن سن کر چونکاواری پھیلی تھی
 وہ اقدس کو صاف محسوس ہوئی تھی! انہیں باتیں کرنا
 چھوڑ کر وہ اسی کے پیچھے بن گئی۔ جہاں مجید چاچا
 چائے ڈال رہے تھے۔ ثانیه اور مہرن نیپل سیٹ
 کر رہی تھیں۔



”سرا! کل آپ کو ابو کے سامنے میرا ذکر نہیں کرنا
 چاہیے تھا۔“ اس نے۔ ”مجھکے ہوئے ٹاپک چھیڑا۔“
 ”کیوں؟“ روحان نے حیران نظروں سے اسے

دیکھا۔

”میرا ذکر انہیں کچھ خاص پسند نہیں ہے۔“ اس
 کی زبان پھسلی۔

”میرا مطلب ہے میرے بارے میں انہیں سب
 نیگیشن ہی لگتا ہے۔ میرا کوئی کام پسند نہیں کرتے جیسے
 کل وہ آپ سیٹ ہو گئے تھے۔“ اس نے بات سنبھالنے
 کی کوشش کی۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا کہ آپ کا انکل کے ساتھ تعلق
 اس قدر سرد کیوں ہے اور جہاں تک ان کے آپ سیٹ

ہونے کی بات ہے تو آپ کی وجہ سے نہیں بلکہ میرے پروفیشن کا سن کر ان کے چہرے پر ناپسندیدگی آئی تھی۔“

افسوس کے ایسے پستے ہاتھ رکے۔

”اور یہ بات مجھے بالکل بری نہیں لگی۔ بہت سے لوگ جب شروع میں مجھ سے ملتے ہیں، میرے کام کے بارے میں جانتے ہیں تو ایسے ہی ری ایکٹ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی بھی یہ اتنا قابل عزت کام نہیں سمجھا جاتا۔ مگر میں اس بات پر کبھی شرمندہ نہیں ہوتا کہ میں ایک شیفت ہوں۔ میں محنت کرتا ہوں، حلال طریقے سے روزی کما ہوں، میرے لیے یہ ہی اہم ہے۔ کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔“

اس کے سنجیدگی سے کہنے پر افسوس جلدی سے بولی، مبادا وہ اسے بھی غلطی نہ سمجھ لے۔

”مجھے تو کوئی ایسا نہیں ہے سر۔ میں تو خود شیفت بننا چاہتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ لیکن کل آپ یہ بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ میری ایک بات یاد رکھیے گا، جس کام پر آپ خود شرمندگی محسوس کریں گی، عزت نہ دیں تو دوسروں سے بھی یہ شکایت نہ کریں کہ وہ اسے قابل عزت کیوں نہیں سمجھتے۔“

روحان نے اپنے مخصوص انداز میں اسے سمجھایا۔ افسوس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ پڑ گیا تھا۔ روحان نرمی سے مسکرایا۔

”بھئی۔۔۔ وہی ٹیبل اور مشروم سوپ آج کی تاریخ میں بنے گا یا باتوں سے ہی گزارا کرنا پڑے گا۔“

افسوس جلدی سے آگے بڑھی، پہلے اس نے سبزیاں دھوئیں، پھر کنگ بورڈ پر انہیں کاٹنا شروع کیا۔ روحان کچھ دیر انہماک سے اسے کام کرتا دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کی پونی ٹیل بھی مسلسل جھول رہی تھی۔ اسے کام کرتا چھوڑ کر وہ کلاس کاراؤنڈ لگانے کی غرض سے آگے بڑھ گیا۔

افسوس کی چیخ سن کر وہ تیزی سے واپس مڑا۔ افسوس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پر گہرا کٹ لگا تھا، جس سے خون

نکل رہا تھا۔ نیتاشا اس کا زخم دیکھنا چاہ رہی تھی، مگر افسوس اسے اپنے قریب نہیں آنے دے رہی تھی اور اسے منع کرتے ہوئے مسلسل روئے جا رہی تھی۔

”نیتاشا کو زخم دکھائیں، وہ آرام سے پٹی کرویں گی۔“

روحان نرمی سے کہتا آگے آیا۔ مگر افسوس نفی میں سر ہلاتی روئے جا رہی تھی۔ روحان نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے اسٹول پر بٹھایا۔

”افسوس! خاموشی سے یہاں بیٹھیں اور نیتاشا کو اپنا کام کرنے دیں۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ نیتاشا اب پٹی باندھ رہی تھی۔ روحان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ممکنہ انداز میں باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔

”افسوس! درد کچھ کم ہوا۔“ اس نے کھنکھارنے ہوئے اسے متوجہ کیا۔ وہ بری طرح چونکی، پھر محض سر ہلا کر آنکھیں جھکائی تھی۔

اس کی دوستوں کی آج ٹائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس لیے چھٹی کے بعد وہ اکیلی ہی شاپنگ پیل آئی تھی۔ ابھی وہ ایک دکان میں داخل ہوئی ہی تھی کہ کاؤنٹر کے پاس کھڑا شخص اسے جانا پہچانا لگا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی، مگر ایک خیال نے اس کے اندر سر اٹھایا تھا۔ وہ اب مل ادا کر کے باہر نکل رہا تھا۔ فریال تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

”روحان تیمور۔“ وہ اس آواز پر چونک کر مڑا۔

”تم روحان تیمور ہو نا؟“

سامنے کھڑی اسٹافٹش اور حسین لڑکی کو اس نے حیرت سے دیکھا۔ پریل کلر کے پرنٹڈ ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی اسی سے مخاطب تھی۔ اس کے لیے حسین بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔

”جی۔۔۔ میں روحان تیمور ہوں، مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”میں فریال سراج۔ امریکہ میں ملے تھے ہم، کچھ

آؤ آیا۔“ فریال کے چہرے پر محظوظ مسکراہٹ تھی۔
اتنے سالوں بعد اسے سامنے دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”خزم کی کرن فریال۔“ اسے بروقت یاد آیا۔
اشانلش سی لڑکی لیے پال، خوب صورت چمک دار
آنکھیں۔ وہ کسی ہی تھی بس حسن میں مزید نکھار آگیا تھا۔

”بس۔۔۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔
ملا نہ صرف دو مہینے ہی ہم ملتے رہے تھے۔ میں
پیشوں میں اپنے بچپن کے گھر گئی تھی اور تم اپنی خالہ کے
ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تمہارا اور خرم کا روز کوئی نہ
کوئی پلان ہوا کرتا تھا۔“ فریال نے خوش ہوتے ہوئے
اس وقت کو یاد کیا تھا۔ روحان بھی یاد کر کے مسکرایا۔

”خرم سے تو ابھی بھی میری کافی اچھی دوستی ہے۔
اب بس مصروفیت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بات کم ہی ہوتی
ہے مگر ہم رابطے میں ضرور ہیں۔“

”پاکستان کب آئے۔ تم تو وہیں پڑھنا چاہتے
تھے۔“ فریال کی زبان پر سوال بجلا۔

”پڑھائی وہیں سے مکمل کی ہے۔ اب یہاں پر ایک
ریسرورنٹ ہے اور کوکنگ اسٹی ٹیوٹ۔“

فریال نے شاک کی سی کیفیت میں اسے دیکھا تھا۔
روحان اس کو حیرت زدہ دیکھ کر محظوظ ہوا۔ اس وقت

اب سب کو بتایا کرتا تھا کہ وہ شیفت بنانا چاہتا ہے تو اس
کی بات کو مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

”آئی ایم آشیف (میں ایک شیفت ہوں)۔“
”سیریسلی۔“ فریال نے اس کی شان دار پرسنالٹی
کو دیکھا۔

اس نے براؤن پیٹ کے ساتھ وائٹ ڈریس
فرٹ پہن رکھی تھی۔ سیاہ بال تھوڑے سے ماتھے پر
گھرے ہوئے تھے۔ بھوری آنکھوں میں زہانت کی
لہک تھی۔ خوب صورت نقوش میں کھلی نرمی اور
لچک کا دھیمپن کسی کو بھی اس کی طرف متوجہ کر سکتا
تھا۔ بلا کا خوبصورت تھا۔ فریال نے دل سے تسلیم کیا۔ وہ
اب اس کے آئیڈیل کا پرتو تھا۔

”شیفت تو کہیں سے نہیں لگتے۔“ فریال اپنے دل
کی بات زبان پر لائی۔ روحان ہنسا۔ ”یقیناً! آپ سوچ
رہی ہوں گی میرے سر پر شیفت والی ٹوپی ہونی چاہیے
اور شرٹ کے اوپر ایپرن۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ فریال مسکرائی۔
”میں چلتا ہوں، کچھ جلدی میں ہوں، انسٹی ٹیوٹ
پہنچنا ہے۔“ روحان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی
جیب سے ورنٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔
”یہ میرا کارڈ ہے۔ جب فری ہوں تو ضرور آئے گا۔“
فریال نے کارڈ تھام لیا۔

کارڈ کو سنبھال کر اپنے ہینڈ بیگ کی اندرونی پاکٹ
میں رکھتے ہوئے اس کے چہرے پر بڑی خوب صورت
مسکان پھیلی تھی۔



”میرا دل چاہ رہا ہے ثانیہ ایک بار پھر تم مجھے تلاش
کرو۔ اس محبت کی خوشبو کو تلاش کرو جو میرے ارد گرد
حصار کیے ہوئے ہے اور جس کا تعلق تم سے ہے۔
مجھے یقین ہے آج تم میرے بارے میں اندازہ تو لگا ہی
لوگی، ہو سکتا ہے پہچان جاؤ۔ آج میں نے گرے پیٹ
وائٹ شرٹ اور گرے کوٹ پہن رکھا ہے اور۔۔۔
میری آنکھوں کا رنگ بھی گرے ہے۔ کیا اتنا کافی
ہے۔“

مسیح کے آخر میں اسائی کلی ہوا تھا۔ خود کو روکنے
کے باوجود وہ اس کا مسیح پڑھ چکی تھی۔

مگر ابھی اسے جا کر وارڈ نمبر گیارہ کے بیڈ نمبر سات
کے مریض کی ہسٹری دوبارہ سے لکھنی تھی، جس کی وجہ
سے کل ڈاکٹر حسام سے اچھی خاصی ڈانٹ سننے کو ملی
تھی۔ پتا نہیں کیسے فریال اس کی ہسٹری تبدیل کر دیا
کرتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ہاؤس جاب کے بعد
وہ کم از کم اس اسپتال میں جاب نہیں کرے گی، جہاں
فریال ہو۔ بس یہ ہاؤس جاب خیر خیریت سے گزر
جائے۔

فائل بند کر کے وہ مڑی ہی تھی کہ اس کے پاؤں

روحان لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔

”ہائیم نہیں ملتا۔ یہاں سے جاتا ہوں تو آرٹیکل لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ فیسٹیول بھی قریب ہے، بہت کام بڑا ہے۔ آئی سے معذرت کیجئے گا۔ ہاں اٹکل سے البتہ میری دو بار ملاقات ہوئی ہے، روحان نے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے وضاحت کی۔ قریب ہی کالی کا مک برا تھا۔ جس کے گھونٹہ ساتھ ساتھ بھر رہا تھا۔ ”مکمل، آئی کب تک آئیں گے؟“

”مکفرم تو نہیں ہے۔ دو ہفتے بعد کا کہہ رہے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے بھی یہی کہہ رہے تھے لیٹ سی۔“

”بس پھر ان لوگوں کے آتے ہی ہم اچھی سی دعوت کریں گے۔ اسی تو اچھے بیٹھتے مجھ سے پوچھتی ہیں۔ میں ہی بھول جاتی تھی آپ سے پوچھنے کا۔“

”اقدس نے کالی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”دعوت تو ہم ضرور کھائیں گے۔ آپ کو اپنے جوہ دکھانے کا موقع بھی تو ملنا چاہیے۔“ روحان مسکرایا۔

”میں تو اب سب بنا سکتی ہوں۔ بس اسی کو یہ بی ٹیشن رہے گی۔ کچھ خراب نہ کروں، حالانکہ اب میں چھوٹی موٹی شیفت تو بن ہی چکی ہوں۔ مگر یہ امیال نہیں سمجھتیں نا۔“

”اقدس کے انداز پر وہ محظوظ ہوا۔“ اور اس چھوٹی موٹی شیفت کو میں ہائیر شیفت دیکھنا پسند کروں گا۔“

”سرا! صرف آپ کو ہی میری صلاحیتوں پر اعتبار ہے۔“ اقدس نے لسٹ اسے تھمائی۔ وہ لسٹ پڑھ رہا تھا۔ جب فون کی کھنٹی بجی۔

”ہائیس۔“ فون کلن سے لگا کر وہ بولا۔ ”اوکے“

میرے آفس میں بھیج دیں۔“ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔

”یہ سارے کام ابھی مکمل کرنے ہیں، کیونکہ ٹائم کم ہے اور کل جا کر ارہنجمنٹس بھی دیکھنی ہیں۔“

اقدس نے سر ہلایا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

”ہائیس۔“ روحان بولا۔ لسٹ اس نے اقدس کو واپس کر دی۔ دروازہ کھلتے ہی روحان نے اٹھ کر آلے والے کا استقبال کیا۔

جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ پلکیں جھپکنا، بھول گئی تھی۔ سامنے سے آتا شخص گرے پیٹ وائٹ شرٹ اور گرے کوٹ میں ملبوس تھا۔

”نہیں۔۔۔ ڈرنک کا ایک جیسا ہونا اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔ آنکھیں گرے نہیں ہو سکتیں۔“ اس نے دل میں سوچا۔

قریب آتے ہی ثانیہ نے اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھا۔ گہری گرے آنکھیں دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی تھی۔

”ہائیہ! آر یو آل رائٹ (کیا آپ ٹھیک ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”ہائیس۔“ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی وہ بشکل بول پائی۔ اس کی گہری آنکھیں اپنے اوپر محسوس کر کے ثانیہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نظریں زمین پر تھیں۔

”اوکے۔“ ڈاکٹر حملو سر ہلاتے کاؤنٹر پر موجود نرس سے کچھ دریافت کر کے اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے آگے پیچھے گئے اور وہ ابھی تک ساکت سی اپنی جگہ کھڑی تھی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر حملو مزید وہ شخص ہو سکتے ہیں جو اس کی محبت میں جیتا تھا۔ آج کا سارا دن اسی جالچ پڑاٹل میں گزرنے والا تھا۔ آج وہ سر جھٹک کر اپنا ذہن ان ساری سوچوں سے خالی نہیں کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ خوش تھی، اتنی خوش کہ خوشی اس کی آنکھوں سے پھوٹی تھی۔ پھر مہر کو اس نے اسی رات کو فون کر کے کھنکٹی آواز میں بتایا تھا کہ کیسے روحان اس کی تکلیف پر پریشان ہو گیا تھا۔

”امی! آپ کا پوچھ رہی تھیں۔ مگر نہیں آئے آپ۔“ اقدس نے پوچھا۔

وہ اس وقت فوڈ فیسٹیول کے لیے ان کاموں کی لسٹ بنا رہی تھی جو ابھی رہتے تھے۔ جبکہ سامنے بیٹھا

”کہا۔ نظرس فائل پر جھکی ہوئی تھیں۔
 ”روحان! چلیں۔ پھر مجھے اسپتال بھی جانا ہو گا۔“
 فریال نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔
 ”اوکے۔ اقدس! آپ انور صاحب کی میل چیک
 کر لیجیے گا۔“ روحان نے جاتے ہوئے اسے ہدایت
 کی۔ اقدس نے بشکل سر ہلایا۔ وہ دونوں باتیں کرتے
 ہوئے آفس سے نکل گئے اور اقدس سفید پڑتے
 چہرے کے ساتھ دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔



پچھلے ایک گھنٹے سے وہ کمرے میں ادھر سے ادھر
 بے سبب چکر لگائے جا رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں
 آ رہا تھا کہ وہ شخص ڈاکٹر حادو ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کے
 جیسا اناسی تو کسی نے پہنا انداز ہی کسی کی آنکھیں اسے
 گرے نظر آئی تھیں۔ اس سب کے باوجود اسے اس
 بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر حادو کام کی بات
 کے علاوہ کسی سے فالو بات کرنا تو درکنار کسی کی طرف
 نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے وہ اور محبت۔
 یہ تو طے تھا وہ اس ٹینشن میں پڑھ نہیں سکتی تھی۔
 اس لیے خود کو ریبلکس کرنے کے لیے چائے بنانے کی
 غرض سے اس نے کچن کا رخ کیا۔



”آخر بتائیں کیوں نہیں کہہ دیا؟“ مہر نے
 پریشانی سے اپنی بات دہرائی۔ اس کے سامنے بیٹھی
 اقدس جب سے آئی تھی روئے جا رہی تھی۔
 ”ان کی زندگی میں فریال ہے اور جہاں فریال ہو،
 وہاں کسی اور کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔“
 مہر نے گہرا سانس لیا۔ اقدس بولے جا رہی تھی۔
 ”کتنی خوش تھی نا میں کہ میری زندگی میں کچھ اچھا
 بھی ہو سکتا ہے۔ مگر میں کیوں بھول گئی تھی کہ میں
 ایک لوزر ہوں۔ ہمیشہ سب سے پیچھے رہ جانے والی لڑکی
 اور پیچھے رہ جانے والوں کو تو کوئی نہیں دیکھتا۔ مہر“ وہ
 جیسے خود پر ہنسی تھی۔
 اقدس کا اتنا شدید رد عمل مہر کے لیے دھچکے سے کم

”واؤ۔ تمہارا انسٹی ٹیوٹ تو بہت شان دار ہے۔
 بے روحان تیمور سے یہ توقع کی جاسکتی ہے، تم جو بھی
 کام کرتے ہو بہت اچھا کرتے ہو آفس پر فیکٹ۔“
 فائل میں پیپر رکھتی اقدس اس آواز پر ٹھک کر
 مڑی تھی۔ روحان کے سامنے کھڑی وہ فریال سراج ہی
 تھی۔ ہمیشہ کی طرح اسٹائنلش لباس، خوب صورت
 سے سیٹ کیے بال، چمکتی حسین آنکھیں، لبوں پر پھیلی
 خوب صورت مسکراہٹ۔

”تھنک یو، بیٹھیں پلیز۔“ روحان نے صوفوں کی
 طرف اشارہ کیا۔

”مجھے کال کر لیتیں، تو اچھا ہوتا یوں بھی اس وقت
 میں ریسیورنٹ میں ہوتا ہوں۔ آج زیادہ کام کی وجہ
 سے انسٹی ٹیوٹ آگیا۔“ روحان اس کے سامنے بیٹھتے
 ہوئے بولا۔

”یوں ہی میرا موڈ بن گیا۔“ فریال مسکراتے ہوئے
 بولی۔ اس کی نظرس روحان پر ہی تھیں۔ اقدس اپنی
 جگہ جی اسے ہی دیکھ کر جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ
 پچھلے کمرے میں موجود ہی نہیں بس وہ دونوں تھے۔
 ”نچ ٹائم ہے، میں کچھ منگوانا ہوں۔“ روحان اپنی
 جگہ سے اٹھا۔ پیچھے کھڑی اقدس کو دیکھ کر وہ بولا۔

”اقدس! ان سے ملیں، یہ فریال ہیں اور فریال، یہ
 مہری بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہیں۔“ روحان نے دونوں
 کا تعارف کرایا۔

اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے فریال کے چہرے پر
 حیرت در آئی۔ مگر اس نے اقدس کو کچھ خاص اہمیت نہ
 دی اور روحان کی طرف مڑی۔

”مجھے یہاں کچھ نہیں کرنا۔ چلو تمہارے
 ریسیورنٹ ہی چلتے ہیں، اسی بہانے وہ بھی دیکھ لوں
 گی۔“ فون اٹھاتے روحان نے سر ہلا کر فون رکھ دیا۔
 ”آپ بھی چلیں اقدس، کچھ کر لیتے ہیں۔“ روحان
 نے اسے مخاطب کیا۔

”تو سر! میں یہ سب سنبھال لیتی ہوں۔ کلاس سے
 پہلے کچھ کام بھی کرنا ہے۔“
 فائل کے صفحے الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس نے

نظریں اقدس کو پریشان کر رہی تھیں۔
”ناشتا کیا آپ نے؟“

”بھوک نہیں تھی، رات کو کھانا بھی لیٹ کھا لیا۔“
آپ وہ نام وغیرہ کنفرم کر دیں۔ ”اقدس نے جانا
ہوئے ہوئے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

”بند کریں یہ سب اور فوراً!“ اٹھیں۔ ”روحان
کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اقدس حیران سی اسے دیکھ
رہی تھی۔ ”آپ نے مجھے اتنا ظالم سمجھ لیا ہے کہ
ناشتے کے آپ سے کام کرواؤں گا۔“

”مگر سر! اس کی ضرورت نہیں۔“ اقدس نے ادا
روکنا چاہا، مگر اس نے مسکراتے ہوئے اس کی ہاتھ
کلی۔

”اٹھیں شاباش۔ زبردست سناشتا کراتا ہوا
آپ کو۔“ چاکلیٹ چپ پین کیک بناتے ہیں۔
”اقدس کے منع کرنے کے باوجود وہ اسے زبردستی
اپنے ساتھ اسی مخصوص ہال میں لے گیا جہاں وہ کلاہ
لیتا تھا۔

پھر روحان کے ساتھ چپ پین کیک بناتے، اس کی ہاتھ
سننے ہوئے اقدس کا موڈ خوش گوار ہو گیا تھا۔
اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔ مزے دار سے
کھکس، روحان تیمور کے اسٹوڈنٹ دور کے
ان یادگار لمحوں میں وہ باقی سب باتیں بھول گئی تھی۔

☆☆☆

دو دن بعد اس کا مسیج آیا جب وہ اسپتال
کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

”اب اس آنکھ پھولی سے میں تنگ آگیا ہوں
لگتا ہے تم بھی مجھے پہچان چکی ہو۔ یقیناً“ اٹھیں
لگا ہو گا۔ بھلا میرے جیسا خشک بندہ اور محبت
میں خود بھی ہوں، مگر شاید محبت کی واردات ایسا
کرتی ہے۔“

تمہارے دل کا حال تو معلوم نہیں۔ میں تمہارا
بھی لگتا ہوں یا نہیں۔ مگر میں اپنی محبت
ہوں۔ شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔ اپنے

نہیں تھا۔

”مانیہ آبی کہتی تھیں کہ فریال نے کبھی کسی کو
اہمیت نہیں دی۔ کبھی کوئی افہو وغیرہ کچھ بھی نہیں رہا
اس کا۔ وہ ہمیشہ سے کہتی تھی کہ وہ اپنے مسٹر رائٹ کو
ہی اہمیت دے گی اور اسی سے شادی کرے گی۔ مگر آج
جو چمک اس کی آنکھوں میں تھی، اس نے ہلا دیا ہے
مجھے۔ کیوں آگئی وہ مہر! اسے تو کوئی بھی اچھا انسان مل
جاتا، پھر روحان تیمور ہی کیوں؟“ آنسو ایک بار پھر اس
کی پلکوں کی باڑ پھلانگ آئے تھے۔

”بس کرو اقدس، کسی کے لیے اپنے جذبات کو بے
مول نہیں کرتے ضروری نہیں جو فریال کے دل میں
ہے وہ سر روحان کے دل میں بھی ہو۔ محبت بھیک نہیں
ہوتی جس کو ہاتھ پھیلا کر مانگا جائے یا دوسرے سے
چھین لی جائے، مہر نے نرمی سے اس کے آنسو صاف
کرتے ہوئے سمجھایا۔ اقدس نے محض سر ہلایا۔

☆☆☆

”فیس اسٹریک ہو گئے ہیں فیسٹول کے لیے اور
پانچ کی گنجائش ہے ابھی۔ شیفت کے نام اور کن
چیزوں کی وہ ورک شاپ کروا رہے ہیں، یہ بتا دوں تو میں
مفتش (اشتراکات) برنٹ ہونے کے لیے بھیج
دوں۔“ اپنے سامنے فائل کھولے وہ سنجیدگی سے بول
رہی تھی۔

”آپ ٹھیک ہیں اقدس۔ کل کلاس بھی نہیں
لی۔“

اس کی غیر متوقع بات پر اقدس نے سر اٹھایا۔ اندر
تک جھانکتی اس کی بھوری آنکھیں اقدس پر تھیں۔
اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ جیسے وہ اس کی
آنکھیں ہی تو پڑھ لیتا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مسیج کر دیا تھا
آپ کو۔“

”آپ روٹی ہیں۔“ روحان نے اس کی سوچی
آنکھیں دیکھ لی تھیں۔

”سر میں درد تھا ساری رات۔“ اس کی جاچتی

مزید ٹینشن دے رکھی تھی۔ سب اسٹالو پہلے سے بک تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ایک سامنے والا اسٹال جو ”کیفے لائٹ“ والوں نے خرید لیا ہوا تھا وہ ریسٹورنٹ ”مہون لائٹ“ والوں کو دے دیا جائے جن کا اسٹال آخری رو میں تھا۔

اقدس اس بات پر کسی طرح راضی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ کیفے والوں نے پہلے یہ اسٹال خرید لیا تھا۔ اس طرح سے عین وقت پر ان کا اسٹال تبدیل کرنا زیادتی تھی۔ اقدس بحث پر اتر آئی تھی۔ روحان نے بیچ میں آ کر دونوں کو روکا اور نہ اچھی خاصی جھڑپ ہو جاتی۔

”ریلیکس اقدس! اتنی ٹینشن کیوں ہو رہی ہیں آپ۔“ سر جاوید کو بھیج کر وہ اس کی طرف مڑا جس کا چہرہ غصے سے تھم رہا تھا۔

”سر! آپ انہیں بھی تو دیکھیں غلط بات کر رہے تھے اوپر سے سہینگو ہونے کا رعب بھی حملے کی کوشش کر رہے تھے۔“ اقدس تلملائی۔

روحان اپنے سینے کے گرد ہاتھ باندھتے ہوئے مسکرایا۔ ”جب آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں تو اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا حوالہ دے کر خاموش کروادیتیں“ آگے میں خود ہی نمٹ لیتا۔

”سر! آپ دیے ہی ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں وہ آپ کو بھی شیشے میں اتار لیتے۔“ اقدس جھج کر بولی۔

اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”ہول بات تو میں سب کی سنتا ہوں لیکن کرتا اپنی مرضی ہوں۔ اس لیے اب ریلیکس۔“

اقدس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ مسکراتے ہوئے اس کے بائیں گال پر پیارا سا ڈھیل بننا تھا جو ہنستے ہوئے اور نمایاں ہو جاتا تھا۔ روحان نے دلچسپی سے اس بیماری سی لڑکی کو دیکھا تھا۔

”گڈ! اب ایسے ہی مسکرا کر سارے مہمانوں کو ویلکم کرنا ہے۔“

پھر سارے وقت وہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ بیرون ملک سے بھی کچھ فوڈ آرگنائزر

کھڑے کھڑے بھیجنا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس وقت ہے۔ ام اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ میں لاہور آ رہا ہوں۔ واپس آ کر خود تم سے جواب مانگوں گا کہ کدلی مرضی میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر حاد منیر۔“

چپ چاپ ہاتھ میں موبائل پکڑے وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ وہ سنجیدہ سے ڈاکٹر حاد جو اپنے اسٹال کے کپے تھے۔ آدھے سے زیادہ باسپٹل ان ہار تھا۔ ثانیہ کو وہ کبھی برے نہیں لگتے تھے۔ بس وہ لمبے معاملے میں کوئی کو تابی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے ثانیہ اکثر ان کی حمایت کر جاتی تھی۔ مگر اس طرح کی صورت حال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔



ہسپتال سے ایک ہفتے پہلے ہی اسے سخت ٹینشن شروع ہو گئی تھی۔ بڑے پیمانے پر منعقد کیا جانے والا ہسپتال باج دونوں پر مشتمل تھا۔ جس میں فوڈ اسٹالز ریسٹورنٹس اور کمپنیز کو دلے گئے تھے۔ کچھ انٹینیٹیوٹ کے اسٹوڈنٹس گئے تھے اور یہ وہ اسٹوڈنٹس تھے جو اس سال کے کمپنیشنز میں جیتے اور روحان نے ان سے کوئی پیسے نہیں لیے تھے۔ یہ کہ یہ ان کے لیے ایک طرح سے حوصلہ افزائی کا نام تھا۔

ہسپتال والے دن تو اس کی ٹینشن کا عالم ہی اور نہ مہمانوں کی آمد تھی اسی حساب سے میہون رنگ بلب صورت کام ہونے سوٹ میں وہ پیش کی طرح ٹانگ رہی تھی۔ بالوں کی پونی ٹیل بنائی ہوئی تھی۔ اس کا مخصوص ہیرا شاکل تھا۔ چہرے پر غیر معمولی مسکراہٹ اور پریشانی رتم تھی۔ روحان اسے بار بار ریلیکس کہہ چکا تھا۔ خود وہ اطمینان سے سب دیکھ رہا تھا۔

ہسپتال شروع نہیں ہوا تھا۔ اس پہلے ہی پریشان تھی اوپر سے سر جاوید نے

اور شیفس شرکت کے لیے آئے تھے۔ ہوٹل میں ان کا چھ دنوں کا قیام تھا۔ گراچی سے پاکستانی شیفس بھی شامل ہوئے تھے۔ چونکہ ورک شاپس دوسرے دن سے شروع ہو رہی تھیں اس لیے آج سب اسٹارٹ کی طرف ہی متوجہ تھے۔

روحان کے ٹیچر سکندر رضا بھی شرکت کے لیے آئے تھے۔ اقدس تو ان کو دیکھتے ہی ادھر ادھر ہونا چاہتی تھی۔ مگر روحان اس کے نہ نہ کہنے کے باوجود زبردستی اسے ملوانے لے گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آج سب آپ کے مہمان ہیں اس لیے خود جا کر سب سے ملیں اور شکریہ ادا کریں ان کے آنے کا۔ وہ شرمندہ سی ان سے ملنے چلی گئی تھی۔ بشکل مسکرائی بھی مگر وہ اتنے پرتپاک سے انداز میں ملے ساتھ ہی تعریف بھی کر رہے تھے کہ اتنی چھوٹی سی لڑکی نے اتنا سب انتظام کر لیا۔

ان سے مل کر اسے واقعی دلی خوشی ہوئی۔ روحان کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ نہ صرف شیفت ہیں بلکہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر بھی ہیں اسے کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ کیوں کہ وہ جس ٹاپک پر بولتے لگتا جیسے سب سے زیادہ معلومات ان ہی کے پاس ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت اسے کرٹل شہاب اور انکل فرقان کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ روحان نے بے حد اصرار کر کے انہیں بلایا تھا مگر وہ ابھی جا میں گئے اس بات کا یقین نہیں تھا۔

سب کچھ بخیر و خوبی شروع ہو گیا تھا۔ سب کے چروں سے یہی لگ رہا تھا کہ وہ فیسٹیول کو خوب انجوائے کر رہے ہیں۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی۔

اقدس مطمئن اور خوش تھی۔ ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے سب سے ملے ہوئے اسے فخر سا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ سب اس کے انتظامات کی تعریف کر رہے تھے۔ اسے سراہ رہے تھے۔ پھر اسے وہ نظر آ

گئی۔ اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ روحان تیار کے قریب کھڑی اس سے ہنس کر باتیں کرتی ہوئی۔ دونوں ساتھ کھڑے تھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہوں۔ فریال کی دوستیں بھی ساتھ تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی تھی۔

انکل سرانج بھی اسے ابو کے ساتھ بیٹھے نظر آ گئے تھے۔ شکر کیا تھا اس نے نور نہ تو فریال نے روحان تیار کا بچہ بھائی نہیں چھوڑا تھا۔



سینئر ڈاکٹر ز کا ایک پینل کانفرنس اینڈ کرنے لاہور گیا ہوا تھا۔ اور ان میں ڈاکٹر حماد بھی شامل تھے۔ یہ بات اسے ہسپتال آ کر معلوم ہوئی تھی۔ یہ جان کر اس نے شکر ادا کیا تھا۔ موجودہ صورت حال اس کے لیے حیران کن بھی تھی اور وہ پریشان بھی تھی کہ اگر ڈاکٹر حماد نے ڈائریکٹ اس سے کچھ کہا تو وہ کیا کہے گی۔

یہ سچ تھا کہ وہ اس نمبر کو بلا کر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے نام سے مخاطب کرنے پر تجسس سائل ابھرا تھا۔ پھر وہ اس کے مہسجور پڑھتی چلی گئی تھی۔ اور اب یہ جان لینے کے بعد کہ وہ ڈاکٹر حماد تھے۔ وہ حیران تھی۔

اس کا کوئی اینڈیل نہیں تھا بلکہ کبھی اس بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

”ایسے کیوں گھور رہی ہو تم دونوں مجھے۔“ ٹانپہ نے حنا اور فرح کو دیکھا۔ جیسے ہی وہ اینڈینس لگا کر دارا کی طرف جانے لگی تھی۔ دونوں اسے گھیر کر ہاؤس آفیسر وارڈ میں لے آئی تھیں۔ اب ان کا خاموشی سے خود کو گھورنا اسے مزید پریشان کر رہا تھا۔ سب سے پہلے حنا نے زبان کھولی۔

”ڈاکٹر حماد نے ہمیں رو پوز کیا ہے اور تم نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔“ ٹانپہ کو دھچکا لگا تھا۔ یہ بات تو اس کے وہ ہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ حنا اس سے ہ

”تمہیں کیسے پتا چلا۔“ ثانیہ کے منہ سے بمشکل نکلا۔

”افسوس یہی ہے کہ تم نے پہلے ہمیں کیوں نہیں بتایا۔“ فرح نے شکایت کرنی نظروں سے اسی دیکھا۔
”مگر میں نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا۔“ ثانیہ ابھی۔

”اتنے بے خبر نہیں ہیں ہم۔ پھر یہ بات تو پورے ہسپتال کو پتا ہے۔“ حنا بولی تو لہجے میں خفگی تھی۔

ثانیہ کا سانس سینے میں اٹکا تھا۔ ”کیا مطلب۔“
”مطلب یہ کہ کل فیس بک پر آپ نے خود سب کو یہ بتایا ہے کہ ڈاکٹر حنا نے آپ کو پروپوز کیا ہے۔“
فرح نے گویا دھماکا کیا تھا۔ ثانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

”ہمیں بھی صبح پتا چلا ہے۔ فارسیہ نے مہیج کیا تھا فرح کو۔ میں تو پارٹ ورن کی تیاری کی وجہ سے فیس بک سے بالکل ہی غائب ہوں۔“

”سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا بولوں میں یہ سب کچھ جو تم دونوں بتا رہی ہو میرے لیے بھی اتنا ہی شاکنگ ہے جتنا تم لوگوں کے لیے اور کون سی فیس بک میں نے تو دو میمنوں سے اپنی فیس بک آئی ڈی ڈی ایچ کیویٹ کی ہوئی ہے۔ پھر یہ سب کیا ہے مجھے نہیں پتا۔“

حنا اور فرح کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ ثانیہ کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وعدہ اتی نہیں کر رہی۔

”ثانیہ اور میں نے اکٹھے ہی تو آئی ڈی ڈی ایچ کیویٹ کی تھی پارٹ ورن کی تیاری کے لیے۔“ حنا گویا دہرایا۔

”لیکن میں نے خود کچھ ہفتے پہلے ثانیہ کا کمنٹ دیکھا تھا فیس بک پر میں تو یہی سمجھی کہ ثانیہ نے فیس بک یوز کرنا شروع کر دی ہے۔“ فرح نے اچھے سے کہا۔

”یعنی کسی نے ثانیہ کی آئی ڈی ایچ کیویٹ کر کے یہ سب کیا ہے۔“ حنا کی بات پر سر ہلاتے فرح نے ثانیہ کو دیکھا جو پریشان سی بیٹھی تھی۔

”ڈاکٹر حنا کے پروپوزل والی بات سینئر ڈاکٹرز کے علاوہ اب تک سارے ہسپتال کو پتا چل چکی ہوگی کیونکہ یہ بات ہمارے ہسپتال کے بیچ پر تائی گئی ہے۔ سینئر ڈاکٹرز کے علاوہ سب اس میں ایڈ ہیں۔ مگر مسئلہ صرف یہی نہیں ہے۔ وارڈ گوسپ والے بیچ پر نہ صرف اس پروپوزل کو ڈسکس کیا جا رہا ہے بلکہ تمہاری پوری پوسٹ کا امنیپ شارٹ بھی لگایا ہے اور ساتھ ساتھ تمہارے دوسری پوسٹس پر کیے گئے کمنٹس کے امنیپ شارٹ بھی ہیں جن میں تم نے ڈاکٹر حنا کی بڑے کھلے الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ان کو پڑھ کر بھی یہی لگتا ہے جیسے تم ان میں انٹرسٹڈ ہو۔“

فرح نے ساتھ ہی موبائل پر وارڈ گوسپس کا بیج کھول کر ثانیہ کو پکڑا لیا تھا۔ ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے موبائل تمام لیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتی جا رہی تھی اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جس نے یہ سب پلان کیا ہے وہ ڈاکٹر حنا تک بھی یہ سب ضرور پہنچائے گا یا پھر کوئی اور ان کو بتا دے گا۔ کسی بھی طرح ان کو پتا تو چلے گا پھر ان کا ری ایکشن کیا ہوگا۔“

فرح کی بات سن کر وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔ آج جمعہ تھا اور پیر سے ڈاکٹر حنا ہسپتال جوائن کر لیتے اور دو دن کافی تھے یہ سب جاننے کے لیے اور آج اسے جن سوالات کا سامنا کرنا پڑنا وہ اور بھی پریشان کن تھا۔



”سب ہی فیسٹیول کی تعریف کر رہے تھے بہت اچھا ہو گیا سب کچھ۔“ اقدس کے لہجے میں خوشی تھی۔

”میں تو پہلے ہی آپ سے کہہ رہا تھا۔ آپ بہت اچھا ایونٹ آرگنائز کر سکتی ہیں اور پھر محنت بھی آپ نے خاصی کی تھی۔“ روحان نے تو صیغی لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اس وقت دفتر میں بیٹھے تھے۔ نیبل پر کافی کے مکے رکھے تھے جن سے بھاپ اڑ رہی تھی۔

”سر سید کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ فینٹول میں
نے ارجح کر دیا ہے۔“ اقدس کو ان کی شکل یاد کر کے
ہنسی آئی۔

”ہوں حیران تو وہ بہت ہوئے مگر انہیں خوشی بھی
ہوئی تھی۔ ہی ازاے وری ناس پر سن (وہ ایک اچھے
انسان ہیں)۔“ روحان مسکرایا۔

”اچھے تو وہ ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے تو میں یہاں
بیٹھی ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ شکریہ تو آپ کو ان کا ادا کرنا چاہیے۔
اچھا وہ کچھ یونیورسٹیز کی طرف سے فون آیا تھا۔ وہ تو
ایونٹس اور کمپیشنز کروانا چاہ رہے ہیں۔“ روحان
نے لیپ ٹاپ اسکرین پر دیکھتے ہوئے بتایا۔
”سر! پہلے انسٹی ٹیوٹ میں کمپیشن کروالیتے
ہیں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔ میرے اسٹوڈنٹس بھی کہہ
رہے تھے کہ کوئی مزے کا کمپیشن کروائیں۔
چیلنجنگ سا۔“

”کوئی آئیڈیا ہے آپ کے پاس۔“ اقدس نے
پوچھا۔

”آئیڈیا تو ہے۔“ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ
کچھ سوچ کر مسکرایا تھا۔ اقدس اس کے بولنے کی منتظر
تھی۔

”امریکہ میں ہمارے کمپیشنز ہوتے تھے۔ کچھ
چیزیں ہمیں دے دی جاتی تھیں اور ان سب کو
استعمال کر کے ہمیں کوئی ڈش ملتی ہوتی تھی۔“

”واؤ! یہ تو بڑے مزے کا کمپیشن ہو گا۔“
”آپ کا بھی نام ڈال دیتے ہیں کنسٹنٹنس
میں۔“ روحان شرارت سے مسکرایا۔

”اتنی ایکسپرت نہیں ہوئی ابھی میں۔ دیکھی دیکھ
کر اچھا لگتی ہوں اسی کو غنیمت سمجھیں۔“ اقدس
نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

روحان نے مسکراتے ہوئے کافی کا کاک ٹیل پر رکھ
کر نظریں دوبارہ سے اسکرین کی جانب منہ دل کر
لیں۔ اقدس موبائل پر فینٹول والی پچزدیکھنے میں

لگن تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی
دی۔ اس سے پہلے کہ روحان یا اقدس میں سے کوئی
کچھ کہتا دروازہ کھلتے ہی ایک بچے کی شکل نظر آئی۔ بغیر
جھجکے وہ روحان کی طرف بڑھا تھا۔

”مائے سن (میرا بیٹا) کیسے ہو۔“ روحان نے اسے
پیار کرتے ہوئے اپنے ساتھ لگایا۔ ان لفظوں نے
اقدس کے قدموں کے نیچے سے گویا زمین کھینچ لی
تھی۔

”کیسا لگا سررازن۔“ دروازے سے داخل ہوتی وہ
لڑکی روحان کے قریب آئی۔ شوڈر کٹ بال، آگے کو
آئی فلیکس، چہرے پر خوب صورت مسکان۔ وہ
خاصی خوش شکل تھی۔ اسٹائنلٹن سا کرتا اس نے پرن
رکھا تھا۔

”اف کورس بہت اچھا لگا یقیناً تمہارا ہی آئیڈیا
ہو گا۔ سررازن دے کا شوق تمہیں ہی ہے۔“ روحان
بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔ خوشی اس کے چہرے پر
صاف نظر آرہی تھی۔ پہلی دفعہ اقدس نے روحان کو
کسی لڑکی سے اتنی بے تکلفی سے بات کرتے دیکھا
تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگ
جائے۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ
نکلے وہ یہاں سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔

”سر! میرے گھر سے کل آرہی ہے مجھے جانا ہو
گا۔“

سرخ چہرے اور جھکی آنکھوں کے ساتھ وہ اتنا کہہ
کر اپنا پنڈ بیگ لے کر باہر نکل گئی تھی۔ تیز تیز
قدموں سے کوریڈور پار کرتے ہوئے اس کا چہرہ
آنسوؤں سے بھینکنا جا رہا تھا۔

”مائے سن۔“ یہ دو الفاظ اس کے تعاقب میں
تھے اقدس شباب اتنی دور بھاگ جانا چاہتی تھی کہ یہ
آواز اس تک نہ پہنچ جائے۔



ثانیہ شہاب اور حماد منیر کا افسانہ زبان زد عام تھا۔
سب ہی حیرت اور تجسس کا شکار تھے کہ آخر یہ افسانہ

کب اور کیسے اور کیونکر شروع ہوا۔ ثانیہ جو ہمیشہ ہی ڈاکٹر حماد کو اچھا ڈاکٹر مانتی تھی اور برملا اس بات کا ذکر بھی کر دیا کرتی تھی اب وہ ساری باتیں اس کے خلاف جاری تھیں۔ بہت سے سوالوں کا اسے سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر اس کے پاس جواب میں صرف خاموشی تھی۔ ڈاکٹر حماد بھی واپس آچکے تھے صبح سے اسے یہی ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں انہیں یہ سب معلوم نہ ہو گیا ہو۔

مریض کا چیک اپ کر کے وہ فارغ ہوئی ہی تھی کہ نرس اس کے پاس آئی۔
 ”ڈاکٹر ثانیہ! آپ کو ڈاکٹر حماد اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔“ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ دیکھ کر ثانیہ کا چہرہ شرمندگی کے مارے سرخ پڑ گیا۔ اپنی تمام تر مت جمع کرتی وہ ان کے دفتر تک پہنچی۔

اندر سامنے ہی ڈاکٹر حماد اپنی مخصوص کرسی پر پتھریلے تاثرات کی ساتھ براجمان تھے۔
 ”آئیے مس ثانیہ۔ انوفٹیشنز ساتھ لائی ہیں یا یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔“

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

کی جانب سے بہنوں کے لیے خوشخبری
 خواتین ڈائجسٹ کے ناول گریٹھے حاصل کریں

30 فی صد رعایت پر

طریقہ کار ناول کی قیمت کے 30 فی صد کاٹ کر
 ڈاک خرچ - 100 روپے فی کتاب مئی آؤد کریں۔

مٹھوانے اور دتی خریدنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”اچھا؟ آپ نے نہیں کیا۔“ ڈاکٹر کالجہ سخت ہوا۔
 ”سر! میری آئی ڈی کو کسی نے ہیک کر کے یہ سب کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس کا مقصد کیا ہے مگر سچ یہی ہے۔“ ثانیہ نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

”سچ تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے یعنی حماد منیر کو اپنے ساتھ اسکیڈ ملا کر کیا ہے۔ میں کیا شکل سے اتنا بھڑک رہی ہوں کہ آپ کی اس جھوٹی کہانی پر اعتبار کر لوں گا۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں آپ کو اسکیڈ ملا کر

میں ادبی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد آیا تھا۔ تب ہی میری ملاقات فرخندہ چوہدری سے ہوئی تھی۔ وہ ہوٹل کی لابی میں میری منتظر تھی۔ وہ شوخ و شنگ طبیعت کی مالک تھی۔ مزاج میں جولانی تھی۔ لیکن اس کی شاعری گہری معنویت اور پرسوزی لیے ہوئے تھی جو اس کی شخصیت کی عکاس قطعاً نہ تھی۔ متناسب نقوش گہری براؤن آنکھیں، دلکش مسکان، ناک میں سونے کی لونگ، جاذب نظر اور دلکشی کا پیکر تھی، ادبی حلقوں میں اس نے تیزی سے اپنی جگہ بنائی تھی۔ پھر بھی مجھے دیکھ کر وہ کسی بھی بچی کی مانند استعجاب سے یک ٹک نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جسے میں کوئی انوکھی شے ہوں یا اگلے ہی پل نظر سے اوجھل ہو جاؤں گا۔

توا لیں سکند

سود و حیا کا حسنا

”آپ ہی ہیں دانیال آفندی؟“ اس کے لہجے میں حیرت آیا تھا۔
”جی۔“

”آپ تو بہت یک ہیں اور ڈھنگ بھی۔“
میرے مختصر جواب پر وہ بر جستگی سے بولی تھی اس کا اتنا بے باک انداز مجھے بالکل نہ بھایا تھا۔
”اس وقت میں جلدی میں ہوں، پھر بات ہوتی ہے۔“

میرا غور جاگ اٹھا تھا۔ اس کی گہری مسکراہٹ اور دائیں رخسار پر پڑتا ہوا ڈھیل محبوم ہو گیا تھا۔ جیسے اسے مجھ سے اس قدر رکھائی کی توقع نہ ہو۔ وہ سرخ ویراک میں اپنی تمام تر تمکنت کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ اگر مہربانیاں آفندی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا

تھا تو وہ بھی کوئی بے بسی نہ تھی۔ اس نے تیزی سے تہی کی منازل طے کی تھیں۔ ایک دن پہلے اس نے مجھے بطور خاص فون کر کے فرمائش کی تھی۔
”میں فرخندہ چوہدری بات کر رہی ہوں۔“ میں ڈرے رنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا اپنی ٹانگی کی ناٹ باندھنے میں مصروف تھا۔ جب میرا فون بج اٹھا تھا۔ میں نے ابھرنے کے بعد انداز میں قدرے تیزی سے فون پر آنے نمبر کو روشن اسکرین پر دیکھ کر بھی نہ پہچانا تھا۔ پھر کوفت محسوس کرتے ہوئے فون اٹھایا اور فون کے دوسری جانب سہیلی سی آواز سن کر میری تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ میں فطرتاً ”حسن پرست ہوں، یہ ہی وجہ ہے کہ بیک وقت مصور بھی ہوں اور شاعر بھی۔“

حسن نفق رکھنے والے دادو حسین کے ڈوگرے بجاتے میرے حوصلوں کو مزید جلا بخشتے ہیں۔ درحقیقت میں اک عشق کی منزل پر پہنچ کر نئے عشق کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہوں۔ عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں حسن سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ہر چمکتی شے سونا دکھائی دینے لگتی ہے۔ چکا چوند کی دنیا میں سحر طرازی میں ڈوب جانے کی خواہش جی میں چلتی ہے۔ میرے حلقہ احباب کے بقول میں باغ و بہار شخصیت کا مالک ہوں۔ جمال دیدہ ہوں۔ چلق و چوند ہوں۔ حسن پر فریفتہ ہو جانے والا ہوں۔ مگر ان سب کے برعکس میں خود سر، اتنا پرست اور تنہا پرست واقع ہوا ہوں۔ دل توڑنے کا ہنر رکھنے والا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے مہذب انداز میں پوچھا۔
مگر لہجہ میں اجنبیت کا تاثر پر قرار رکھا تھا۔
”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ کل آپ جس ادبی کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔ اس میں میں ناچیز بھی مدعو ہوں۔ میری دیرینہ آرزو ہے کہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو سکے۔ آپ کی شاعری ہی میرا اصل اثاثہ ہے، جس کو پڑھ کر میں نے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا۔“ فون پر اتنی لمبی گفتگو مجھے بیشہ کوفت جتلا کر دیتی ہے۔ میں نے بنا جواب دیے گہری سانس لے کر اپنا موڈ بحال کیا۔



”وہ کی جی، ملتے ہیں پھر۔“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو لکھ بھر کے لیے دوسری جانب فون پر خاموشی چھا گئی۔

”جی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے پریویم اٹھایا اور خود پر چھڑنے لگا۔

نامعلوم کیوں مجھے اچانک اس کی گم ہو جانے والی مسکراہٹ سے لگا کہ چند چمکتے جتنو معدوم ہو گئے ہوں۔ اک عجیب سی بے قراری نے دل پر دستک دی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ اک بار پھر سے مسکرائے اور میں اس کے گل میں پڑتا ڈمھل دیکھوں۔ شاید اس کی پوری شخصیت میں یہ ہی وہ شے تھی یہی وہ خاصیت تھی جو مجھے اپنی جانب مائل کر رہی تھی۔

”آپ سے مل کر اچھا لگا فرخندہ۔ اس وقت میں بے حد تھکاں محسوس کر رہا ہوں۔ آج میں اسی ہوٹل میں ہوں۔ کل ملاقات ہوئی ہے۔“ میں نے اخلاقاً کہا تو وہ دھیمسا سر خم کر کے مسکرا دی تھی۔ وہی گہرا ڈمھل جو مجھے الجھانے لگا تھا۔ میں اس کو دیکھ کر رہ گیا۔



میں نے گلاس ڈور کھولا۔ سامنے ہوٹل کے وسیع

”میں آدھے گھنٹے سے یہاں آئی ہوں، آپ نے کہا تھا شام کو ملاقات ہوگی اور آپ اب آرہے ہیں میں تو اس ہوٹل کی مہمان نہیں ہوں، ٹانا، ٹانی گے یہاں ٹھہری ہوں اور کب سے آپ کی منتظر ہوں۔“ وہ شکوہ کنال لہجے میں بولی۔ مجھے اچانک شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ کل بھی میں نے اس سے کوئی اچھا سلوک نہ کیا تھا اور آج بھی کوئی اچھا تاثر نہ چھوڑا تھا۔

”آئیں، کُلی بیٹے ہیں۔“ میں نے اسے فراخ دلی سے آفر کی تو وہ خشکیوں نگاہوں سے مجھ کو دیکھ کر بولی۔

”آپ بہت خود پرست ہیں۔ مجھ سے تو پوچھیں کہ میں کُلی بیٹا چاہتی ہوں یا چائے۔“ اس کے انداز پر

میری بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔
”جی محترمہ! بتائیں کیا پینا پسند کریں گی آپ؟“

میں نے شرارتی انداز میں کہا۔ میرا موڈ ایک دم ہی نہ جانے کیوں اچھا ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی سی لڑکی مجھے خاصی دلچسپ لگنے لگی تھی۔

اس کے لب و لہجے میں شفافیت تھی۔ تصنع بناوٹ سے پاک انداز بیان تھا۔ جو مجھے اپنا گرویدہ کر رہا تھا۔ ورنہ یہاں تو بناوٹی لوگوں کا جوم تھا اور میں تھا۔ عجب کم کی بوندوں کی مانند نرم و گداز لہجہ مجھے اسیر کر گیا۔ یوں جیسے نرم روسی خنک شام کا ساں ہو۔ وہ اتنے ہلکے ہلکے انداز میں بات کرتی کہ میں تحیر سے اس کی سادگی کو دیکھتا چلا جاتا تھا۔ بہت جلد ہم دونوں دوست بن گئے۔



میں آرٹ اینڈ آرٹ ریسرچ سینٹر کے آفس سے واپس لوٹا۔ سارنگ لٹ سے اپنی آٹو نکال رہا تھا جب دور وہ مسکراتی ہاتھ ہلاتی نظر آئی، نامعلوم کون مجھ تھا جو اسے میرے بل بل کی خبر دیتے لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس کا سوائے میرے ساتھ وقت چنانے کے کوئی کام ہی نہ رہا ہو۔

اس کے والدین حیات تھے مگر ان دونوں کی علیحدگی ہو چکی تھی۔ وہ اپنی ماما کے ساتھ کراچی کے پوش علاقے میں رہتی تھی۔ اسلام آباد میں اس کا نکھال مقیم تھا۔ علیحدگی کے بعد اس کی ماما نے دوسری شادی کر لی تھی اور یوں وہ اپنی نئی دنیا میں گم ہو گئی تھیں۔ فرخندہ کو دیکھ کر گمان بھی نہ ہوا تھا کہ وہ اتنے کرانسیس سے گزری ہے۔ یہ سب معلومات میں نے اپنے ایک دوست کے توسط سے حاصل کی تھیں۔ ورنہ فرخندہ کی لالباہی سی ہنسی نے کبھی مجھے یہ یاد نہ کروایا تھا کہ وہ اندر سے دھبی ہے یا والدین کی شفقت سے محروم ہے۔ اگرچہ دولت کی اسے کوئی کمی نہ تھی۔ مگر شاید اصل رشتوں کی کمی تھی۔ تب ہی وہ اتنی پُرسوز اور دھکی شاعری کیا کرتی تھی۔ بسا اوقات اس کا ہر وقت میرا تعاقب کرنا میرا موڈ بھی خراب کر دیتا تھا اور

میرا لب و لہجہ کھردرا ہو جاتا، مگر وہ نم آنکھوں سے فقط میرا منہ دیکھتی رہتی۔ جب تک کہ مجھے اپنے تلخ و ترش رویے کا احساس نہ ہو جاتا تھا۔

”کہاں کے ارادے ہیں؟“ وہ خوش دلی سے بولی اور میں اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر رہ گیا تھا۔ اس وقت میرا آرام کرنے کا ارادہ تھا، مگر وہ جس تیار سے میرے سامنے برجوش مسکان لیے کھڑی تھی، مجھے اپنا ارادہ ٹوٹا لگ رہا تھا۔

”تمہاری طرف ہی آرہا تھا۔ زوروں کی بھوک لگی ہے۔ ڈنر کرتے ہیں۔“ میں نے گہری ستائشی نگاہ اس کے سیراپے پر ڈالی تھی۔ وہ میری نظروں کا زاویہ بھانپ گئی تھی۔

”کیسی لگ رہی ہوں میں؟“ تب ہی فوراً سوال دے اٹھا تھا۔

”ہمیشہ کی طرح خوب صورت۔“ میں نے بھی آج کھلے دل سے اسے سراہا تھا۔ وہ سیدھی دل پر نقب زنی کرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

”تو چلیں۔“ وہ بڑھ کر فرنٹ سیٹ پر ارجمان ہو گئی تھی۔ اس کی چال میں وقار و تمکنت تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

شام کے سائے ڈھل چکے تھے اور ہم دونوں ریسٹوران میں مخصوص ایرے میں بیٹھے باتوں میں گم تھے۔ تب ہی ویٹر کھانا لے آیا، جس کا آرڈر ہم دونوں نے باہمی مشاورت سے دیا تھا۔

وہ شام بے حد حسین تھی۔ اتنی حسین لڑکی میرے سامنے بیٹھی میری تعریف کر رہی تھی۔ تھکان اور کوفت خوش گواریت میں بدل چکی تھی۔

”آپ جانتے ہیں، آپ میرے آئیڈیل ہیں۔ آپ کو بنا دیکھے ہی میں آپ کی شاعری کی دہرائی ہو چکی تھی۔ پھر میں نے بھی قلم تھاما تو آپ کے نقش قدم پر چل نکلی، مگر آپ جتنا اعلان لکھ سکتی، نہ کوئی لکھ سکتا ہے۔ یہ تو خدا داد صلاحیت ہے، جس کے نصیب میں رقم ہو، اس کو ملتی ہے۔“ اس کے الفاظ میری تنی ہوئی

گردن کے اکڑاؤ میں مزید اضافے کا باعث بن رہے تھے۔
”تم بھی اچھی شاعری کرتی ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا تو وہ شرمائی گئی۔

”آپ یوں ہی دل رکھ رہے ہیں میرا۔“ اس کا انداز خفت بھرا تھا۔ میں ہنس دیا۔
”اور یہ دل رکھنا کیا ہوتا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ تو میری ہنسی میں اس کی جلتی رنگ ہنسی کی آمیزش بھی ہو گئی تھی۔ پھر بہت جلد ہم دونوں اخبارات کی نہنت بن گئے۔ میں تو ان باتوں کا عادی تھا۔ مگر فرخندہ نے اخبارات میں اپنی اور میری تصاویر دیکھ کر گہرا صدمہ لیا۔ وہ بالکل چپ ہو گئی تھی۔



میں اس کے گھر پہلی مرتبہ گیا تھا۔ شاید ایک ہفتے مسلسل فرخندہ سے نہ ملنے کے باعث میں جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چلا تھا۔ فرخندہ میرے لیے فقط دل لگی کا سلمان نہ رہی تھی۔ میرے جذبات اور احساسات اس کے لیے اس سے بڑھ کر تھے۔ اسی لیے جب اخبارات میں فرخندہ کے کردار پر حرف اٹھایا گیا تو میں اپنی جگہ مجرم سا بن گیا تھا۔
اگرچہ ہم دونوں اکثر ملتے تھے اور کئی بار لانگ ڈرائیو اور ڈنر بھی اکٹھے کر چکے تھے۔ مگر ہم دونوں میں ایک فاصلہ تھا۔ ہم دونوں اپنی حدود جانتے تھے۔ وہ ایک بولڈ لڑکی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کا انداز اتنا دو ٹوک ہوا کرتا تھا کہ میں کبھی اس سے ایک حد سے بڑھ کر بات نہ کر سکتا تھا۔

شان دار بنگلے کے پریش لاؤنج میں سے گزر کر مجھے ڈرامنگ روم میں اٹھایا گیا تھا۔ میں نے اطراف کا طائرانہ جائزہ لیا۔ بے حد خوب صورت ڈیکوریشن ہیسز اور اعلیٰ ہینشنگز سے سجادہ وسیع و عریض مہمان خانہ اہل خانہ کے ذوق کا عکاس تھا۔

”السلام علیکم، کیسے مزاج ہیں برخوردار۔“ ایک معمر بزرگ نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ان

کی نظروں میں میرے لیے سناٹا تھا۔
”شاء اللہ، فری اکثر آپ کا ذکر کرتی رہی ہے۔ آپ کی شخصیت واقعی جاذب نظر اور شان دار ہے۔“ ان کی تعریف پر میں کھل اٹھا۔

”جی آپ کی ذمہ نوازی ہے۔“ میں نے انکساری سے کہا۔ تب ہی فری آگئی، سنا ہوا چوہ، متورم پونے اور سوچی آنکھیں لیے وہ آن بیٹھی تھی۔

”ارے بھئی، اس کو سمجھاؤ۔ یہ سب اخبارات کی باتیں ہیں۔ جب شہرت ملتی ہے تو اس کا کچھ تاوان تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہت بڑا دل درکار ہوا کرتا ہے، زمانے کے سردو گرم کو جھیلنے کے لیے۔“ فری کے مٹا امتیاز حسن نے نامحانہ انداز میں کہا۔ تو میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”در اصل میں اسی سلسلے میں بات کرنے یہاں آیا ہوں، میں فری کو اپنانے کا خواہش مند ہوں۔ جو داغ میری وجہ سے اس کے ماتھے پر لگا ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ مٹ جائے اس لیے میں فری سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں، میرا دنیا میں کوئی نہیں جو عزیز و اقارب ہیں۔ وہ از خود آس لگائے بیٹھے ہیں۔ والدین کی کار حادثے میں وفات کے بعد ان کی تمام جائیداد کا روبرو میرے نام ہے۔ فری کو کبھی تنگی ترشی کا سامنا نہ ہوگا۔“

میری بات پر فرخندہ نے استعجاب سے میری جانب ایک ٹک دیکھا تھا۔ فرخندہ کا بکھرا ہوا حلیہ، تلخ جالباس، جس طرح ابھرنے کے بعد سورج ڈھل کر تاریخی کر میں بکھرتا ہے۔ ویسے ہی وہ مضبعل سی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا پناہ دل ڈوب رہا تھا۔ وہ اک پل ہی تھا۔ جس میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اس کا آزدگی میں لپٹاؤ جوید دیکھ نہ پارہا تھا، مگر سے نکلے وقت میرا ارادہ فقط اسے تسلی اور دلاسا دینا تھا۔ مگر اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اتنے دن اس کو نہ دیکھ کر جو بے کلی میرے دل میں سر اٹھا رہی تھی۔ وہ محض اس سے محبت ہے۔

میری بات پر فرخندہ کے آنسو اک ٹو اتار سے بنے لگے تھے۔ اب میں خود کو درحقیقت قصور وار گردان رہا تھا۔ اخبارات میں جس حد تک خرافات چھاپی گئی تھیں کوئی بھی شریف النفس انسان اس کو پڑھ کر سر

اٹھا کر نہ جی سکتا تھا۔

”کو کوئی ناں مجھ سے شادی؟“ اس کے تانا کے جاتے ہی میں نے محبت پاش لہجے میں پوچھا تھا۔

”اتنے دن کیوں نہیں آئے آپ؟“ اس کا وہی اپنائیت بھر انداز جو مجھے اپنا ایڑ کر لیتا تھا۔

”بس دل کے کچھ معاملات تھے جو طے کرنے میں لگا تھا۔ یہ دل ڈانواں ڈول تھا۔ لیکن جوں ہی تمہارا اداس چہرہ دیکھا۔ وہ اک شکش جو اتنے دنوں سے میرے اندر تھی۔ اس کو قرار مل گیا۔“

☆☆☆

پھر شادی اگلے ہفتے ہی رکھ دی گئی۔ تمام اخبارات میں شادی کے حوالے سے سرخی لگادی گئی تھی۔ تاکہ لوگوں کی زبانیں بند کی جاسکیں۔

شادی کی شانگنگ کے حوالے سے وہ بے حد ضد کر رہی تھی کہ تمام شانگنگ ہم مل کر کریں گے۔

مجھے اس طرح کی سرگرمیوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر اس کی دل جوئی کی خاطر میں نے یہ فریضہ بھی بخوشی اٹھالیا تھا۔ ہر دکان پر وہ بچوں کی طرح چل رہی تھی۔ ہر لباس کو پکڑ کر وہ میری رائے لے رہی تھی۔

”فری! جانتی ہو۔ میں اک نامکمل انسان تھا۔ ایک عرصہ تک میں نے لڑکیوں سے دل لگی کی ہے۔ مگر دل کی لگی کیا ہوتی ہے، مجھے اب معلوم ہوا ہے۔“ میں نے اعتراف کیا تو ایک دم اس کی مسکن سنجیدگی میں بدل گئی تھی۔

”ایسا کیوں کرتے تھے آپ؟ کیا لڑکیوں کے احساسات نہیں ہوتے؟ وہ بھی تو دل رکھتی ہیں۔ اس کے ٹوٹنے پر ان کو بھی تکلیف ہوتی ہوگی۔“ آپ نے

اپنی بدنامی کا بھی خیال نہیں کیا؟ اس نے سوال کیا تو میں اس کی بات سے محظوظ ہو کر ہنس دیا تھا۔

”ارے ان لڑکیوں کی کیا وقعت یا ان کی عزت اور پاس داری کا میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اگر اتنی ہی نیک نامی کا خیال ہے تو ملنا ہی چھوڑ دیں۔ یہ سب میری فین ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا حق ہے کہ حسن کو سراہوں۔ اگر شاعر ہو کر میں یہ فریضہ ادا نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ پھر بدنامی کی کیا بات سب کو معلوم ہے کہ مرد حضرات کا ان سب میں کوئی قصور نہیں ہوا کرتا۔“ وہ بدلتے تاثرات لیے مجھے سن رہی تھی۔ میں اس کے تاثرات کو کوئی پام دینے سے قاصر تھا۔ مگر وہ بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے بالکل ہی غلط موضوع پر بلا تکن بولنا شروع کر دیا ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

”ارے تم کیوں موڈ آف کر رہی ہو۔ آئس کریم کھاؤ ناں۔ پکھل جائے گی۔“ میں نے کہا تو وہ سر جھکا کر آئس کریم کھانے لگی۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی میرا دل نچلنے کیوں گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید شادی پر ہر دو لہا کا انداز کچھ یوں ہی ہوا کرتا ہو۔ خیر میں بے حد نروس تھا۔ میں نے اپنی والدہ کے حوالے سے تھوڑی سی غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ میری والدہ حیات تھیں۔ اور میں شادی کے اس مبارک موقع پر ان کا تاریک سایہ نہیں بڑنے دینا چاہتا تھا۔ میری ماں جو ماں کہلانے کی بھی مستحق نہیں۔ میرے باپ کو چھوڑ جانے والی، مجھے ماتا کی شفقت سے محروم کروینے والی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میری ماں نے ایک اجنبی سے شناسائی کے بعد مجھے چھوڑ دیا تو وہ میرے اور بابا کے دل سے اتر گئی۔ بابا کی وفات کے بعد میری امی نے مجھے بیٹا کہہ کر گلے لگانے کی حسرت کا بارہا ذکر کیا۔ مگر میں نے ہر مرتبہ انہیں دھتکار دیا۔ جب میں بچہ تھا، مجھے شفقت اور محبت کی ضرورت تھی تو

میری ماں نے مجھے اپنی محبت سے محروم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے فری کے حوالے سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس کرب و اذیت سے دوچار رہی ہے۔ جس سے میں ایک عرصہ تک نبرد آزما رہا ہوں۔ تو میں نے بھی اس اچھی لڑکی سے گہری اپنائیت محسوس کی۔

پھر جب ایک مرتبہ از خود فری نے رو رو کر اپنے والدین کی لافعلی کا احوال سنایا، خاص کر اپنی امی کے حوالے سے تو میرا خون میری کپٹیوں میں ٹکریں مارنے لگا تھا۔ کسی پھرے ہوئے طوفان کی مانند۔

فری سے یہی مانوسیت رفتہ رفتہ محبت میں بدل گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سے دوری کا خیال بھی اب میرے لیے سہلان روح تھا۔ اب تک جتنی لڑکیوں کے دل توڑے تھے۔ یہی خیال تھا کہ میں کہیں نہ کہیں اپنی ماں کی بسو فانی کا بدلہ لے رہا ہوں۔

کسی حسین چہرے اور اس کی ذات میں بڑھتی دلچسپی دیکھ کر بدیلہ لینے کے لیے میری تمام حسیات چوکس ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ اک لڑکی عالیہ نے یوں ہی میری محبت کا دم بھرا تھا۔ اور میں نے اس کی محبت کو ٹھوکر مار دی تھی۔ اتنا تک پہنچا کہ محبت کو ٹھکرانے کا لطف کیا ہوتا ہے یہ میں ہی جانتا تھا۔ پھر اڑتے اڑتے میرے کانوں تک یہ خبر پہنچی تھی کہ اس عالیہ نامی لڑکی نے لوٹشی کر لی ہے۔ میں ایک بار سوخ مالدار شخص تھا اور اس خبر کو با آسانی دیا دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے سیکرٹری کے ذریعے تمام معاملات سیٹ کروا لیے تھے۔ دولت کے انبار تلے ہر معاملہ، ہر بات دب جاتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی اہم یا خاص کیوں نہ ہو۔ یوں بھی میری اطلاع کے مطابق فریق پارٹی بھی ہرگز رسوائی کی روداد نہ تھی۔ وہ خود بھی اس تمام معاملے کو اچھالنے کے حق میں نہ تھی۔ یوں بھی دیکھا جائے تو میں نے کیا ہی کیا تھا۔

تھوڑے سے التفات کو اگر کوئی لڑکی جان کا روگ ہلے تو اس میں میری خطای کیا ہے۔ میں تو بدلے کی آگ میں جلنے والا سائیکسی سا انسان ہوں۔ اگرچہ اپنی اس بدنظمی کو جو میری ذات کا خاصا سہرا ہے۔ میں نے

دنیا کی تیز چبھتی ہوئی نظروں سے روپوش رکھا ہے۔ مگر ایک انسان اگر اپنے ضمیر کی عدالت میں جائے تو اسے اپنا اصل چہرہ آسانی دکھائی دے جاتا ہے۔

اب اس بات کو بھی اک عرصہ بیت چکا ہے۔ میں تو ان تمام باتوں کو یکسر فراموش کر چکا ہوں۔ میرے چند دیرینہ دوست جو میری اس حصلت سے واقف ہیں وہ میرے شادی جیسے فیصلے پر انکشت بدنداں ہیں۔ شاید مجھے بعد میں پچھتاوا ہو۔ ایسا بھی سننے کو ملا ہے۔ تبصرہ کرنے والے فقط قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں، دل کا حال تو خود انسان جانتا ہے۔ اور میں وائیل آئندی بقائمی ہوش و حواس یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے فرخندہ چوہدری سے عشق ہو گیا ہے۔ میں پور پور اس کی محبت میں ڈوب چکا ہوں۔ اس سے دوری مجھے گلے ملنے لگی ہے۔ اسی لیے میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر کچھ احسان جتاتے ہوئے کہ ذلت آمیز خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ خود فرخندہ چوہدری اس بات سے قطعی بے خبر ہے کہ یہ اخبارات کبھی بھی میرے اور اس کے تعلق پر خبریں نہ چھاپ سکتے اگر میں خود ہی اس بات کا خواہاں یا متحمس نہ ہوتا۔ میں نے اک بڑی بچی رقم ان سرخیوں کے لیے جیب سے نکال کر دی ہے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ فرخندہ تا عمر اس احساس میں رہے کہ میں اس کی محبت میں ڈوب چکا ہوں اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک دے رہا ہوں۔ یہی وہ بات ہے جس نے مجھے سوچنے اور اس عمل کے لیے مجبور کیا ہے میں نے کہا تھا ناں کہ محبت تو ہے مگر دولت انسان کا پس پوائنٹ ہے۔ اور اسی دولت کے بل بوتے پر میں نے ایسی چال چلی کہ اب وہ مجھ سے شادی تو کر رہی رہی ہے۔ مگر میری احسان مند بھی ہے اور تا عمر رہے گی۔

اس کی آنکھوں میں ممنونیت میں نے اس دن دیکھ لی تھی جب شادی کی آفر کی تھی۔ حالانکہ یہ سب میرے بنائے ہوئے منصوبے کا حصہ تھا۔ میں ایک ہفتہ جان بوجھ کر اس سے نہ ملا۔ تاکہ وہ میری کمی کو محسوس کرے اور پھر جب میں اچانک اس کے سامنے

میں اس جیسے شخص کے ساتھ شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو عورت کے دل کو کھلونا سمجھ کر کھیلتا ہے۔ اور ایک سے دل بھر جانے کے بعد دوسری کی جانب توجہ مبذول کر لیتا ہے۔ جو اپنے ہی زعم میں خود کو پوچھتا ہو۔ جس کی گردان ”میں“ سے شروع ہو کر میں پر ہی ٹوٹتی ہو۔ اس کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے۔ میں چاہتی تو کچھ عرصہ کے لیے یہ شخص جیل میں سزا مگر جو احساس ذلت میں اسے دے رہی ہوں، وہ اسے تا عمر کچوکے دیتا رہے گا۔ میں اس سے ہرگز شادی نہیں کروں گی اور مسٹر وانیال! یہ رہا ثبوت کہ جو اخبارات تم نے اپنی جانب سے خریدے تھے اور انہیں میری بدنامی کا کام سونپا تھا۔ ان میں سے دو اخبارات کے ایڈیٹر میرے عزیز ہیں۔ اتنی بڑی چال چلنے سے قبل ذرا تسلی تو کروا لیتے۔“

فرخندہ نے ہوا میں تصاویر اچھال دی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں سربازار عریاں ہو گیا ہوں۔ سب کٹھا کٹھ میری اور فرخندہ کی تصاویر لے رہے تھے۔ میرے وجود میں نجانے کیوں اتنی برف اتر آئی تھی کہ میں چاہ کر بھی بول نہ پارہا تھا۔

”اگر ایسا ہی تھا تو مس فرخندہ! یہ شادی پر رضامند ہونا یہ کیا ماجرا ہے۔“ اک جرنلسٹ نے سوال کیا تو وہ ہنس دی تھی۔

”میں چاہتی تھی کہ اس شخص کو ذہنی طور پر اتنی ہی اذیت کا سامنا کرنا پڑے جتنا کہ میں نے کیا ہے۔ اور میں آج شام کی فلائٹ سے بیرون ملک جا رہی ہوں۔ میرے بابا ایک عرصہ سے مجھے بلارہے تھے۔ میں نے سوچا کہ جاتے جاتے ذرا ان صاحب کو ان کا اصل چہرہ دکھا دیا جائے۔“

یہ فرخندہ تو معصوم سی فرخندہ سے یکسر مختلف لگ رہی تھی۔ جسے ایک عرصہ سے میں چاہتا چلا آ رہا تھا۔ آج اس کے گل میں پڑتا، بخور وہ ڈمپل نہیں طنز میں لپٹا ہوا کوئی تیر تھا جو مجھے چھلنی کر رہا تھا۔ مجھے اچانک لگا کہ میں حواس کھو رہا ہوں۔ بجوم میرے گرد اٹھا ہوا اور میں ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

جاؤں تو وہ میری جھٹک پا کر فائٹ شادی کا فیصلہ کرے اور پھر ایسا ہی ہوتا گیا جیسا میں نے پلاننگ کی تھی۔ سارا معاملہ خود بخود سیٹ ہو گیا تھا۔

اور آج میں نرمس سا ہوں۔ نامعلوم گھبراہٹ سی ہے۔ آواری کے بینکویٹ ہال میں دو لمبا بنے میں قمقموں کی زد میں خاصا مطمئن سا بیٹھا تھا بقول فرخندہ وہ بیوی پارلر میں میرے لیے خاص اہتمام سے تیار ہو رہی ہے۔ میں سرشاری کی کیفیت لیے اس کا شدت سے منتظر ہوں۔ شہر کی نامی گرا می — اور اہم سیاسی شخصیات بھی اس تقریب سعید میں مدعو ہیں۔ مختلف اخبارات اور جریدے میرا انٹرویو لینے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں تاکہ شہ سرخیوں کے ساتھ میری شادی کا احوال تفصیل سے لکھ سکیں۔ میں چاہتا تھا کہ نکاح خواں نکاح پڑھا دے تو میں اس کے بعد ہی میڈیا کو فیس کروں۔

تب ہی اک گاڑی آ کر رکی اور تمام کمرے اس جانب فوکس ہو گئے تھے۔ اندازہ تھا کہ اس گاڑی میں فرخندہ ہو گی اور وہ فرخندہ چوہدری ہی تھی۔ مگر بالکل سادہ سے حلیمے میں۔ اگرچہ وہ اس سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ مگر میرا دل اسے سادہ حلیمے میں دیکھ کر ہونکنے لگا تھا۔ کچھ ایسا اس کے چہرے پر ضرور رقم تھا کہ میں چونک گیا تھا۔ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اسٹیج پر آئی ہے۔

”مس فرخندہ چوہدری آپ۔“ مختلف آوازوں میں گھری وہ بہت مطمئن تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کروایا تھا۔ میں یک ٹک کرسی پر براجمان اس کے انداز کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ سب کی آمد کا بہت شکریہ۔ اگر میں بلاتی تو شاید یوں اتنے سارے صحافی نہ آتے۔ لیکن جس مقصد کے تحت آپ سب یہاں مدعو ہوئے ہیں، وہ اب ممکن نہیں ہے۔ میں وانیال آندری سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی۔ اک ایسا انسان جو رشتوں کو نبھانے کے ہنر سے ناواقف ہے۔ ارے رشتے تو دور کی بات ہے۔ یہ تو انسان ہی کہلانے کے قابل نہیں ہے۔“

تھا۔ محبت کے اس سفر میں ہار میری ہی ہوئی تھی۔



میں فرخندہ چوہدری ہوں۔ حساس دل رکھنے والی۔ محبت اور اخلاق کے جذلوں سے گندھی ہوئی ایک روایتی سی لڑکی ہوں۔ جس دن مجھے عالیہ کی خودکشی کی اطلاع ملی، اس دن میں ٹوٹ سی گئی تھی۔ عالیہ میرے چچا کی بیٹی ہی نہ تھی، میری بہن میری ہم راز، میری دوست بھی تھی عالیہ کے لبوں پر پچھلے چند ماہ سے کسی شاعر و انیال کا نام رہنے لگا تھا۔

”جانتی ہو فری! وہ اتنا بینڈ سم ہے کہ بندہ اس پر نگاہ ڈالے اور مرے۔“ میں اس کی وارفتگی پر ہنس دیتی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میں ہاسپٹل میں تھا۔ میرے سامنے وہی عورت تھی جسے میں زندگی میں کبھی دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ وہ میری ماں تھی جو فکری سے مجھے تنگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ کئی دنوں سے سوئی نہیں ہے۔

”شکر ہے مالک کا۔ آج پورے تین دن بعد تم ہوش میں آئے ہو۔“ وہ محبت سے بولی تھیں۔

”مجھے کیا ہوا تھا؟“ چاک کا سارے منظر دوبارہ میری آنکھوں میں کسی فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔ فرخندہ کا تسخیرانہ انداز اور دنیا کی طنز یہ نگاہیں۔

”تمہارا ندوس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔“ ماں نے یہ کہہ کر مجھ سے نظریں چرائی تھیں۔

”یہ لفافہ نجانے کون دے گیا تھا۔“ ایک خاکی رنگ کا لفافہ مجھے تھا کہیں میرا چہرہ نکلنے لگی۔

”اب کیسے ہو۔“ مبہم سا لہجہ۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”بیٹا! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی کوئی بھی عورت اتنی سفاک نہیں ہوتی کہ اپنے بچے کو چھوڑ کر جائے۔ تمہارے باپ نے تم سے ملنے پر پابندی عائد کی تھی۔“

ماں کے لہجہ میں کالج کی کہچیاں تھیں۔

”میں تمہارے لیے جوس لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی تھی۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک خط تھا۔

دانیال آئندی!

”میں نے اپنی زن عالیہ کا بدلہ تم سے لے لیا ہے۔ امید ہے اب کسی لڑکی کا دل توڑنے سے پہلے سو بار سوچو گے۔“

فرخندہ چوہدری!

میں ہچکولوں کی زد میں تھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ میں سب جیت کر بھی ہار چکا تھا۔ میں اب دنیا کا سامنا کرنے سے کترانے لگا تھا۔ میں تنہا کی اوڑھ چکا

”فری! میں اس سے ایک دن نہ ملوں تو لگتا ہے جیسے میں مری جاؤں گی۔ اس کی شاعری، ارے شاعری سے یاد آیا۔ میں نے اس سے سرسری سا تمہارا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا۔ تم اپنی شاعری کو ڈائری تک بند نہ رکھو۔ اسے منظر عام پر لاؤ۔“ وہ جوش سے بولی تھی۔

”ارے چھوڑو، وہ تو کالج ٹائم کی ہے۔ میں کہاں اتنی عمدہ شاعری کرتی ہوں۔“ میں ہنس دی تھی۔

عالیہ کی ہر بات دانیال سے شروع ہو کر دانیال پر ہی ختم ہونے لگی تھی۔ عالیہ گھر میں بڑی تھی۔ اس کی شادی کا تذکرہ چھڑا تو اس نے سب کے سامنے دانیال کا نام لے کر سب کو حیران کر دیا۔

”اس کو بلاؤ۔“ چچانے کہا۔

میں نے دیکھا کہ عالیہ پر یقین تھی کہ وہ ضرور دانیال کو آمادہ کر لے گی۔ ان دنوں میں ماسٹرز کر رہی تھی۔

میرے فائنل ایر کے ایگزامز تھے۔ میں بے انتہا مصروف تھی۔ تب ہی مجھے اک دن عالیہ کا فون آیا۔ وہ

دور رہی تھی۔

”فری! دانیال کو مجھ سے محبت نہ تھی۔ وہ کہتا ہے، میں اک فلمی لڑکی ہوں۔ اور فقط دل لگی کیے جانے کے لائق ہوں۔ فری تم کو تو معلوم ہے، میں نے کبھی کسی کو اس طرح نہیں چاہا۔“ اس کا اس طرح

رونا مجھے ہولارہا تھا۔

”ارے تم فکر مت کرو۔ ملتے ہیں اس سے۔ میں بات کروں گی۔“

اتنا آسان بھی نہ تھا۔ میں اب ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگی تھی تاکہ اسے میری عادت ہو۔ اور ایک دن یہ عادت محبت میں بدل جائے۔ بسا اوقات وہ بے حد رکھائی سے بھی بولتا تھا۔ مگر میری مستقل مزاجی کے سامنے ڈھے سا گیا۔ اور پھر وہ مجھے اپنے دل کی بات بتانے لگا۔

میں نے دلجوئی کی اور پھر میں نے دوسرے دن اپنا مقالہ جمع کروانا تھا۔ میں بری طرح مصروف تھی۔ چاہ

کر بھی اس دن عالیہ کی جانب نہ جاسکی۔ اور اس کا برین ٹیمبرج ہو گیا۔

اگرچہ بظاہر یہ عام سی موت تھی۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ کس شے کا اتنا اثر لے رہی تھی۔ اخبارات میں اس کی چھپنے والی تصاویر اس کی توڑ پھوڑ کی اصل وجہ بن گئی تھیں اور دانیال کا رو کھانا اذہم میں جانتی تھی کہ وہ ایک باہمت لڑکی ہے۔ مگر اسے اس راہ پر لانے والی ذات دانیال کی تھی۔ میری کنزن کی موت کو دانیال نے خود کشی کا رنگ دیا تھا یا شاید اس کے سیکرٹری نے ایسا کیا تھا۔ مگر اب پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا۔ میں نے طے کیا کہ ایک بار اس دانیال سے مل کر اس کو برا بھلا کہوں گی۔ ملاقات سے قبل ہی بی بی وی پر اس کے ایک انٹرویو میں اس کا حقیر بھرا انداز مجھے بھڑکا گیا تھا۔

”اب ہر دوسری لڑکی جو میری محبت کا دم بھرتی ہے، مرجائے گی تو کیا مجھ پر قتل کا الزام دھرایا جائے گا۔“ غور میں ڈوبا لب و لہجہ لیے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بول رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ تب میرے ذہن نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس شخص سے عالیہ کا انتقام لوں۔ میں ایک عام سی لڑکی بن کر اس کے سامنے جا کر انتقام نہ لے سکتی تھی۔

میں اس کو محبت میں ایک خاص مقام تک لا کر چھوڑنا چاہتی تھی تاکہ اسے بھی درد کا احساس ہو وہ بھی وہی کرب و اذیت ہے جو عالیہ نے سہی تھی میں نے اپنی شاعری کا مجموعہ شائع کروایا۔ جو راتوں رات مقبول ہو گیا۔ اگرچہ اس طرح شہرت کا حصول کبھی بھی میرا مطمح نظر نہ رہا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب میری دانیال سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے بے حد مغرور لگا اور انداز سے بڑھ کر شاطر اور مشکل لگا۔ اسے زیر کرنا

کوئی بھی مرد جب اپنا اصل چہرہ آشکار کرنے لگے تو سمجھ لیتا چاہے یہ کہ عورت اب اس کے دل اور دماغ دونوں پر قابض ہو چکی ہے۔ جس دن اس نے عالیہ کا ذکر کیا اس دن میرا جی چلا کہ اس کا منہ نوج لوں۔ مگر ضبط کیے اس کے سامنے بیٹھی رہی۔ اگر یہی کرنا ہوتا تو اتنا فاصلہ عبور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر جب اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی تو میں مطمئن ہو گئی تھی۔

اور پھر وہ دن بھی آیا جب بھری محفل میں اس کو عریاں کر کے میں نے تمام لڑکیوں کی توہین اور ذلت کا بدلہ لے ڈالا تھا۔ مگر اس شہ اور مات کے چکر میں نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں اپنا آپ گنوا بیٹھی ہوں۔ اس دن جب دانیال بے ہوش ہو گیا۔ اور اگلے دن اطلاع ملی کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے تو میں چاہ کر بھی اس دن کی فیلانٹ سے باہر نہ جاسکی۔ میں اسپتال اسے دیکھنے گئی تھی۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کے چہرے پر کرب پھیلا تھا۔ محبت میں ہار جانے کا کرب اور اس کرب کو مجھ سے بہتر کون جاسکتا تھا کہ میں بھی تو دانیال سے لڑتے لڑتے خود سے ہار بیٹھی تھی۔ مگر عورت جب محبت اور انا میں سے ایک چیز چن لیتی ہے تو محبت کو دل کے نہال خانوں میں دفن کر کے اپنی عزت کو ترجیح دیتی ہے۔

میں نے الوداعی نگاہ دانیال پر ڈالی اور لوٹ آئی۔ میری آنکھوں کی کمی میرے گل بھگوئے لگی تھی۔ کون طے کر سکتا تھا کہ اس سوویاں میں میں نے کیا کھویا اور کیلیا تھا۔



توحشی بات

میرے لیے آپ کی خوشی اور پسند ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ وہ ان کے ہاتھوں پر دباؤ ڈالتا اٹھ گیا تھا۔
نبیلہ بیگم جیسے ہوش میں آگئیں۔ اسی وقت سلوی تیزی سے اندر آئی۔
”اے سلوی! کچھ سنا تم نے؟ جمشید کیا کہہ گیا ہے۔“

”امی! میں زار سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
نبیلہ بیگم کے سر پر گویا چھت آگری تھی۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے جمشید کو دیکھنے لگیں۔ جس کے گندمی، سنجیدہ چہرے پر مذاق کا شائبہ تک نہیں تھا۔
”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟“ موڈب

”جی امی! ابھی اپنے کانوں سے ہی تو سنا ہے۔“ اس کا بھی شاید میں کی طرح ابھی سکتے ٹوٹا تھا۔
”شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پی لیتے یا نواز“
عمران سارے اختلافات بھلا کر ایک دوسرے سے ”سیاسی چھپھل“ ڈالتے، مجھے تب بھی اتنی حیرت نہ ہوتی، جتنا اس کے منہ سے یہ بات سن کر ہوئی ہے۔
ایسی خواہش کا اظہار ظفری کرنا تب بھی کوئی بات

لہجے میں وہ پوچھ رہا تھا۔
نبیلہ بیگم کیا جواب دیتیں، وہ تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ابھی تک آنکھوں میں بے یقینی لیے اپنے حد درجہ سعادت مند بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ جو مزید کہہ رہا تھا۔
”امی! میں نے آپ کو صرف اپنی پسند بتائی ہے۔ باقی فیصلہ آپ جو بھی کریں گی مجھے بخوشی قبول ہوگا۔“

مکمل ٹائل





تھی، لیکن میرا جشید۔“
ان کا انداز ایسا تھا۔ ”ہائے میں لٹ گئی۔“
”وہی تو امی! میں خود حیران ہوں یہ بیٹھے بٹھائے
جشید بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک تو اپنے منہ سے شادی
کا اظہار اور وہ بھی زارا سے؟“

”میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے، حمہ کو فون ملا وہی آکر
کچھ حل نکالے گی، اس مسئلے کا۔“ نبیلہ بیگم کو ہر قسم
کی ہنگامی صورت حال میں اپنی بڑی بیٹی کا خیال ہی آتا
تھا۔ جس کے نادر و نایاب مشوروں پر وہ آمناء و صدقا
عمل کرتی تھیں۔ سلویٰ نے وہیں چپٹھے بیٹھے ہاتھ
برہا کر موبائل اٹھایا اور بڑی بہن کا نمبر ملائے لگی۔
دوسری طرف سے اس کی غلت بھری آواز سنائی دی۔
”جی امی! خیریت؟“

”ارے حمہ! میری بچی، خیر، خیریت کو چھوڑ، تو بس
یہاں پہنچ، بڑی ضروری بات کرنی ہے تجھ سے۔“
”امی ایسی بھی کیا ضروری بات ہے۔ آج لمبی کو
دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ آپ جانتی ہیں ایسے موقع
پر میرا وہاں ہونا کتنا ضروری ہے۔ آخر کو بڑی بہو
ہوں۔“ حمہ کے ٹھنک کے کہنے پر نبیلہ بیگم کا پارہ ہائی
ہوا۔

”صبح میرا منہ مت کھلو، حمہ! جیسے میں تو جانتی
ہی نہیں ان لوگوں نے تمہیں بڑی بہو کے کس
سکھاس پر بٹھا رکھا ہے۔“
”تو میں بھی کون سا ان کی شان و شوکت برہانے
کے لیے وہاں بیٹھوں گی۔ آپ کو ہوتا تو ہے میری ساس،
نندیں کتنی گھٹی ہیں، جانے کیا کیا معاملات طے ہوں،
مجھے ہوا تو بڑی لگنے دیں گی۔“

”چھا،“ دفع کران کو۔ ابھی تو یہاں کی خیر، خبر لے۔
میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔“
معاملہ واقعی سنگین نوعیت کا تھا۔ حمہ نے اپنے
آنے کی یقین دہانی کروا کر فون بند کر دیا۔

”چھا،“ تو یہ چکر ہے۔ میں تو ظفیری کی طرف سے

ایسا کوئی شوشا چھوڑے جانے کی منتظر تھی۔ یہ اپنے
جشید بھائی کو کیا ہوا؟“ ساری بات سن کر حمہ نے بھی
انگلیاں و اب لیں منہ میں۔
”جشید بھائی تو نظر اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھتے۔ یقیناً“
اس زارا نے ہی کوئی چکر چلایا ہو گا۔“ فی الفور پہلا
خیال اس کے ذہن میں یہ ہی آیا۔

”وہ آدمی بے زار زارا کھر آئے مہمانوں سے سلام
دعا کرے، یہ بھی بہت ہے۔ نہ جانے کس دھیان گیان
میں رہتی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے عجیب مافوق
الطبیعت قسم کی لڑکی ہے۔ نہ ہنستی بولتی ہے، نہ جتنی
سنورنی ہے۔ لڑکیوں والی تو کوئی بات ہی نہیں اس
میں۔ اس معاملے میں پیش رفت اس کی جانب سے
ہونی ہوگی، میں مان ہی نہیں سکتی۔“ سلویٰ کی بات
سے اتفاق تو حمہ اور نبیلہ بیگم کو بھی تھا۔

”ویسے امی! یہ بھی اچھا ہے جشید بھائی نے ماموں
کی زارا کا نام لیا ہے۔ اگر کسی ایسی کسی کو پسند کر بیٹھے
تو میں اور آپ بھلا کیا کر لیتے۔ ویسے بھی سر سر روزگار
اور خیر مختار ہیں۔“ حمہ کی بات سیدھی ان کے دل کو جا
گئی تھی۔ وہ ایسے ہی تو اس کی عقل مندی کی قائل
نہیں تھیں۔

”تو اب کیا کہتی ہو رشتہ ڈالوں زارا کے لیے؟“
”ایا میاں سے تو بات کر لیں، ورنہ ہمیشہ کی طرح
واویلہ چاچا میں گے کہ انہیں کسی قاتل نہیں جانتا۔“
”اے ہاں، ان سے بھی بات کر لیں گے۔“ نبیلہ
بیگم نے ناک پر سے کبھی اڑائی۔ ان کی سوچ کا پتہ
دور اڑان بھرتا جا رہا تھا۔



”باغیچے کی گھاس کتنی لمبی ہو گئی ہے۔ ساتھ والی
نگہت خالہ کے ہاں کو بلوا کر ترش والوں گی۔“ اپنے
ہرے بھرے باغیچے میں اگے کچھ پھول پودوں کو پانی
سے نہلاتے ہوئے اس نے فکر مند نگاہ گھاس پر ڈالی۔
جس پر پانی کی بوندیں میوٹیوں کی مانند چک رہی تھیں۔
یہ باغیچہ اس کے لیے جنت کے کسی کٹڑے سے کم



”میں وہ ابھی کر دیتی ہوں“ آپ کی چائے۔“
 ”بھڑ میں کئی چائے۔“ اس کے ہاتھ سے کپ
 لے کر مصطفیٰ نے اپنی زور سے سلیب پر چٹاکہ چائے
 چھلک کر اس کے پیروں پر آگری۔ درد کی شدت سے
 اس نے فوراً پاؤں پیچھے ہٹایا۔

”عجیب محبوبہ الحواس عورت ہے پڑی ہے میرے
 بات سنو۔“ اگر یہاں ہوش و حواس کے ساتھ رہنا
 ہے تو ٹھیک ورنہ چلتی پھرتی نظر آوے۔“ اس کے جھکے سر

کو انگلی سے بجاتا وہ سخت سے کتابا ہر نکل گیا۔

”کیا ہوا بیٹا؟ کیوں چلا رہا تھا مصطفیٰ؟“ منہ ذہ بیگم
 نے یقیناً ”من و عن سن لیا تھا“ لیکن وہ اس کے کندھے
 پر ہاتھ رکھے نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔ مومنہ کی
 آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”پاؤں دکھاؤ، زیادہ جلاتو نہیں؟“ کہتے ہوئے انہوں
 نے اسے پکڑ کر اسٹول پر بٹھایا اور برٹال لے کر اس
 کے پاؤں کے جلے حصے پر لگانے لگیں۔

مومنہ نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ ”آئی ایم
 سوری بیٹا۔“ منہ ذہ بیگم کا لہجہ شرمندگی لیے ہوئے
 تھا۔ ایسے بیٹے کی مال ہونے پر وہ واقعی شرمندہ تھیں۔
 ”غلطی میری ہے ائی! جب انہوں نے شرٹ
 استری کرنے کے لیے لہا تھا تو مجھے اسی وقت کر کے رکھ
 دینا چاہیے تھی۔“

”تم غلطی سے شرٹ اسی وقت استری کر کے رکھ
 دیتیں، لیکن وہ پھر بھی کسی نہ کسی بات کو ایڈیو بنا کر یہ
 ہنگامہ ضرور کھڑا کرنا۔ اس لیے خود کو قصور وار سمجھنا
 چھوڑ دو۔“

مومنہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے اس شفیق
 عورت کا چہرہ دیکھا۔ اگر اس کی اپنی مال حیات ہوتیں تو
 وہ یقیناً ”ایسی ہی ہوتیں۔“

”چھاپلو، جا کر اب آرام کرو، کھانا بنانے میں ابھی
 بہت وقت ہے، زارا بنائے گی۔“

باہر مشہود صاحب کے قدموں کی مخصوص چاپ
 ابھری تھی۔ دونوں سانس بہو ایک دم الٹ ہوئیں۔

نہیں تھا۔ اس کے پھول ہے، پودے، کلیوں سے
 اسے عشق تھا۔ اس کی بے کلی کو قرار اسی باغیچے میں
 اگر ملتا۔ کلی کلی منڈلاتا، بھورا نہ جانے کس سمت اڑ
 گیا تھا کہ اس کی نگاہوں میں سنہری تتلی آئی۔ سفید
 پھولوں کے سب پر رقص کرتی سنہری تتلی کو وہ محویت
 سے دیکھے گئی۔ اگلے لمحے اس کی سانس گویا رک سی
 گئی۔ اس نے بدقت تمام آنکھیں جھپکا کر سامنے کا
 منظر دیکھا۔ اس کا حلق تک خشک ہو گیا۔ اگلا لمحہ موت
 تھا۔ نہ جانے کب سے گھات لگائے بیٹھی چھپکلی نے
 سرعت سے سنہری رقص کرتی تتلی کو پکڑ کر اپنے حلق
 میں اتار لیا۔ مسکراتی رنگین زندگی محلوں میں مٹ گئی
 تھی۔ وہ ششدر رہی منہ پر ہاتھ رکھے وہاں سے اٹھ کر
 بھاگتی چلی گئی۔

مومنہ بھا بھی اسی وقت کچن سے نکلی تھیں۔ انہیں
 اچانک یاد آگیا تھا کہ مصطفیٰ نے انہیں وائٹ شرٹ
 استری کرنے کو کہا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ
 رہی تھیں کہ حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھے سسکیں
 دہائی اپنے کمرے کی طرف جاتی زارا کو دیکھا۔

”زارا! سنو تو کیا ہوا؟“ انہوں نے پریشانی سے اسے
 پکارا۔ لیکن وہ نکلتی چلی گئی۔

”سارے طاقت ور کمزوروں کے لیے اتنے ظالم
 کیوں ثابت ہوتے ہیں؟“ بیڈ پر گری وہ پھوٹ پھوٹ
 کر رو دی۔



”مومنہ!“ مصطفیٰ کی پکار دھاڑ سے مشابہ تھی۔
 کب میں چائے ڈالتی مومنہ کے ہاتھ کانپے۔ اس سے
 پہلے کہ وہ باہر لپکتی، مصطفیٰ خود ہی اس کے سر پر پہنچ
 گیا۔

”کہاں مرکب جاتی ہو۔ میں نے سفید شرٹ
 استری کرنے کے لیے کہا تھا، کی تم نے؟“

مومنہ کے اوسان خطا ہونے لگے۔ وہ شرٹ استری
 کرنے ہی تو جا رہی تھی، جب روٹی ہوئی زارا کو دیکھا تو
 اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔ اس نے خشک حلق ترکیا۔

”یہاں راز و نیاز کی کون سی کچھڑی پکائی جا رہی ہے؟ اتنا احساس نہیں ہے کہ گھر آئے شوہر کو چائے پانی کا ہی پوچھ لیا جائے۔“ کرخت لہجے میں بولتے وہ چن کے کھلے دروازے میں آن کھڑے ہوئے تھے۔
”میں وہ بس ابھی لا ہی رہی تھی۔“ منہ زدہ بیگم لگ گئیں۔

”مجھے تو چائے پانی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے؟“ طنزیہ نگاہیں یہاں وہاں دوڑائیں منہ زدہ بیگم کہہ نہ سکیں کہ ابھی تو آپ چن کے سامنے سے گزر کر اپنے کمرے تک بھی نہیں گئے، پھر چائے پانی کیسے آپ کی خدمت میں پیش کرتیں۔

”صاحب زادی کہاں ہیں آپ کی؟ اس سے کہو اس جھاڑ جھنکاڑ اور گھبروں، تیلیوں سے راز و نیاز کرنے سے فرصت مل جائے تو تھوڑا وقت گھرداری کو بھی دے دیا کرے۔ ورنہ وہ بھی ماں کی طرح پھوٹن کے مظاہرے کر کے کسی شریف النفس کا جینا اجیرن کرے گی۔“ قہر بھر نظری ان پر ڈالتے وہ باہر نکل گئے تو منہ زدہ بیگم کرسی پر ڈھسے ہی گئیں۔

”ہر بار سوچتی ہوں مشہود صاحب کو ایسا کوئی موقع نہیں دوں گی، لیکن پھر بھی چوک ہو جاتی ہے۔“
”چوک آپ سے نہیں ہوتی امی! اب خود ہی کوئی نہ کوئی ایسا موقع ڈھونڈ نکالتے ہیں۔“

چائے کا پانی پڑھاتے ہوئے مومنہ بولی۔ ان دونوں کا دکھ ایک سا تھا۔ ان کی بد قسمتی تھی وہ ایسے مردوں کے زیر دست آئی تھیں جو عورت کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت دینے کے قائل نہیں تھے۔
”آپ ان کے لیے چائے لے جائیں جب تک میں زار اُود کچھ آؤں۔“

نرے ان کے ہاتھ میں تمھارے مومنہ باہر نکلی۔ اپنے کمرے میں لفظ لفظ سنتی زار انے تنخی سے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا تھا۔



”میں سوچ رہی ہوں کل مشہود بھائی کے گھر جا کر

تمہارے اور زار کے رشتے کی بات کر آؤں۔“
نبیلہ بیگم کی بات سن کر جشید کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ”امی آپ دل سے تو راضی ہیں نا اس رشتے پر؟“ گو کہ اپنی خواہش سے دستبرداری بہت مشکل تھی، لیکن وہ ماں کی دل آزاری بھی نہیں چاہتا تھا۔

”ہاں بیٹا! میرے لیے تمہاری خوشی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔“ نبیلہ بیگم اپنے حد درجہ سعادت مند بیٹے کے دل میں کوئی گرہ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ اگر ان کے دل میں کوئی پھانس تھی بھی تو انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔ جشید کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔ باقی سب وہ خود اچھے سے سنھال لیتیں۔

”بائی داوے بھائی! آپ کو اس پتھر کی صورت میں ایسا کیا نظر آیا آخر؟“ چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سلوی نے شرارت سے پوچھا۔
”تمہیں کوئی اعتراض ہے تو تادو چھٹکی؟“

”ارے نا بابانہ، ہمیں دو بار کرنے والے دلوں کے بیچ ظالم سماج بن کر روڑے نہیں اٹکانے۔“ وہ ہنستے ہوئے ہاتھ اٹھا کر شرارت سے کہہ رہی تھی۔ لیکن جشید نے سنجیدگی سے ٹوک دیا۔

”سنو یہ پیار، محبت والا کوئی سین نہیں ہے غلط بات مت کرو۔“ اس کی سنجیدگی پر سلوی لمحہ بھر کو چپ سی رہ گئی۔

”ارے یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ اتنی بڑی خبر اور ایک میں بے چارہ ہی بے خبر۔“ ظفری تیزی سے سیڑھیاں اتر تالافون میں آیا تھا۔
”تو شروع ہو گئی اب اس کی نوٹسکی۔“ نبیلہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

”نوٹسکی کہاں کی امی حضور۔ اندر ابامیاں کی حالت بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بالا ہی بالا سارے معاملات طے کر لیے، ہم باپ، بیٹا کو کاتوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟“

”اے میاں میرا منہ مت کھلو آؤ۔ کہاں کے

آخر میں وہ تنہا بولی۔

غیر فوراً برامان گیا۔ ”تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ میری اماں سارے میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ دیں گی؟“

”ہاں، کچھ بعد نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے کہتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ جبکہ غیور کے تصور کے پردے پر چم سے زارا کا سر اٹایا۔ اپنا جشید لالہ اور وہ مصر کی حور، قسمت بھی کبھی کیسے کیسے جوڑ توڑ کر جاتی ہے۔ اس کے ماتھے پر غنائیں سی ابھرتی جا رہی تھیں۔



عرصے بعد زندگی دونوں بیٹیوں سمیت آمد منیوہ بیگم کو حیران کر گئی اور ان کی آمد کا مقصد جان کر تو انہوں نے بے ساختہ مومنہ کی طرف دیکھا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے، بہنوں کے لیے ایک اور کتاب

دستِ کدھر

فوزیہ یاسمین



قیمت - 750/- روپے

32735021

معاملات ایسے معاملات، ہم ان کے گھر رشتہ ڈال آئے، ادھر سے ہاں ہو گئی، خاندان بھر میں لٹوٹ گئے اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے اور تیرے ابا میاں کی توجا کر میں ابھی خبر لیتی ہوں۔ دھان پان سے ہیں اپنی صحت دیکھی نہیں اور لگتے ہیں بات بات پر غصے سے ہچکولے کھانے۔“

نبیلہ بیگم تو جلال میں آگئیں۔ ظفری سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔ سلوی نے ”لو اب بھگتو“ کا اشارہ کیا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ ارادہ چھت پر جا کر سوکے کپڑے اتارنے کا تھا۔ ادھر ریٹنگ سے ٹیک لگائے غیور شاید

اسی کا منتظر تھا۔ دونوں گھروں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ سلوی پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا ہوا۔ ”نکمی لڑکی کہاں گم تھیں اب تک کپڑے بے چارے تمہارے انتظار میں سوکھ سوکھ کر کاٹنا ہو گئے۔“

”کپڑے یا تم؟“ سلوی نے مسکراہٹ دی۔ ”میں یار۔“ اس کے بے چارگی سے کہنے پر وہ ہنس دی۔

”اچھا، سنو مجھے تمہارے گھر سے کسی غیر معمولی پر مطلب افزا تقریر کی خوشبو آ رہی ہے۔“ ”تو تمہیں کس نے کہا ہے ہمارے گھر کی خوشبو میں سوکھتے پھو۔“

”حد ادب، لڑکی میں تمہارا ہونے والا نصف بہتر ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم بنا کسی بحث کے مجھے بتا دو اصل معاملہ کیا ہے؟“

سلوی کو اس کی ماں کی طرح ٹوہ لینے والی عادت سخت پڑی لگتی تھی۔ ”کل ہم جشید بھائی کے لیے زارا کا ہاتھ مانگنے جا میں گے۔“

”کیا اس مصری شہزادی کا ہاتھ اور وہ بھی اپنے جشید بھائی کے لیے؟“ غیور ایک دم چونکا۔

”ہاں وہی، لیکن خدارا تم یہ بات ابھی پچھو کو مت بتانا، کیونکہ امی کافی الجھل اس بات کو صیغہ راز میں رکھنے کا ارادہ ہے۔“ کپڑوں کا گتہ سینے سے لگائے

”زارا کے لیے جشید کا رشتہ؟“



”کیا کہا آپ نے؟“ زارا بدمی۔

”تمہاری اور جشید کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔ تمہیں خوشی نہیں ہوئی سن کر؟“ مومنہ نے ایک دم خوف سے سفید پڑنا اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیسی ہی شادی جیسے ابا اور امی کی ہوئی تھی؟ جیسے آپ کی اور مصطفیٰ بھائی کی ہوئی؟“ اس نے وحشت زدہ سی آنکھیں اٹھا کر مومنہ کو دیکھا۔ خود ہم لہجے میں بول رہی تھی۔

”سب ایک جیسے ہوں یہ لازمی تو نہیں زارا۔ جشید بہت سلجھا ہوا ہے۔“ اس کے ہاتھ کی پشت نرمی سے سہلاتی وہ سمجھاتے ہوئے بول رہی تھی۔ زارا نے درشتی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”مجھے شادی نہیں کرنی، کسی سے بھی نہیں، کبھی نہیں۔“

”ایسا مت کہو زارا۔ مجھے ویسے ہی خدشہ ہے، کہیں ابا کسی بات کو جواز بنا کر اس رشتے سے انکار نہ کر دیں۔ جشید جیسے موقعت والوں کو ہی ملا کرتے ہیں۔“ مومنہ کو وہ جھوٹی بہن کی طرح عزیز تھی۔ محبت سے اس کا رخسار تپتی پانی وہ بہت نرمی سے اسے سمجھا رہی تھی۔

”خدا کے لیے بھابھی! چپ ہو جائیں۔“ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے چیخ اٹھی۔ ”امی سے جا کر کہہ دیں مجھے نہیں کرنی شادی، انکار کر دیں، چھو کو۔“

”وہ بہت مجبور ہیں زارا! انہیں مزید آنا نیش میں مبتلاؤ۔“ مومنہ کے لہجے میں بے بسی کی سحر آئی۔

”آپ امی میں ہم سب مجبور ہیں تو خدا کرے ابا خود ہی اس رشتے سے انکار کر دیں یا پھر۔“

مومنہ نے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور گلے سے لگا کر آہستہ آہستہ اس کی پشت تھکنے لگی۔ اس کا جسم کسی کنور شلخ کی مانند لرز رہا تھا۔

”شادی یعنی موت۔“

”میرا جشید لاکھوں میں ایک ہے۔ اس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں، لیکن زارا اپنی بچی ہے۔ دکھ سکھ میں ساتھ تو دے گی۔ غیروں کا کیا بھروسہ؟ کل کو میرے بیٹے کو قابو کر کے ہمیں ہی ہاتھ سے پکڑ کر باہر چلا کر دے۔ زارا اپنا خون ہے۔ کچھ تو احساس کر ہی لے گی ہمارا۔“ اس وقت لاؤنج میں صرف نیلہ بیگم کی آواز گونج رہی تھی۔

منہ ذہ بیگم اور مومنہ کی کیا مجال کوئی جواب دیتیں۔ سامنے ہی صوفے پر مشہود صاحب اور مصطفیٰ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے تھے۔ جو بھی بولنا تھا انہوں نے ہی بولنا تھا۔

یہ مشہود صاحب کی شخصیت کا رعب ہی تھا کہ سلوی اور حمہ بھی دم سادھے بیٹھی تھیں۔ انہیں ماموں کے گھر کا ماحول شروع سے ہی ناپسند تھا۔ عجیب گھٹا گھٹا سا۔

”بھائی صاحب ساتھ نہیں آئے؟“ مشہود نے بہنوئی کی بابت دریافت کیا۔

”ان کو دوسرے کے مرض نے کہیں آنے جانے کے قابل چھوڑا ہی کہاں ہے۔ کسی طرح آ بھی جاتے تو واپسی پر انہیں اسٹریچر بٹھائے ہمیں اسپتال کی دوزخی لگائی پڑتی۔“

مشہود صاحب نے ہنکارا بھرا۔ ”ٹھیک ہے کیا بیگم! جشید بھی اپنا ہی بچہ ہے۔ ہم چند روز میں سوچ کر آپ کو جواب دے دیں گے۔“ وہی رعوت بھرا بے نیاز لہجہ۔

”کیسی غیروں جیسی باتیں کرتے ہیں مشہود بھائی! بھلا انہوں میں کیسی سوچ بچار۔ ویسے آپ نے جو سوچنا ہے سوچ لیں جواب تو میں نے ہاں میں ہی لیتا ہے۔“

وہ بہنوں والے من سے بول رہی تھیں۔ گو کہ ایسا کوئی حق انہیں بھی دیا نہیں گیا تھا۔ بہن تھیں تو کیا ہوا، تھیں تو ایک عورت وہی پاؤں کی جوتی۔

اقبال احمد کا ہی بھانجا تھا۔ لیکن جب ثروت نے غیور کے لیے سلوی کا ہاتھ مانگا تو اقبال احمد جو رسمی سا سوچنے کے لیے وقت مانگنا چاہتے تھے، نبیلہ بیگم نے ٹھونک بجا کر اسی وقت رشتے کے لیے رضامندی دے دی۔ اقبال احمد اپنا سامنے لے کر رہ گئے۔

اور اب جمشید کی دفعہ بھی انہوں نے سارے معاملات بالذی بالا طے کر لیے۔ گو کہ اقبال احمد بیوی کی دھونس بھری طبیعت سے سمجھو تا کر چلے گئے، لیکن گھر میں تیسرے درجے کے شہری کا سلوک انہیں چراغ بیا کر جاتا۔

”کیوں سارے کے سارے میرے اوپر چڑھے آرہے ہو، مارو گے کیا مجھے؟ ہاں ماری ڈالو، خُش کم جہاں پاک۔“ وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ کھانسی کا پھندہ سالک گیا۔

”کیوں حلق پھاڑ رہے ہیں، پتا تو ہے اتنا سا چلانے سے بھی آپ کی ہڈیاں پسلیاں ایک برابر ہو جاتی ہیں۔ چلو بھی بچپو، باہر جا کر ہلا گلا کرو۔ یہاں تمہارے ابا میاں کا دم ٹھٹ رہا ہے۔“ نبیلہ بیگم نے سب کو باہر ہانکا اور خود ابا میاں پر گہری سخت نظر ڈالتی، زوردار ٹھلا سے دروازہ بند کر کے باہر آ گئیں۔ ابا میاں ایک بار پھر پیچ کو تائب کھا کر رہ گئے۔

ظفری لاؤنج میں ہی فل والیوم میں لگنے لگا کر بھلتے بچوں کو ساتھ لگائے ڈانس پر یکیش کرنے لگا۔

”اے لو، ذرا دیکھو، تمہارے تو اپنے بچے ہی کافی ہیں رونق لگانے کے لیے۔ میں تو کشتی ہوں خاندان برادری کو بلا کر زرا خون ہی جلاتا ہے اپنا۔“ نبیلہ بیگم نے ہنس کر حمہ کو دیکھا جو ان کا پاؤں دوچ کر کرے میں لے گئی۔

”فدہ ای! اوھر آئیں آہ۔“ اس کے تاثرات سے نبیلہ بیگم نے اندازہ لگایا، گوئی سیوس بات ہے۔ سلوی بھی بوہن آکر ٹک گئی۔

”یہ بلا گلا صرف تین دنوں کے لیے ہوتا ہے ای۔ پھر سب اپنی زندگی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہو گا، کچھ سوچا آپ نے؟“

اسے اپنی خوش قسمتی پر آج سے پہلے اتنا رشک کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے چاند کو چھونے کی تمنا کی تھی اور قسمت نے اسے اس کے پہلو میں لانے کی راہ ہموار کر دی تھی۔ ابھی ابھی تو نبیلہ بیگم اسے مڑھ سنا گئی تھیں۔ مشہور ماموں نے رشتے کے لیے رضامندی دے رہی تھی۔ اپنے آفس میں ریو الوٹک چیربر آٹکھیں موندے جھوٹا وہ پوری طرح اس خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے زارا کا سر ہلا آباد ہو گیا۔

وہ سنہری کانچ کی گڑیا جیسے کوئی پتھر کی مورت ہو۔ مسکراہٹ بھی راستہ بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر نہیں بھگی تھی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں اوداسی کا ایک جہاں سا آباد تھا۔ ایسا جہاں جس میں برپادی ہی تھی۔ جمشید کو وہ کسی مقدس راز کی طرح پاکیزہ لگتی تھی۔

”تم میرے دل کی اولین خوشی ہو زارا۔ جس دن تمہاری ان سنہری آنکھوں کے کانچ میں میری محبت کا عکس چمکے گا اس دن میری ذات کی تکمیل ہوگی۔ میں اپنی محبت سے تمہیں مسکراتا سکھا دوں گا اوداس لڑکی۔“ بند آنکھوں کے پار محبت کا جہاں سا آباد ہو رہا تھا۔

ابا میاں کے کمرے میں اس وقت سب نے اودھم مچا رکھا تھا۔ حمہ، اس کی بچیاں، سلوی، ظفری اور ہاٹ دار آواز میں بولتی نبیلہ بیگم۔ موضوع ٹھٹھو جمشید کی شادی ہی تھا۔ ابا میاں کا مزاج آج بھی سوانیزے پر ہی تھا۔ درحقیقت انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ اس سارے معاملے میں ان سے مشورہ تو درکنار رائے لینا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔

نبیلہ بیگم نے اس بار بھی اپنی سی کی۔ حمہ کا رشتہ ہی انہوں نے اپنی ایما پر طے کیا تھا۔ بقول ان کے اقبال احمد کو بھلا ایسی نزاکتوں کا کیا احساس۔ غیور گو کہ

”اے حمد! جھ سے یوں کھڑا کر بات کرتا تھا۔“
 ”پہلے ہی داغ پچی ہوا پڑا ہے میرا۔“
 حمد نے گہری سانس بھری۔ ”صاف اور سیدھی بات ہے امی، آپ کے گھر کا سارا انحصار حبشید بھائی کے بزنس پر ہے۔ اس کی پسند کی بیوی تو لارہ ہی ہیں، لیکن آپ شاید یہ بھول گئیں من پسند بیوی اکثر بہت بُری ہوتا ہے۔ حبشید بھائی کے دل پر تو زارا پہلے سے ہی چڑھی ہوئی ہے، کل کلاں کو اس نے انہیں ہمارے خلاف کوئی الٹی سیدھی پٹی پڑھا دی تو آپ تو ہاتھ ہی ملتی رہ جائیں گی۔“

حمد کا انداز ایسا تھا کہ نبیلہ بیگم شدید عدم تحفظ کا شکار ہونے لگیں۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کماؤ پوت بیٹا ہاتھ سے نکل گیا تو راجدھانی تو گئی ہی گئی۔ انہوں نے سخت پریشان نظروں سے حمد کو دیکھا جو مزید کہہ رہی تھی۔

”آپ نے حبشید بھائی کی مرضی پوری کر دی۔ اب آگے اس کی مت چلنے دیجئے گا۔ شروع دن سے ہی اس پر کنٹرول رکھیں گی تو سب کچھ آپ کے قابو میں ہی رہے گا۔“

”اے پر میں کروں گی کیا؟“
 ”او میری بھولی ماں! آپ زارا کو حبشید بھائی کے زیادہ قریب مت ہونے دیجئے گا۔ جتنا ان کے درمیان فاصلہ رہے گا، اتنا ہی آپ کا فائدہ ہے۔ کچھ سمجھیں میری بات؟“

”خاک سمجھی، میاں بیوی میں بھلا کیسا فاصلہ۔ دیکھ حمد مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“
 ”اچھا سسٹیں، میں آپ کو بتاتی ہوں۔“ نبیلہ بیگم ہمد تن گوش ہو گئیں۔



اس کا دل چاہ رہا تھا اپنے ہرے بھرے باغیچے کے سارے پھول توڑ کر نسل ڈالے، پتیاں نوچے اور گلیوں کو پیروں تلے روند ڈالے۔ ہوا ساکن تھی۔ وہ جاسن کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے بے آواز رو رہی

”تو اب میری یہ جنت بھی مجھ سے چھین جائے گی۔“ ایک ادھ کھائی جاسن اس کی گود میں آگری تھی۔ پتوں میں چھپی گھری نے ایک چور نظر اس کے جھکے سر پر ڈالی۔ اسے اداس اور ملول دیکھ کر امود کے پتوں میں چھپی بھوری چڑیوں نے دم سادھ لیا تھا۔ بچے سناکت، پھول سر نیسواڑے کھڑے تھے۔ تیلیوں نے اپنے خوشنما برسمیٹ لیے تھے۔ ان کی ہم دم، ان کی ہمزاد، ان کی شہزادی اداس تھی، تو وہ کیونکر خوش ہو پاتے؟

”زارا! اٹھو یہاں سے، تمہیں امی بلا رہی ہیں۔“
 مومنہ نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بنا کسی جھٹ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 منہذہ بیگم نے اس کا پریشان چہرہ اپنے ہاتھوں کے پالے میں قہم لیا۔ ”زارا کیوں کر رہی ہو ایسا میرے بچے؟“

وہ سسکنے لگی تھی۔ ”میرے ساتھ ایسا مت کریں امی پلیز۔“
 ”کیا تمہیں نہیں لگتا اللہ نے ہماری کسی نیکی کے عوض حبشید جیسا پروپونل بھیج دیا ہے۔ ورنہ اس خیال نے میری راتوں کی نیند چھین لی تھی کہ کیس کی روز تمہارے ابا اپنے ہی جیسے کسی بے حس کے کھونٹے سے تمہیں باندھ آئیں گے۔ تمہیں یہاں کون سا سکھ، کون سا مقام ملا ہے؟ خدا تمہیں نوازے جارہا ہے تو تم کیوں کفرانِ نعمت کی مرتکب ہونا چاہتی ہو؟“

اسے دیکھا ہے، جس کی قسمت نے اسے یہاں لا پٹھا ہے، مصطفیٰ! جب جب اس کے ساتھ ناروا سلوک کرتا ہے، تب تب میں اس سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہتی۔ تم نے مردوں کے روپ میں صرف باپ اور بھائی کی جارحیت دیکھی ہے، لیکن دنیا صرف ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔“ وہ دھیرے دھیرے اسے پرسکون کر رہی تھیں۔ وہ پرسکون نہیں ہوئی، لیکن اندر کا بیجان قدرے سدھم پڑ گیا۔

کمپنیوں، اہل امی ڈی، اہل سی ڈی کمپنیوں کے مالکان سے اس کے معاملے طے پانے لگے۔ برنس کی دنیا میں اس کی ایک پہچان سی بن گئی۔

گوکہ ابامیاں کی طبیعت سنبھل گئی تھی، لیکن نہ جانے کیسا خوف ان کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا کہ اگر وہ دکان پر جانا شروع کر دیں گے تو وہ کہیں پھر سے شو روم سے چھوٹی دکان میں نہ بدل جائے۔ جشید کی سعادت مندی نے انہیں بے فکر کر دیا تھا۔ حمہ کی شادی خوب دھوم دھام سے طے پا گئی۔ گھر میں بھی خاطر خواہ تبدیلیاں کی گئیں۔ ماربل کا چمکتا فرش، قیمتی قالین، پیڑ پر دے، نفیس گل دان، بہترین کراکری۔ وہ نئے نئے امیر ہوئے تھے، سو سب کے ٹھاٹھ دیکھنے لائق تھے۔

ظفر من موچی ٹاپ تھا۔ پڑھائی کے علاوہ دوست پارٹیاں، شغل میلے ہی اس کی زندگی کا حصہ تھے۔ نبیلہ بیگم کی خواہش تھی وہ بھی جشید کے ساتھ برنس میں ہاتھ بٹائے۔ دل کے اندر کہیں یہ خیال بھی تھا کہ ایک بیٹے کے کاروبار سنبھالنے سے یہ کیا بلیٹ ہوئی، دوسرا بھی ساتھ لگ جائے تو گویا بن بنے لگ جائے گا۔ لیکن ظفری ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا۔ جشید کا ہاتھ ان کے سر پر تھا، انہیں بھلا زمانے کے سرور گرم کی کیا فکر۔



”بہت خوب بھابھی بیگم! یہ کیا بات طے کرنے کے بعد غیوں کی طرح مٹھائی بھجوا دی۔ میری کون سی بیٹیوں کی لائن لگی کھڑی تھی۔ اک واک بیٹا ہے، وہ بھی آپ کی فرزندگی میں دے دیا، لیکن آپ نے تو سارے معاملات یوں طے کیے کہ ہمیں کالوں کلن خبر بھی نہیں ہونے دی۔“ ثروت پھپھو کو جسے یہ اطلاع ملی گرتی پڑی غیور کے ہمراہ پہنچ گئیں۔ گرتی پڑتی (محاورہ) ”اور نہ وہ گرنے پڑنے والوں میں سے نہیں تھیں۔“

”کیا کموں ثروت، بس سب کچھ اچانک ہی ہوا۔“

”اٹا! میرے اندر آب دونوں جتنا حوصلہ نہیں ہے۔ بالکل بھی نہیں۔“ وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔

”نمت سوچو ایسا، میرے بچے کچھ مت سوچو، سب اس پر چھوڑ دو۔ وہ ہے نا ہمارا انگلیبان، وہ سب سنبھال لے گا۔“

منجھہ بیگم نے دائیں بائیں بازو پھیلا کر دونوں کو اپنی بانسوں میں بھر لیا تھا۔



اس کا بچپن سے ایک ہی خواب تھا، خوب پڑھ لکھ کر کسی اچھی سی پوسٹ پر ملازمت کرنا۔ وہ بی ایس کی فائنل ایر میں تھا، جب ابامیاں کو ہارٹ انیک ہوا۔ گوکہ معمولی سا انیک تھا، لیکن دھان پان سے ابامیاں بالکل ڈھے گئے۔ ان کی الیکٹرونک کی چھوٹی سی دکان تھی۔ ان کا واحد ذریعہ معاش گھر کے تمام خرچے اسی الیکٹرونک کی دکان سے ہونے والی آمدنی سے چلتے۔

ابامیاں کی طبیعت اور گرمی صحت انہیں دکان پر جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ سلوی اور ظفر تم عمر تھے، ان کے کندھوں پر صرف پڑھائی کا بوجھ تھا۔ حمہ کی شادی کی عمر ہو چلی تھی۔ گھر کے اخراجات، ابامیاں کا علاج، ماں کا ششدر چروہ، جشید کے سامنے ڈھیر سارے سوا لہ نشان آکھڑے ہوئے تھے۔ اس نے سامنے کھلی ہوئی کتاب بند کر دی۔ اس کا پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ پوری رات سو نہیں سکتا۔

”تو اگر یہ قربانی میرے حصے میں آتی ہے تو یوں ہی سی۔“ اگلے روز اس نے ابامیاں کی دکان سنبھالنے کا پہلہ سب کو سنا دیا۔

ماں بہنوں کے چروں پر پھیلتا سکون اسے اندر تک سکون کر گیا۔ قسمت نے یاد دہی کی یا پھر خدا کو اس کی نصی بھا گئی، اس کے دکان سنبھالنے ہی کا روپار ترقی کرنے لگا۔ وہ چھوٹی سی دکان اس کی محنت اور لگن کے لب بوتے بڑے شوروم میں بدل گئی۔ مشہور موبائل

ورنہ تم تو اپنی ہو، تم سے بھلا کیسی پرورداری۔“ خلاف مزاج نبیلہ بیگم نے رسائیت سے جواب دیا۔

”اپنے پن کی بھی خوب کمی۔“ انہوں نے لمبا سا طنزیہ ہنکارا بھرا۔ پھر قدرے جھکتے ہوئے رازداری سے بولیں۔

”ویسے بھابھی آپ نے کبھی جشید کے لیے اپنی بھتیجی زارا کا خیال تو ظاہر نہیں کیا اور اب یوں آنا“ فانا“ سارے معاملات طے پا گئے۔ کہیں ان دونوں کی پسند و پسند کا کوئی چکر نہیں؟“

یہ سن کر نبیلہ بیگم کا ضبط جواب دے گیا۔ ”خدا جانے ثروت صاف اور سیدھی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ اپنی طرف سے پھندے ٹانگنے لگ جاتی ہو۔ کوئی ایسا ویسا چکر نہیں ہے، تم اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑا کر خواہ مخواہ خود کو ہلکان مت کیا کرو۔“

ایسے کرارے جواب پر ثروت پھپھو جی بھر کر بد مزہ ہوئیں۔ پھر پاس سے گزرتی سلوی کو آواز دی۔

”اے سلوی میری بچی! کوئی چائے پانی ہی پلا دو۔ ایک تم ہی تو ہو جس کی خاطر یہاں کا رخ کرتی ہوں۔ ورنہ کون یہاں ہمیں پوچھتا ہے۔“

”جی پھپھو بس ابھی ملائی۔“ چائے کے ساتھ اس نے اور بھی ڈھیر سارے لوازمات پھپھو کے سامنے چن دیے تھے۔ جن سے بھرپور انصاف کرتی پھپھو کی نظر اچانک اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جاتی حمہ پر پڑی تھی۔

”یہ حمہ کیا سارا وقت یہیں پر ہوتی ہے؟ اپنے سرال نہیں ملتی۔ میں تو جب بھی آؤں یہ اور اس کی بچیاں یہاں ہی ڈیرہ جلائے ملتی ہیں۔“ آخر میں بھرپور فتنہ پھپھو کے بے تکلف ٹھٹھے کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا۔

”کیوں نہیں جاتی اپنے سرال؟ یہ تو بھائی کی شادی کے دن نزدیک ہیں تو تیاری میں ہمارا ہاتھ بٹانے آئی ہوئی ہے۔ ورنہ میں اور سلوی اکیلی بھلا کیا کیا دیکھیں۔“

ماں اور پھپھو کی تکرار سے آکتا کر سلوی کچن میں

چلی آئی اور اس کے پیچھے اپنا چائے کا پلٹا اٹھا ئے غیور بھی۔

”چلو بھئی سلوی! اب تم ہی کچھ منہ سے پھوٹ دو، اصل چکر کیا ہے؟ اماں صبح کہتی ہیں مہمانی کبھی بھی اصل بات نہیں بتائیں گی۔“ خدا جانے وہ ماں کے کہنے پر ”کچی رپورٹ“ لینے آیا تھا یا ذاتی طور پر اس رشتے کے حوالے سے اس کے اپنے دل میں کھدبھدھی ہوئی تھی۔ جو بھی تھا سلوی کو خوب ناؤ آیا۔

”غیور! تمہیں نہیں لگتا، تم اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہو؟ جشید بھائی اور زارا کے رشتے طے ہونے میں ایسا کیا تعجب کہ تم لوگوں کی تفضلی ہی نہیں ہو پارہی۔“ سلوی نے ٹھیک ٹھاک دل کی بھڑاس نکالی۔ حقیقتاً ”اے غیور کی اس معاملے میں اس قدر دخل اندازی ناگوار گزری تھی۔

”تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو، مجھے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“ غیور نے فوراً ”پینتہ ابد لا۔“ میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر۔“ سینے پر ہاتھ رکھے سر کو خم کیے وہ یوں بولا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی سلوی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

”اچھا چلو لاؤنچ میں چلتے ہیں۔“ وہاں ثروت پھپھو اب جشید کو گھیرے بہت ٹھٹک کر کہہ رہی تھیں۔ ”بھئی دولہا کی اکلوتی پھپھو ہوں! میں تو شادی پر سونے کے کڑے لوں گی۔“

جشید — دھیمسا مسکراتے ہوئے سر ہٹا کر بیٹھا تھا اور پھپھو تھیں کہ پھیلتی ہی جا رہی تھیں۔ نبیلہ بیگم اور حمہ نے بے ساختہ دانت کچپچائے۔

پانی کا گلاس منہ سے لگائے ظفیری کو اچھو لگ گیا۔ ”کیا کہہ رہی ہیں پھپھو کڑے اور وہ بھی سونے کے؟“ ”کیوں کیا،“ جھنجھاکا اپنی خوشی سے اکلوتی پھپھو کی ”اتنی“ سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتا۔ ماشاء اللہ لاکھوں کمار ہا ہے۔“

”دیکھ لیں پھپھو، پھر تو غیور کی شادی پر آپ کو اگلی امی کو سونے کے کڑے پہنانے پڑیں گے، پھر وہ

”جسم لگ رہے ہیں نادونوں؟“ نہ جانے کب سلوی اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔
وہ چونک گیا۔ ”ہاں، بہت۔“ ٹھنڈی سانس سینے میں اتاری اور وہاں سے ہٹ گیا۔

سلوی کندھے اچکا کر اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں دودھ پلائی کی رسم کے لیے کزنز مومنہ کو آگے کر رہی تھیں۔ کاہدار سوٹ میں جی سنوری مومنہ نے متوحش نظریں چار اطراف دوڑائیں۔ مصطفیٰ کہیں بر مصوف تھا، لیکن مومنہ کو اس کی نگاہیں خود برجی شخصوں ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں تسکنتی جھجک رہی تھی۔

”کم آن بھابھی! گھبرا کیوں رہی ہیں؟ ایسے موقع بار بار تھوڑی ملتے ہیں۔ ہمارے دولہا بھائی خاصی بھاری بھر کم اسای ہیں، ہم ایسے ہی تو نہیں چھوڑیں گے ان کو۔“

کسی شرارتی سی کزن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھنے والا سنجیدہ سا جشید اس وقت پھیر چھاڑ کر انجوائے کر رہا تھا۔ مومنہ نے کزنز سے ہاتھوں سے دودھ کے گلاس والی رے آگے کی۔

”ہاں بھی نندی قوم! کتنے لے کر ٹوگی؟“ ظفیری بھی میدان میں کود آیا تھا۔
”نندی قوم؟“ لڑکیوں نے خوب برا مانا۔ ظفیری نے شانے اچکائے۔

”پچاس ہزار۔“ ستارہ نے کہنے کے ساتھ ہی مومنہ کی ہتھیلی پکڑ کر آگے کر دی۔
”یہ منہ اور مسور کی وال۔“

”میر متعلقہ افراد اپنی حدود میں رہیں، ہم اپنے دولہا بھائی سے مخاطب ہیں۔“

اس سے پہلے کہ ظفیری کوئی کرار اس جواب دیتا، جشید نے مسکراتے ہوئے پچاس سے بھی کچھ اوپر ہزار ہزار کے کئی نوٹ مومنہ کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ جہاں لڑکیوں نے ہر کانٹو بلند کیا۔ وہیں حمہ بے ہوش ہونے والی ہو گئی۔

صاحب برابر۔ کیونکہ خیر سے آپ کا کلوتا بیٹا ہے اور اپنی خوشی میں ”اکلوتی مملی“ کی ”تی“ سی خواہش تو وہ بھی پوری کر دے گا۔“

اب اچھوٹنے کی باری پھپھو کی تھی۔ نبیلہ بیگم کلابی پی ایک سو کنٹرول میں آنے لگا۔

جشید کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر پھپھو اپنی بات منوا کر ہی اٹھیں، لیکن اب ان کے لیے اکیلا ظفیری ہی کافی تھا۔

☆☆☆

نبیلہ بیگم نے سوچا تو یہ ہی تھا کہ بچت کے سنہری اصولوں پر عمل کرتے ساری تیاری اوسط درجے کی ہی کریں گی، لیکن جس طرح جشید نے بری وغیرہ کی تیاری کے لیے دل کھول کر پیسہ ان کے ہاتھ میں رکھا تھا، انہیں حمہ کے خدشات بجا لگنے لگے تھے۔

”دیکھ لیں امی! ابھی سے آپ کے صاحب زادے کا یہ حال ہے۔ اب آگے سب کچھ آپ ہی نے سنبھالنا ہے۔ آنے والی یقیناً“ آپ کی بیٹی ہے، لیکن وہ جشید بھائی کی بیوی ہے اور وہ بھی من پسند یہ بات مت بھولیے گا۔“

حمہ برابر اس کی برین واشنگ کیے جاتی۔ جبکہ سلوی بے نیاز سی اپنی تیاریوں میں مگن رہی۔

شادی کی مخصوص رونق اتر آئی تھی۔ لہراتے رنگین آچھل، کھٹکتی چوڑیاں، بے فکر قہقہے، شرمیلی مسکراہٹیں، دبی سرگوشیاں، غرض ہر کوئی مشغول، ہر کوئی مگن۔ ایسے میں ایک غیور تھا جس کے دل میں ایک سو کنٹرول کا بھابھ بھڑ بھڑا رہا تھا۔

اس کی نگاہیں اسٹیج پر جشید کے پہلو میں بیٹھی زارا پر جم سی گئیں۔ جیسے کسی نے سنہری مجسمہ تراش کر اس کے پہلو میں بٹھا دیا ہو۔ ”اتنے عام سے جشید کی ایسی قسمت۔ عام سے نقوش ہندی رنگت، اونچے۔ اتد کا جشید آج بہت خاص بن گیا تھا۔ اس کے ہرے پر پھیلے مسرت کے رنگ اس کی اندرونی خوشی کے غماز تھے۔“

چل رہا تھا۔

جشید بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ رہا تھا۔ غیر محسوس انداز میں ہاتھ سے لنگا سمیٹتی وہ قدرے پیچھے ہٹ کر جشید کے لبوں پر زیر لب مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”تم کھانا کھاؤ“ جشید نے دیکھ کر اس کے ایک ایک انگلیں کو دیکھ کر کہا۔ اسے لگا اگر وہ ساری رات بھی اس طرح بنا پلک جھپکے اسے دیکھتا رہے تو پوری رات کھائے گی، لیکن آنکھیں سیر نہیں ہوں گی۔ اپنے اس خیال پر اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

”جانتی ہو زارا مجھے ہمیشہ وہ نہیں ملا جو میں نے چاہا۔ اگر ملا بھی تو بہت تردد کے بعد، لیکن تمہاری دلہ قسمت نے ایسی یاد دہانی کی کہ ابھی تک میں بے یقین سا ہوں۔ جس کو چاہا اس کو اتنی آسانی سے پا بھی لیا۔ گو کہ اپنے جذباتوں کی صداقت پر مجھے پورا یقین تھا، لیکن ماموں جان کا مزاج مجھے کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا ہونے سے روکتا تھا، لیکن اس بار قسمت واقعی مجھ پر مہربان رہی۔“

زارا اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔ کمرہ گلاب کے تازہ پھولوں سے مکھڑا تھا۔ بیڈ پر بھی پیتاں بکھری ہوئی تھیں۔

”یہ تمہاری رونمائی۔“ جشید نے خوب صورت سا تمثیلی کیس کھول کر اس کے سامنے کیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا سر دھاتی ہاتھ تھام لیا۔ زارا کو جیسے گرنٹ نے چھو لیا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی نرم گرفت سے چھڑایا۔ جشید بھونچکا ہوا نظر آیا۔

”میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔“ کیس اس کے ہاتھ سے لے کر بند کر کے اس نے بیڈ پر ڈال دیا۔ ننھے منے ڈائمنڈ سے جگمگا تا گولڈ کے نفیس برسلیٹ کو اس نے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ جسے کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد خریدا پایا تھا۔

”تم محبت پر یقین نہیں رکھتیں؟“

زارا کے سرخ لٹاؤ دار ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ آئی تھی۔ کیا مسکراہٹ ایسی بھی ہو سکتی ہے جان لیوا؟

مومنہ نے جلدی سے ہاتھ پیچے لیا۔ اس نے دور سے ہی سفید کٹن کے شلوار قمیص میں لمبوس مصطفیٰ کو اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ مومنہ نے گھبراہٹ کے مارے پیسے ستارہ کے ہاتھ میں تھمائے۔

”یہ بعد میں سب آپس میں بانٹ لیتا۔“ اس نے سارے رشتہ میں منظر سے گویا کٹ کر ساکت بیٹھی زارا پر نظر ڈالی۔ اسی وقت زارا نے بھی نگاہ اٹھا کر اس انداز سے دیکھا کہ مومنہ بے ساختہ آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ پر بوسا لیتے زیر لب کہا۔ ”خدا تمہاری ان آنکھوں کی لاج رکھے۔“ اور غم پلکیں جھپکاتی اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔

☆☆☆

”غصہ کرنا مرد کی شان ہے، چاہے وہ بے غصہ چیخ چلا کر اتارے ہاتھ اٹھا کر برتن توڑ کر یا پھر کسی کا دل اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ میرا گھر ہے، یہاں پتا بھی ہوتا ہے تو صرف میری مرضی سے۔“ رعونت بھری آواز دیواروں سے ٹکرا کر سارے گھر میں سالوں تک گونجتی رہی تھی۔ کچھ اس طرح کہ اس گھر کی عورتوں کی سماعتوں میں یہ آواز گویا بس سی گئی۔

”شوہر کو کیسے خوش رکھنا ہے، یہ تم جیسی جاہل عورت کبھی نہیں جان سکتی۔“ باپ کے پر تو مصطفیٰ مشہور نے چائے کا کپ سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔ ”مجھے زبان دراز عورتیں سخت ناپسند ہیں اپنی اوقات میں رہنا سیکھو۔“

کوئی بہت بے دردی سے کسی کی عزت نفس کو روند رہا تھا۔ اس کی شخصیت کے اعتماد کو پیروں تلے مسل رہا تھا اس کی ذات کے غور کو توڑ کر اپنی نام نہاد مردانگی کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔

”دیکھنا اور سننا اس قدر اذیت ناک تھا تو پھر سننا؟“

زارا کو لگا وہ کسی صلیب پر شکنجی ہے۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ آوازوں کا شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہسٹریائی ہو کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے چیخ اٹھتی وہ چوکی۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند

کے آرام سے سو سکتی ہو۔ میرے دعوے کو اپنی امانت سمجھو۔ اور میں امانت میں خیانت کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ کہہ کر وہ ٹیس پر چلا گیا۔



”کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہو؟“ سلویٰ نے حمہ کا پر سوچ چہرہ دیکھا۔

دونوں اس وقت ایک ہی تکیے پر سر رکھے کارپٹ پر لیٹی تھیں، قرب ہی ثروت پھوپھی منہ پر دوپٹا ڈالنے اللہ جانے سوری تھیں یا پھر سونے کی اداکاری کر رہی تھیں۔ ظفری صوفے پر آڑھا ترچھا لیٹا موبائل پر بزی تھا۔

”تم نے دیکھا سلویٰ! دودھ پلائی کے وقت جمشید بھائی نے کیسے اتنے ڈھیر سارے میے نکال کر ان لوگوں کو دے دیے۔“ حمہ کی سوئی ابھی تک وہیں انکی ہوئی تھی۔

”ہاں، ہمیں بھی تو انہوں نے شاپنگ کے لیے ایسے ہزاروں پکڑائے تھے۔“

”ہم ہمیں ہیں، ہمارا حق بنتا تھا۔“ حمہ کی آواز ایک دم اونچی ہوئی تھی۔

سلویٰ نے فوراً اسے ٹھوکا مارا۔ اور پھپھو کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں پھر سے سرگوشیوں میں بات کرنے لگی تھیں۔ بظاہر نیند میں گم پھپھو کے کان دونوں بہنوں کی ”کھسر پھسر“ پر ہی لگے ہوئے تھے۔

”کم بخت اشاروں میں باتیں کرنے لگی ہیں۔“ بد مزہ سا ہو کر ان کے خیال کی رونے پلٹا کھایا۔ جس طرح جمشید نے اپنی شادی پر کھلا خرچا کیا تھا یقیناً لاڈلی بہن کی شادی پر بھی ایسے پالی کی طرح ہی پیسہ بہائے گا۔

ظفری کے بچے کی وجہ سے کڑوں کی خواہش تو نا آسودہ رہ گئی۔ لیکن غیور اور سلویٰ کی شادی پر وہ بہت کچھ آسانی سے نکلوا لیں گی۔ انہیں غیور کا سلویٰ کے ساتھ رشتہ طے کرنے کا اپنا فیصلہ بالکل درست لگا۔

”مردوں کے منہ سے محبت کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ وہ اہل کی ”میم“ سے واقف نہیں ہوتے انہیں ایسے دھمکے نہیں کرنے چاہئیں۔“

”تو تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔“ جمشید نے گہری ماحس اے اندر اتاری۔

”میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی۔“

”اور اگر میں کہوں میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں دارا۔ بے تحاشا محبت۔“ آنکھوں میں محبت کے دیپ چلائے وہ سرپا سوال بن گیا تھا۔ زارا نے نگاہیں پھریں۔

”یہ قربت کی چاہ ہے جسے آپ محبت کا نام دے رہے ہیں۔“ وہ اس کے پہلو سے اٹھ کر بیڈ سے نیچے اتر آئی تھی۔ چوڑیوں کی جلت رنگ سی بج اٹھی۔ جمشید اس کے مقابل آنکھڑا ہوا۔ زارا کو اس کی سانسیوں کی فہم اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

”تم میری محبت کی تو بین کر رہی ہو۔“

”تو کیا نہیں ہے آپ کو میری قرب کی طلب؟“

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اس کے سامنے کسی امتحان کی طرح آنکھڑی ہوئی تھی۔ جمشید کا دل ہارنے لگا۔

”اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو تمہاری یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو جائے گی کیونکہ قرب کی طلب بھی وہاں جاتی ہے جہاں محبت ہو۔ لیکن مجھے تم سے جسم کا نہیں روح کا تعلق قائم کرنا ہے۔ جب تک تمہارے دل میں میری محبت میرے قرب کی طلب نہیں جاگے گی میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”اور یہ دعو اکب تک برقرار رہے گا؟“ وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”جس دن تم خودیہ بر سلیٹ پہن کر میری محبت کا اعتراف کرو گی۔“ وہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اس کا ہوش رہا حسن اسے کمزور کر رہا تھا۔ لیکن اسے اپنے جذبات کو بے مول نہیں کرنا تھا۔ اس کے بٹنے ہی دارا نے سانس بحال کی۔

ہونے کے باوجود ان لوگوں میں کمزروالی ہے نکلی نہیں تھی۔

ایک تو زارا کی کم گوئی اور دوسرا مشہور ماموں کے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ وہ لوگ ان کے گھر زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ لیکن اب رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی۔ سلوی نے اس کی طرف دوستانہ مسکراہٹ اچھالی اور اٹھ کر الماری سے اس کے لیے تیز آتش کلر کا بھاری کلدار سوٹ نکالا۔ ساتھ میں میک اپ کا سامان، میچنگ جوتیاں، جیولری وغیرہ، لیکن سدا کی ساوگی پسند زارا ان لوازمات کو دیکھ کر بدک ہی تو اٹھی۔ پھر سلوی کے لاکھ ٹوکنے کے باوجود اس نے آسمانی رنگ کا نسبنا، بلکے کلام والا شیفون کا سوٹ پہن لیا۔

سنہری غم بالوں کو سلجھا کر پشت پر ڈالا اور دو شاؤ ولول کندھوں پر پھیلا لیا۔ سلوی حق دق رہ گئی۔ مانتا کر اس کی خوب صورتی کسی مصنوعی بناؤ سنگھار کی محتاج نہیں تھی۔ لیکن اس نے تو اپنا اسٹک تنک لگا لے سے انکار کر دیا تھا۔ رسم دنیا، موقع، دستور بھی آخر کو چڑیا کا نام ہے۔ سلوی نے بمشکل خود کو کنے سے روک کر پھر سر جھٹک کر سارا سلیمان دوبارہ اندر رکھتے ہوئے بولی۔

”بانی داوے! آپ کو بھائی نے منہ دکھائی میں کہہ دیا؟“ زارا نے دروازہ کھول کر برسلیٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”داؤ! اتنا پیارا ہے۔ لیکن آپ نے پہنا کیوں نہیں؟“ گولڈ کا برسلیٹ جگر جگر چمک رہا تھا۔ زارا نے نگاہ چرائی۔ ”بعد میں پہن لوں گی۔“ غم محسوس انداز میں کہیں اس کے ہاتھ سے لے کر دروازے میں ڈال دیا۔

”عجیب الٹی مخلوق ہیں۔“ سلوی سر جھٹکتے ہوئے اس کو لیے بیڑھیان اترنے لگی۔

وہ نبیلہ بیگم اور حمہ کی ہدایت پر ہی اس کی تامل میں مدد کے لیے اوپر بیجی گئی تھی، لیکن اب زارا کی ”ستاری“ پر نظر پڑتے ہی دونوں نے ایک ساتھ سلاطین کو گھورا۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔ ناشتے

”ہائے پھپھو پر چھپکی کر گئی۔“ ظفیری نے بہت اچانک کچھ یوں کہا کہ پھپھو بدک کر اٹھ بیٹھیں۔ نیند کا ڈرانا، خراٹے سب ہوا ہو گئے۔

”کہاں؟ کہاں ہے چھپکی؟“ کھرے ہو کر کپڑے جھاڑتی، وہ باقاعدہ تانیٹے لگی تھیں۔

ظفیری کا زوردار فتنہ بلند ہوا۔ سلوی اور حمہ کے چروں پر بھی دبی دبی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھپھو کھسانی سی ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ظفیری کے لئے لیتیں اسی وقت نبیلہ بیگم چلی آئیں۔

”ارے بھی لڑکیوں! ابھی تک پڑی اینٹھ رہی ہو۔ وہ جیلہ اور اس کی ماں اکیلی ہی بچن میں لگی ہیں۔ جاؤ جا کر ناشتے کا انتظام دیکھو۔“



اس کے کمرے کی دو کھڑکیاں باغیچے کی طرف نکلتی تھیں۔ چڑیوں کی چکار اور انواع و اقسام کے پھولوں کی مہک سے جو بوجھل ہوا کے جھوٹے اس کے لیے صبح کی آمد کا پیغام لاتے لیکن اب منظر بدل گیا تھا۔ باسی پھولوں کی مہک اس کے خوابیدہ احساسات سے ٹکرانی تھی۔ وہ خالی لڈ بن کی کیفیت میں یوں ہی چند ٹانگیے لیٹی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ نظر سامنے ڈیرنگ ٹیبل کے آئینے میں ابھرتے اپنے عکس پر جا کر کی تھی۔

سنہری ابھی لٹیں، پھیلا کا جل، منامٹا میک اپ، ناک میں چمکتی لونگ آئینے میں جھللاتا عکس اسے گزری رات کی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے حنا کی مہک پھوٹ رہی تھی۔ تو وہ رات اگر گزر بھی گئی جس کے بارے میں اسے لگتا تھا وہ کانٹوں پر بسر کرے گی۔ لیکن سب کچھ اس کی توقع کے برخلاف ہوا تھا۔

یہ جشد کے بخشے اٹھو کا ہی اعجاز تھا کہ وہ یوں بے خبر ہو کر سوئی۔ لیکن وہ خود کہاں تھا؟ مختلف سوچوں کے بحور میں ڈوبتی ابھرتی وہ دواش روم میں بند ہو گئی۔ شاور لینے سے طبیعت پر چھایا سارا بوجھل بن دور ہو گیا تھا۔ وہ باہر نکلی تو سلوی بیڈ پر اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ ہم عمر

زارا کا تنفس تیز تر ہو گیا۔ ”کسے؟“
 ”ہاں۔۔۔ وہ بس اس دن غلطی سے واش روم
 میں۔۔۔“

”کیسی ہی غلطی سے جیسے پہلے بھی آپ بہت بار
 کبھی واش روم میں پھسل کر گر جایا کرتیں، تو کبھی
 سیڑھیوں سے؟“ زارا نے غبی سے اس کی بات کاٹی۔
 مومنہ کی پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔ زارا کو ایک دم
 اس پر ڈھیر سارا ترس آیا۔

”کب تک یوں پردے والی رہیں گی ان کے
 گناہوں پر؟ اس بار کیوں ہاتھ اٹھایا انہوں نے؟“
 ”تمہاری شادی والے روز اسٹیج پر انہوں نے مجھے
 دیکھ لیا تھا۔“

”تو کیا کر رہی تھیں آپ؟ محض ہم عمر لڑکیوں کے
 ساتھ تھوڑا سا ہنسی مذاق اور بس؟“

”یہ تو تم سمجھتی ہو؟ انہیں لگا تھا میں سب کے بیچ ان
 کی آنکھوں میں دھول جھونکتی بے حیائی سے
 کچھ بے اڑا رہی تھی۔“ مومنہ کی آنکھیں برسنے
 لگی تھیں۔ زارا کے دل پر ڈھیر سارا بوجھ آن گرا۔

اس کا دل اداس ہو رہا تھا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے
 بھی اس نے جشید کو اوی کے ہاں چھوڑنے کے لیے
 کہا۔ جشید نے بنا کسی تاثر کے اُس جاتے ہوئے
 اسے یہاں ڈراپ کر دیا تھا۔ لیکن یہاں آکر اس کے
 دل کا بوجھ مزید بڑھ گیا۔

”یہ سب چھوڑو زارا، تم یہ بتاؤ، تم خوش تو ہونا؟“
 مومنہ کے دل کا بوجھ بٹ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت
 سے کیلے رخسار صاف کر ڈالے۔

”ہنا نہیں۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔
 ”خوشی کو محسوس کرو؟ یہ تمہیں اپنے وجود کا احساس
 دلائے گی۔“

”یاد ہے، ایک بار آپ نے ہی کہا تھا خوشی خوشبو کی
 طرح ہوتی ہے۔ جسے سات پردوں میں بھی چھپاؤ، پھر
 بھی اپنا آپ عیاں کر دیتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن مجھے تمہارے وجود سے وہ محسوس
 پھوٹی محسوس کیوں نہیں ہو رہی زارا؟“ محبت بھرا لہجہ

اگر اور انصاف کرتی ثروت پھپھو نے مارے استعجاب
 کے ناک پر انگلی دھر لی۔ ان کی زبان کون روک سکتا
 تھا؟

”لو کوئی کہے گا کہ یہ نئی نوبلی دلہن ہے نہ
 مرغی پاؤ ڈر نہ کہنے، اے دلہن! شروع کے دن میں تو
 لوگوں کے بناؤ سنگھار کے چاؤ ہی پورے ہونے میں
 نہیں آتے۔ ایک تم ہونے سجنے کا شوق نہ سنورنے کا
 اہل۔ ہمارے وقتوں میں تو جب تک پہلا بچہ گود میں
 نہیں آجاتا تھا، تب تک نئی دلہنوں والے سنگھار ماند ہی
 نہ پڑتے۔“ زارا کے کان کی لوہیں تک سرخ پڑ گئیں۔
 بالکل سامنے ہی سفید شلوار قمیص میں ہاں سیلتے
 سے جمائے، آستینیں موڑے اخبار پنی کرتے جشید
 نے ایک بھر پور نگاہ اس کے سر اپنے پر ڈالی تھی۔

حمد نے بے اختیار پہلو بدلا۔ ”آخر یہ پھپھو اپنے
 گھر چلی کیوں نہیں جاتیں۔ ڈیرہ ہی جمایا انہوں نے
 نہ۔“

جشید اٹھ کر چلا گیا تھا۔ پھپھو ابھی بھی کچھ بول
 رہی تھیں۔ زارا کو اپنے چہرے پر عجیب سی چھین کا
 احساس ہوا۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔ جشید کی چھوٹی
 ٹکڑ پر غیور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ نگاہ ملنے پر
 سکرارتے ہوئے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔
 ہاسرار مسکرا ہٹ چھپ گئی تھی، لیکن آنکھیں؟

آنکھیں ایسی بھی ہوتی ہیں؟ بے باک اندر تک
 لڑی، گراہیت آمیز عورت کے اندر اللہ نے یہ حس
 رکھی ہے وہ مرد کی اپنی طرف اٹھنے والی نگاہ پہچان جانی
 ہے۔

اور اس ”نگاہ“ میں خیر نہیں تھی۔ زارا کو اہاندام
 لٹکتا محسوس ہوا۔

☆ ☆ ☆

”یہ کیا ہوا؟“ مومنہ کے ماتھے پر پڑا نیل دیکھ کر وہ
 لگ گئی۔

مومنہ نے بے ساختہ نگاہ چرائی۔ ”چوٹ لگ گئی
 ل۔“

ترس رہے ہیں۔ اگر تم تھوڑی سی عنایت ان پر کرو وہ بھی کھل کر جھوم اٹھیں گے۔“ دونوں بانو نے ہر باندھے وہ اس کے اداس سراپے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

جوتے سے زمین کھرچتی زار نے گہری سانس اٹھا اندر اتاری اور بنا کوئی جواب دیے پلٹی۔ وہ بھی اس کی معیت میں اندر آگیا۔ مشہود صاحب اور مصطفیٰ زمینوں کے کام کے سلسلے میں رقبہ پر مصروف تھے۔ منہزہ بیگم ان کی عدم موجودگی کی توجیہ بیان کرتے ایک ایک چیز محبت سے اس کے آگے پیش کر رہی تھیں۔

”مگر تم لوگ تھوڑا سا اور رک جاتے تو ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ وہ لوگ بس آنے ہی والے ہوں گے۔“

بمشکل کھانا ختم کر کے زارا جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جمشید نے خوش گواری حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے لگا شاید وہ رات یہاں رکنے کا ارادہ ظاہر کرے گی۔ لیکن اب جانے کے لیے کھڑا ہوتا دیکھا کہ اس نے گہری اطمینان بھری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔ گوکہ ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے وہ اس سے صدیوں کے فاصلے پر تھی۔ لیکن جمشید کے لیے اس کی اپنے آس پاس موجودگی ہی باعث طمانیت تھی۔

زارا باپ اور بھائی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنا بھرم ٹوٹنے کا خوف نہیں تھا، لیکن وہ باپ اور بھائی کی جارحانہ فطرت سے واقف تھی۔ وہ ماں اور مومنہ کا بھرم نہیں ٹوٹنے دینا چاہتی تھی۔



ایک بے حد تھکا دینے والے دن کا اختتام ہوا تھا۔ جمشید ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرنا لاؤنج میں صوفے پر ڈھے سا گیا۔ نیچے کارپٹ پر سلوکی کٹن کا ڈھیر لگائے ان پر کرا چڑھا رہی تھی۔ جبکہ نبیلہ بیگم کی تمام توجیہ اس وقت ہیوی پر چلتے اپنے پسندیدہ ڈرامے کی طرف تھی۔

تاسف لیے ہوئے تھا۔
”میں زندگی میں خوش فہمیوں کو جگہ نہیں دیتا چاہتی۔“ وہ اٹھ کر کھلی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اسے لگا مومنہ اس کی آنکھیں سے اندر کا سارا بھید پالیں گی۔

”خوش فہمی نہ سہی، تلوانیوں کو بھی جگہ مت دو، ورنہ بدگلیاں جنم لیں گی۔“
زارا پلٹی، لیکن منہزہ بیگم کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر بات لیوں میں دیالی۔
”جمشید کھانا بیس کھائے گا نا؟“

”ہاں نہیں امی!“ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

”بری بات بنیا! تمہیں اس سے کہنا چاہیے تھا جب شام کو وہ تمہیں لینے آئے کھانا بیس کھائے۔“
”امی جو پکا ہو گا وہی پیش کر دیجئے گا۔ خواہ مخواہ کسی کو سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مومنہ کے ماتھے پر زانبل اس کی نچی برہا رہا تھا۔
”کسی کو عزت دینے سے ہماری عزت میں کمی واقع نہیں ہو جاتی۔“
”لیکن اکثر لوگ اس عزت افزائی کے قابل نہیں ہوتے امی۔“

”خدا کرے جمشید کا شمار ایسے لوگوں میں نہ ہو۔“
زارا کے لیوں پر بے بس مسکراہٹ دور آئی تھی۔ وہ ماں کی طرح خوش امید نہیں تھی۔

منہزہ بیگم مومنہ کو شام کے کھانے کی ہدایت دینے لگی تھیں۔ زارا آہستہ سے اٹھ کر باغیچے میں آگئی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی پھول، پتے چڑیاں، اچھلتی گھبریاں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ شاید وہ خود بدل گئی تھی۔ اسے یہ گھر، دو دیوار، اپنا باغیچہ سب ایک دم اجنبی سا لگنے لگا تھا۔

”چھا تو تم ان سب کو مس کر رہی تھیں؟“ جمشید کے کلوں کی مہک پھولوں کی باس پر حاوی ہونے لگی تھی۔ ”سنو اس سے دگنا بڑا لان وہاں بھی ہے جہاں کے پھول، پودے کسی کی نظر التفات کو برسوں سے

جب نادیا کی قدرے ہچکچائی آواز ابھری۔
 ”سنو سلوی! تم سے ایک بات کہنی تھی۔“
 ”یہاں کہو۔“ سلوی تسلی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

”یار تم ہانڈ منت کرنا۔ بات دراصل یہ ہے کہ کل شام میں ہم لوگ وائیل بھائی کے ساتھ باہر فٹز کرنے گئے تو وہاں ریٹسٹورنٹ میں، میں نے تمہارے کزن غیور کو دیکھا۔ وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ تھلہ لڑکی اس کے ساتھ بہت فرینک ہو رہی تھی یا شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ بہت فرینک تھے۔“

سلوی ایک دم چپ سی ہو گئی۔ مگر کمزور دفاعی لہجے میں بولی۔ ”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی نادیا۔“

”نہیں آں یار! میں نے تمہارا وہ کزن دیکھ رکھا ہے، بلکہ تمہارے حوالے سے تو خاصی اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ میں اسی اوپین میں تھی کہ تمہیں بتاؤں نہ بتاؤں، لیکن پھر سوچا شاید تم سے یہ بات چھپا کر میں تم سے کوئی زیادتی نہ کر بیٹھوں۔ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی، وہ سو فیصد وہی تھا۔“

اس کے اس قدر پر اعتماد انداز پر سلوی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

نادیا تاسف زدہ لہجے میں بولی۔ ”آئی ایم سوری یار۔“

”اٹس اوکے نادیا! تمہیں کس اینڈ اللہ حافظ۔“
 اس کے علاوہ اور کیا کہتی۔



اگلے روز ہشاش بشاش غیور، ظفیری کے ساتھ کیرم کی بازی جمائے بیٹھا تھا۔ بے فکر اور لا پرواہی میں ایک چیز مشترکہ تھی، ان کی حد سے بڑھی ہوئی غیر ذمہ داری۔ سلوی کے جی میں آیا اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو جانے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ۔

”کیا ریٹسٹورنٹ میں کسی لڑکی کے ساتھ وہی تھا؟“
 اور اگر اس نے کہہ دیا۔ ”ہاں وہ میں ہی تھا“

”ایک کپ چائے ملے گی؟“ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے اس نے سامنے سے آتی زارا سے کہا تو وہ ہانک کوئی جواب دیے پلٹی۔ جمشید اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

نبیلہ بیگم کے اشارے پر سلوی فوراً اٹھی۔ ان اٹھکے چھپے اشاروں کے پیچھے حمہ کی دی جانے والی مخصوص ہدایات تھیں جو وہ جاتے جاتے ماں، بہن کو اچھی طرح ذہن نشین کروا گئی تھی۔ زارا نے ابھی چھلے پر چائے کپانی چڑھایا ہی تھا کہ سلوی اچلی آئی۔

”آپ کی ساس آپ کو یاد فرما رہی تھیں۔ جا کر ان کی بات سن لیں، جمشید بھائی کو چائے میں دے آتی ہوں۔“

زارا سر ہلاتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔ سلوی نے آرام سے چولہا بند کر کے کھولتا پانی سنک میں بہایا اور فرق ہے سیب نکال کر وہیں مزے سے کھانے لگی۔

لاؤنج میں نبیلہ بیگم نے زارا کو پاس بٹھا کر نہ جانے کب کارانا کوئی خاندانی قصہ چھیڑ دیا تھا۔ زارا کو ایسے خاندانی قصوں سے بھلا کیا دلچسپی ہوتی تھی، محض خاموشی سے سنتی رہی۔ ادھر اپنے کمرے میں سر میں اٹھتی درد کی ٹیسوں کو دباتے جمشید کی نگاہیں بار بار وال گلاک کی جانب اٹھ جاتیں۔ گلاک کی ٹنگ ٹنگ اس کی باؤسی بڑھا رہی تھی۔

”نا پسندیدگی اور لا تعلقی کی کوئی تو حد ہوتی ہوگی زارا؟“

سر کا درد سوا تھا، لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا
 اسے اندر سے کاٹ رہا تھا۔



”سلوی! تمہارا فون ہے۔“ لاؤنج سے ظفیری پکار رہا تھا۔

اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کرتی سلوی نے ہولڈ پر رکھا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کی دست نادیا تھی۔ دعا سلام کے بعد سلوی اس کے یوں بے وقت فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی

تو؟“

تو شاید وہ آج کے بعد کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کہائے گی۔ اس نے غیور پر سے نظریں ہٹائیں۔ کھلی گھڑی کے دونوں پٹ بند کیے اور وہاں سے ہٹ گئی۔

ظفری کو مات دینے کے بعد باہر نکل کر اس نے بھرپور انگڑائی لی تھی۔ موسم جوین پر تھا۔ سلون کی بدلیاں آسمان کے فراخ سینے پر اڑتی پھر رہی تھیں۔ ہوا میں پھولوں کی باس شامل تھی۔ اس کی نظر سامنے اٹھی اور گھمری گئی۔

پھولوں کے سنج کے پاس جھولے پر نیم درازہ کرسی اور بی جہاں کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کا سفید باریک روپٹا ہوا کے سنگ پھر پھڑپھڑا رہا تھا۔ منظر اتنا مکمل اور بھرپور تھا کہ غیور یہ تک فراموش کر گیا اس وقت وہ کہاں ہے۔ چونکا اس وقت جب اس کے دوئے کا پلو اس کی ٹانگوں سے آلیٹا۔ زار نے کسمساکر آنکھیں کھولیں اور پھر جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ روپٹا کھینچ کر شانوں پر پھیلائے وہ کھڑی ہوئی۔ اسے سامنے والے کی آنکھوں سے خوف اور رین ایک ساتھ آئی تھی۔

”آپ کو دیکھ کر مجھے ہر دفعہ پرستان سے راستہ بھول کر آنے والی کسی پری کا گمان کیوں ہوتا ہے؟“ وہ اس کے راستے میں کھڑا تھا۔

”مجھے فضول باتیں سننے کی عادت نہیں ہے، بہتر ہو گا تم اپنے کام سے کام رکھو۔“ غرا کر کستی وہ پلٹی اور تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

غیور کی مسکراتی آنکھوں نے دیر تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

”اف ای! کیا بتاؤں مجھ سے چوری چھپے ان ماں بیٹیوں نے تو بالابہی بالا لہنی کا رشتہ تقریباً“ طے کر دیا تھا اور مشتاق کو دیکھیں ایسا ماں، بہنوں کا بڑھایا ہوا کہ سب کچھ جانتے ہوئے مجھے کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔ لیکن ہوا کیا کل لڑکے کی ماں۔ مسمی شکل بنا کر

انکار کر گئی کہ لڑکا راضی نہیں ہے، وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ میرے تو سینے میں ٹھنڈ بڑھ گئی۔ دیکھنے والی شکلیں ہو رہی تھیں ان کی۔ مجھے تو مزا آگیا کی میں۔“

حمہ کی آج دونوں بعد آمد ہوئی تھی۔ وہ دھواں دھار شروع ہوئی نبیلہ بیگم ہم تن گوش تھیں۔ لیکن ظفری نے انتہائی تآسف سے سر ہلایا۔

”چہ چہ آپ کیا بری بات ہے۔ بجائے۔ ان کے اس مشکل وقت میں ان سے ہمدردی کرنے کے آپ ان کی روٹی شکلیں دیکھ کر مزے لیتی رہیں۔“ حمہ نے اسے گھورا۔ ”چپ کرو تم۔ تمہیں کیا پتا ان ساس نندوں کی چالاکیاں۔“

”ہلے پتا نہیں تھا، لیکن اب چل رہا ہے۔“ اس کا اشارہ تجھ کر اب کی بار ماں بیٹی دونوں نے اسے بری طرح گھورا تھا۔

حمہ نبیلہ بیگم کی طرف جھکتے قدرے رازداری سے پوچھنے لگی۔ ”مہورانی کا سنا میں“ اپنے دام سے باہر تو نہیں آئی۔“

نبیلہ بیگم نے بے زاری سے ہاتھ ہلایا۔ ”اے کہاں، ہمارا جشید ہی اس کے پیچھے پاؤلا ہوا جا رہا تھا۔ ورنہ وہ تو اسے گھاس تک نہیں ڈالتی۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے امی۔“ حمہ پُر جوش سی مزید آگے کھسکی تھی۔

☆☆☆

زار کو کسی بل قرار نہیں آ رہا تھا۔ اسے اپنے اندر چنگاریاں سی پھوٹی محسوس ہوئیں۔ اپنی بے خبری اور سامنے والے کی جرات نے اس کے اندر شرابے سے دوڑا دیے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سب کچھ تنس تنس کر ڈالے۔ اندرونی خلفشار چہرے پر بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ بند کراؤن سے ٹیک لگا جشید نے اس کے ایک ایک عضو سے پھوٹی بے قراری کو محسوس کیا۔

”تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے زار۔“ وہ چونکی۔ گویا کمرے میں اس کی موجودگی سے بے

خبر ہو۔

وہاں سے ہٹ گئی۔ کمرے سے نکلے حبشید سے اس کی
ہڈ بھڑھوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے پہلو سے کتر اکروہ
کمرے میں آئی۔
”زارا سنو!“ وہ چلی اور سوالیہ نگاہوں سے اسے
دیکھنے لگی۔

”یہ کچھ پیسے رکھ لو۔“ حبشید نے دو قدم کا فاصلہ
پاٹ کر نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔
”کیوں؟“ زارا نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔
”اے کیوں کا کیا مطلب، بھئی، انسان کی ہزار
ضرورتیں ہوتی ہیں۔“

”میرے پاس ہیں پیسے۔“
”جانتا ہوں، لیکن یہ بھی رکھ لو، کام آئیں گے۔
کیونکہ منہ سے تو تم کبھی بات نہیں۔“
”مجھے مانگنے کی عادت نہیں ہے۔“

”لیکن اپنا ”حق“ چھوڑنا کہاں کی دانشمندی
ہے؟“ زارا محض لمحہ بھر کے لیے ہی اس کی روشن
آنکھوں میں دیکھ پائی تھی۔ لودیتی نگاہیں جو کمائیاں سنا
رہی تھیں، زارا وہ سنتا نہیں چاہتی تھی۔ وہ دانستہ رخ
موڑ گئی۔

حبشید نے نوٹ ڈرنگ ٹیبل پر رکھ کر قدم باہر کی
جانب بڑھادیے تھے۔ زارا نے وہ سارے نوٹ اٹھا کر
درازیں میں رکھ دیے۔ وہ اکثر یوں ہی ڈھیر سارے نوٹ
اسے پکڑا دیتا، جنہیں وہ اسی طرح دراڑ میں ڈال دیتی۔
اس کی بھلا کیا ضرورتیں ہوتی تھیں۔ پھپھونے سچ کما
تھا اسے عام لڑکیوں کی طرح نہ سمجھنے کا شوق تھا، نہ
سنورنے کا ارمان۔ اس کے جیز بری کے کپڑے اتنے
تھے کہ وہ اگلے کچھ سال تک ان ہی سے کام چلا لیتی۔
اس نے موبائل اٹھا کر امی کو کال ملائی۔ یہ شان دار
ساموئل بھی شادی کے دو سرے روز حبشید نے
اسے دیا تھا۔ وہ بیٹا کسے بہت غیر محسوس انداز میں اس
کی ہر ضرورت پوری کر دیتا۔ لیکن زارا کسی طور اپنے
دل کے بند کو اڑھونے پر آمادہ نہیں تھی۔
دوسری طرف سے گل مومنہ نے اٹھائی۔ لہجے میں
جبری بلاشت پیدا کرتے بھی زارا نے محسوس کر لیا،

”تم جی ٹینس کیوں ہو؟ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔“
نرم لہجہ جذبات سے بوجھل ہونے لگا تھا۔
زارا نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، کچھ
نہیں۔“

تکیہ اٹھا کر صوفے پر رکھا اور لیٹ کر دوسری طرف
کوٹ بدل لی۔ وہ آج بھی اس کے لیے اتنی ہی اجنبی
تھی۔ اور حبشید اس قدر خوش فہم کہ اسے لگا کہ وہ اس
سے اپنی پریشانیاں شیئر کرے گی۔ ایک اذیت بھری
مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی تھی۔ وہ تو آج
تک اسے یہ حق بھی دینے پر تیار نہیں تھی کہ حبشید
اس کی بے اعتنائی کا گلہ لیوں پر لے آتا۔
”کاش کہ کبھی تم مجھ پر اعتبار کر سکو زارا۔“ نیلگوں
بلب کی مدھم مدھم روشنی میں اس کی پشت کو دیکھتے اس نے
آزردگی سے سوچا۔



آج ثروت پھپھو خاص طور پر غیور اور سلوی کی
شادی کی بات کرنے آئی تھیں۔ نیلہ بیگم کو اعتراض تو
کوئی نہیں تھا، لیکن وہ شان دار جیز کے ہمراہ شان و
شوکت سے بیٹی کو رخصت کرنا چاہتی تھیں۔
”بس بھابھی بیگم! کیلے بن کا عذاب اب اور نہیں
جھیلنا چاہتا مجھ سے، بہو آئے گی تو گھر میں رونق آجائے
گی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے میرے پاس، مجھے میری
بچی کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔“ پھپھو کی عاجزی
کا آج عالم ہی اور تھا۔

”تمہاری بات بجا ثروت! لیکن ہم اپنی بیٹی کو خالی
ہاتھ تو رخصت نہیں کر سکتے۔ حبشید کی لاڈلی ہے
سلوی۔ خوب دھوم دھام سے اسے رخصت کرے
گا۔“

پھپھو کی پاچھیں یہاں سے وہاں تک چر گئیں۔
لیور نے چائے پیش کرتی سلوی کی طرف دلکش
مسکراہٹ اچھالی۔ سلوی کے لیوں پر بھی دھیمی مسکان
ان ٹھہری تھی۔ زارا نے تلخی سے یہ منظر دیکھا اور

اس کا لہجہ پست اور آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ دعا، سلام اور وہ چار باتوں کے بعد اس نے فون منیجرہ بیگم کو پکڑا دیا تھا۔ ان کا انداز بھی مومنہ کی طرح گھٹا گھٹا تھا۔
 زارا نے گہری سانس اپنے اندر اتاری۔ یقیناً مشہود صاحب اور مصطفیٰ گھر پر ہی تھے۔ ان کی موجودگی میں وہ دونوں کھل کر سانس تک نہیں لیتی تھیں کیا کہ کھل کر بات کرنا۔ زارا نے بہت بے دلی سے کال کالی تھی۔



”ارے واہ! آپ کی چائے کی یہ خوشبو ہی تو مجھے روز بھلا کھینچ کر لے آئی ہے۔ اپنے لیے تو بتا ہی رہی ہیں، اگر زحمت نہ ہو تو ایک کپ میرے لیے بھی بنا دیجئے۔“

وہ جو اپنی سوچوں میں گم چائے کپ میں ڈال رہی تھی، پشت سے ابھری غیور کی آواز پر اچھل پڑی۔ پھر دل کی پوھر کن کو قابو میں لاتے مڑی اور چاچا کرولی۔
 ”تمہیں ایسی فرمائشیں مجھ سے نہیں، سلویٰ سے کرنی چاہئیں۔“

غیور ہلکا سا قہقہہ لگا کر نرس پڑا اور سلیب پر پڑا اس کا چائے کا کپ اٹھا کر لیوں سے لگالیا۔ زارا بری طرح کھول کر رہ گئی۔
 اس شخص کی جسارتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

”سلویٰ کی چائے میں آپ جیسا دم کہاں زارا جی۔“ اس کے سامنے راہ مسدود کیے وہ گویا چائے اور اس کی بے بسی سے ایک ساتھ لطف اٹھا رہا تھا۔ زارا کا بے ساختہ دل چاہا اس کی مکروہ آنکھیں نوج ڈالے۔ وہ جتنا اسے نظر انداز کرتی وہ اتنا ہی اس کی راہ میں حائل ہو جاتا۔ وہ چاہ کر بھی اس کے بے ہودہ رویے کی شکایت کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے بھی نہیں جس کے پاس شکایت کرنے کے اس کے تمام حقوق محفوظ تھے۔

”پتا ہے آپ کی باتوں کا میں بالکل برا نہیں مانتا۔
 مہ جبینوں پر اتنا خرہ تو چٹا ہی ہے۔“

”راستے سے ہوں۔“ درشتی سے کہتی وہ باہر نکل گئی۔

غیور نے اس کی پشت پر لہرائی سنہری چوٹی کو بہت حسرت سے دیکھا تھا، لیکن سامنے سے آئی سلویٰ کو دیکھ کر چہرے کے تاثرات فوراً بدل لیے۔

”کیا ہوا؟“ سلویٰ نے ابوجا چکا کر پوچھا۔
 ”سوچ رہا تھا تمہاری بھابھی اتنی بھی روڈ نہیں ہے۔ ابھی انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے چائے کا کپ بنا کر پیش کیا ہے، لگتا ہے انہیں اس گھر میں میری حیثیت کا اندازہ ہو گیا ہے۔“

”چھاپ؟“ سلویٰ کا اچھا بے یقینی لہجہ ہوا تھا۔
 ”چھاپ کا کیا مطلب، تمہیں لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ سلویٰ نے گہری سانس کھینچے کندھے اچکائے اور فریق کھول کر اندر پانی کی بوتلیں رکھنے لگی۔ غیور اسے کھورتے ہوئے زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا نکل گیا۔



حیرت، بے یقینی اور خوشی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ محض فکر منیجرہ بیگم کا چہرہ دیکھتی رہی۔ جو اتنی بڑی خبر اسے سنا کر اب اپنا آنسوؤں سے ترچہ صاف کر رہی تھیں۔ شادی کے پانچ سال بعد مومنہ امید سے ہوئی تھی۔ گھر کی دیرانیوں میں قدرت نے قلعاریاں گونجنے کا اہتمام کر دیا تھا۔ وہ بے ساختہ ماں سے لپٹ گئی۔ پھر مومنہ کے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ اسے گلے سے لگائے، اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”آپ سوچ بھی نہیں سکتیں، میں کتنی خوش ہوں آج۔“
 لیکن کچھ غیر معمولی تھا، جس نے اسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔
 اس نے مومنہ کا ستا چہرہ دیکھا۔

”میں یہ بچہ پیدا نہیں کروں گی۔“
 اس کے سر پر گویا چھت آگری تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مومنہ کو دیکھا۔

سے باہر چلا گیا تھا۔ اسے ان قدموں کا بوسا لینا تھا جس نے انہیں چلنا سکھایا تھا۔



وہ بہت ہلکی پھلکی ہو کر گھر لوٹی تھی۔

آسمان پر اڑتی سائون کی بدلیوں نے ایکا کر لیا۔ ایسی گھنگھور گھٹائیں چھائیں کہ چھما پھم مہمند برسنے لگا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی پر بوندوں نے دستک دی تو نیند کا چھٹی کیس دور اڑان بھر گیا۔

وہ سیاہ بی چپل پاؤں میں پھنساتی ٹیرس پر آگئی۔ آسمان سے گرتی شفاف بوندوں نے اس کا تن من بھگو دیا تھا۔ وہ بارش کی دیوانی تھی۔ گرختے بادل، کڑکتی بجلی اسے بالکل بھی خوف زدہ نہیں کر رہا تھا۔ اس کے لیے بارش کی ان شفاف بوندوں میں خوشی تھی۔ ہر چیز سے بے نیاز وہ دیر تک بھیگتی رہی۔ پھر کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کیے اور بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

جشید پچھلے دو دنوں سے کاروباری کام کے سلسلے میں شرے سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپسی کے بارے نہ اس نے بتایا تھا نہ زار نے پوچھا ضروری سمجھا۔ اس کی موجودگی میں وہ صوفے پر سوئی، لیکن اب بیڈ پر سوئی اس کی بیگلی پلکیں پھر سے جڑنے لگی تھیں۔ جب وہ نیند کی وادی میں قدم رھتی بے خبر ہوئی تب بارش کی بوچھاڑ سے خود کو بچانے کی ناکام کوشش کرنا جشید تقریباً ”بھاگتے قدموں سے کمرے میں آیا تھا۔

سامنے ہی وہ کسی خوشنما خواب کی طرح بیڈ پر محو استراحت تھی۔ بمشکل اس پر سے نظریں ہٹا تا وہ پیچھے کرنے واش روم چلا گیا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ جسم بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ پیچھے کر کے جلتی آنکھیں مسلتا بیڈ کی دوسری طرف لیٹ گیا۔ ایک نظر اس کے بے خبر وجود پر ڈالی اور کروش و سری طرف بدل لی۔

رات کا نہ جانے کون سا پھر تھا انجانے احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اگلے لمحہ اس کا سانس سینے میں اٹک گیا۔ اس کے بے حد قریب جشید کروش

کفرانِ نعمت کی یہ کون سی شکل تھی؟ اس نے مومنہ کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ ”اس گھر کے مرد بھی عورت کو اس کا مان اس کا جائزہ مقام نہیں دیں گے۔ میں نے اپنی قسمت پر صبر کر لیا ہے، لیکن میں نہیں چاہتی کل کو ایک اور زارا ابجسم سوال بن کر میرے سامنے آکر کھڑی ہو جائے۔ میں اس کے کس کس سوال کا جواب دوں گی؟“

”بھابھی! لازمی تو نہیں ہے بیٹی ہی ہو۔ ہو سکتا ہے بیٹے کی پیدائش مصطفیٰ بھائی کو بدل دے۔“

مومنہ نے سرخ چہرے لیے لب کھلتے نفی میں سر ہلایا۔ ”بیٹا! مصطفیٰ کا خون ہو گا جو ایسے ہی ایک دن کسی اور مومنہ کی زندگی اجیرن کرے گا“ اسے خون کے آنسو رلائے گا۔“ اس کی آنکھوں سے اس وقت آنسو نہیں جیسے لمبہ نہ نکلا تھا۔

زارا اور وہ ایک ساتھ روٹی تھیں۔ اور باہر دہلیز پر کھڑا مصطفیٰ گویا ان ہی قدموں پہ جم سا گیا تھا۔ برسوں بعد کوئی جھکڑ چلا تھا جس نے یک دم شعور کی نہ جانے کب سے بند ساری کھڑکیاں ایک ایک کر کے کھول دیں۔ ضمیر کے آئینے پر بڑی گرد بہت برانی تھی، لیکن سامنے روٹی ہوئی دونوں عورتوں کے آنسوؤں سے وہ گرد مٹنے لگی تھی۔ چاروں طرف گویا کسی نے آئینے سے لاکر رکھ دیے تھے باپ کے قدم غلط راہ پر پڑے تھے۔ وہ کیوں ان کے نقش پا پر چلا گیا؟ وہ تو قبل از اسلام زمانہ جاہلیت کے اصول رکھتے تھے وہ کیوں اس فرسودہ نظام جاہلیت کے مرد کا روپ دھار گیا۔ وہ اتنا برا تھا، اتنا برا بنا رہا کہ اس کے نکاح میں آئی عورت نے آج اللہ کی سب سے بڑی نعمت سے منہ موڑنے کا سوچ چلیا تھا؟

وہ شل قدموں سے اندر آیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ چوٹیں۔ مارے گھبراہٹ کے کھڑی ہو گئیں اور خوف سے اپنے کیلے رخسار رگڑ ڈالے۔ لیکن یہ وہ مصطفیٰ تو نہیں تھا جسے وہ جانتی تھیں، یہ تو کوئی اور ہی تھا۔ انہیں سینے سے لگائے ان کے سروں کے بوسے لیتا۔ ان دونوں کو بے یقینی بھری مسرت کے حوالے کرتا وہ تیزی

بے سدھ پڑا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی، چہرہ بخار کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ شاید پہلی بار اس نے اسے یوں غور سے دیکھا تھا۔ پھر آہستہ سے دروازہ بند کرتی باہر نکل آئی۔

حمہ بچوں سمیت آئی ہوئی تھی۔ گھر میں افزائش کا ماحول تھا۔ کاموں میں لگی زارا کا دھیان بھٹک بھٹک کر اپنے کمرے کی طرف چلا جاتا۔ وہ اپنی اس قدر بے چینی کی وجہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”میں“ جمشید بھائی سو رہے ہیں۔ میں ابھی انہیں دیکھ کے آ رہی ہوں۔“ غائب دماغی سے حمہ کی بات سنتی زارا نے چونک کر سلوی کی طرف دیکھا تھا جو نیلے بیگم کو جمشید کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”نہ جانے اس نے میڈیسن لی بھی تھی یا نہیں؟ طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔“ زارا کی بے چینی تھی کہ حد سے سوا تھی۔ کئی بار اس کا دل چاہا ایک نظر جا کر اسے دیکھ آئے، لیکن ایسی ہر کوشش کے نتیجے میں یا تو نیلے بیگم کو کوئی ضروری کام یاد آجاتا یا پھر حمہ کسی نئی بات میں الجھ جاتی۔

ایسے ہی وہ بے حد عجیب سادوں ڈھل گیا۔ رات کو جب وہ آخری کام ختم کر کے میز آئی تو جمشید بازو آنکھوں پر رکھے بیڈ کے وسط میں لیٹا تھا۔ وہ یوں ہی انگلیاں پچھاتی کچھ سوچے گئی۔ گزشتہ رات جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی بھی توقع کے برخلاف تھا۔

وہ جمشید پر چلانا نہیں چاہتی تھی، لیکن خود پر ضبط بھی نہیں رکھ پائی۔ شاید اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے جمشید نے بازو آنکھوں پر سے ہٹایا اور تکیہ اٹھا کر خاموشی سے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ یہ اس کی شدید ترین ناراضی کا اظہار تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

زارا کو لگا بیڈ پر جیسے کانٹے سے آگ آئے ہوں۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو لگا چہرے پر اس کی سانسوں کی تپش نے کوئی آگ ہی نہ لگادی ہو۔ ہاتھ ہاتھ اس کے بھاری مضبوط بازو کا لمس پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ اس کا تنفس تیز ہو گیا، تکیہ ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔

بدلے بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا دایاں بازو زارا کے ہاتھ پر دھرا تھا۔ جیسے غیند میں کموٹ بدلی ہو۔ اس کی سانسوں کی تپش سے زارا کو اپنا چوتھتا محسوس ہوا۔ ناقابل فہم احساسات سے دوچار ہوتے ہوئے اس نے جمشید کا بازو ہٹایا اور اٹھ بیٹھی۔ اسی وقت جمشید کی آنکھ کھلی تھی۔ اپنی اٹھل پٹھل ہوتی دھڑکنوں کو قابو میں لاتی زارا کا سرخ بڑنا چہرہ دیکھ کر لمحہ بھر میں وہ معاملہ سمجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ معذرت کا کوئی لفظ بولتا، زارا غصے سے ابل پڑی۔

”آپ نے تو اپنی امانت میں خیانت نہ کرنے کے بڑے بڑے دعوے کیے تھے، تو کہاں گئے آپ کے وہ دعوے؟“ جمشید کو وہ کسی پھری ہوئی موج کی طرح لگی تھی تندر اور ناقابل رسائی۔

”آزم سوری زارا۔۔۔ دراصل رات۔۔۔“
”نست دیں مجھے جھوٹے لہکے کیوز۔ آپ بھی دوسرے مردوں کی طرح ہیں، دغا باز اور فریبی۔“ محض موقع ملنے کی ناک میں تھے۔

”بس!“ جمشید نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ وہ قدم چلتا اس کے بے حد قہر آٹھرا۔ بخار کی حدت سے جسم انگارہ ہو رہا تھا اور آنکھیں لہو رنگ۔ زارا کا بازو دوپٹے کر وہ غریبا۔

”میری بے احتیاطی کو تم موقع پرستی کا نام نہیں دے سکتیں۔ بیوی ہو تو میری۔ اگر میں اتنا ہی جذبات کے ہاتھوں بے لگام ہوتا تو موقع تلاش نہ کرتا، خود موقع پیدا کر لیتا۔“ جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر وہ ہٹ گیا۔

زارا اس کی کھڑی رہ گئی۔



ساون ٹوٹ کر برسا اور فضا میں مخصوص جس چھوڑ گیا۔ درود پوار پر عجیب سی پرمردگی سی لپٹی محسوس ہوئی۔ جمشید بخار میں بری طرح پھٹک رہا تھا۔ ظفری ڈاکٹر کو لے آیا تھا۔ بخار کا زور تو ٹوٹ گیا، لیکن اسے اپنا وجود ٹوٹا سا محسوس ہو رہا تھا۔ زارا نے دیکھا وہ بیڈ پر

بے نیاز سار تھا۔ شاید اسے شادی جیسے مقدس بندھن میں بندھے جانے کے احساس نے شعور بخش دیا تھا۔ کچھ بھی تھا، زار نے سکون کی سانس لی۔

حمہ تقریباً روزی آجانی۔ بازار کے خوب چکر لگتے۔ واپسی لہے پھندے شاپنگ ہیگز کے ہمراہ ہوتی۔ نبیلہ بیگم نے دو ایک بار اسے بھی اپنے ساتھ شاپنگ پر چلنے کے لیے کہا، لیکن وہ ”اگلی بار“ کا کہہ کر ٹال جاتی۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر تھی کہ جشید اسے پہلے کی طرح پیسے وغیرہ دے کر یا شاپنگ پر لے جانے کا کہے گا۔ لیکن دوسری طرف گیمبر چپ تھی۔ وہ تو گویا اس کی موجودگی سے بھی لالعلقی ہو گیا تھا۔

جب وہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دیتا تو وہ بے رخی پر ترقی اور اب اس کے ذرا سے التفات کے لیے اس کا دواں دواں منتظر تھا۔ وہ اپنے دل کی کیفیت پر خود بھی انگشت بدندان تھی۔ گھر میں ہوتی رونق، ہنگامہ کچھ بھی اسے متاثر نہیں کر رہا تھا۔ وہ بے کل سی گھر میں زور و شور سے ہوتی تیاریاں دیکھ رہی تھی۔

آج بھی سب شاپنگ کرنے یا زار گئی تھیں۔ سلویٰ بھی ساتھ گئی تھی۔ زار اکیلی ہی گھر پر رہ گئی۔ ملازمہ چھٹی پر تھی۔ اس نے دوپہر کا کھانا بنا کر بھرپور شاور لیا۔ کٹن کا سن خوشبو سبز امتزاج کا سوٹ پہن کر نیت کا ہم رنگ دوپٹا کندھے پر ڈالا اور ہلکی سی نمی لیے بالوں کو سمیٹ کر بائیں کندھے پر ڈالتی وہ لاؤنچ میں چلی آئی۔ یوں ہی وقت گزارنے کے لیے صوفے پر نیم دراز، ورق گردانی کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی پلکیں بوجھل ہوتی جڑنے لگیں۔ میگزین الٹا کر کے سینے پر رکھا اور بے خبر ہو گئی۔

باہر دم ٹھوٹے جھس میں کسی درخت کی شاخ پر بیٹھا چرندہ زور سے چیخا تھا۔ صاف آسمان کے سینے پر چلیں چلارنے لگیں۔ شیطان، شیطانیت پر کمر بستہ ہوا۔ چہرے پر کرمہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ زار کی جھٹکے سے آنکھ کھلی تھی۔ اتنے قریب دو زانو بیٹھے غیور کو دیکھ کر کٹ کٹا کر اٹھی تھی۔

”تم؟ کیوں آئے ہو یہاں؟“

ساری رات سو نہیں پائی تھی۔
”زار!“ اگلی صبح وہ معمول کے مطابق کچن میں سب کا ناشتا بنانے میں مصروف تھی، جب نبیلہ بیگم چلی آئیں۔
”جی؟“ وہ پوچھی۔

”جشید کا ناشتا بنایا ہے تو رے کمرے میں لے چلو۔ آج میں اپنے بیٹے کو خود ناشتا کرواؤں گی۔“ پھپھو کی بات پر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اگر آج تک سب کو لگتا تھا وہ نارمل میاں بیوی کی طرح زندگی گزار رہے ہیں تو اس میں بھی سارا کمال جشید کے اس کے ساتھ روار کھے جانے والے یک طرفہ نارمل رویے کا تھا، ورنہ بات زار کی بے اعتنائی کی ہوتی تو اب تک کئی کہانیاں جنم لے چکی ہوتیں۔ لیکن آج اسے بیڈ کے بجائے ڈریسنگ روم میں سویا دیکھ کر پھپھو سب جان چاہیں گی۔ کچھ بھی تھا، گھر والوں کی نظروں میں اپنے لیے مسخر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

لرزتی ٹانگوں سے رے لیے وہ پھپھو کے ہمراہ کمرے میں آئی تو بے ساختہ اس کے لبوں سے گہری اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ جشید فریش ہو کر بیڈ پر ہی نیم دراز تھا۔ زار کے چہرے پر پھیلتا سکون اس کی نگاہیں سے مخفی نہیں رہا تھا۔

”نہ جانے یہ ہر بار کیسے اس کے دل کا بھید پالیتا ہے؟“ نظریں چراپی رے بیڈ پر رکھ کر وہ باہر نکل گئی۔



غیور اور سلویٰ کی شادی کی تاریخ دو ہفتے بعد کی طے پا گئی تھی۔ دن ٹھوڑے تھے اور کام زیادہ۔ گھر میں خوش گوار سی چھل پھل تھی۔ جشید نے پھر سے شو روم جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے اور زار کے درمیان کھڑی اجنبیت کی دیوار پر غلط فہمی کی بلیں کچھ اور پروان چڑھ گئی تھیں۔

غیور نے یہاں آنا بہت کم کر دیا تھا۔ اگر آتا بھی تو کسی بہت ضروری کام سے اور زار سے لالعلقی اور

اور جنگ میں سب جائز ہے۔ زارا ایک دم پیچھے ہٹی دیوار سے جا لگی تھی۔ آگے پیچھے ساری راہیں مسدود۔
”دیکھو میرے منہ مت لگو۔“ لرزتے لہجے پر قابو پائے وہ انگلی اٹھا کر بولی۔

”منہ ہی تو لگنا چاہتا ہوں۔“ اس کی جسارت بڑھی تھی۔ زارا نے زنانے دار پھڑاس کے چہرے پر دے مارا۔ غیور کو اس کی جرات پر حیرت اور عیش ایک ساتھ آیا۔ فاصلہ کم تھا وہ اس کو دبوچ ہی لیتا کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔

کھلے دروازے کے بیچ بیچ تصویر کی مانند استلاہ سلوی کے ہاتھ سے شائنگ میگزین چھوٹ کر گر گئے۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر دکھ بھری بے یقینی تھی کہ زارا کا دل چاہا بھاگ کر اس کے پاس جائے اور جھنجھوڑتے ہوئے اس کی غلط فہمی دور کروے۔ لیکن قدم ہٹنے سے انکاری تھ۔

شاطرانہ مزاج غیور جست لگا کر سلوی کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ وہ گھاگ تھا اور عیار بھی پلک جھپکتے اس نے اس ساری کہانی کا منظر بدل دیا۔ سلوی کی ساکت پلکیں لرزیں اور وہ بتا کچھ کے لئے قدم ہٹی وہاں سے بھاگتی چلی گئی۔

لاؤنج بھرتا جا رہا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں الزام تراشیاں، جھوٹ۔ اس نے ساری بازی اپنے ہاتھ میں کر لی تھی۔ زارا چلا چلا کر سب کو اس کو اصلیت بتانا چاہتی تھی لیکن زبان گنگ تھی۔ یہ سب کچھ اس کی توقع سے زیادہ تھا۔

”لو بھابھی بیگم! دیکھ لیا خوب صورت بھولانے کا انجام۔ پہلے ہمارے سیدھے سادے جشید کو پھانس کر اپنا الو سیدھا کیا۔ اب میرے بیٹے پر ڈورے والے لگ گئی۔ اس معصوم نے توڑھکے جھپٹنوں میں مجھے کئی بار بہو کے کرتوت بتائے چاہے لیکن میں ہر دفعہ گھبر کی عزت کا سوچ کر اسے خاموش کرا دیتی۔ یہ کہاں خبر تھی کہ بہو ایک دن یوں اپنے جذبات کے ہاتھوں بے لگام ہو جائے گی۔“

”اگر ایسے نظارے دیکھنے کو ملیں تو میں تو روز ہی آیا کروں۔“ وہ خباثت سے مسکرایا۔
زارا اس کی ڈھٹائی پر شذر سی کھڑی تھی۔ ”تم میری سوچ سے بھی بڑھ کر گھٹیا ہو۔ تمہیں تو شاید یہ بھی یاد نہیں، ایک ہفتے بعد سلوی سے تمہاری شادی ہونے والی ہے۔“

وہ جو سمجھ رہی تھی شادی میں بندھے جانے کے احساس نے اس کی کاپیا پلٹ دی ہے تو آج یہ خام خیالی بھی دور ہوئی۔ غیوریوں ہنسا گویا اس کی بات سے بہت لطف اٹھا رہا ہو۔

”شاید تم نے یہ کہاوت نہیں سن رکھی، عورت کی الماری میں نئے سوٹ اور مرد کے دل میں نئی عورت کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔“
دو قدموں کا فاصلہ اس نے آپ سے ”تم“ تک آتیاٹ لیا تھا۔

”اپنی حد میں رہو، ورنہ میں سب کو تمہاری اصلیت بتانے میں اب دو منٹ بھی نہیں لگاؤں گی۔ بلکہ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے، یہ گھناؤنا چہرہ سب کو دکھا دینا چاہیے تھا، لیکن دیر اب بھی نہیں ہوئی، تم سلوی تو کیا کسی بھی لڑکی کے قابل نہیں ہو۔“

”خاصی اچھی تقریر کرتی ہو۔ آتم ریلی امپر بیڈ۔ لیکن تمہیں کسا لگتا ہے تمہارے کہے پر یہ لوگ یقین کر لیں گے؟“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ چیلنج کرتے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

زارا اپنے اندر کے خوف پر بمشکل قابو پائے بظاہر مضبوطی سے اس کے سامنے جی کھڑی تھی۔

”تم پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتی ہو؟ یقین جانو میرے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے۔ مجھے تم سے پہلی ہی نظر میں محبت ہو گئی، لیکن افسوس یہ نظر بہت دیر سے تم پر پڑی۔ ورنہ وہ ہمارا گھونچو جشید لالہ اس قابل کہاں۔ یہ تو لنگور کے پہلو میں حور والی بات ہو گئی۔ خیر بگڑا تو اب بھی کچھ نہیں ہے، اگر تم میرا ساتھ دو تو میں سب سنبھال لوں گا۔ تمہاری خاطر سلوی تو کیا کسی کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ کہتے ہیں نا محبت

کہانی تو بیٹے نے بن لی تھی اب اس پر پھندنے
ثروت پھپھونے ٹانگ دیے۔
زارا نے شل ہوتے اعصاب کے ساتھ جشید کو
دیکھا۔

ساکت اور حیرت زدہ۔ زارا کو لگا وہ ساری زندگی ان
آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملا سکے گی۔
سب کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ ایک وہ ہی چپ تھا۔
مکھن تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ زارا قدم قدم چلتی
ساکت کھڑے جشید کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے
لگا اگر وہ آج نہ بولی تو شاید زندگی بھر بولنے کے قابل
نہیں رہے گی۔

”یہ سب جھوٹ ہے۔ میرا یقین کریں۔“ بہت
دقتوں سے وہ محض انتہائی بول پائی۔
”رے یہ کیوں یقین کرے گا تمہارا؟ تم نے منہ
کالا کرنے سے پہلے کون سا۔“

”بس!“ جشید گرجا تھا۔ ”چپ کر جائیں آپ
لوگ۔“ ایک دم سناٹا سا چھایا تھا۔ ”جھوٹ یہ شخص
بول رہا ہے۔ کھوٹ زارا کے نہیں اس کے دل میں
ہے۔“ غیور کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا وہ سرد
ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”مجھے اپنی بیوی کی
پاکدامنی پر پورا بھروسہ ہے اگر آپ سب ٹوکیا پوری
دنیا بھی اگر گئے زارا کی نیت میں فتور ہے تو میں تب
بھی یہی کہوں گا میری بیوی پاک باز ہے۔ اس کے
دامن پر کوئی دھبہ نہیں۔“ وہ بولا نہیں تھا اس نے زارا
کے مودہ وجود میں جیسے جان ڈال دی تھی۔
اس کا دل چاہا وہ اس کے قدموں پر سر رکھ کر پھوٹ
پھوٹ کر رو دے۔



ثروت پھپھو جاتے جاتے بھی بہت کچھ کہہ
گئیں۔ ”بھابھی بیگم اب تو اپنی آنکھیں کھول لیں
آپ جشید میاں کی آنکھوں پر تو اس کی محبت کی پٹی
بندھی ہے جو وہ آنکھوں دیکھی کبھی ننگے کو بھی تیار
ہی مگر آپ تو کچھ ہوش کے ناخن لیجئے!“ نبیلہ بیگم سر

دونوں ہاتھوں میں تھاے سوچ میں ڈوب گئیں۔
”ہائے امی! مجھے تو سوچ سوچ کر نینش ہو رہی
ہے۔ شادی میں محض چند دن ہی تو رہ گئے ہیں اور اب
یہ سارا فساد۔ میں جو بیگم بھر کر بسن کی شادی کا کہہ کر
آئی تھی اب اگر خدا نخواستہ شادی رک گئی تو کیا منہ
لے کر جاؤں گی اپنے سسرال۔ کیسے کیسے طعنے نہ دیں
گی وہ مجھے۔“ حمہ کا مارے پریشانی کے برا حال تھا۔

”واہ حمہ آپ گریٹ! یاد ہے جب آپ کی منہ کا
رشتہ ٹوٹ گیا تھا تب آپ طنز کر کے ان کی بے بسی کے
مزے لیتی رہی تھیں اگر اس مشکل وقت میں آپ
ہمدردی کے دو بول بول کر ان کا غم بانٹ لیتیں تو آج
آپ کو یہ خدشہ نہ سنا تاکہ آپ کی بسن کا رشتہ ٹوٹنے پر
وہ لوگ آپ کی بے بسی کا مذاق اڑائیں گی۔ آپ کو یہ
خوف نہ ہو تاکہ آپ کے ہی کے الفاظ آج وہ آپ کے
منہ پر ماریں گی۔“

بقلا پر لا پرواہ نظر آنے والا ظفیری گہری سنجیدگی سے
کہتے تھے سب جھٹکتا وہاں سے اٹھ گیا۔
حمہ بیٹھنے کی طرح نہ تو اسے ٹیٹ سکی اور نہ ہی
آنکھیں دکھا سکی۔ جب سچ سامنے آکر کھڑا ہو جائے تو
آنکھیں یوں ہی جھک جایا کرتی ہیں۔ نبیلہ بیگم ٹھنڈی
آہ بھر کر رہ گئیں۔



گھر میں ویرانی سی اتر آئی تھی۔ نبیلہ بیگم سوچوں
میں گم! بابامیاں کے سرد ہنکارے ابھرتے اور پھر جامد
خاموشی چھا جاتی۔ سلوی اپنے کمرے میں بند تھی۔
زارا نے اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور
کچھ سوچ کر اندر آگئی۔ سلوی آنکھیں موندے بیڈ
کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ آہٹ پر اس نے
سر اوپر اٹھایا پھر نظریں جھکا لیں۔

”سلوی! تم بھی مجھے قصور وار سمجھتی ہو؟ کیا تمہیں
بھی لگتا ہے میں گناہ گار ہوں؟“ اس کے قریب بیٹھتے
ہوئے زارا نے بھرائی آواز میں پوچھا۔ ”تمہاری چپ
میرے اندر احساسِ ندامت بڑھا رہی ہے۔ پلیز سلوی

کچھ تو بولو۔“
 سلوی نے گہری سانس بھرتے ہوئے سراپر اٹھایا
 تھا اور بہت ٹھہرے لہجے میں بولی۔
 ”جو تھپڑ آپ نے اس دن اس کے چہرے پر مارا وہ
 مجھے بہت پہلے ہی اس کے منہ پر مار دینا چاہیے تھا۔“
 زارا نے بے ساختہ اسے گلے سے لگالیا۔ ”وہ
 تمہارے قاتل نہیں تھا کبھی بھی اس کے چہن جانے
 پر افسردہ میت ہوتا۔“ اس کی پیٹھ سلاتا وہ غم لہجے میں
 بول رہی تھی۔ سلوی کی پلکیں بھیجتی چلی گئیں۔
 زارا بہت ہلکی پھلکی ہو کر باہر نکلی تھی۔ دل پر جو
 بوجھ پڑا تھا وہ ہٹ گیا تھا۔ جشید کی تلاش میں وہ طویل
 راہ داری طے کر کے زینہ چڑھتی بالکونی میں آئی۔ وہ
 اس کی جانب پشت کیے کھڑا تھا۔ زارا کو اس سے بہت
 کچھ کہنا تھا۔ البتہ سی مسکراہٹ نے اس کے سارے
 چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ محبت کی دلفریب خوشبو کہیں
 بہت قریب سے پھونتی دور تک پھیل گئی تھی۔ اس
 سے پہلے کہ وہ اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتی۔
 جشید پلٹا۔

”جو ضروری سامان پیک کرنا ہے کر لو میں تمہیں گھر
 چھوڑ آؤں۔“ زارا نے ششدر سا ہو کر اس کا چہرہ
 دیکھا۔ محبت کے خوشنما پرندے نے اپنے پر سمیٹ
 لیے تھے۔

”آپ مجھے گھر سے جانے کو کہہ رہے ہیں؟“
 ”ہاں۔“ وہ دھڑام سے نیچے آگری تھی۔ ابھی تو وہ
 ٹھیک طرح سے خوش بھی نہیں ہو پائی تھی۔ کہ لگا کسی
 نے اس کے دل پر پاؤں سارکھ دیا ہو۔ اس کی حالت
 سے بے خبر وہ پیٹھ موڑے کہہ رہا تھا۔
 ”میں غلط تھا۔ مجھے لگا میری محبت اتنی زور آور
 ہے کہ ایک دن اس کے آگے تمہاری ضد، جھوٹی انا
 نام نہاد نفرت سب بار جائے گی لیکن میں غلط تھا۔ تم تو
 آج بھی اسی مقام پر ٹھہری ہو۔ شاید میرے جذباتوں میں
 ہی کوئی کمی تھی جو یہ تمہارے دل کے بند کوڑ نہیں
 کھول پائے بلکہ محبت تو درکنار میں تو تمہاری عزت کی
 حفاظت بھی نہیں کر سکا۔ میری وجہ سے تمہیں اپنے
 ثروت پھینک دینا پڑا۔ اس وقت وہ ابامیاں
 کے کمرے میں تھیں۔ نبیلہ بیگم، حمہ، جشید، ظفری
 سب وہیں تھے۔ وہ گئی زارا تو اس کی ہمت ہی نہیں
 ہوئی اندر جانے کی۔
 اندر ثروت پچھو کہہ رہی تھیں۔ ”بھائی میاں! جو
 کچھ ہوا بس اس پر مٹی ڈالیں۔ گھر کی بات گھر میں ہی
 رہ جائے تو اچھا ہے۔ جب جشید میاں ہی آنکھوں
 دیکھی کبھی ننگے کو تیار ہیں تو ہم تم کون ہوتے ہیں
 اعتراض کرنے والے۔ کیسی دل کو چیرتی ویرانی ہے
 ۔ لگتا ہی نہیں شادی والا گھر ہے۔ میں آج بھی کہنے
 آئی ہوں بس آپ لوگ اپنے دل کو سنبھالیں۔ خیر سے
 میرے بیٹے کی شادی نہٹ جائے پھر آپ جا میں اور
 آپ کی ہو۔“ ثروت پچھو نے بات مکمل کر کے
 تائیدی نظروں سے بھائی اور بھابی کو دیکھا۔
 نبیلہ بیگم نے خود کو اتنا بے بس زندگی میں پہلے کبھی

نہیں پایا تھا۔ انہوں نے شوہر کا پر سوچ چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے پنپے تلے قدم اٹھاتی سلوی چلی آئی۔

”ایسا! میں یہ شادی نہیں کروں گی۔“ بنا کسی کی طرف دیکھے وہ ابامیاں کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

مؤدب لہجہ، قطعی انداز۔

”ہائے ہائے بیٹا! یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کرے کوئی بھرے کوئی۔ تمہیں کاہے کو اعتراض ہونے لگا شادی پر اب۔“

”پھپھو! میں اپنے ابا سے بات کر رہی ہوں۔“

سلوی کا انداز نہیں بدلا تھا۔ پھوپھو جڑبو کر رہ گئیں۔

”بولیں ابا! کیا آپ محض اس خوف سے کہ لوگ کیا کہیں گے مجھے ایسے شخص کے ساتھ رخصت کر دیں گے جو بد کردار ہے۔ جس کے دل میں فتور اور نیت میں کھوٹ ہے، جو رشتوں کے تقدس کا بھرم رکھنا نہیں جانتا۔ کیا آپ سب کچھ جانتے ہو جیسے محض دنیا کے خوف سے ساری زندگی کے لیے مجھے سوئی پر چڑھا دیں گے؟“ دو زانو ہو کر ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھے، سر اٹھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

”نہیں ہرگز نہیں!“ ابا نے ہاتھ اس کے سر پر رکھا تھا وہ ان کے ہاتھوں پر ہاتھ نکالے رو دی۔

”ہائے بھائی میاں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ تو بچی ہے نا سمجھ ہے۔“ اسے کیا پتا عین وقت پر شادی رک جائے تو کیسی کیسی بدنامیاں نہ جھیلنی پڑیں گی۔ آپ ہی کچھ ہوش کے ناخن لیں۔ غیور نے بتایا تو ہے بہو نے اس پر دوڑے ڈالنے چاہے۔

”پھپھو! آپ کا بیٹا جھوٹ بول رہا ہے اور یہ آپ بھی جانتی ہیں۔“ سلوی نے اس انداز میں کہا کہ پھپھو ایک دم چپ رہ گئیں۔ ہاتھ کی پشت سے کیلے رخسار رگڑتی وہ باہر نکل گئی تھی۔ پیچھے بولنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔



ٹیرس پر کرسی ڈالے، آسمان کی وسعتوں پر نگاہیں

جمائے وہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ زارا اٹھ کر رہ گئی۔ وہ اسموکنگ کرتا ہے یہ بات وہ آج جان پائی تھی۔ چند ٹانھیں اس کی پشت کو تھپتی یوں ہی کھڑی رہی پھر آہستہ سے قدم اٹھاتی قریب چلی آئی۔ اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ اس کی کرسی کی پشت تمام لیت۔ دو قدم کے فاصلے پر وہ رک گئی تھی۔ جشید نے گردن موڑ کر دیکھا پھر سابقہ انداز میں نظریں سامنے جمادیں۔ زارا نے اگلیاں تنخانیں۔

”کافی نہیں گے؟“

”میں کافی نہیں پیتا۔“ اسے ایک دم دھیر ساری شرمندگی ہوئی۔ وہ بھلا کہاں جانتی تھی اس کی پسند ناپسند کے بارے میں۔

”چائے؟“ ہمت کر کے پھر پوچھا۔

”مطلب نہیں ہے۔“ سگریٹ کا ادھ جلا ٹکرا وہ پیروں تلے نسل رہا تھا۔ زارا اپوس لوٹ آئی۔

اس بار وہ امی کے ہاں آئی تو مومنہ اسے دیکھ کر چونک گئی۔ ”تمہاری آنکھیں آج کون سے بھید کھول رہی ہیں زارا؟“

”مجھے جشید سے محبت ہو گئی ہے بھابھی! بہت شدید قسم کی محبت۔“ زبان نے بھید کھول دیا تھا۔

”اور تم اس بات کا اعتراف کسی جرم کی طرح کر رہی ہو۔“ مومنہ خوش گوار سا مسکرائی۔

”کیونکہ میں نے سب کچھ کھو دیا ہے۔“ مومنہ کی مسکراہٹ سمٹی۔ اور زارا بولتی چلی گئی۔

”انہوں نے مجھے میری نظروں میں معتبر کیا۔ اس وقت وہ ایک قیامت ہی تو تھی، جب سب بچ چور ہے مجھے سنگار کر رہے تھے، لیکن ان کے لفظوں نے میرے مودہ تن میں جان ڈال دی۔ جب وہ سب میرے کردار پر انگلی اٹھا رہے تھے تو انہوں نے کہا۔

”میری بیوی پاک دامن ہے، مجھے اس پر بھروسہ ہے۔“ انہوں نے نہ تو مجھ سے کوئی وضاحت مانگی نہ کوئی بحث یا دلیل، لیکن ایسا مان، ایسا بھروسہ۔ میں پھر سے جی اٹھی بھابھی! میری ہر خواہش، ہر ضرورت کو وہ ہٹا کے پوری کر دیتے اور میں آج تک یہ بھی نہیں جان پائی کہ

”اؤں؟“ انہوں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا اور پیشانی مسلی۔

زارا پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔ چائے بنائی اور بھاپ اڑانا مک انہیں پڑایا۔ خود ریموٹ اٹھا کر دوسرے صوفے پر چپٹیل بدلنے لگی۔ نبیلہ بیگم جن نظروں سے آج اسے دیکھے جا رہی تھیں اسے عجب سلا حاس ہوا۔ ایسے تو انہوں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ چائے کا کپ لبوں سے لگاتے نبیلہ بیگم نے سوچا۔

”ہم ما میں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ بیٹیوں کی خوشیوں کے لیے دعائیں مانگتے نہیں خشکیاں اور بیٹوں کی خوشی پر خود ساختہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ پرانی بیٹی کے آنے پر اپنے بیٹوں کو کیوں پر لیا کر دیتی ہیں۔ اور یہ زارا کتنی معصوم اور سادہ دل ہے۔ حمہ کی اتنی سیدھی باتوں میں آکر میں نے اسے جشید سے دور رکھنے کے کیا کیا جتن نہ کئے۔ پرانی بیٹی کے لیے گڑھا کھودتے میں یہ کیوں بھول گئی کہ میری اپنی بیٹیاں بھی تو خدا سے دور نہیں۔“

زارا پر نظریں جمائے وہ مسلسل سوچے گئیں۔ ”چھپھو! کیا سر میں زیادہ درد ہے؟“ ان کی نظروں سے الجھن محسوس کر کے اس نے ٹی وی آف کر کے ریموٹ رکھ دیا تھا۔

”نہیں بیٹا! چائے پیتے ہی درد کم ہو گیا۔“ وہ شاید پہلی بار اس طرح مسکرائی تھیں۔



جدید طرز پر بنے اس شان دار سے گھر میں جمال نعتوں کی فراوانی تھی، وہیں سلیقہ کا شہید فقدان بھی تھا۔ سب اس سوچ کے حامل تھے کہ اگر سب کچھ ملازموں کے سر پر کھڑے ہو کر ہی کروانا ہے تو پھر ملازم رکھنے کا کیا فائدہ بندہ خود ہی کام کرے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جزوقتی ملازمہ اوپر اوپر سے بھاڑ پوچھ کر کے چلی جاتی۔ کھانا اور روٹیاں وغیرہ پکانے کے لیے جو عورت رکھی گئی تھی وہ بھی مالکوں کی عدم توجہی اور لاپرواہی کی وجہ سے اپنی مرضی سے سالن میں ’مرج‘ مسالے

وہ کافی نہیں چائے پیتے ہیں۔ وہ کیا چاہتے ہیں کیا نہیں سمجھے یہ جاننے سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔“ ”تو اب جان لو اس میں کیا مشکل ہے؟“

زارا نے ناسف سے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ کتنی تھیں تا وہ عام مردوں سے بہت مختلف ہیں، آپ سچ کہتی تھیں، لیکن میں نے یہ بات سمجھنے میں بہت دیر کر دی۔“

”تم اپنی جھولی میں بے اعتباری عدم تحفظ اور شاید ناپسندیدگی کے کانٹے لے کر گئی تھیں، لیکن اب جودل کی بستی میں محبت کی کلی چٹکی ہے، اس کی منک ہر ناپسندیدہ جذبے پر حاوی ہو جائے گی۔ کچھ نہیں بگڑا زارا۔ بھلا محبت کرنے والے بھی کبھی ہارا کرتے ہیں۔“

زارا پہلی بار مسکرائی تھی۔



”چھپھو! آپ کے لیے کھانے کو کچھ لے اؤں؟“ نبیلہ بیگم کو لاؤنج میں سوچوں میں ڈوبا دکھ کر وہ ان کے پاس چلی گئی۔ سامنے ٹی وی چل رہا تھا، لیکن ان کا دھیان کہیں اور تھا۔ زارا نے انہیں ہمیشہ بارعب آواز میں حکم چلاتے دیکھا تھا۔ لیکن جب سے سلوی کا رشتہ ٹوٹا تھا، وہ یوں ہی پہلوں چپ چاپ سوچوں میں گم رہتیں۔ عین شادی کے وقت بی بی کا رشتہ ٹوٹ جانا انہیں گہرے صدمے سے دوچار کر گیا تھا۔

کیسے کیسے سوال نہ اٹھے، خاندان بھر میں چہ گوئیاں جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھیں، سچی بات پر پردہ ڈال کر شادی رکنے کے انہوں نے جتنے بھی جواز گھڑے تھے سب بودے اور بے وزن تھے۔ لیکن اس کے علاوہ ان کے پاس اور چارہ ہی کیا تھا۔ جشید کا اپنی بیوی پر اس قدر بھروسہ اور سلوی کا پراعتماد قطعی فیصلہ۔ شاید وہ اپنے فیصلوں میں اپنے بچوں کی طرح شفاف نہیں تھیں۔

چونک کر سامنے کھڑی زارا کو دیکھا جو مؤدب سی پوچھ ہی تھی۔ ”آپ کے لیے کھانے کو کچھ لے

کرن

ماہنامہ
نومبر 2017 کا شمارہ شائع ہو گیا

”کرن کا دسترخوان“

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- فنکار ”سید علی حسن“ سے شاہین رشیدی ملاقات،
- ”آواز کی دنیا سے“ اس ماہ مہمان ہیں ”ایس ایم ایس انجم“،
- اداکارہ ”سونیا مشال“ کہتی ہیں ”میری بھی سنیے“،
- اس ماہ ”آشا خیر“ کے ”مقابل ہے آئینہ“
- ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت عبداللہ کے سلسلہ وار ناول کی پہلی قسط،
- ”رائیڈر“ تجزیہ ریاض کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،
- ”من مورو کھ کی بات نہ مانو“ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- ریحانہ آفتاب کا مکمل ناول ”مجھے جینے کا حق دو“
- ”مہجور لٹین“ مصباح علی سید کا مکمل ناول،
- حیات بخاری کا ناول ”بہار شکر ہے“
- ”میری پائل چڑی کھٹکے“ حمیرا نوشین کا ناول،
- یاسمین نشاط، شبنم گل، ماریہ یاسر اور مزل سلیم کے اداکاروں اور مستقل سلسلے،

جھوٹے اور روٹیاں تھوپ کر چلی جاتی۔ یہ ہی حال وسیع و عریض لان کا تھا جس میں خوب صورت پھول پودوں سے زیادہ جھاڑ جھنکاڑ کی بہتات تھی۔ زارا کا خول چٹا تو گھر میں پھیلی ابتری کا عالم دیکھ کر کمرستی خود میدان میں اتر آئی۔ جشید کی محبت نے اس کے وجود کو معطر کر کے پھولوں کی طرح ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس نے نہ صرف اس گھر اس کے مینوں کو دل سے اپنا مانا بلکہ ان کا سب کچھ دل سے اپنا بھی لیا۔

جشید کے کام اپنے ہاتھوں سے گرتے وہ اتنے خوش گووار محسوسات سے دوچار ہوتی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہو۔ اب اس کی توجہ اور سلیقہ مندی کی بدولت گھر میں جو واضح تبدیلی آئی اس نے افراد خانہ کو خوش گووار حیرت سے دوچار کیا تھا۔

پانی کی موٹی دھار سے پودوں کو نہلاتی وہ حیران کھڑے مالی کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ ”مجھے کسی نے کہا تھا یہاں کے پھول پودے میری ذرا سی نظر التفات سے کھل کر جھوم اٹھیں گے اور انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“

پائپ مالی کے ہاتھ میں تھا کر گیلے پائپ سے جھکتی وہ سیڑھیوں کی جانب سے بڑھ گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ باڑھ کے اس پار کرسی ڈالے جشید نے اس کا لفظ لفظ بخوبی سن لیا تھا۔



نبیلہ بیگم حیرت زدہ سی عمارہ خاتون کو دیکھے گئیں۔ جو رشتے میں ان کی چچی بہن تھیں۔ برسوں بعد ان کی آمد نبیلہ بیگم کو وہ بھولا بسرا واقعہ یاد دلایا۔ جب انہوں نے اپنے بیٹے شہیار کے لیے سلوئی کا رشتہ مانگا تھا۔ نبیلہ بیگم کو بڑھے لکھے، سنجیدہ، برسر روزگار شہیار کے رشتے سے انکار کر کے حقیقتاً ”افسوس ہو رہا تھا“ لیکن اس وقت وہ سلوئی کی بات غیور کے ساتھ تقریباً طے کر چکی تھیں۔ دل کے کسی نہاں خانے میں اس خیال نے بھی چٹکی کھلی کہ شہیار غیور کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہترین تھا، لیکن وہ اپنے قول سے پھرنے

والوں میں سے نہیں تھیں۔ ویسے بھی غیور اور سلویٰ کا رشتہ انہوں نے اپنی ایما پر طے کیا تھا۔
عمارہ خاتون کو کہ شہر سے باہر ہائش پذیر تھیں، لیکن خاندانی معاملات سے بے خبر نہیں تھیں۔ انہوں نے ایک بار پھر نیبلہ بیگم سے — شہر یار کے لیے سلویٰ کا ہاتھ مانگا۔ ”کیا دل کی کشافش دور کرنے سے خدائے مہربان یوں ہی سیدھی شفاف راہیں نکال کر سامنے رکھ دیتا ہے؟“

ڈیڈ بالی آنکھوں سے نیبلہ بیگم کا دل سجدہ شکر بجالایا تھا۔ ”میں جشیدہ اور اس کے والد سے مشورہ کر کے ہی آپ کو کوئی جواب دے سکوں گی۔“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں ضرور مشورہ کریں، بس یہ دھیان میں رکھیے گا کہ اس بار ہمیں جواب ہاں میں چاہیے۔“

سلویٰ اور زارا چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں۔ عمارہ خاتون سلویٰ پر ایک پیار بھری نظر ڈالتے کہہ رہی تھیں۔ زارا نے جیسے سے مسکراتے ہوئے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دیا تھا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔

نیبلہ بیگم اپنے فیصلوں میں خود مختار رہی تھیں۔ چھوٹے بڑے کسی بھی معاملے میں انہوں نے شوہر سے مشورہ کرنے یا اجازت طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں باپ بھائی کو ہمیشہ عورتوں پر حکم چلاتے دیکھا تھا۔ اس خوف سے کہ ان کا مجازی خدا بھی انہیں جوتی کی نوک پر رکھے وہ خود ان پر حاوی ہوتی چلی گئیں۔ گو کہ دل میں معترف تھیں کہ اقبال احمد ان مردوں میں سے نہیں جو بلاوجہ عورتوں پر حکمرانی جتاتے ہیں، لیکن اب سوچ کے کئی دورہ اوہرے تھے۔

”پھر آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟“ انہوں نے شاید پہلی بار کسی معاملے میں اقبال صاحب سے رائے مانگی تھی۔ وہ اگر حیران ہوئے بھی تھے تو ظاہر نہیں کیا۔ پہلے پہل نیبلہ بیگم کی عدم توجہی اور ان کی دیکھا

دیکھی بچوں کا بھی باپ کو نظر انداز کرنا انہیں چڑچڑایا گیا تھا۔
”جو آپ کو مناسب لگے۔“
”نہیں، آپ باپ ہیں اس کے، آپ کی رائے اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ میری، آپ کی رضامندی کے بغیر میں انہیں کوئی حتمی جواب نہیں دوں گی۔“ کتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں وہ اس وقت خود کو اقبال صاحب مسکرانے لگے۔



آگے کے سارے معاملات بہت خوش اسلوبی سے طے ہوتے چلے گئے۔ عمارہ خاتون جلد شادی کی خواہاں تھیں۔ یوں جٹ مگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔ نیبلہ بیگم نے بھی تقریباً ”ساری تیاری مکمل کر رکھی تھی۔ اس لیے انہوں نے ہالنامنا مناسب نہیں سمجھا۔ گھر میں خوشی کے شادیا نے گونج اٹھے تھے۔ اس بار کیا پلٹ یہ ہوئی کہ شادی کے سارے فنکشنز میں حمہ کے سرسرا والے پیش پیش رہے۔ حمہ خود ہر معاملے میں ان کو آگے کر رہی تھی۔ بے جا بغض، عناد اور تعصب کو دل سے نکال دیں تو رشتوں میں خود بخود پر خلوص سی چاشنی کھل جاتی ہے۔ خور و شراب کے پہلو میں دہن بنی سلویٰ کے چہرے پر پھیلا سکون نیبلہ بیگم کو طمانیت سے دوچار کر گیا تھا۔

ولیمے پر زارائے گہرے سرخ رنگ کی بھاری کاہدار فراک اور چوڑی دار پا جامہ پہن رکھا تھا۔ ڈارک ریڈ لپ اسٹک، دائیں کلائی میں ٹھنکتی سرخ چوڑیاں، سنہری سلکی بالوں کو سیٹ کر کے بائیں کندھے پر ڈالا اور جھک کر سینڈل کے اسٹریپ بند کرنے لگی۔ وہ پہلی بار یوں دل لگا کر تیار ہو رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتا جشیدہ اسے دیکھ کر ٹھٹھکا تھا۔ پھر دانستہ نظر انداز کر کے ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو کر خود پر ری فوم اسپرے کرنے لگا۔ زارا سیدھی ہوئی تو خود کو اس کے پہلو میں کھڑے پایا۔ اس کے وجود سے اٹھتی خوشبو جشیدہ کو اپنے حواسوں پر چھاتی محسوس

ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ جاتا، زار نے بے ساختہ اسے پکارا۔
”سینے؟ اگر زحمت نہ ہو تو پلیز مجھے یہ پہنا دیں گے؟“

”نہیں، میں نے ڈائمنڈ والا جگمگاتا برسلٹ اس کے سامنے تھیلی پر رکھے وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ جشید نے برسلٹ اٹھایا تو زار نے کلائی آگے کر دی۔
”نیکے ذرا دھیان سے پہنائیے گا۔ میرے شوہر نے مجھے دیا تھا، میرے لیے بہت خاص ہے۔“

”جب ہی اتنے عرصے سے دراز میں پھینک رکھا تھا۔“ بے ساختہ وہ کہہ گیا۔ زار نے دل میں شکر کیا، وہ کچھ تو بولا۔

”کچھ خاص چیزیں خاص وقت کے لیے ہی سنبھال کر رکھی جاتی ہیں، ورنہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔“ جشید نے اس کے جھکے سر کو دیکھا۔ وہ لب کاٹنے کہہ رہی تھی۔

”اگر کوئی اپنے کیے پر نادم ہو کر معافی مانگتا چاہے تو وہ اپنی شرمندگی کا اظہار کس طرح کرے کہ سامنے والا پورے دل سے اسے معاف کر دے۔ کل پڑ کر ہاتھ جوڑ کر یا پھر پیوں پر ہاتھ رکھ کر؟ بتائیں جشید! میں سب کچھ کرنے پر تیار ہوں۔“

”سب ہی کچھ کرنے پر تیار ہو، اسوائے محبت کے۔ وہ لفظ بولنے کے ہے نا؟“ وہ نمونے پن سے بولا تو زار نے ایک دم جھکا سر اوپر اٹھایا اور زیر لب ہر لایا۔

”محبت؟ آپ محبت کی بات کرتے ہیں۔ آپ کے جس سحر میں میں مبتلا ہوئی ہوں وہ محبت سے بھی اوپر کی چیز ہے۔“ کلائی میں جگمگاتے برسلٹ کو نرمی سے چھوتے وہ کہہ رہی تھی۔

”مجھے تو آپ نے اسی دن بے مول خرید لیا تھا، جب سب مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگا رہے تھے، لیکن آپ نے میرا اعتبار کیا۔ جاننے ہیں اس وقت میں نے کسی کو معافی نہیں دی، نہ اپنا یقین دلانے کے لیے تمہیں کھائیں، لیکن جب آپ پر میری نظر پڑی، مجھے

لگا دنیا کچھ نہیں، میرے لیے آپ کا بھروسا، آپ کا اعتبار ہی سب کچھ ہے۔ تب مجھے سمجھ میں آیا سب کچھ چھوڑ کر میں اس وقت آپ کے سامنے کیوں آ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے صرف آپ کا اعتبار چاہیے تھا۔“

بو جھل پلکیں جھپک کر وہ آنسو اپنے اندر اتارنے کی سعی کر رہی تھی۔ ایک بے صبرا آنسو لڑھک کر گال پر پھسل گیا۔ جشید نے بہت محبت سے اپنی انگلی کی پور سے وہ چن لیا تھا۔

”مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ شدید محبت۔“

”تم ہی سی بات کہنے میں اتنا وقت لگا دیا زار۔“ جشید نے بازو پھیلا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ”چھانسنو۔“ گہیر لہجے میں وہ اس کے گل کے بہت پاس سرگوشی کر رہا تھا۔ زار کی دھڑکنوں نے قیامت سی مچا دی۔

”تاہم ملے تو ذرا ڈیر تک روم کی تفصیلی صفائی تو کرو، تاہم رات کو پچھر سونے نہیں دیتے۔“ ”کیا؟“ زار اچلائی۔

”یو ایئر آہستہ! گلن کے پردے پھاڑو گی کیا؟ اور اگر صفائی کرنے سے اتنی ہی جان جاتی ہے تو مجھ کو پچھر سو اپنے کمرے میں سونے کی اجازت ہی عنایت فرما دو۔“ وہ اس کے سین پر ہاتھ پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہہ رہا تھا۔

زار نے مسکراتے ہوئے سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔



سردق کی شخصیت

ماڈل میشاہ مغل

میک اپ روبریوٹی پارلر

فوٹو گرافی مونس رضا

سچا سچا دل

کوئی ادھر ادھر سے برآمد ہو جائے گا ذرا ڈھونڈیں گے تو ویسے ہے کدھر وہ تین گھنٹے ہو گئے مجھے آئے ہوئے نظر نہیں آئی ورنہ اس کے بھٹے ڈھول جیسی آواز تو جیسے ہی پکی سڑک اتر کے آؤ مکان چھاڑنے لگتی ہے۔ ”وہ تو دو دن ہوئے شہر گئی ہوئی ہے۔ ماموں آئے تھے لینے، عرشی کی منگنی ہے اگلے ہفتے تو ممانی نے بلوا بھیجا ہے۔ عرشی کے ساتھ مل کر کچھ تیاری وغیرہ کر دانی تھی۔“ جگ گلاس اٹھا کر لے جاتی آمنہ نے من سے انداز میں کہا۔ یہ جانے اور دیکھے بغیر کہ آیت کے نہ ہونے کی خبر سے کیسے اس کا چہرہ اتر سا گیا تھا۔



”اف کتنے خوب صورت کپڑے ہیں!“ رنگ برنگے جھلملاتے جدید طرز کے کپڑوں پر اس نے

”آہا، گھر کی بنی مزیدار ٹھنڈائی، جیو بھابھی! دو دھو نہاؤں پوتوں پہلو! ایسے ہی کہتے ہیں ناں ایسے موقعوں پر؟ ٹھنڈی ٹھار ٹھنڈائی کے دو گلاس لی کر اس نے آمنہ سے کہا تو اس نے پیار سے اس کے کندھے پر دھب رسید کی۔

”شہر جا کر بالکل ہی بے شرم ہو گئے ہو سدیس۔“ شرم سے آمنہ کا چہرہ لال ہو گیا۔

”لو اس میں شرم کی یا شہر سے تعلق ہونے کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہے ابھی پر سول ہی تو ابانے بھائی کے رشتہ کے لیے ہونے کی خوش خبری سنائی ہے مجھے۔ عید کے بعد تیرے شادی کا پروگرام ہے۔ میں تو کہتا ہوں گے ہاتھوں اپنی تک چڑھی، بمن کو بھی پٹنا ڈالو ایک خرچے میں دو شادیاں پٹ جائیں گی۔ لڑکا بھی

ناولٹ





جگمگاتی نظر ڈالی۔

اس بے مہر لڑکی کا انتظار کرتے کرتے آخر اس کی ایک ہفتہ کی چھٹیاں تمام ہوئی تھیں مگر اس نے شاید اپنی کزن کی مفتی میں شرکت کر کے ہی واپس آنا تھا۔ وہ نکلنے ہی والا تھا جب تائی اماں ایک چھوٹے سے بیگ کے ہمراہ اندر آئی تھیں۔

”سدیس بچے! یہ کچھ کپڑے میں نے تیار کروائے ہیں آیت کے لیے۔ یہ دینے ہیں اس کو جا کر بتاؤ بھلا! ایسی بھی کیا بوکھلا ہٹ کہ اٹھ کے ماموں کے ساتھ چل دی۔ نہ بتایا کہ مفتی میں شرکت کرے گی نہ کوئی تقریب کے لیے تیاری کی۔ وہ تو کل پرسوں آمنہ کو اس کی مامی نے فون کر کے مفتی کا دعوت نامہ دیا۔ آمنہ تو میرے کہنے کے باوجود بھی نہیں جا رہی شر! یہ تم ہی جاتے ہوئے اس کا کچھ سامان لے جاؤ اور یہ آیت کے ہاتھ میں لفافہ سنبھال کے دے دینا۔ تحفہ کے لیے اپنی ممانی کو دے دے گی۔ وہ تو خود بچی ہے ایسی زناکتوں کا اسے کہاں خیال ہوگا۔ تم تو جا ہی رہے ہو شر۔ تمہارے ابا کو اتنا لسا سفر نہ کرنا پڑے۔ بس ایک ہی بار اسے مفتی کے بعد لینے کے لیے چلے جائیں گے۔“

وہ جو اسے اس بار نہ دیکھ سکنے کی حسرت لیے جا رہا تھا۔ مطمئن ہو گیا کہ چلو اس بہانے اس پاگل اور سر پھری سے ملاقات ہو جائے گی جسے احساس تک نہ تھا کہ کوئی اسے دل کی تمام شدتوں سے چاہتا ہے اور اپنے تھسہسہ کے تھیلی مراحل میں سب چھوڑ چھاڑ کر اپنے پروفیسر سے ارجنٹ چھٹی لے کر صرف حل کی خاطر چلا آیا تھا۔

☆☆☆

ممانی ڈھیروں کام اس کے حوالے کر کے عرشی کے ہمراہ پارلر سدھاری تھیں۔ جبکہ زاشی گھر پر تھی۔ آیت جلدی جلدی ان تمام سوئوں اور گفتگوں کو مہارت سے پیک کر رہی تھی جو عرشی کے سرال والوں کو دے جانے تھے۔

”سہیہ تم ایسے کیسے سب کچھ منوں میں کر لیتی ہو۔ اس قسم کے سینے بیرونے کے کام ہوں یا کو کنگ سب

”پسند آئے ہیں ناں! میں نے اپنی بیٹی کے لیے بنوائے ہیں اور بھی بیچ پوچھو تو میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ آخر آیت کو ہماری ایسی کون سی بات بری لگی کہ اس نے پلٹ کر تین ماہ خبر ہی نہیں لی۔ ایک دوبار کال کرنے کی کوشش کی مگر بتا چلا کہ سٹکل اتنے کم ہیں تمہاری گاؤں کی سائبر پر کہ بات ہی نہیں ہو سکتی۔“

تمہارے ماموں تو ماموں، بہنیں بھی اداس ہو گئی تھیں تمہارے بہن۔“ ممانی نے پیشہ کی طرح شفقت سے کہا تو اتنی توجہ اور محبت پر آیت کھل اٹھی۔

”ارے نہیں ممانی! ناراضی کی تو بات ہی نہیں تھی۔ پندرہ دن تو رہ کر گئی تھی یہاں پھر آمنہ ہے نا، میرے بغیر اداس ہو جاتی ہے۔ ماں کو تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں شعور میں۔ ابا کے گزر جانے کے بعد ہم بہنیں ہی ایک دوسرے کا سب کچھ ہیں۔ ویسے تو تائی، تائی، جلیس۔ سدیس بھائی سب گھر والے بے حد اچھے ہیں خیال رکھنے والے مگر اپنی بہنوں کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے ناں۔ میں اس سے لڑتی بھی بہت ہوں، ناراض بھی جلدی ہو جاتی ہوں مگر آمنہ کے بغیر میں بھی جلدی اداس ہو جاتی ہوں۔“ بہن کے ذکر پر اس کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی تھی۔

”بالکل بیٹا! یہ تو رشتہ ہی ایسا ہے دل سے جڑا ہوا۔ تمہارے ماموں آج تک اپنی بہن کو یاد کر کر کے روتے ہیں۔ اتنی ہی عمر لکھوا کے آئی تھی بے چاری ورنہ جانے کی عمر تو نہ تھی اس کی۔ اصل میں لاڈوں پلی تھی، شہری سہولیات اور آسائش کی عادی، تمہارے ابا کی اچھی شکل صورت پر مر مٹی تھی ورنہ رشتوں کی کمی تھوڑی تھی اسے۔ تمہارے ابا کو اللہ بخشے خود خیال کرنا چاہیے تھا کہ دیہات کی مشکل زندگی کیسے برداشت کر پائے گی وہ مگر اس بھلے مانس کی ایک ہی ضد تھی کہ رہتا ہے تو میرے ساتھ گاؤں میں ہی رہنا ہے۔ بس شادی کے بعد راج سال بمشکل زندہ رہی۔“ ممانی نے ایک بار بھڑوہی ذکر چھیڑ کر اسے اداس کر دیا تھا۔

میں ایکسپریٹ۔“ اپنے ناخن فائل کرتی راشی نے رشک سے کہا، پھر خود ہی اپنی اس کیفیت کو پیچھے دھکیل کر رخوت سے بولی۔

”تم لوگوں کے پاس کوئی اور آپشن بھی تو نہیں ہے۔ بس کام، کام، کام نہ کوئی سوشل میڈیٹیوٹی نہ کوئی پڑھائی نہ گید رنگ اور نہ ہی پارٹیز۔“

”جی نہیں راشی باجی! آمنہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی ہے مگر پچھلے ہی سال اس نے شاندار ڈویژن

میں بی۔ اے کیا ہے۔ اب ایم اے انگلش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، میرا بھی ایک دو ماہ میں بی اے کے امتحان متوقع ہے۔ ماسٹرز تو ان شاء اللہ خیر ابھی دن ہے۔ مگر کام کے لیے کوئی خلاصی نہیں ہے۔ تائی کہتی ہیں کام عورت کا زیور ہے اور کام کے بنا بھلا عورت کیا عورت ہوئی؟ بہت سخت ہیں ہماری تائی اس معاملے میں، میں تو بس مارے باندھے کھیتی ہوں ہر کام، آپ آمنہ کو دیکھیں! ماشاء اللہ ایسی پھرتی سے سارے کام منٹوں میں پٹا جاتی ہے۔ اس کے سینے کپڑوں کی دھوم دوسرے گاؤں تک ہے۔

ایک دفعہ جو ڈویژن دیکھ لے اس سے کہیں زیادہ شان دار ایسا تیار کرتی ہے لگتا نہیں ہے کہ کسی چمک میں ٹیٹھی عام سی لڑکی نے سیاہ اور مزے کی بات ہے کہ سلائی اسے تائی نے سکھائی ہے مگر بانی کے کئی کورسز اس نے نیٹ سے سیکھے ہیں۔ مجھے تو آمنہ، تائی کی تالاق شاگرد کہتی ہے۔ یہ تیس، یہ پیکنگ ہو گئی مکمل۔ اب میں آپ کا جوس بنا لاؤں پھر ملازمہ سے مل کر اسٹور سے کچھ سالن نکھواتا ہے۔“ اس نے آخری گفٹ پیک کر کے اپنی بات مکمل کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہوں ٹھیک ہے۔۔۔ سنو آیت! راشی نے کسی قدر حسد سے اس کے گھن انداز کو دیکھا اور بلایا۔ آیت جاتے جاتے رہی۔

”یہ باجی، آبی وغیرہ اب شہر میں آؤٹ ڈیفنڈ ہیں! اچھا نہیں لگتا تم بس مجھے راشی کہا کرو۔“

”جی راشی با۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ وہ کچھ لمحے نا سبھی سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے لیے فریش جوس تیار کرنے کچن میں چلی آئی۔ جس وقت وہ اسٹور میں سے ملازمہ سے سالن باہر نکلا چکی اور فریش ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ جو اس باختہ سی راشی اس کے پاس آئی۔

”آیت! وہ تم سے تمہارا کرن ملنے آیا ہے۔ جلدی آؤ، بے چارہ پتا نہیں کب سے ویٹ کر رہا ہے۔ چوکیدار تو تمہیں پتا ہے خطی سا ہے۔ صبح گائیڈ ہی نہیں کیا اسے۔ وہ تو میں ڈرائیور کو دیکھنے باہر نکلی تو

چوکیدار سے الجھتا نظر آیا۔“

”اف اللہ! ضرور سدیس ہو گا۔ چوکیدار کا بھی دماغ خراب ہے۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی۔ رات ہی تو آمنہ نے بتایا تھا کہ تائی اس کے لیے کپڑے بھجوا رہی ہیں سدیس کے ہاتھ۔ اس نے لاکھ کہا کہ مای بوا چکی ہیں اس کے کپڑے عمر وہ آمنہ ہی کیا جو مان جائے۔

”تمہیں تو پتا ہے آیت! تائی ایسی باتوں کی نزاکتوں کا کتنا خیال کرتی ہیں کہہ رہی تھیں پہلے بتانی آیت تو شاندار لباس تیار کر کے دیتی، کمر تو اب بھی نہیں چھوڑی۔ کہتی ہیں کیا سوچیں گے تم لوگوں کے نضال والے کہ بی بی کو بغیر تیار کے تقریب میں بھیج دیا۔ بلکہ وہ تو یقیناً تھیں کہ مجھے بھی جانا چاہیے مگر تمہیں تو میری علوت کا پتا ہے کہاں کہیں اور جاتی ہوں۔ تم پتا نہیں کیسے پرانے گھر میں اتنے اتنے دن رہ لیتی ہو۔ میرا تو بیاہم گھٹتا ہے۔ اچھا سنو اپنا خیال رکھنا اور جلدی سے واپسی کی سوچنا، ہم سب اواس ہیں تمہارے بتا۔“ آمنہ کی رات والی گفتگو ذہن میں تازہ کرتی وہ اس کے سامنے آئی تھی۔

”شباباش ہے بھی! پرانی شادی میں عبد اللہ دیوانہ، سنا تو بہت بار تھا آج کسی پر صادق آتے اب دیکھا ہے۔“ اسے دیکھ کر سوکھے دھانوں پر پانی پڑا تھا گویا۔ سو اس کے سلام کے جواب کے بعد خوشدلی سے سدیس نے کہا۔

آیت بے ساختہ ماتھے پر ہاتھ مار کر اٹھی۔
”تم ہمیشہ ایسے ہی مجھے غصہ دلا کر سارا الزام میرے
اوپر ڈال دیتے ہو۔“

”مجھے پتا تھا بے وقوف ایسے ہی بیٹھی ہوگی۔ اس
لئے آپ کی تواضع کے لیے یہ سب لے آئی ہوں۔“
زاشی ملازمہ کے ہمراہ مع لوازمات کی ٹرائی کے اندر
آتے ہی خاصے خوشگوار لمبے میں بولی۔ آیت اچھی
خاصی شرمندہ ہو گئی۔

”یہ بے وقوف نہیں ہے مس! صرف ساہو ہے اور
ہم چونکہ خود بھی ایسے ہی ہوتے ہیں دیہاتی لوگ طبع
اور فصیح سے عاری۔ پسند بھی ایسے ہی لوگوں کو کرتے
ہیں۔“ اپنے سابقہ بے نیازی والے خول میں سمٹتا وہ
زاشی سے مخاطب ہوتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے! بدھرتیار ہو گئے جانے کے لیے بیٹھو! یہ
سب شروع کر کے پھر ختم بھی کرو۔ اور کھانا کھائے بغیر
تو میں نے تمہیں جانے نہیں دینا۔ آمنہ کو پتا چلا کہ
میں نے تمہیں ایسے جانے دیا تو گردن دبا دے گی میری
اور مجھے۔۔۔ مجھے بھی سکون نہیں آئے گا کہ فضول
باتوں میں لگ کے تمہیں کچھ کھائے بیٹے بغیر بھیج
دیا۔“ اس کے الوداعی کلمات بولنے سے پہلے وہ تڑپ
کر آئی اور بازو سے پکڑ کر اسے صوفے پر واپس دھکیلا
اور ملازمہ کے ہاتھ سے ٹرائی لے کر اپنے مخصوص
انداز میں شروع ہو گئی۔

سندیس نے ٹار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھا
جبکہ ان دونوں کے اس بے نیاز اور بے تکلفانہ انداز
کو کسی نے حسد و رشک کے طے جلے تاثرات سے
دیکھا تھا۔



لگے دن رات کو جب وہ ممانی کو گرم دودھ دینے
آئی تو انہوں نے اسے روک لیا تھا۔
”رکو آیت! مجھے تمہیں کسی سے ملنا ہے۔“
انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور دودھ کا
گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ آیت نے نا بھیجی

”پرانی کیوں میری ماموں زاد ہے۔“ نروٹھے پن
سے اطلاع دی گئی۔

”ہا! ماموں زاد۔۔۔ ویسے یہ تمہارے ماموں لوگ
ناراض ہی بھلے تھے۔ اب جب سے یہ معافی تلافی کا
معاملہ ہوا ہے تمہاری تو شکل دیکھنے سے رہ گئے ہم
لوگ۔ گھر فون کرو تو آیت بی بی کبھی کس لیے تو کبھی
کس لیے ماموں کے گھر سدھاری ہوئی ہیں۔ پر سئل
تمہارا سیل نہیں کہ تم رکھنا پسند نہیں کرتیں۔ اب بندہ
کرے بھی تو کیا کرے۔“

”ہونہ، تمہیں تو سارے رشتے اللہ کے فضل سے
بنے بنائے ملے ہیں اس لیے قدر ہی نہیں۔ ہم سے
پوچھو! اتنا ترستے رہے ہیں ان رشتوں کے لیے۔“
منہ بنا کر آیت نے کہا۔

”چھا! یعنی کہ میرے ابا، اماں جو تم لوگوں پر جان
قربان کرتے ہیں وہ عمر بھر کی محبت اکارت گئی اور تم ان
کی اتنی محبت کے باوجود بھی کسی رشتے کو ترستی رہ گئی
ہو۔ علم میں ہونا چاہیے تمہارے پیارے تایا اور تائی
کے جو یہ کہتے ہیں کہ تم ان کو ماں باپ کی جگہ سمجھتی
ہو۔“ سندیس نے تاسف سے کہا تو وہ حسب معمول
بھڑک اٹھی۔

”تم۔۔۔ تم جیسے آدمی! پھلے کٹنی کا نوروژن!
ہمیشہ ایسی بات ہی نکالنا اس خریب کار دماغ سے۔۔۔
میں نے کب کہا کہ تائی، تایا کے پیار میں کوئی کمی رہی۔
میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ہر رشتہ اپنی الگ اہمیت رکھتا
ہے۔“

اس کے جواب پر وہ ہنسناؤ ہنستا ہی چلا گیا۔
”دیری گڈ! اب آیا مزہ! ورنہ میں پریشان کہ ہماری
وہ آیت کہاں چلی گئی۔ اب اگر لڑائی سے فرصت مل
گئی ہو تو بندہ اتنی دور سے آئے ممان کو چائے پانی ہی
پوچھ لیتا ہے۔ پہلے ہی اس خردماغ کو کیدار نے دماغ
پلپلا کر کے رکھ دیا۔ رہی سہی کسر تم پوری کر رہی ہو۔“
دبچی سے اس کے غصیلے روپ کو نظروں میں اتارتا وہ
دبچی سے گویا ہوا۔

سے یہاں وہاں دیکھا تو اسے ممائی کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔

”میری بات یاد رکھنا احمر! اور میں ابھی تمہیں آیت سے ملواتی ہوں، کھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ میری پسند کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکو گے۔“ اب وہ کسی سے مخاطب تھیں۔

آیت گری سانس لے کر رہ گئی۔ ممائی کینیڈا میں مقیم اپنے بیٹے سے بات کر رہی تھیں۔ جو عرصہ دس سال سے بوجہ روزگار وہیں مقیم تھا اور ممائی لوگوں کے خاندان کے ٹھٹھا باٹ پیٹیا۔ اسی کی دیار غیر کی ممائی کے مروجہ منہ منت تھے۔ وگرنہ ماموں تو بینک میں گریڈ سولہ کے ملازم تھے۔ ممائی نے اسے احمر سے بات کرنے کو کہا تو آیت شرما گئی۔

”مم۔۔۔ میں کیسے ممائی! آپ بس میرا اسلام دے دیں ان کو۔ میں بھلا کیا بات کروں گی۔“ وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ ممائی نے زبردستی اسے پھر سے بٹھالیا۔

”اے بیٹھو بھی آیت! گاؤں میں رکھ کے انیس سو ساٹھ کی لڑکی ہی بناؤ لاکھ لوگوں کو تمہارے دو دھیال والوں نے ورنہ اپنے گمے ماموں زاوے سے بات کرنے میں کیسی شرم بھی۔“ کہتے ساتھ انہوں نے دو ڈو کیمرہ اس کے اوپر سیٹ کر دیا۔ آیت نے گھبرا کر اسکرین پر نگاہ کی، ایک خوبو شخص مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔

”واقعی میں ممی نے جتنی آپ کی تعریفیں کی ہیں آپ ان سے کئی گنا بڑھ کہیا رہی ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ آج کے اس قدر فاسٹ دور میں بھی کوئی لڑکی لڑکے سے بات کرتے ہوئے ہیپری ٹیشن کا شکار ہو سکتی ہے۔“ وہ حیرت سے اس کے سامنے ہوتے چہرے کو دیکھتے کہہ رہا تھا۔

آیت نے ڈھلکا دوپٹہ جلدی سے درست کیا پھر آہستہ سے اسے سلام کیا۔ مگر احمر کی بے تکلفانہ اور ہلکی پھلکی باتوں نے جلد ہی اس کی گھبراہٹ دور کر دی۔ وہ اس سے ان کے گاؤں کے بارے میں، گاؤں کی

مشکل زندگی کے بارے میں حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

”مائی گاؤ آیت! میں حیران رہ گیا جب پتہ چلا کہ تم لوگ ابھی تک آگ جلا کر کوئنگ کرتے ہو۔ آج بھی ہینڈ پمپ ہی پانی کا ذریعہ ہے۔ مطلب گاؤں کی لائف پر سائنس کی ترقی نے کوئی اثر ہی نہیں کیا۔ آج بھی صدیوں پرانے نظام کے تحت ایک لف لائف گزار رہے ہو تم لوگ۔“ اس کی حیرت پر آیت مسکرا دی تھی۔

”ارے نہیں احمر بھائی! آپ چونکہ ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک کی بھانگی دوڑتی زندگی کا حصہ ہیں تو اس لیے زیادہ احساس ہو رہا ہے آپ کو ورنہ ہماری زندگی اتنی مشکل نہیں ہے جتنی آپ کو لگ رہی ہے۔“

”مطلب مشکل ہے۔۔۔ یہ تو ماننی ہو تاں ڈیئر کرن۔“

اس دن ان کے درمیان تکلف کا پسلا پر وہ بیٹھے ہی آیت اپنی عادت کے تحت بولی تو بولتی ہی چلی گئی۔ ممائی مسکراتے ہوئے ان دونوں کو باتیں کرتے سن رہی تھیں پھر عرشی کی مگنی تک ایسی ہی دو تین اسکاٹ پر ہوئی باتیں آیت کو احمر کے متعلق بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئیں۔ اور مگنی والے دن آیت کو بچے سنورے دیکھ کر گنتی دیر احمر مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کے حسن میں زمین و آسمان کے قلابے ملا تا وہ اسے نئے زمانے کی سیر کرانا رہا تھا۔ صبح تک وہ اسی ملاقات اور انہی الفاظ کے سرور میں تھی۔ کیا وہ اتنی خوب صورت تھی اس نے خود سے سوال کیا۔ پھر کسی نے اب تک کچھ کہا کیوں نہیں؟ آئینے کے سامنے خود کو ہر ہر زاویے سے دیکھتے ہوئے وہ خود سوال جواب کرتی رہی۔ آئینے میں جب خود احمر کے الفاظ کی روشنی میں پرکھا تو لگا کہ ہاں وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔

”ارے یار! تم یہاں پتا نہیں کس دنیا میں گم ہو۔ میں ممی کے کمرے میں ڈھونڈ رہی تھی تمہیں؟ راشی نے اچانک اندر آتے ہوئے اس فسوں کو ایک دم ہی توڑ دیا جس کے حصار میں وہ گھری تھی۔“

”اف آیت! کتنا بولتی ہو تم۔ ایک فون نمبر ہی عنایت کر دو مجھے، مہربانی ہوگی۔“ زاشی نے دانت پیسے اسے غصے میں دیکھ کر سدیس نامہ پڑھتی آیت فوراً ہی چپ ہوئی۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

”میرے پاس نمبر ہو تو دوں نال۔ میرے پاس تو سرے سے فون ہی نہیں ہے۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ گھر میں لینڈ لائن فون ہے۔ سدیس کو گھریات گزرتا ہو تو اسی پر کر لیتا ہے۔ ہاں بھائی کے پاس موبائل۔“

”اف بولنے کی مشین، بس کرو۔ ایسا کرنا جب گھر جاؤ واپس گاؤں اپنے تو گھر کے کسی بندے سے اس کا نمبر لے کر مجھے لکھو اتنا ہے تم نے کال کر کے گھر کا نمبر تو ہے تم لوگوں کے پاس میرا بھی نوٹ کرلو۔“ خفا خفا سی زاشی نے کہا۔

”جی کر دوں گی مگر آپ نے کیا کہنا ہے اس سے مجھے بتائیں میں بتا دوں گی۔“ اس نے پر جوش انداز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں، ایک کلمہ ہے اس کی یونیورسٹی کا۔ یہ میرا نمبر رکھو اور کم مت کرنا۔“ زاشی نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک کلنڈر آگیا اس پر اپنا نمبر لکھ کر آیت کو دیا۔

اور وہ چٹ آیت کو پکڑا کر ایک بار پھر اسے جلد نمبر بھیجنے کی تاکید کرتے ہوئے یہ جاہ جلا۔ آیت چٹ کو دیکھ کر بس کندھے اچکا کر رہ گئی۔



مگنی کے اگلے روز تاپا اسے لینے آگئے تھے۔ مگر آ کر آمنہ اور تانی نے بہت گرجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

”آیت کی بیٹی! وہاں جا کر ہم سب کو بھول ہی تو گئیں تم۔ پتا بھی ہے، ہم سب کتنے اداں ہو گئے تھے۔ اب تم جا کے دکھاؤ ذرا بہت ماروں گی۔“ آمنہ نے نم آنکھوں سے اس کو گلے لگایا۔

”مجھے تو پتا ہی اب چلا آیت کہ تو میرے آنگن کی بولتی بیٹا ہے۔ تیرے تاپا الگ بولائے بولائے سے پھر

”کیا ہوا زاشی! خیریت کوئی کام تھا؟“ آئینے میں زاشی کا عکس دیکھ کر آیت نے کہا۔ اس دن کے بعد زاشی باجی کہنے کا تکلف چھوڑ دیا تھا اس نے۔

”ہاں بھئی! تم نے تو کہا تھا کہ گاؤں سے آمنہ بھی شرکت کرے گی عرشی کی مگنی میں اور ہو سکتا ہے تمہارے چچا کے بیٹے بھی آئیں۔ خصوصاً ”شہروالے“ بیٹے کو تو اتنا ہی چاہیے تھا۔ وہ کیا۔ نام تھا ان کا سدیس!“ زاشی نے پوچھا تو آیت حیرت میں گھر گئی۔ ہمہ وقت اپنی ذات میں کم زاشی کب سے رشتہ داروں کے بارے میں اتنے گہرے انداز میں سوچنے لگی۔

”ہاں وہ آمنہ تو تانی کے بغیر ہوتی ہی نہیں گھر سے۔ اور تاپا لوگوں کا انویٹیشن ہی نہیں تھا۔ مگنی نے کہا تھا صرف چند قریبی رشتہ داروں کو بلا رہے ہیں اور سدیس وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔

”دعوت نامہ ہو تا تب بھی مشکل سے آتا تھا اس نے بہت موڈی اور مشکل بندہ ہے وہ۔“

”نہیں بھی مجھے تو بہت اچھا لگا۔ جولی سا۔“ فریڈلی۔ تم بھی آیت بہت بے وقوف ہو۔ انسانوں کی پرکھ ہی نہیں ہے تمہیں۔ مجھے بھی یاد نہیں رہا۔ میں ہی انویٹ کر لیتی انہیں۔ تم ایسا کرو تمہارے پاس نمبر تو ہو گا اس کا مجھے دو۔“ زاشی کے اس طرح کہنے پر آیت کو حیرت ہوئی۔

”نہیں زاشی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ سدیس ہمارے گھر اور گاؤں میں سنجیدہ اور اچھا خاصہ ڈراؤنا مشہور ہے۔ لڑکیوں کو ڈانٹنے میں تو اس کا جواب نہیں مجھے۔ تو خصوصی نظر کرم ہوتی ہے اس کی۔ چادر کے بغیر یا ہر مت جاؤ۔ کلی میں ہنستا ہوا کیوں دیکھا تمہیں؟ مغرب کے بعد گھر سے باہر ہیں تو تانیں توڑ دوں گا۔ میرے لیے تو احکامات کی ایک کتب تیار کر رکھی ہے اس نے اس میں سے سبق پڑھ پڑھ کر مجھے سنا رہا تھا ہے۔ وہ تو اس دن بھی تانی نے زبردستی تاپا سے کھلوا کے یہاں بھجوا دیا ہو گا اسے کہ آیت کو سلمان دے آنا ورنہ ایک دو دفعہ تانی نے مگنی کو فصل کا میوہ بھجوانا تھا فٹ سے انکار کر دیا تھا پھر تانی نے۔“

رہے تھے۔ ”تائی نے کہا وہ راشی کے ایک ایک بار کے
پنے ہوئے جدید تراش خراش کے لباس میں کسی
ملکہ کی طرح اترائی بیٹھی تھی۔
”دیکھو تو جلیس کے ابا! کتنی پیاری لگ رہی ہے
آیت! بالکل شری گزریوں جیسی!“ تائی نے تایا کو
مخاطب کر کے کہا۔

”اس میں کوئی شک ہے بھلا کہ ہماری بچیاں ہیں
ہی پیاری۔“ تایا نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔
اسی بل جلیس بھیا کے آتے ہی آمنہ تو تیزی سے
وہاں سے ہٹ گئی تھی کہ تاریخ طے ہونے کے بعد
لڑکے کا لڑکی سے مکمل پردہ ہوتا تھا۔ اگرچہ ایک ہی گھر
میں ایسا ممکن تو نہیں تھا مگر پھر بھی آمنہ بہت احتیاط
برتنی تھی۔ ویسے بھی عمر میں آیت سے صرف ایک
سال بڑی آمنہ آیت سے کئی گنا زیادہ سمجھ دار اور
معاملہ فہم تھی۔
آیت اب کسی ٹیپ ریکارڈ کی طرح مملتی نامہ
شروع کر چکی تھی۔



”بس بھی کرو آیت! مانا کہ بہت متاثر ہو کر آئی ہو
تم ماموں کے خاندان سے مگر میں ہر وقت ان کا تذکرہ
سن سن کے عاجز آگئی ہوں۔ بھی۔ پتا نہیں کیوں تم نے
وہ سب کچھ بھلا دیا جو مملتی نے اسی کے ساتھ کیا تھا۔
ان ہی کی وجہ سے تانا اور ماموں نے ابو سے شادی
کرنے پر اسی سے قطع تعلق کر لیا تھا اور جائیداد میں
سے کچھ نہیں دیا تھا۔ اہی کی شادی اپنے محبوبہ انھوس
بھائی سے کرانے کی خواہاں تھیں مگر مملتی صاحبہ
اور جب اہی نے انکار کر کے ابو کا نام لیا تو تانا بکا اوتا
بھڑکایا کہ وہ اہی کی شکل دیکھنے کے بھی رو اوار نہ رہے
تھے۔

اب جب ہمارے وہ پیارے رشتے ان لوگوں سے
تجدید تعلقات کی خواہش دل میں دیپے مٹی میں جا
سوئے ہیں تو نہ جانے کس مقصد کے تحت دوبارہ انہوں
نے تعلقات استوار کیے ہیں۔ جس عورت کو اپنے

میکے کی دلہن ہار کرنے کی اجازت صرف اس عورت کی
وجہ سے نہ ملے گی ہو اس کو آج اس کی بیٹیاں کیسے اتنی
پیاری ہو سکتی ہیں۔ سوچنے کی بات ہے اگر کوئی سوچنا
چاہے تو۔“ آمنہ نے تو اسے اچھا خاصا رگیدڑ والا تیسرا
دن تھا اسے ماموں، مملتی کے خاندان کا راکگ الاپتے
ہوئے۔

”اچھا ناں آمنہ! ہر کسی کے اپنے اپنے نظریات
ہوتے ہیں، اپنی اور اپنی اولاد کی طرز زندگی کے حوالے
سے۔ مملتی بتاتی ہیں کہ تانا اور ماموں آج تک اس لیے
خفا رہے کہ اہی نے اپنی مرضی سے ابو سے شادی کی
تھی مگر ابو ویسے نہیں نکلے شادی کے بعد جیسے انہوں
نے دعوے کیے تھے۔ اہی کے حوالے سے تانا کے
خدا شات بیچ ثابت ہوئے۔ ابانے ایک شہر میں بلی
بڑھی سہولیات کی علوی لڑکی کو زبردستی اس مشکل
زندگی کو گزارنے پر مجبور کر دیا۔ تانا چاہتے تھے کہ وہ
اس صورت اہی کو ان کا جائیداد کا حصہ دیں گے اگر وہ
ان کی بات مانیں اور گاؤں چھوڑ کر شہر آن بیسں مگر اہی
بے چاری ادھر تانا کی مانتیں تو ابو ناراض ہوتے اور ابو
کی بیان کر انہوں نے تانا کو پیشہ کے لیے ناراض کر دیا۔
اور سنو آمنہ! وہ امر تو یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ہم
آگ جلا کر کھانا پلاتے ہیں، ہمارے ہاں پینڈپ کا
استعمال کیا جاتا ہے اور۔“

”بس آیت بس! آدمی اور عورتی باتیں سن کر کبھی
پورے نتائج اخذ نہیں کیے جاتے۔ اس سے بہت
تباہی پھیلتی ہے۔ اہی نے ہم سے کبھی کچھ بھی نہیں
چھپایا پھر بھی تم مملتی کی باتوں کا یقین کر رہی ہو۔
تمہاری عقل زندگی کے گنج گنگ مسائل کو سمجھنے
کے لیے بہت تھوڑی ہے یا تم ابھی استعمال ہی نہیں
کرنا چاہتیں، مگر میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ ہماری
اہی نے ایک آئیڈیل زندگی گزارا تھی ابانے ساتھ
اور ہمیں بھی اللہ نے بے شمار نعمتیں دی ہیں۔ کسی چیز
کی کمی نہیں رکھی۔ مگر جب ایک چیز کا مقابلہ دوسری
چیز سے کیا جائے تو کسی ایک میں تو کمی آئے گی ناں۔

چکا تھا۔ موصوفہ اب سدیس کو دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلارہی تھیں۔

”یہ تمہارے چچا کی بیٹی ہے ناں! بچپن میں بھی ایسی ہی شرارتی تھی۔ یاد ہے ایک بار امرو درخت سے اس نے توڑے تھے مار تمہیں مٹھلوائی تھی۔“ احمد کی یاداشت یقیناً ”اچھی تھی۔“

”ہمم۔“ سدیس کے منہ سے مبہم سا نکلنا۔

”اچھا مارا! کچھ دن تو رہے گا ناں ملتے ہیں پھر صبح۔“

ان کے گھر سے تین گھر پہلے احمد کا گھر تھا۔ احمد سے

الوداعی کلمات کہہ کر وہ غصے سے بھرا ہوا گھر آیا تھا۔

جہاں گیٹ کے پاس ہی آیت نے گرجو شمی سے اس کا

استقبال کیا مگر بہت جلد اس کی خوشی دم توڑ گئی جب وہ

اس کے سلام کا جواب دے بغیر اس کو بے دردی سے

بازو سے پکڑ کر صحن میں ٹھیک اسی جگہ لے آیا جہاں

شام کے وقت نماز افراخوانہ خوش گہیوں میں مصروف

تھے۔ آمنہ البتہ مجلس کی موجودگی کے سبب اندر تھی

مگر وہ بھی سدیس کی غیر متوقع اور تیز آواز سن کر باہر

آگئی۔

”میں کہتا ہوں اتنی بڑی ہو گئی ہے یہ مگر اتنی عقل

نہیں اس میں کہ عورتیں اس طرح دہراؤں،

دروازوں اور منڈیروں پر چھپکلیوں کی طرح لٹکتی اچھی

نہیں لگتیں۔ مت پوچھیں، کتنا شرمندہ ہوا میں احمد

کے سامنے۔“ وہ دانت کچا کر بولا۔

”خود ہو گے تم عورت اور چھپکلی۔“ جواب دے

کر وہ مجلس بھائی کے پہلو میں جا بیٹھی۔

”دیکھ رہی ہیں اس کی زبان کی دھار، بجائے اپنی

غلطی ماننے کے کیسے فیٹنجی کی طرح چل رہی ہے؟“

بیوں کا ادب نہ شرم۔ ”اس نے ایک تیز نظر اس پر

ڈال کر تائی کی طرف رخ کیا جو نا سبھی سے کبھی آیت کو

دیکھتیں تو کبھی غصے میں دھاڑتے سدیس کو۔

”اچھا سدیس میرے بھائی! تم بیٹھو! میں پانی لاتی

ہوں، پانی پو اور تسلی سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیوں غصے میں

ہو؟ کیا کیا ہے اس نے۔“ آمنہ نے سدیس کو بازو سے

پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا اور خود آیت کو خشکیں نظروں

تم ہماری اور ان کی زندگی کے درمیان کیا اور کیا کیا کا فرق دکھانا چھوڑ دو۔ وہ ہمارے رشتہ دار ہیں قریبی مگر ان سے تعلق ایسے ہی رکھو جیسے دور کے عزیزوں کا ہوتا ہے۔ آئیں گے تو سو بسم اللہ۔ ان کے دکھ سکھ میں بھی شریک ہوں گے مگر ایسے نہیں کہ جیسے تم کر رہی ہو، دو دن وہاں رہ کر کیا آئی ہو، تمہیں ہماری زندگی میں کمی اور مشکلات دکھنے لگیں۔“

”اف آمنہ! ایک بات ہی کی تھی میں نے کہ شہر کی

زندگی زیادہ آسان اور رنگارنگ ہے بہ نسبت گاؤں کی

زندگی کے، تم نے تو پورا ایک پھر ہی پلا دیا مجھے۔“ وہ منہ

پھلا کر بولی۔

”میں صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ

اپنی آنکھوں اور عقل کو بھی زحمت دینی چاہیے۔ سنی

سنائی پر یقین کرنے کی بجائے ویسے بھی دور کے

ڈھول سنانے ہوتے ہیں تم نے سنائی ہو گا بے وقوف

لڑکی۔“

”ناں دنیا میں ایک میں ہی بے وقوف ہوں۔“ وہ

اور چڑھ گئی۔ آمنہ کو بے اختیار اپنی سادہ اور بے وقوف

ہنس پر پیار آ گیا۔

”اچھا نا اچھی چھوڑو! تائی اماں نے مزیدار ستوتیار

کیا ہے تمہارے لیے۔ آؤ میں وہ بنا رہی ہوں۔“ آمنہ

نے اس کی پسندیدہ چیز کا نام لے کر اس کا بگڑا موڈ

درست کیا۔



پندرہ دن بعد کہیں گھر آنے کا موقع ملا تھا اسے۔

بس میں ہی اسے چچا تاج دین کا بیٹا احمد مل گیا جو شہر میں

ملازم تھا۔ گھر ہی آ رہا تھا۔ اچھی علیک سلیک تھی ان

کے گھرانے سے کہ قریبی ہمسائے تھے سو تین چار

گھنٹے کا سفر کیسے گزر گیا پتا ہی نہ چلا۔ دونوں ساتھ ہی

پکی سڑک سے اتر کر لمبی گیڈنڈی عبور کرتے ہوئے

گاؤں پہنچے شام ہونے والی تھی۔ گھر کے قریب پہنچتے

ہی سدیس کی نگاہ منڈر سے ٹپکی آیت پر پڑی۔ اس

نے کن اکھیوں سے احمد کو دیکھا جو یقیناً ”آیت کو دیکھ

سے گھورتی ہوئی پانی لینے چلی گئی۔

گئی۔

”ہونہ، کیسے ڈانٹ دیا۔ آرام سے نہیں سمجھا سکتا تھا۔ جل نکلا۔“ دل ہی دل میں اسے کئی صلواتیں سناتے وہ اٹھی اور آمنہ کے ساتھ جا کر دسترخوان لگانے میں مدد کرنے لگی۔

”مت ایسا کیا کرو آیت! اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ احمد ہو یا کوئی اور گاؤں کے کسی بھی فرد کی نظر پڑتی تو کیا سوچتا وہ کہ ایسی شتر بے مہار ہیں اس گھر کی لڑکیاں۔۔۔ تو یہ مجھے تو سوچ سوچ کر شرمندگی ہو رہی ہے۔“ آمنہ کا اس طرح کہنا اسے غصہ دلا گیا۔

”مانا کہ غلطی ہو گئی مگر ایسا بھی گناہ نہیں کر دیا میں نے کہ ہر فرد ہی فتویٰ لگانے کھڑا ہو گیا۔ ماموں لوگ اچھے ہیں۔ عرشی زاشی پاجی جب جی چاہے جس لباس میں ہوں اٹھ کر چل پڑتی ہیں مارکیٹ، دوستوں کے ہاں، واک کرنے جاتی ہیں۔ ایک ہم ہیں منڈیر سے کیا

جھانک لیا گویا قیامت ہی آگئی۔“

”ماحول، ماحول کا فرق ہوتا ہے پاگل لڑکی! اٹھو پانی رکھو یہاں۔ میں بلاتی ہوں سب کو اور موڈ ٹھیک کرو اپنا۔“ آمنہ اس کو مزید سمجھانے کا ارادہ ترک کرتی سب کو بلانے چلی گئی۔ آیت سر جھٹک کر رہ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ اس سے مکمل ناراض تھی۔ اس وجہ سے چپ چاپ معمول کے کام نبھاتی رہی۔ اپنی ان چیزوں کی بابت بھی دریافت نہیں کیا جو لٹ اس نے پچھلی دفعہ اسے بنا کر دی تھی کہ شہر سے لے کر آئے آمنہ سے چوری کیونکہ وہ اس کے ایسے لا ابا بلی روسیے سے سخت تنگ تھی۔

”سنا ہے لوگ خفا ہیں ہم سے۔۔۔ بلکہ مجھے تو ڈنڈا برسانے کے انداز سے لگ رہا ہے جیسے یہاں لحاف نہیں میں ہوں۔“ متبسم انداز میں گویا ہوتے ہوئے وہ اس کے پاس چلا آیا۔

جلس نے آمنہ کے اس روپ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اس وقت غالباً وہ اس رشتے کی نزاکت کو بھولے ہوئے تھی جو اسے کئی دن سے اس سے چھپنے پر مجبور کر رہا تھا۔ سدیس نے تھے ہوئے لہجے میں ساری بات بتا دی۔

”تو کون سا انوکھا کچھ کر دیا میں نے۔ ڈوبتے سورج کو دکھانا مجھے ہمیشہ سے بے حد پسند ہے۔ اور وہ ٹائم میں چھت بری گزارتی ہوں۔ سب جانتے ہیں۔ تالی اماں کو بتا کر گئی تھی میں۔ اس لفٹ کے کوڈنا تھا تم نے جو اس طرح لوگوں کی ماؤں، بہنوں کو سرعام تاڑتا پھر رہا تھا مگر نہیں، تمہیں ہمیشہ مجھے رلانے میں مزہ آتا ہے۔ کتنی خوش ہو کر میں تالی کو بتانے آ رہی تھی تمہاری آمد کا۔“ اس کی عجیب منطق پر سدیس نے اس سر پھری لڑکی کو ایک بار پھر گھور کر دیکھا جبکہ جلیس بھائی نے بشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

”تمہیں کس بے وقوف نے کہا کہ منڈیر پر چو کھٹا سجا کر ڈوتا سورج دیکھو۔ صبح کے بچوں سچ بھی تو یہ نظارہ آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔

”وہ تو دیکھ لیا تھا بس وہ عادت ہے ناں نیچے اترنے سے پہلے منڈیر سے سارے گاؤں کا منظر دیکھنے کی، کبھی تم بھی دیکھنا آتا اچھا۔“ مگر اس کے خون خوار تاثرات دیکھ کر جلیس کے پیچھے چھپ گئی۔

”اچھا اب غصہ ٹھوک دو سدیس! بچی ہے، سمجھ جائے گی اور تم بھی آیت! اچھی بچیاں اس طرح کی حرکتیں نہیں کیا کرتیں۔ زندگی سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں شید کرنا تمہارا حق ہے مگر ایسے کہ دو سرا متوجہ ہو کر کچھ الٹا سیدھا نہ سوچ سکے۔ امید ہے تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔ اب اٹھو اور بھائی کے لیے کھانا بناؤ شہلاش۔“ جلیس بھائی نے ہمیشہ کی طرح اس کو اس انداز میں سمجھا کہ اس نے دل میں عدد کر لیا کہ آئندہ وہ محتاط رہے گی مگر سدیس سے ناراضی سوا ہو

ابھی ابھی آمنہ نے ایک لحاف میں ڈورے ڈال کر اسے دیا تھا کہ سیدھا کر کے اس پر موٹا ڈنڈا برسا کر اس کے سارے بل نکال دے تاکہ ڈورے برابر ہو جائیں۔ اب آمنہ اور تائی دوسرے لحاف میں ڈورے ڈال رہی تھیں۔ آیت نے غصے سے اسے دیکھا اور منہ ہی منہ میں بدبلا کر جواب دیے بنا لحاف پر ایک اور ڈنڈا برسا دیا۔

”اس کا مطلب ہے میرا اندازہ صحیح نکلا۔ پتا نہیں کیا کچھ سوچ کر گاؤں آنا ہوں مگر تم ہر بار کچھ ایسا کرتی ہو کہ ہماری لڑائی ہو جاتی ہے۔ اچھا اب ناراضی ختم کرو، غلطی تمہاری ہوئی ہے مگر ہر بار بھائی عبا اور اماں سے ڈانٹ بھی مجھے پڑتی ہے کہ ہماری پیاری کور لادیا۔ ہوتے ہیں بھی ایسی قسمت والے لوگ۔ اچھا اب جلدی سے ماں جاؤ پھر میں تمہیں تمہاری چیزیں دکھاؤں تاکہ تم غمی نہ تیار کر کے مجھے دے سکو۔“

آیت مسکرائی اور اسے دیکھا۔ سدیس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ وہ ایسی ہی تھی چھوٹی چھوٹی بات پر روٹھ جانے والی اور ماں جانے والی۔

”ایک شرط پر۔“ وہ مزید پھیلی۔

”بولو کنیز! بادشاہ کو آج کے دن ہر شرط منظور ہے۔“

”بادشاہ سلامت! کنیز کو اماںوں کے باغ کی سیر کرائی جائے۔ تبا گھر تولے آتے ہیں مگر ہاتھ سے تول تول کر خوب مولے تازے مالٹے درخت سے اتار کے کھانے میں جو مزہ ہے مال۔“ آنکھیں میچ کر اس نے مالٹے کا مڑو لیا سدیس مسکرا دیا۔

”چلو ٹھیک ہے یہ مال واسباب اماں اور آمنہ کے حوالے کر کے چاور پن کر آؤ بلکہ چلو میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اماں کو بتا دس کہ ہم ذرا باغ میں جا رہے ہیں۔ آمنہ کو بھی ساتھ لیے چلتے ہیں۔“ وہ اس کے ساتھ لحاف اٹھا کر چلتے ہوئے بولا۔

”آمنہ۔۔۔ وہ پور لڑکی کبھی بھی نہیں جائے گی اور جلیس بھائی وہاں موجود ہوں گے یہ سوچ کر تو بالکل ہی

نہیں جائے گی۔“ اس نے منہ پتا کر پیش گوئی کی اور واقعی آمنہ نے منع کر دیا حالانکہ تائی نے لاکھ کہا کہ وہ بھی چلی جائے۔ مگر آمنہ نے ہزاروں کاموں کی فرست گنوا دی جو کرنے والے تھے ہاں یہ ضرور کہا کہ اس کے لیے کھٹے میٹھے مالٹے لے کر آجائے وہ جس بنائے گی۔ راستے میں انہیں تاپا بھی ملے تھے۔ جبکہ جلیس بھائی باغ میں موجود تھے۔ فروٹ پیٹیوں میں پیک کروا کے گاڑی پر لوڈ کروا رہے تھے۔

چند سال پہلے شوق شوق میں لگایا گیا اماںوں کا باغ اب دوسرا سال تھا اچھا خاصا منافع دینے لگا تھا۔ سدیس آیت کو مزدوروں سے ہٹ کر دوسرے کونے میں لے گیا جس طرف درختوں پر سے پھل اتر چکا تھا اب اکا دکا مالٹا سبز سبز درختوں میں سے کیس کیس جھانک رہا تھا۔ سدیس نے اچک کر چند مالٹے توڑے۔

”یہ تمہاری ماموں زاد کچھ عجیب سی لڑکی نہیں ہے۔ اپنی منوانے والی، سائیکو سی۔“ اس نے مالٹا چھیل کر اس کی طرف بڑھایا۔

”کون زاشی! انہیں تو بہت اچھی ہیں۔ بس ذرا لاڈلی ہیں ماموں مملائی کی۔ ارے ہاں انہوں نے تمہارا سیل نمبر منگو لیا تھا مجھ سے۔ تمہاری یونیورسٹی کا کچھ کام تھا ان کو۔ پلیز کرو ان کو۔“ بھرے منہ کے ساتھ اس نے بمشکل بات کی۔ سدیس احمد بے ساختہ طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ خود حیران تھا کہ آیت کے ماموں کے گھر جس لڑکی سے اس کی سیر سری سی ملاقات ہوئی تھی جو اسے قطعاً ”یاد نہیں تھی مگر جب اس لڑکی کی اسے کال موصول ہوئی تھی تو وہ یوں مخاطب ہوئی تھی جیسے وہ اس کا گہرا دوست ہو۔

پہلی ملاقات میں ہی اس نے اسے لچ کی آفر دے ڈالی تھی۔ صرف آمنہ اور آیت کا خیال کر کے اس نے آرام سے بات کی تھی اور اس کی لچ کی آفر نرمی سے مسترد کر دی تھی۔ ورنہ لڑکیوں میں خاصا روڈ مشہور تھا۔

”پنپنے ہی گراتے ہیں ٹیشیں پر بجلیاں۔۔۔ سنا تھا

عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔ ”اس نے مزے لے کر مائے کھائی آیت کو مخاطب کیا۔
”پتا نہیں کیسے محاوروں میں بات کرتے ہو۔ بڑی تو کجہن نہیں آئیں تمہاری باتیں۔“ آیت نے منہ ہٹا کر کہا۔

”اچھا سنو آیت! اباکہ رہے تھے کہ آمنہ کے بعد جلد از جلد آیت کی بھی شادی کرنا چاہتے ہیں۔“
”ہیں وہ کیوں؟ پوچھوں گی تیا سے کہ اتنا تنگ آ گئے مجھ سے؟“ اس نے بقیہ ماندہ اودھ کھایا مائے نیچے پھینک کر کہا۔

اتنے میں جلس بھائی بھی آتے دکھائی دیے۔ آیت دھب دھب کرتی جلس بھائی کے پاس آئی اور سدیس کی کٹی بات کہ متعلق پوچھا کہ کیا واقعی تیا ایسا کوئی خیال رکھتے ہیں۔ جلس بھائی نے آیت کے نودھے پن سے کھی ہوئی بات سن کر معنی خیزی سے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

”نہیں بھئی یہ ہوائی ضرور کسی دشمن نے اڑائی ہو گی ورنہ آیت رانی تو ابھی بچی ہے۔ خوب سارا پڑھے

گی اور اس کی شادی ہم ایسے تھوڑی کر دیں گے خوب دیکھ بھل کر اچھا سا لڑکا دیکھیں گے۔ اگر آیت ہاں کرے گی تو شادی ہوگی ورنہ نہیں۔“ جلس بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر سدیس کے قریب آگئے۔ آیت نے سکھ کی سانس لی اور جتنا نظر سے سدیس کو دیکھ کر کہا۔

”میں بھی کہوں مجھ سے ہر بات پوچھنے اور بتانے والے تیا اتنی بڑی بات کہے کہہ سکتے ہیں۔“ اس کے اس طرح کہنے پر جلس بھائی بے اختیار ہنس دیے۔

”چلو بھائی! ان ملکوں میں نیل نہیں۔ ابھی اپنا ہیمان اپنی پڑھائی پر لگاؤ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرتا ہے۔“
جلس بھائی نے بد مزہ سے بھائی کو خوش گواری سے کہا۔ کیونکہ اس کا مطلع نظر سمجھتے تھے مگر آیت سے گھر کا ہر فرد اتنی ہیار کرتا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔

”آخر آپ کو نشین کیا ہے اس بات سے۔ اپنے فائدے کے لیے آپ ایک دیہاتی لڑکی کو ہو بنائے تو تیار بیٹھی ہیں مگر میری خوشی کے لیے میرے رشتے کی بات نہیں کرنا چاہتیں۔ کچھ بھی تو کی نہیں ہے سدیس میں خوب صورت، ویل ڈیسٹ، ویل ایجو کیٹڈ۔“ زاشی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی کے ابھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر لے جائے اور سدیس احمد سے اپنا رشتہ پکا کر اودھ آجائے۔

”یہی تو میں نہیں چاہتی بے عقل لڑکی۔ وہ لڑکا کوئی اور ایکس وائے، زید ہو تا تو میں مان بھی لیتی تمہاری بات۔ اب ایسے ویٹ سٹ کا رشتہ مجھے ہرگز نہیں قبول۔“ انہوں نے دو نوک انداز میں کہا۔

”کتنی خود غرض ہیں می آپ! اپنا مفاد عزیز ہے آپ کو صرف۔ عرشی نے جس لڑکے پر انگلی رکھی آپ نے اس کو اس کی زندگی میں لانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا اب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے سدیس احمد پسند ہے۔ خوش قسمتی سے وہ ہمارا رشتہ دار بھی نکل آیا ہے تو آپ پتا نہیں کون سی اسٹور بزنسنا رہی ہیں مجھے، وہ سٹ۔ اور پتا نہیں کیا کیا۔“ زاشی نے تیز جے میں کہا۔

”اچھا اچھا۔ دیکھوں گی پہلے آیت کا معاملہ تو نپٹانے دو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرتا ہے۔“ انہوں نے خفگی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”اور مجھے ذرا احمر کا نمبر ملا کے دیتی جاؤ یاد دہانی نہ کراؤں تو کوئی کام بھی نہیں ہو تا اس گھر میں۔ اب بھی عرشی کے زیورات پے منٹ کے لیے رکے ہوئے ہیں۔ احمر سے کہوں جلدی پیسے بھجوائے ایک تو اس لڑکے کی لاپرواہیاں۔“ وہ بیڑ پاتی ہوئی زاشی سے مخاطب تھیں۔

”سب کی فکر ہے۔ ایک میرا خیال نہیں ہے۔“ اس نے سر جھٹک کر ان کو موبائل پر احمر کا نمبر ملا کر دیا۔



”کیسے ہیں احمر بھائی؟“ وہ خوشی سے چلائی۔ ہال



باہر گیا ہے۔“ آمنہ نے سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”آمنہ! تم نے کیا کسی اور نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں
 کہ میں اتنی خوب صورت ہوں۔“ دیوار میں نصب
 چھوٹے سے آئینے میں وہ خود کو دیکھتی کسی اور ہی دنیا
 میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس نے آمنہ کی بات کا جواب
 دیے بغیر اپنے چہرے کے نقوش کو ہاتھوں سے محسوس
 کرتے ہوئے کہا۔ آمنہ دم بخود اسے دیکھ گئی۔

ابھی وہ اسے کرپہ نے کارا رہ رکھتی تھی جب تائی
 کسی کام سے اندر آئی تھیں۔ یوں وہ بات وہیں رہ گئی
 تھی۔ مگر آمنہ کو آیت کے انداز ضرور ٹھٹک گئے تھے۔
 پھر اگلے روز ماموں کے گھر والے چلے آئے تھے۔
 تجدید تعلقات کے بعد یہ ان کی دوسری بار آمد تھی۔
 ممالی ان دونوں کے لیے کافی سارے تحائف لے کر
 آئی تھیں۔ سارا دن گزار کر جاتے ہوئے عرشی نے
 چپکے سے ایک ڈبا آیت کے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

آیت نے ناگہی سے عرشی کو دیکھا پھر جھماکے
 سے احمر کی بات یاد آتے ہی اس نے وہ پیکٹ عرشی کے
 ہاتھ سے لے لیا تھا۔ جاتے جاتے ممالی تائی جی سے
 اجازت لے کر گئی تھیں کہ اگلے ہفتے آیت کو ایک بار
 پھر بلوانے کا ارادہ تھا ان کا شہر۔

”پیاری تو آمنہ بھی ہمیں اتنی ہی ہے جتنی آیت
 مگر آیت چونکہ بنی بنائی سچیلہ ہے تو اس کے ماموں
 کی جب تک ناراضی تھی سو تھی۔ اب تو آیت کو دیکھے
 بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔“ ممالی نے بے حد پیار سے کہا۔
 جب تائی نے کہا تھا کہ ”آیت تو ان کے گھر کی رونق
 ہے اس کے تایا اور باقی سب اس کے بغیر اداس ہو
 جاتے ہیں۔ وہ اس کے ماموں کا گھر ہے وہ اسے منع
 نہیں کر سکی جائے سے مگر زیادہ دن نہ لگائے وہاں۔“
 آیت تو فخر اور خوشی کے مارے پھول کے کپا ہونے لگی
 کہ ماموں کے گھر کا ہر فرد ہی اس کا دیوانہ نکلا۔

جب کہ آمنہ کو ممالی کی یہ سب باتیں چاچلو سی
 لگیں اور کسی حد تک کسی مقصد کا پیش خیمہ بھی۔
 ویسے ہی ممالی کی شہر بلانے کی سرسری دعوت کو پہلے ہی

سے باہر نکلتی آمنہ اس کی ہر جوش آواز سن کر زردا کی ذرا
 چوٹ پر رکی پھر باہر نکل گئی مگر ذہن میں یہی سوال
 گردش کر رہا تھا کہ اس کی اپنے ماموں زاد سے کب
 اتنی بے تکلفی ہوئی۔ گھر کے لینڈ لائن نمبر پر کچھ لمحے
 قبل اس نے اپنے ماموں زاد احمر کی کال ریسپونڈ کی تھی۔
 احمر نے اپنا رسمی سا تعارف کرانے کے بعد آمنہ کا حال
 احوال پوچھا تھا پھر ایک دو منٹ کی گفتگو کے بعد آیت
 کو بلانے کو کہا تھا۔

”یار! ایک تو تم لوگوں کے اس دیہاتی سسٹم سے
 تنگ ہوں۔ نیٹ کی کوریج نہیں یہاں۔ سیل فون
 رکھنا تمہیں پسند نہیں۔ اب بندہ رابطہ بھی کرے تو
 کیسے اور کہاں کرے۔ وہ تو نمی سے یہاں کا یہ نمبر لیا
 ورنہ تم کسی کو بے قرار کر کے ایسے گاؤں کو پیاری
 ہو میں کہ پھر پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ اچھا سنو! نمی اور
 عرشی زاشی بھی تم سے ملنے کو بے چین ہیں۔ ایک دو
 دنوں میں چکر لگائیں گی تمہاری طرف۔ عرشی کے ہاتھ
 تمہارا آفٹ بھجوا رہا ہوں۔ اگلا رابطہ اسی پر ہو گا اب“
 بہت سی باتوں کے بعد اس نے کچھ نئے خوابوں کی

نوید اسے دے کر فون بند کر دیا تھا۔ کیسی خوب صورت
 باتیں کرتا تھا احمر۔

”ہزاروں لڑکیوں سے ملا ہوں آیت! مگر جو بات تم
 میں ہے وہ کسی اور میں کہاں؟ یار جب سے تمہیں
 دیکھا ہے دل پر قابو ہی نہیں رہا۔ حالانکہ جس جگہ میں
 رہتا ہوں وہاں ایسی فیملنگز کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔
 پھر میں بھی دو اور دو چار کرنے والا پریکٹیکل بندہ لیجو آج
 تک پہلی نظر کی محبت کا ہمیشہ مذاق اڑاتا رہا ہوں اب
 اپنے ہی الفاظ میرا مذاق اڑاتے محسوس ہوتے ہیں جو
 میں اس قسم کی صورت حال میں اپنے دوستوں کو کہا
 کرتا تھا۔“ احمر کے الفاظ کی بازگشت چہرے پر روشنی
 بن کر ایسے پھیلی کہ جب وہ مسکرائی ہوئی اپنے اور
 آمنہ کے گھرے میں داخل ہوئی تو آمنہ چونک گئی۔

”تم نے پہلے تو نہیں بتایا کہ ماموں کے بیٹے سے
 تمہاری بات چیت ہے؟ تم نے تو بتایا تھا کہ وہ ملک سے

اور ہم سائنس کی اس جدید ٹیکنالوجی سے اس قدر نااہل ہیں۔ ماموں نے تب ہی وعدہ کیا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو بھی سیل فون لے کر دوں گا۔ وہ سچ اور جھوٹ کی آمیزش سے بات بتاتی ہوئی مکمل سیل کی طرف متوجہ تھی۔

”ہوں! مگر میں نظریہ ضرورت پر یقین رکھتی ہوں۔ جس چیز کی ضرورت نہیں ہے اس کا استعمال کبھی بھی ہمیں فائدہ نہیں دیتا۔ جیسے کہ اس وقت یہ چھوٹا سا آلہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس کا ہم البدل بھی ہے گھر میں اور گھر کے مرفوں کے پاس موبائل بھی۔ جب ضرورت ہی نہیں ہمیں تو استعمال کا فائدہ۔ ورنہ دلائے کو تو تیا جی اور مجلس نے کتنی بار کہا دلاو دینے کو تمہیں یہی بات ماموں کی فیملی کو سمجھا دینی چاہیے تھی۔ اب تمہارے اس طرح جدیدوں کی طرح موبائل لے لینے کو وہ لوگ یہ نہیں بتایا، تلی جی کی محبت کو کن معنوں میں لیں گے مگر تم۔ تمہیں ہر بات سمجھانی پڑتی ہے پھر سمجھ میں آتی ہے اور بعض دفعہ سمجھانے پر بھی اوپر سے گزر جاتی ہے۔“ آمنہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”آمنہ! امت ڈانٹو بھی ہماری بیٹی کو۔ تحفہ تھا اس نے لے لیا کوئی بات نہیں ماموں ہیں تم لوگوں کے۔

حق بیٹا ہے تمہارا۔“ تلی جو نہ جلنے کس لیے وہاں آئی تھیں۔ آمنہ کی کچھ باتیں ان کے کالوں میں پڑیں تو غصے ہوئی آمنہ کو ٹوک دیا۔

”یہی بات تو اس کو سمجھ میں نہیں آتی تلی جی! اچھا اب آپ دونوں ذرا پوز بیٹائیں پیارا سا۔ میں ایک یادگار سی تصویر لوں آپ دونوں کی۔ پھر آمنہ کو بتاؤں کہ اپنے پیاروں کی یادگار رکھنا ہے جا استعمال میں نہیں آگے۔ ہمیشہ کی طرح اس نے آمنہ کی بات کا نوٹس لیے بیٹا مسکرا کر تلی جی سے کہا اور ناراض سی آمنہ کے نہ نہ کرنے اور تلی جی کے شرمانے گھبرانے کے باوجود دونوں کا ایک خوب صورت سافٹویئر اور جب ان دونوں کو تصویر دکھائی تو اپنی پھولی شکل دیکھ کر

انکار کر چکی تھی کہ اسے گھر سے باہر اول تو جانا کچھ خاص پسند نہیں ہاں کبھی کہیں جانا بھی پڑے تو اسے شروع سے اب تک تلی جی کے ساتھ جانے کی عادت ہے۔

”عادت تو آیت کو بھی تھی تلی کے بغیر کہیں نہ جانے کی۔ اب نجانے کیوں یہ اپنی پرانی عادتوں کے ساتھ بہت کچھ بھولنے لگی ہے۔“ آمنہ نے سنجیدگی سے کہا اور ایک نظر زاشی سے باتیں بگھارتی آیت پر ڈالی۔

”بس بچی ہے ناں۔ جہاں پیار ملے گا وہیں کی محنائش نکلے گی ناں۔“ ممانی نے پھر کہا تھا۔ تلی جی کیا نہیں بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

آیت نے ان لوگوں کے جانے کے بعد آمنہ سے چھپ کر احمر کاوا گیا گفٹ کھولا تھا۔ وہ ایک جدید طرز کا چھوٹا سا موبائل سیٹ تھا۔ آیت جس کو دیکھ کر عجیب سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل اسے نہ تو موبائل کی کبھی ضرورت پڑی تھی نہ ہی اسے پسند تھا رکھنا۔

”مگر میں اسے آپریٹ کیسے کروں گی۔“ مجلس بھیہما سے سیکھ لوں گی۔ اور اور اگر انہوں نے پوچھا کہاں

سے آیا۔ تو میں۔ تو میں کہہ دوں گی ماموں نے دیا ہے۔“ کتنی دیر موبائل کو ہاتھ میں پکڑے وہ خود سے ہی سوال جواب کرتی رہی اور شام کو مجلس بھائی کو ایسے ہی کہہ کر اس نے سارا تو نہیں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔

”ارے یہ کب دیا تمہیں؟ جب ہمارے لیے وہ گفٹ لائے تو اس میں تو نہیں تھا۔ تم نے کیوں لیا اتنا بڑگا گفٹ اور ضرورت بھی نہیں تھی گھر میں فون ہے اسی۔ بات بھی کر لیتے ہیں وہ لوگ۔“ آمنہ نے اوارہ سی کہا۔

”کیا ہے آمنہ! کیوں نہیں ہے ضرورت! یہاں افقی نہیں بتا چلتا مگر ماموں کے گھر جب سب کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرے پاس موبائل نہیں تو ان کے اذرات دیکھ کر میں شرمندہ ہو گئی۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی

تمہارے تایا کب آئیں تمہیں لینے۔ یہ فون کر کے بتا دینا اور جلدی آنے کی کرنا چاہئے! پتا تو ہے نال کہ ہم سب اداس ہو جاتے ہیں اپنی بیٹی کے بنا۔“ تائی نے اسے گلے لگا کر کہا۔



”ہمارے سامنے تو بڑا تم لوگوں سے محبت جتاتے ہیں یہ لوگ۔ پیٹھ پیچھے کیسے ہیں۔؟ ممانی نے پاؤں دپائی آیت کو بغور دیکھتے سوال کیا۔ آج اسے ماموں کے گھر آئے دو سرادن تھا۔ ممانی اور عرشی کا سرادن آج بازاروں کی خاک چھانٹنے گزرا تھا۔ ایک ماہ میں عرشی کی شادی متوجع تھی تو ممانی گھر کی ذمہ داری آیت پر ڈال کر خود بازار نکل گئی تھیں، اب شام سے ہی پاؤں اور ٹانگوں کی شکایت لے کر بیٹھی تھیں۔ آیت بھاگ کر تیل لے آئی تھی اور جیسے ہی اس نے بتایا کہ روزانہ تائی جی کے پاؤں کے ماش کرنا اس کا معمول ہے۔ ممانی نے سوال کیا تھا۔

”کون۔۔۔ کون ممانی، کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ ارے وہی۔۔۔ تمہارے تایا تائی۔“ انہوں نے بے زاری سے ہاتھ ہلایا۔

”ارے کیسی بات کرتی ہیں ممانی! تایا جی، تائی جی تو جان چھڑکتے ہیں ہم بہنوں پر اور مجھے تو وہ اپنے گھر کی بیٹا کہتے ہیں۔ صرف جتاتے نہیں محبت۔ ممانی لہہ حقیقت میں اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے ہیں، ہمیں میری اور سدیس کی ہیرا کی لڑائی میں چاہے قصور میرا ہو ہمیشہ سدیس کو ڈانٹتے ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ مجلس بھیا بھی میرا ساتھ دیتے ہیں۔ ڈانٹتے، شانتے کا کلم آمنہ کرتی ہے صرف اوپر اوپر سے ورنہ۔“

”ہاں بھئی کیسے نہ چاہیں اور سر آنکھوں پر بٹھائیں تم لوگوں کو۔“ آخر کو ہر طرف سے فائدے ہی فائدے ہیں۔ ہوتی کوئی غریب، کم صورت، بد سلیقہ بچیاں۔ میں دیکھتی کیسے محبت جاتی ان لوگوں کی۔“ انہوں نے ناگواری سے کہا تو آیت نا بھئی ان کو دیکھ کر ہلکا

آمنہ بھی مسکرا دی تھی۔ جب آیت اس کی ہنستے ہوئے تصاویر لے رہی تھی۔

”چلیں تائی جی! میں آپ کی اور تایا جی کی تصویریں بناؤں۔ آپ کے پاس تو بس تایا جی اور اپنی وہ بلیک اینڈ واٹھ تصاویر موجود ہیں جن میں نہ کوئی بندے کی شکل ڈھنگ سے نظر آئی ہے نہ منظر۔“ اب وہ تائی جی کا ہاتھ پکڑ کر بار بار رہی تھی۔

”لو اس بے وقوف کو اب نئی مصوفیت مل گئی۔“ آمنہ طویل سانس لیتی ہوئی دھلے کپڑوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ جنہیں یہ کرنے کا وہ آیت کے ذمہ لگا کر گئی تھی مگر اسے موبائل کی نئی نئی متعارف ہونے والی دنیا نے مصروف رکھا ہوا تھا۔ وہ سر جھٹک کر خود ہی وہ ادھر اور کام مکمل کرنے لگی۔

”نجانے کب اس کا بچپنا ختم ہو گا۔۔۔“ وہ ہنسی مانی۔



اگلے ہفتے ماموں واقعی اسے لینے آ گئے تھے اور وہ ہنسی خوشی جانے کی تیاری کرتی پھر رہی تھی۔

”پہلے تو تمہیں خود ہی اسی وقت ممانی کو منع کر دینا چاہیے تھا۔ تائی جی انکار کر کے خواہ مخواہ میں کیوں بری بنیں۔ مگر تمہیں ایسی نزاکتوں کا خیال ہوتا تو میں ہر وقت سر پھوٹتی نہ پھر رہی ہوتی تمہارے ساتھ۔ اب اگر جاری ہوں تو ممانی کو درد دل بعد کی واپسی کی کرنا۔ اس طرح بار بار وہاں تمہارا جانا مجھے پسند نہیں آ رہا تو تائی جی اور تایا جی کو کہاں اچھا لگ رہا ہو گا۔“ اسے چھوٹے سے بیک میں خوشی خوشی کپڑے رکھتے دیکھ کر آمنہ نے کہا تھا۔

”ہاں ہاں مجھے پتا ہے۔ اب اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں میں۔ اور پھر اپنی اس سقراط بن سے میری جتنی بھی لڑائی ہوتی ہو گھر سے باہر مجھے بڑی یاد آتی ہے۔“ اس نے آکر آمنہ کے گلے میں بائیں ڈالیں۔

”آیت! بچے یہ کچھ دیکھی سوتائیں ہیں جو تمہاری ممانی کے لیے بیچ رہی ہوں۔ بھلا شرمیں کہاں ملتا ہو گا یہ سب گاڑی میں رکھا دیا ہے سب سامان اور

کاش کرتے ہاتھ ست پڑ گئے تھے۔
 ”نہیں سمجھیں ناں۔۔۔ تم کل کی بچی کہاں سمجھو گی
 ان باتوں کو۔۔۔ میں بتاتی ہوں۔“ وہ جوش سے اٹھ کر
 بیٹھ گئیں۔

”ارے بھی تم لوگوں کو بال پوس کہ۔۔۔ محبت لٹا کر
 نقصان میں تھوڑی رہے وہ لوگ۔ ہر طرف سے فائدہ
 ہی فائدہ ہے۔ گھر کی جائیداد گھر میں رہے گی۔ پھر دیکھو
 اپنی تائی کو کب سے ہر قسم کی ذمہ داری سے فارغ کر دیا
 تم دونوں نے ان کو۔۔۔ بھونکا کر احسان نہیں کر رہیں
 تمہاری بہن پر۔۔۔ ارے بھی مفت کی نوکرائی بھی تو مل
 جائے گی ناں۔۔۔ سمجھیں کہ نہیں۔“ انہوں نے ساری
 پہلی بوجھ کر جیسے خود کو داد دی تھی۔

اس بار بھی ڈھیروں تحائف اس کے ہمراہ تھے۔



”اب مہمانی کر کے یہ آنے جانے کے قے تمام
 کرو۔ کیونکہ محترمہ تمہاری امتحان کی ڈیٹ شیٹ آچکی
 ہے۔ اپنی پوری توجہ بڑھائی پر لگاؤ اور گھر کی طرف سے
 تمہاری دلچسپی بہت کم ہو گئی ہے۔ تائی بے چاری اکیلی
 لگی رہتی ہیں شادی سر پر کھڑی ہے۔“

وہ صبح ہی گاؤں آئی تھی۔ اب رات کو جب دونوں
 اکٹھے ہوئی تھیں تو آمنہ نے خالی لفافے میں اس کی
 ڈیٹ شیٹ اس کی طرف بڑھائی تھی اور خود دوپٹے پر
 گونا گونے بیٹھ گئی تھی۔

”کس کی شادی آمنہ۔۔۔؟“ وہ شرارت سے گویا
 ہوئی۔ آمنہ نے اسے گھورا۔



”بات بد لٹا خوب آتا ہے تمہیں۔“
 ”اصل میں آمنہ تم ہر چیز اور ہر کام سنبھال لیتی ہو
 پھر تائی کہاں کرنے دیتی ہیں مجھے کچھ۔۔۔ اب کل سے
 جلیس بھائی سے تھوڑا سا ناام پھر لیتی ہوں نا کہ انگلش
 کی رویہ من ہو جائے باقی تیاری ہے میری۔۔۔ تمہارے
 جو جو کام رہتے ہیں وہ بھی لے لے بنا دو مجھے۔ میں کروں
 گی۔“ اس نے کہا تو آمنہ نے اطمینان کی سانس لی کہ
 شکر ہے وہ بھی سنجیدہ ہوئی۔

”اچھا ابھی بچوں لائبریری سے کچھ کپڑے منگوائے ہیں
 بری کے لیے اور آیت تمہارے شادی پر پہننے کے لیے“

ان دو دنوں میں عرشی نے اسے موبائل کے
 استعمال میں ماہر تو نہیں البتہ اچھا خاصا طریقہ سکھادیا
 تھا۔ پھر ماموں کے گھر آنے کی سب سے بڑی وجہ احمد
 سے ہونے والی ویڈیو چٹ ہوتی تھی جو اسے غیر
 محسوس طریقے سے اپنی طرف مائل کر چکا تھا۔ اس بار
 اس نے کھل کر اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا
 کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور جلد ہی ممانی
 اس کا رشتہ اس کے تایا، تائی کے پاس لائیں گی اس کا
 جواب بال میں ہونا چاہیے۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے
 لگی تھی اور شرما کر رون بند کر دیا تھا۔ تیسرے دن آمنہ

دیکھ لو کیسے ہیں۔ باقی شادی اور ولیمہ کا اس بار جب سدیس آئے گا تو اس کے ساتھ جا کے تم دونوں لے آنا۔“ تائی جی بڑے سے شہر کے ہمراہ اندر آئیں۔
 ”واہ تائی کلرز تو سارے میری پسند کے لگ رہے ہیں۔ کام بھی بظاہر تو اچھا ہی لگ رہا ہے۔ کون لایا؟“
 آیت نے اپنے والا شہر چھٹ کر اس میں سے چاروں سوٹوں کو نکال کر پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ ایک ایک سوٹ پورا کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔
 ”جلس جابا تھا کل شہر تو اسی کے ذمے لگایا تھا۔ اس نے سدیس کو ساتھ لیا۔ دونوں بھائی لائے ہیں۔ میں نے تو کہا کہ آمنہ کو ساتھ لے کر جاؤ ادھر سے آیت کو بھی ساتھ لے لیتا مگر آمنہ نے ہی منع کر دیا۔“
 تائی اب تفصیل بتا رہی تھیں۔

”کلنی دنوں سے تم دونوں سے ایک بات کرنا چاہ رہی تھی میں۔“ تھوڑے توقف کے تائی جی ان دونوں کو دیکھ کر گویا ہوئیں۔ وہ دونوں تائی جی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”خدا گواہ ہے کہ تمہارے والدین کے جانے کے بعد ہم لوگوں نے پوری کوشش کی کہ تمہیں ان کی کمی محسوس نہ ہو اگرچہ ماں باپ کی جگہ تو دنیا کا کوئی رشتہ بھی نہیں لے سکتا پھر بھی۔ پھر تمہارے تایا اور میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ہماری دونوں بیچیاں ہمیشہ ہمارے پاس رہیں ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنی رہیں کہ تم دونوں سے ہی ہمارے گھر کی رونق ہے اور ہماری بیٹیوں کی کمی کو تم دونوں نے ہی دور کیا تھا۔ پھر جلس نے شادی کے لیے آمنہ کے لیے اپنی خوشی سے ہاں بھر کر ہماری دیرینہ خواہش کو پورا کر دیا۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوئیں۔

”جی تائی جی! ہمیں پتا ہے آپ کی محبت کا۔ آپ کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ آمنہ ان کے پاس آکر بیٹھی اور محبت سے ان کے دونوں ہاتھوں کو تھلا۔ تائی جی مسکرا دی تھیں۔

”اب اس بار جب سدیس آیا تو اس نے جو بات کی اسے سن کر تو مانو میرے اور تمہارے تایا کے دل کی کلی

کھل گئی۔ ہم ابھی اس سے اور آیت سے بات کرتے کے لیے سوچ دیکھ رہے تھے اور اللہ نے ہماری مراد پوری کر دی۔“ اپنے نام پر آیت کے کان کھڑے ہوئے وہ پوری جان سے تائی جی کی طرف متوجہ ہوئی تاہم بولی کچھ نہیں تھی۔

”سدیس چاہتا ہے کہ وہ امتحانوں سے فارغ ہونے والا ہے تو جلس کے ساتھ ہی اس کی شادی بھی آیت سے کر دی جائے۔ اب آیت ہاں کے تو ہیں اور آمنہ خیر سے ساتھ ساتھ تیار کر لیں۔“ تائی جی کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑا تھا جبکہ آیت تو یوں بیٹھی تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔

”مئی ایک آدھ روز میں آنے والی ہیں رشتہ کی بات کرنے۔ تمہارا جواب ہاں میں ہونا چاہیے۔“
 ”جلدی اپنی بیٹی کو میں اپنے گھر واپس لے آؤں گی۔“ ممائی اور احمر کے الفاظ کی بازگشت دماغ میں گونجتی ہی وہ چونک اٹھی۔

”تائی۔۔۔ وہ میں سوچ کر جواب دوں گی۔“ آمنہ جو اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ اس کے اس طرح اٹک کر کہنے پر چپ ہو گئی۔
 ”ٹھیک ہے میری بیٹی! ایک دو دن میں مجھے بتا دینا تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے بلکہ تمہارا ہر فیصلہ ہمیں دل و جان سے قبول ہو گا۔“ تائی نے اٹھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھر کر کہا۔

”آمنہ! مجھے سدیس سے شادی نہیں کرنی بتا دینا تائی کو بلکہ، بلکہ۔“ تیزی سے بات مکمل کرتے کرتے وہ رکی، آمنہ دل پر ہاتھ رکھے بس اسے دیکھ گئی۔

”بلکہ۔۔۔“ آمنہ کی آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔
 ”ممائی ایک دو دن میں احمر کا رشتہ لے کر آنے والی ہیں۔“ اس نے اپنے ہاتھوں پر نظریں جما کر آہستہ سے کہا کہ اس پل آمنہ کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔

”کچھ مت کہنا آمنہ۔۔۔ کچھ بھی نہیں کہنا۔ میں نے ہمیشہ وہی کیا جو تائی نے یا تم نے کہا مگر میری زندگی کا سب سے بڑا اور اہم فیصلہ میں اپنے دل کی خوشی کے

لیے کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت اچھا ہے۔ تم اس سے بات کرو گی تو بہت خوش ہو گی۔ وہ مجھے بہت چاہتا ہے آمنہ۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے وہیں لے جائے گا اپنے ساتھ۔۔۔

اپنے خوابوں کی راہ گزر پر احمر کے ہمراہ چلتی وہ اتنی خوش تھی کہ اس نے آمنہ کے پھیکے بڑے چہرے پر نگاہ ہی نہ کی۔ نہ ہی باہر آنکھوں میں آنسو لیے نائی کی طرف دھیان گیا تھا جو ابھی کمرے سے باہر پوری نگلی بھی نہ تھیں جب اس نے آمنہ سے اپنے دل کی بات کہنے میں جلدی کی تھی۔ وہ وہاں سے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے چلی گئی تھیں۔

”اور میں سوچتی ہی رہی کہ مملانی کے اتنے محبت جتانے کا آخر کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس بات کا تو میں نے آخر تک تصور ہی نہیں کیا تھا۔ تم جیسے پاگل اور بے عقل ہی ایسے لوگوں کا آسان ہدف ہوتے ہیں شکار کے لیے۔“ آمنہ نے سیاٹ لہجے میں کہا۔

”ایسے مت کہو آمنہ! اگر ایسا ہے تو ایسی بات نائی لوگوں کے بارے میں بھی تو سوچی جاسکتی ہے۔ کس چیز کی کمی ہے ہم لوگوں میں۔۔۔ شکل، صورت، جائیداد۔۔۔ وہ بھی تو اس لیے۔“ مگر اس کی بات مکمل ہونے سے قبل آمنہ کا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تھا۔

”یہ تھپڑ مجھے بہت پہلے تمہارے منہ پر مارنا چاہیے تھا آیت! دو دن کی یہ تھرڑ کلاس محبت نے تمہیں یہ سکھایا ہے کہ تم اپنے ماں باپ جیسے نائی، تایا کی محبت کا مذاق اڑاؤ، ان کے خلوص کو تو لو۔“ غصے سے آمنہ کی آواز بھرا گئی۔



مملانی، ماموں اور سدیس کی آمد ایک ہی دن ہوئی تھی۔ آمنہ تو اسی دن سے مسلسل چپ رہ کر اپنی ناراضی کا اظہار کر رہی تھی۔ اگرچہ آیت کو اپنی اس دن والی بدگمانی پر بعد میں بے حد افسوس ہوا تھا۔ وہ محض آمنہ کو چپ کرانے کے لیے ایسے اول فیل بول گئی تھی۔ ورنہ نائی، تایا کی تو وہ خود بھی صحبتوں کی گواہ تھی وہ بھلا کیسے ان کے بارے میں ایسے سوچ سکتی تھی

مگر آمنہ کی محبت تو عقیدت کی حد تک تھی تایا، نائی سے کہ وہ اس دن کے بعد بالکل چپ ہی ہو گئی تھی ہاں نائی کے رویے میں فرق نہیں آیا تھا۔

”ٹھیک ہے، ہن! آپ کی خواہش سر آنکھوں پر مگر آیت سے پوچھئے بغیر ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔“ مملانی کے آیت کے رشتہ ماننے پر نائی جی نے رساں سے کہا تھا۔ تایا جی تو صاف انکار کرنا چاہ رہے تھے جبکہ سدیس کے ماتھے کے بل سے اسلانی گئے جاسکتے تھے مگر نائی جی نے مناسب الفاظ میں بات کو ختم کرنا چاہا تھا تو ان کی بات کسی نے کلن نہ تھی۔

”ارے آیت کا تو مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کرے گی۔ بہت محبت ہے اس بچی کو ہمارے گھرانے سے، بہت ترسی ہے وہ ان محبتوں کے لیے ہاں کا عندیہ ملتے ہی شادی کی تاریخ مقرر کریں گے تاکہ احمر بھی وقت کے وقت پہنچ سکے۔ بلکہ آیت کو تو ابھی بلوا کے اس کی رائے معلوم کر لیں۔“

”ہمارے ہاں ایسا نہیں ہو تا بلبل! بچی کی رائے اس کی نائی بہت جلد معلوم کر کے آپ تک اپنا فیصلہ پہنچا دیں گی۔ صرف آپ لوگوں کا رشتہ نہیں ہے بلکہ اس سے بہتر اور اچھے رشتے زیر غور ہیں۔ ہم سوچ سمجھ کر جواب دیں گے۔“ تایا جی کو سب کے سامنے آیت کے بلوانے والی بات بہت بری لگی تھی۔ انہوں نے قطعی لہجے میں کہہ کر مملانی کا منہ بند کر دیا تھا۔

”بھائی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگم! ایسی بھی کیا ہتھیلی ہے سرسوں جلی، بیٹی والوں کو پورا حق ہوتا ہے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا۔ ٹھیک ہے جناب! ہم لوگ آپ کے فیصلے کے منتظر رہیں گے۔“ ماموں نے تایا جی کے دو ٹوک انداز دیکھ کر بات بدلی تھی۔ سدیس تو ان لوگوں کا ایسا حتمی انداز دیکھ کر وہیں سے اٹھ گیا تھا۔

”تمہیں جلسیں بھیا پسند تھے آمنہ! مجھے سدیس اس حوالے سے ہرگز پسند نہیں ہے۔ جلسیں بھائی، ہم سب کے لیے اتنے اچھے، محبت کرنے والے ہیں اور تمہارے لیے تو خیر ان کا انداز ہی جدا ہے۔ مگر سدیس،

”تہماری بہن ہوں آیت! تمہارا برا نہیں چاہتی۔ ابھی میری زندگی کی کئی تہیں مجھ سے برگشتہ کر رہی ہے مگر میں تہیں اسی کئی سے ہی زندگی کے اسباق پر بھانا چاہتی ہوں جو اگر خدا خواستہ زندگی نے پردھائے تو۔ زندگی کے پردھائے گئے سبق بہت سخت ہوتے ہیں بہت امتحان لیتے ہیں۔ کیونکہ زندگی نے آج تک ٹھوکر لگائے بغیر کسی کو کوئی سبق نہیں پردھایا۔ تھوڑی سی عقل استعمال کرو سب کچھ واضح ہو جائے گا۔“ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی اس کے سامنے، سدیس اپنی محبت کی اس سے زیادہ تذلیل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سودر اندہ پوری طرح سے کھولتا ہوا اندر آیا تھا دونوں نے اسے دیکھ کر اپنے اپنے آنسو پونچھے تھے۔

”میرے لیے مت لڑو آمنہ! میں محبت کو اعزاز کے ساتھ لینا پسند کرتا ہوں نہ کہ بھگ میں۔ یا تو میری محبت میں کمی ہوگی یا دوسرے کی دعاؤں کو شرف قبولیت مل گیا ہو گا۔ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور آیت کو اس کا یہ حق ویسے ہی حاصل ہے جس طرح مجھے یا کسی دوسرے کو۔“ اس نے آمنہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”یہ بے وقوفی کر رہی ہے سدیس! اور میں اسے ایسے کیسے کنوئیں میں چھلانگ لگانے دے سکتی ہوں۔ تم بھی اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کے بجائے اسی کا

ساتھ دے رہو۔ بتاؤ اس کو کہ کتنی محبت ہے تمہیں اس سے۔ آج سے نہیں بہت پہلے سے۔ تم نے کتنی بار مجھے اور جلیس کو یہ بات بتائی اور اس بیوقوف کو بتانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کیا۔ کاش تم اسے تب ہی بتا دیتے۔“ آمنہ زور زور سے روتے ہوئے بول رہی تھی۔

آیت نے ان دونوں کو بے یقینی سے دیکھا تھا۔ اس کی بے یقین نظروں پر سدیس احمد پھیکا سا مسکرا کر آیت کی طرف آیا۔

”جیسا تم چاہو گی، ویسا ہو گا۔ اس بار سدیس احمد تمہاری کئی گئی کسی بات کا الٹ نہیں کرے گا۔ اگرچہ

اس کا رویہ دیکھا ہے تم نے۔ ہر بات میں میرے الٹ کرتا ہے۔ ہمیشہ اسے یہ گلہ رہا کہ میں نے اس کے ماں باپ سے اس کے حصے کا پیار بھی لے لیا۔ ہر بات ہر کام ہر چیز جو میرے حوالے سے ہو اس میں کبرے نکالنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ میں ہرگز ایسے شخص کے ساتھ اپنی پوری زندگی نہیں گزار سکتی جسے محبت سے سذرہ برابر بھی لگاؤ نہ ہو۔

میں اس منطقی کو نہیں مانتی کہ ایک بہن اگر ایک گھر میں خوش رہے گی تو دوسری کے خوش رہنے کا پیمانہ بھی وہی ہو گا۔ میں تمہاری وقتی ناراضی سہہ سکتی ہوں لیکن اس کے لیے اپنی عمر بھر کی خوشی قربان نہیں کر سکتی۔ اس لیے پلیز مجھے مجبور مت کرو ورنہ میں خود ہی مائی جی کو منع کر دوں گی۔“

”اتنی بدگمانی! اتنا زہر۔ آیت۔۔۔ وہ دنگ ہی تو رہ گیا تھا اس کے اپنے بارے میں خیالات سن کر۔ آیت کی ممانی کی باتیں اور انداز جب برداشت سے باہر ہوا تو وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ رہا تھا جب اپنے نام کی تکرار پر ان دونوں بہنوں کے کمرے کے سامنے رک گیا تھا۔

”یہی تو تمہاری بے وقوفی کی انتہا ہے جاہل لڑکی! غلطی کرنے پر اپنے بہت ایہوں کو ٹوکا جاتا ہے، سرزنش کی جاتی ہے۔ اور جو ایسا نہیں کرتا وہ آپ کا اپنا نہیں ہوتا۔ سدیس تم سے بہت محبت کرتا ہے یہ میں بہت

پہلے سے جانتی ہوں مگر تم جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو الفاظ کے ہیر پھیر میں الجھنا پسند کرتی ہیں۔ وقت تو آنے دیتیں عملی زندگی میں اسے اپنی محبت ثابت کرنے کا۔ مگر تم تو لفظوں کے سنہرے جال میں ہی پھنس گئیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ممانی کے الفاظ کی شیرینی کے پیچھے چھپی چالو سی کو تمہاری عقل جانچ پائی نہ سدیس کی سرزنش میں چھپی اپنی محبت کو خیر خواہی کو پرکھ سکیں۔“

آمنہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بے حس لڑکی کو جھنجھوڑ کر رکھ دے جس نے کئی دنوں سے اپنے دماغ کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی خراب کر رکھا تھا۔

اس کے دل کی دنیا کیوں نہ لٹ جائے۔۔۔ میں منالوں کا سب کو۔۔۔ میرا یقین رکھو۔۔۔ اس نے آیت کے کھلے سر کو دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی بات مکمل کر کے رکھا نہیں تھا۔

”ختم کر دیا تم نے سب کچھ آیت! اپنے ہاتھوں سے اپنی خوش قسمتی کا دروازہ بند کر دیا۔“ آمنہ، سدیس احمد کے قدموں کی ٹھٹھکی پر بڑبڑائی۔

”بھی تو میرے حق میں بول دیا کرو آمنہ! کبھی تو میرے لیے بھی دعائیہ کلمات کہہ دیا کرو۔ جس طرح سدیس کو گلہ رہا تھا کہ میں نے تایا تائی سے اس کے جیسے کی محبت چھین لی تھی۔ اس نے بھی تو بدلے میں تمہاری محبت اور طرف داری میری نسبت زیادہ پائی ہے ہمیشہ۔ اب ماں جاؤ پلینز تاکہ میں پوری طرح خوش تو ہو سکوں۔ تمہاری ناراضی مجھے خوش ہی نہیں ہونے دے رہی۔“ وہ اداسی سے بولتے ہوئے آمنہ کے قریب آئی۔ جس نے صرف ایک نظر اسے دیکھ کر گلے سے لگا لیا تھا۔



تایا تو سن کر سکتے میں رہ گئے تھے کہ آیت کی مرضی اپنے ماموں زاد کے لیے ہے۔ ورنہ ان کا تو ارادہ یہی تھا کہ ایک دو دن میں ماموں کے گھر رشتے سے انکار کروا کے سدیس سے اس کی باقاعدہ بات طے کر کے جلیس کے ساتھ ان کی شادی بھی کر دی جائے گی۔

”چلو ایسے ہی سہی، جیسے وہ چاہتی ہے ویسا ہی ہو گا۔“ تائی جی نے آہستہ سے ان کو آیت کی مرضی کا بتایا تھا۔ کچھ لمحے خاموشی کے بعد تایا جی نے ایسے کہا جیسے انہیں اس بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔

”ہاں اللہ نصیب اچھا کرے۔۔۔“ تائی جی نے بھی تائید کی جبکہ پاس بیٹھی آمنہ خواہ مخواہ میں شرمندہ ہو گئی۔

”سب کیوں اس کی بات آرام سے مان رہے ہیں۔۔۔ اسے کوئی روکتا کیوں نہیں۔۔۔ ڈانٹتا کیوں نہیں۔۔۔ آپ آپ کہیں ناں تایا جی اس سے وہ نا سمجھ ہے۔۔۔ بد وقتی کر رہی ہیں تو آپ کو اسے سمجھانا چاہیے۔“ وہ در

دی تھی۔ تایا جی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”ناں۔۔۔ ناں رومت میرے بچے! وہ کہیں اور نہیں اپنے مامے کے گھر ہی تو جاری ہے بچے! اپنے ہیں دیکھ بھالے ہیں اور بھلا کیا چاہیے ہوا ہے۔ اس کے اچھے نصیب کے لیے دعا کرو آمنہ پتہ! بار بار اس کو باتیں مت سناؤ۔ ڈانٹو مت۔ میں دیکھ رہا ہوں تم اس رشتے والی بات سے اس سے ناراض ناراض سی ہو۔ ایسا مت کرو بیٹا جی! یہ حق تو ہر لڑکی کو ہمارا مذہب دیتا ہے اس نے کچھ غلط نہیں کیا بس اپنی مرضی بتائی ہے۔“

”اور سدیس کا کیا ہو گا تایا جی! پتا نہیں۔ کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ جتنا خوش اس گھر میں رہ سکتی ہے اور کہیں نہیں بھلا میرے اور تائی جیسے لاڈ کون اٹھا سکتا ہے اس کے۔“ آمنہ نے بھرائی آواز میں کہا تو تایا جی ہنس پڑے۔

”او میری جھلی دھی ہے تو بھی آمنہ! دھیاں تو سب کی لاڈلی ہوتی ہیں۔ بس تقدیر آگے بھی لاڈ اٹھانے والے عطا کرے۔ یہی دعا کرو بس اور سدیس ماشاء اللہ سمجھ دار بچہ ہے۔ کچھ دنوں تک شادی ہو جائے گی تو نئے رشتوں میں بہت چمک ہوتی ہے پر اپنی محبتوں کو خود میں سمو لیتے ہیں۔ عام طور پر ایک ہی گھر میں رہنے والے بچوں میں ایسا لاڈ و قدرتی بات ہے۔ مگر اب آیت پتہ کی مرضی نہیں ہے تو دونوں اپنی شادی کے بعد یہ بات بھی بھول بھال جائیں گے۔ شاباش تو فکر نہ کر۔“

”ہاں آمنہ! ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ تو نصیبوں کی بات ہوتی ہے اور نصیبوں سے بھی کوئی لڑ سکا ہے بھلا۔ تم میری فکر چھوٹو اور شادی کی تیاری کرو۔ اماں بتا رہی ہیں کہ تم آیت سے بات بھی نہیں کر رہیں۔ بہت غلط کر رہی ہو۔ شاباش اپنا موڈ ٹھیک کر کے اس بے وقوف لڑکی کو بھی مناؤ جو منہ بنائے پھر رہی ہے۔ بھی مجھے تو اپنے گھر کا یہ اداس اداس ماحول ذرا نہیں پسند آ رہا۔“

سدیس اور جلیس بھائی اکٹھے اندر داخل ہوئے تھے۔ جب ان کے کانوں میں ابا کی کچھ باتیں پڑیں تو

اسی قسم کے طرز عمل کی ان کا ماحول عکاسی کرتا تھا۔



سردیس نے قصداً خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

آمنہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے کہنا چاہتی ہوں۔ بھلا رانی محبتیں بھی اتنی جلدی اور آسانی سے بھلائی جاسکتی ہیں جن کی جڑیں نچانے کہاں کہاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے پھیکا سا مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ جلسیں بھائی نے بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

نیا جی کے ہاں کرتے ہی ماموں کی فیملی ایک بار پھر آ کر مگنی کی رسم طے کرنے کے ساتھ ساتھ شادی کی تاریخ بھی رکھ گئی تھی۔ جو کہ آمنہ اور جلسیں کی شادی کے ایک ہفتہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔

زاشی نے مملی سے اصرار کیا تھا کہ مگنی کے موقع پر اس کی اور سردیس کے رشتے کی بات بھی کی جائے مگر مملی نے اسے سمجھا بھالیا تھا کہ مگنی کا موقع اس بات کے لیے قطعاً مناسب نہیں ہے۔ ایک ماہ بعد جب شادی پر نکاح ہو گا تو وہ نکاح سے کچھ دیر قبل یہ پیشکش رکھیں گی نیا جی کے سامنے تاکہ دباؤ میں آکر وہ انکار نہ کر سکیں۔ زاشی طوعاً و کرہاً ماں کی ہان گئی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ مملی کا سرے سے ایسا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ آمنہ نے اب آیت سے بات چیت شروع کر دی تھی۔

تاہم ان کے درمیان ہلکی سی اجنبیت ضرور در آئی تھی۔ مگنی کے بعد سے آیت یا تو اپنے خیالوں میں گم رہتی یا احمر سے فون پر لمبی لمبی بات کیا کرتی تھی۔ مگنی کے بعد اس نے موبائل کو مزید چھپانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ ویسے بھی اب اس کے خیال میں اب ان کے درمیان ایک رشتہ موجود تھا جس کے تحت وہ بات کر سکتے تھے۔ احمر سے بات چیت کے بعد اس کے خیالات میں تیزی سے تبدیلی آرہی تھی۔ بعض اوقات اس کی ہنسی کی آواز سے نائی جی اور آمنہ نظریں چرا جاتیں کیونکہ اسی گھر میں جلسیں سے باضابطہ رشتہ طے ہونے کے بعد آمنہ اس سے باقاعدہ پردہ کرتی تھی کہ یہی مذہب بھی جیتا تھا اور یہی ان کی روایات تھیں اور

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ نائی جی! منع کر دیں آپ کہ ہم لوگ نہیں بیچ رہے آیت کو وہاں شادی کر کے لے جائیں گے پھر بھلا جیسا ان کا ماحول ہے ویسے ڈھال لیں اسے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا مگر یہ کیا بات ہوئی کہ لڑکی بیس دن پہلے ہونے والی سسرال جا کر رہے اور اپنی شادی کی خریداری کرے۔ ان کا ہو گا ایسا ماحول ہمارا نہیں ہے۔ اپنی مرضی کا لے لیں سب کچھ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

ناپ وی تھا جو وہ اس دن لے گئے۔ اب یہ بھلا کوئی تک نہتی ہے کہ لڑکا بھی آج کل میں پاکستان پہنچنے والا ہے۔ ساتھ مل کر شاپنگ کی جائے گی ہونہ۔“ آمنہ تو مملی کے فون کا اور ان کی فرمائش کا نائی جی کی زبانی سن کر بھڑک اٹھی تھی۔ آیت نے البتہ ضرور اسے شاکی نظروں سے دیکھا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! مگر اس قسم کے رشتوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔“ نائی جی کچھ تذبذب کا شکار ہو کر بولیں۔ ان کی موجودگی میں تو آیت چپ رہی مگر نائی جی کو تیار کرنے جب کسی کام کے لیے بلایا تو وہ بات کو وہیں ادھورا چھوڑ چلی گئیں تب ان کے جانے کے بعد آیت گویا پھٹ پڑی تھی۔ جب آمنہ نے اس سے پوچھا۔

”تم خود بتاؤ آیت! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں میرے تو خیال میں مملی کو کال کر کے تم خود ہی منع کر دو۔“ ”اور مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے میری بات سے جیلس ہو رہی ہو۔“ آیت کے ٹھنڈے ٹھار لہجے کی سردی زیادہ تھی یا اس کے الفاظ کی دھار زیادہ نوکلی تھی۔ آمنہ اس پر لب سمجھ نہ سکی تھی آیت مزید گویا ہوئی۔

”پہلے پہل میں اسے ایک بہن کی فطری جذبات سمجھی تھی کہ میری بہن مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ وہ مجھے خود سے دور نہیں کر سکتی۔ مگر جیسے جیسے وقت

گزر گیا مجھے میری سمجھ میں آ گیا آمنہ کہ تم سے
برداشت ہی نہیں ہو رہا کہ تم گاؤں کے ایک معمولی گھر
میں زندگی گزارو اور تمہاری بہن کینڈا جیسے ملک میں
جا کر عیش کرے۔ تم جلیں بھائی جیسے عام لی اے پاس
کسان کی بیوی بنو اور تمہاری بہن احمر جیسے پائی
کو الیفائیڈ، فارن پلٹ شخص کی ہمراہی میں زندگی
گزارے۔

مجھے اس شادی سے روکنا سہل کی محبت نہیں
تھی تمہاری جیسی تھی آمنہ! جو تم قدم قدم پر ظاہر کر
رہی ہو۔ ماں تو بہت عرصہ پہلے میں کھوپکی ہوں اب
مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے بہن بھی کھودی ہے۔
”بکو اس بند کو اپنی! میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے
رشتوں اور ایسی زندگی پر جس نے تمہاری عقل،
بصارت تو کیا مجھے کی حس تک چھین لی ہے میرے
نزدیک رشتوں کا خلوص اور اپنا پن معنی رکھتا ہے بس
اور وہ سب کچھ مجھے پوری دنیا میں صرف اسی گھر میں
مل سکتا ہے۔ نجائے کیوں مجھے تو تم پر غصہ بھی نہیں آ
رہا ترس آ رہا ہے۔ تمہاری سوچ کی پسماندگی پر۔ میری
طرف سے جو چاہو، جیسے چاہو ویسے کرو، میں اب کوئی
بات نہیں کروں گی کہ تم نے تو ہم دونوں کا معمول رشتہ

مارکیٹ لے کر گئی تھیں پھر ضروری شاپنگ کرانے
کے بعد پارلر لے کر گئی تھیں۔ دو گھنٹے کی محنت کے بعد
اس کاؤنیزر حسن مزید نکھر گیا تھا۔ ضروری ٹرٹمنٹ کے
بعد ممائی نے ایک سائنٹسٹ سوٹ تبدیل کروانے کے
بعد اس کا ہلکا ہلکا میک اپ بھی کروا دیا تھا، آیت نے
ایک دو دفعہ پوچھا بھی تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ بس
معنی خیزی سے ہنسا کہ جیسا وہ کہہ رہی ہیں،
وہ ویسا کر لی جائے۔

”اب تو بتائیں ممائی! یہ سب کیا ہے؟“ اگرچہ اپنا
یہ روپ اسے بے حد پسند آیا تھا مگر ممائی کے پراسرار
انداز پر اب وہ الجھن کا شکار تھی۔ ویسے بھی آمنہ سے
ہونے والی کل کی رات کلائی کے بعد سے وہ دل ہی دل
میں بے حد پچھتاتی تھی کہ جذبات میں وہ پتا نہیں کیا کیا
تھی مگر اب تو آمنہ کا سرد انداز اور خود اس کی اپنی انا
آڑے آئی تھی اور وہ آمنہ سے معافی کا ارادہ ہی
باندھتی رہ گئی تھی کہ ممائی صبح ہی صبح اسے لینے آن
پہنچی تھیں اور ممائی کی آمد اسے ہمیشہ سدھ بدھ بھلا
دیتی تھی۔

”بھئی میں تو سربراہی رہتا چاہ رہی تھی گھر پہنچ کر

مگر تم سے صبری نہیں ہو رہا تو سن لو کہ احمر کل شام کا
پاکستان پہنچ چکا ہے۔ تم لوگ چونکہ پہلی مرتبہ ملو گے تو
میں چاہتی تھی کہ کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہ جائے اور وہ
دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے اور داد دے میری پسند کی کہ
کیسا بہتر اس کی ماں نے اس کے لیے ڈھونڈا ہے۔“
ممائی نے فخریہ انداز میں کہا۔ آیت کا منہ کھلے کا کھلے رہ
گیا۔ وہیں دل میں کہیں عجیب سے جذبات سر
اٹھانے لگے پہلی بار روبرو ہونے کا خیال اتنا جواں فزا
تھا کہ وہ خیالوں ہی خیالوں میں کہیں دور نکل گئی تھی۔
”ممائی آپ نے تانی۔ میرا مطلب ہے میں گھر
ذکر کیا تھا احمر کے آنے کا کچھ دیر کے بعد خیال آنے پر
اس نے جھجک کر پوچھا۔

”ارے نہیں جھجی! مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے
کیا تم نے۔ میں نہیں جانتی کہ کیا گاؤں میں رہنے

ہی شک کے ترانہ میں تول ڈالا۔
پھر بھی دعا ہے کہ اللہ کرے تمہارے وہ سارے
خواب سچ ثابت ہوں جن کی ظاہری چمک دک نے
رشتوں کا ہی مذاق بنا ڈالا۔“ آمنہ کہہ کر رکی نہیں
تھی۔ باہر جا کر دم لیا تھا اور نجائے اس کی اور تانی کی
مزید کیا بات چیت ہوئی تھی کہ اگلی صبح ممائی صبح
ڈرائیور آیت کو لینے آن پہنچی تھیں۔

جاتے سے نہ تو آمنہ نے حسب معمول نصیحتوں کا
پلندہ اس کے ہمراہ کیا تھا نہ دروازے تک رخصت
کرنے آئی تھی۔ ممائی سے مل کر وہ کہیں میں جو گم ہوئی
تھی آیت کے جانے کے بعد باہر نکلی تھی ہاں اس کی
آنکھوں کی سرخی ضرور گواہ تھی کہ وہ اپنی بہن کی بے
وقتہی پر بہت دیر روئی رہی تھی۔

ممائی شہر آ کر گھر لے جانے کے بجائے اسے

والی لوگ کس قدر تنگ نظر ہوتے ہیں اس حوالے سے۔۔۔ انہوں نے کسی قدر حقارت سے کہا تو آیت کو کچھ خاص اچھا نہ لگا تھا ان کا لہجہ۔ تاہم کچھ بولی نہیں تھی۔

”واؤ لکننگ سوپر بی این انویسٹ۔۔۔ ممی آپ نے احمر کا پورا ہندوستان کرنے کا پروگرام بنالیا۔۔۔ اسے دیکھ کر زاشی نے سر ہلایا اور ممانی سے کہا۔

”بالکل۔۔۔ میری بیٹی ہے، اتنی خوب صورت کہ جو دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ احمر بھی دیکھنا، کینڈین لڑکیاں چھوڑ کینڈا کو نہ بھول جائے پھر کہنا، ہے کہاں احمر بلاؤ اسے۔۔۔ ممانی نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور زاشی سے کہا۔

”وہ تو بہت دیر ہوئی دوستوں کی طرف نکلے ہوئے ہیں۔ عرشی اپنی فرینڈز کے ساتھ وہ اپنے۔۔۔ میری بھی فرینڈ کی برتھ ڈے ہے۔ نکل ہی رہی تھی کہ آپ لوگوں کو دیکھ کر رک گئی۔“ زاشی نے بتاتے ہوئے درمیانی میز پر پڑا اپنا آؤچ اٹھایا اور بائے بائے کرتی باہر نکل گئی۔

”آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہے۔۔۔ تم بیٹا جا کر ذرا ریسٹ کرو۔۔۔ میں اس لڑکے کا ہتا کروں کہ کہاں ہے۔“ ممانی نے اپنے بالکل پاس دھرے پرس میں سیل نکال کر نمبر ملایا اور آیت سے کہا۔ آیت اثبات میں سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”احمر کے بچے! کہاں ہو؟ تمہیں کہا بھی تھا کہ میں آیت کو لے کر گھر آ رہی ہوں۔ گھر پر ہی رکھو۔۔۔“ ان کی بات سن کر آیت کے قدم زرا دیر کو ست پڑے مگر اگلی بات سننے بغیر وہ ایک نئی الجھن لیے گیٹ روم کی طرف آ گئی۔

کیا احمر اس سے نہیں ملنا چاہتا؟ پھر ممانی کے بتانے کے باوجود رکاوٹیں نہیں گھر پر؟ آئینے کو اپنے بے حد خوب صورت نظر آتے عکس پر نظر جماتے اس نے سوچا۔



”پوچھیں ذرا اس سے۔۔۔ اب جب بڑی مشکل

سے ہی سہی سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا ہے تو کیوں یہ سب برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔۔۔“ ممانی نے تیز لہجے میں ماموں سے کہا۔ احمر ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بالکل پاس ہی عرشی ایک میگزین کی ورق گردانی کرنے میں مگن تھی جیسے اسے اپنی کسی سے کوئی سروکار نہ ہو زاشی البتہ ماں کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔

”ہاں تو میاں۔۔۔ کیا تکلیف ہے تمہیں۔۔۔ تم سے کوئی تقاضا نہیں کر رہے نہ کوئی ڈیمانڈ۔۔۔ بس آرام سے شادی کر کے بھلے چلے جاؤ واپس۔۔۔ ہر سال جیسے چکر لگاتے ہو لوگ جایا کرتا۔“

”بھائی ایسا ٹھیک کہہ رہے ہیں یا تو آپ کو پہلے ہاں نہیں کرنی تھی اس شادی کے لیے۔۔۔ اب شادی سے ایک ماہ پہلے آپ آکر کہہ رہے ہیں کہ آپ کو شادی نہیں کرنی۔“ زاشی نے ماں کا ساتھ دیا۔ مگر احمر تو جیسے پھٹ پڑا۔

”ہاں تو ایک بار غلطی ہو گئی نانتا ہوں۔۔۔ وہ بھی ممی کے کہنے میں آکر یار فتمیں دے کر دودھ نہ بجھنے کا ٹھیکر جذباتی ڈانٹا مگر زسے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں

اس معصوم لڑکی کو اپنی طرف مائل کروں۔۔۔ میں بھی ایسے ہی سب کچھ جلتے دینا چاہ رہا تھا مگر جانتی ہو زاشی! وہ ایک بل کے لیے رکا۔

”بچھلے بھٹتے میری بیٹی پیدا ہوئی اور تین دن پہلے جب میں اسے لے کر بیٹھا اس کے چہرے کے نقوش کو دیکھتے تھے وہاں کسی اور کا چہرہ ابھر آیا۔۔۔ بائے گاؤ! میں کانپ گیا یہ سوچ کر کہ آج میں کسی کی بیٹی کے ساتھ دھوکا کر رہا ہوں خدا نہ کرے کل میری بیٹی کے ساتھ ایسا ہوا تو کیا کروں گا؟ بس پہلی فرصت میں میں نے ٹکٹ کٹایا اور فیسی کو ممی کی بیماری کا ہتا کے یہاں آ گیا ہوں۔

میں پہلے جذباتی دباؤ کے تحت اس معصوم لڑکی کے جذبات سے کھینچا رہا ہوں جس کا افسوس مجھے تا عمر رہے گا۔ آپ لوگ میری بات کا یقین کریں کہ میں یہاں آ جاؤں گپا کستان واپس۔ اگرچہ فوراً نہیں ممکنہ

تین سال میں میرا وہاں سے سب کچھ واپس لے کر کے واپس آنے کا ارادہ ہے۔ مگر میں یہاں دوسری شادی نہیں کر سکتا۔

”رہنے دو بھائی۔۔۔ آٹھ سال سے یہی لارے سن رہے ہیں تمہارے۔ ہم کسی کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کر رہے۔ شادی کے کچھ دن بعد میں آیت کو خود تمہاری شادی کا بتا دوں گی۔ بچوں کی شادی ہو جائے گی۔ اب اگر ہم میاں بیوی اپنے بڑھاپے کا سہارا چاہتے ہیں تو تم مان کیوں نہیں جاتے۔ مالی لحاظ سے دو بیویاں رکھ سکتے ہو تم۔ مان بھی لوں کہ تمہاری انگریز بیوی یہاں آنے پر راضی بھی ہو جائے تو ہم بڑھاپہ بھی کو خاک منہ لگاتا ہے اس نے۔

آیت اچھی فرماں بردار بچی ہے۔ ایک آدھ دن کے لیے آتی ہے تو ایسے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہے گویا اس کا اپنا ہی گھر ہو۔ بہو بن کے ہمیں وہ سنبھالے کی تو اور کون سنبھالے گا؟ میں کہہ دے رہی ہوں احزاب موقع کے اور پھر تو نے انکار کیا تو میں زہر کھا لوں گی بس۔۔۔ آج وہ بچی آئی ہوئی ہے۔ اس سے کوئی بھی فضول بکواس کیے بغیر تم نے اسے پوری کمپنی

دینی ہے اور اپنی محبت کا بھرپور یقین دلانا ہے۔ یہ جو خناس وہاں سے بھر کے آئے ہو اسے وہیں کہیں دماغ کے اندر دفن کر دو۔۔۔ ممائی اب یہی تو اپنے جلائی روپ میں آئی تھیں۔ احزابے بسی سے سب کو دیکھ کر رہ گیا۔ ”تمہاری ممی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں احزاب! سب کچھ بھلا کے شادی کی تیاری میں بھرپور حصہ لو۔ آیت واقعی بہت اچھی بچی ہے۔ تم سے صرف اتنی گزارش ہے کہ شادی کر کے خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔۔۔ آگے تمہاری ممی جانیں اور میں جانوں۔“

دروازے میں ساکت کھڑی آیت کے آنسوؤں نے بھی اندر کہیں جا کر برف کی چادر اوڑھ لی تھی۔ ایک خوفناک سناٹا تھا جو اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اندر بیٹھے فرعونوں کے درمیان اب بھی اس کی قسمت کا فیصلہ زیر بحث تھا۔

”ارے وہ تو اتنی بھولی بچی ہے کہ اکثر اسے زاشی کے ایک دو بار پہنے گئے کپڑے جو تودے دیتی ہوں۔ خوش ہو کر لے لیتی ہے۔“ ممائی کے کہنے پر اسے خود سے گھٹن آئی۔۔۔

اپنے گھر میں سدیس تایا، جلیس بھائی ہوں یا تائی ہر خریداری پہلے آیت کے سامنے لائی جاتی جو وہ پسند کرتی اس کے بعد باقی سب کی باری آتی تھی۔ خلا میں چلتی وہ گیٹ روم میں واپس آتی تھی۔۔۔ کیکپاتے ہاتھوں سے اس نے زندگی میں پہلی بار سدیس کو کال ملائی تھی۔ جس کا نمبر نہ جانے کس کیفیت میں اس نے پچھلے ہفتے ہی فیڈ کیا تھا ورنہ تو اس کے سیل پر صرف احمر کی کال آتی تھی۔

”میرے ماموں کے گھر کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو۔“ اس نے سدیس کی پہلو کے جواب میں فوراً کہا۔ آیت کی روٹی روٹی آواز پر وہ ٹھٹک گیا، چونک گیا۔ ”کیوں خیریت؟ تم کہاں ہو؟ پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔“

”جلدی سے یہاں آ جاؤ سدیس! میں گیٹ کے پاس ہی ملوں گی تمہیں۔ روڈ پر آتے ہی نیل دتا میں آ جاؤں گی۔ مجھے ابھی کے ابھی گھر چھوڑ کے آؤ۔“

اس نے کسی بھی سوال کا جواب دیے بغیر کال ڈراپ کر دی۔

یقین تھا کہ اس نے پندرہ منٹ کہا ہے تو واقعی پندرہ منٹ میں ہی گیٹ پر ہو گا۔ بیک ہیڈ کے نیچے سے ٹھیسٹ کر اپنا ایک سوٹ نکال کر تبدیل کرنے کے بعد رگڑ رگڑ کر منہ دھویا جس کا آدھا میک اپ آنسوؤں نے دھو دیا تھا۔ جب تک وہ چادر لپیٹ کر بیگ اٹھا کر تیار ہوئی۔ اس کے سیل پر سدیس کی مس کال اور باہر چہنچہ کا مسمیہ آچکا تھا۔

مضبوط قدم اٹھاتی وہ گیٹ روم سے باہر آ گئی۔ اب وہ وہی پرانی والی آیت تھی تندر، دو ٹوک، ہر بات منہ پر کہہ دینے والی۔ کچھ دیر پہلے کی جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو نیوالی آیت سے قطعاً ”مختلف۔“

یہ سفر زیادہ دور تک طے نہیں ہوا تھا ورنہ بہت مشکل ہو جاتی۔۔۔ میرا کزن مجھے باہر لینے آچکا ہے۔ ماموں آپ اپنی بہن کی طرح ہمیں بھی مرا ہوا تصور کر لیجئے گا اور ممائی صرف ایک بار ہی سوچا ہو تاکہ آپ کی بھی دو بیٹیوں ہیں۔۔۔ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی تیزی سے باہر آئی تھی کہ باہر سے مسلسل بارش بج رہا تھا۔

”ارے۔۔۔ تمہارے پاس تو بایک تھی ناں۔۔۔ یہ گاڑی کہاں سے آئی؟“ اگلا دروازہ اس کے لیے کھولے سدیس اس کا منتظر تھا۔ گاڑی دیکھ کر آیت نے کہا تو اس کے بیٹھے ہی سدیس نے اس سے بیگ لے کر پچھلی نشست پر اچھالا اور خود گاڑی آگے بڑھا دی۔

”اب اس وقت تمہیں بایک پر لے جا کر میں نے اماں، ابا سے مار نہیں کھائی تھی۔ دوست کی لے کر آیا ہوں۔ اب جلدی سے شروع ہو جاؤ کہ اس ایمر جنسی کال اور ارجنٹ واپسی کا کیا چکر ہے۔“ مین روڈ پر آتے ہی اس نے گاڑی کی اسپید بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ خود غرض رشتے ان کو نکال کی مانند ہیں جو اگر جلتے ہوئے ہوں تو زخم دیتے ہیں اور اگر بجھ چکے ہوں تو ہاتھ کالے کرتے ہیں۔ اس بات کا مطلب آج پورے معانی و مفہوم کے ساتھ میری سمجھ میں آیا ہے۔ ورنہ جب میں نے یہ پڑھا تھا پھر اپنے رشتے ذہن میں لاتے ہی میں نے سوچا تھا بھلا رشتے کبھی کبھی خود غرض ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے گرد بے غرض رشتے جو دیکھے تھے۔ اور آج رشتوں کا جو روپ میں نے دیکھا ہے۔ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو انہوں نے مجھے زندہ درگور کرنے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔“ پھر اس نے آہستہ آہستہ ساری روڈ او سدیس کے گوش گزار کر دی۔ جس کو سن کر منوں بوجھ سدیس نے اپنے سر سے ہٹا محسوس کیا۔

”تم رورہی ہو۔۔۔؟ ایسے ہی میں تمہیں بے وقوف نہیں کہتا۔“ وہ اسے آنسو صاف کرنا دیکھ کر تاسف سے بولا۔

ممائی کے کمرے میں ابھی بھی میٹنگ جاری تھی جیسی احمر اور ممائی کی تیز آواز ایک ساتھ آرہی تھی، ایک تلخ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ اس نے پورے اعتماد سے دروازہ کھول کر قدم اندر رکھا۔ اس بل آیت کو دیکھ کر سب کو سانس سونگھ گیا تھا گویا اس نے پہلے سے اتاری ہوئی ڈائمنڈ کی انگوٹھی جو ممائی نے بات کی ہونے پر اسے پسائی تھی درمیانی میز پر رکھی۔

”میں اتنی کمزور ہرگز نہیں تھی ممائی جتنی آپ نے مجھے سمجھ لیا تھا۔ مجھے کمزور کر گیا تھا میری ماں کی طرف سے بجا۔ آخری خونی رشتہ۔۔۔“ اس کی آواز بھر اگئی۔ ممائی کا رنگ فق پڑ گیا۔ ماموں گڑبڑا گئے۔

”آمنہ کہتی رہی کہ میری ڈانٹ سے ہی زندگی کے کچھ سبق سیکھ جاؤ ورنہ زندگی ٹھوکر لگائے بغیر سبق نہیں سکھائی اور آپ سب نے مجھے زندگی کے تلخ ترین سبق پڑھائے ہیں۔ ٹھوکر تو بہت شدید ہے۔ تکلیف بھی حد سے سوا ہے مگر اللہ کے کرم سے مجھے سنبھالنے والے بہت ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔ مجھے زیادہ عرصہ یہ تکلیف یاد دھو کا یاد نہیں رکھنے دیں گے۔ دکھ تو سب سے زیادہ مجھے آپ کی طرف سے ملا ہے۔

ماموں! یہ سب غیر سہی آپ سے تو خون کا رشتہ تھا میرا، بھانجی نہ سمجھتے، یتیم سمجھ کر ہی ایک لفظ میری حمایت میں بول دیتے تو آج اسی لفظ سے ہی مالا مال ہو جاتی ہیں۔

”اور احمر!۔۔۔“ اب وہ ساکت بیٹھے احمر کی طرف مڑی۔

”آپ کی طرف سے مجھے کوئی گلہ نہیں ہے، پتا نہیں آپ اپنی بھانجی کی جنگ لڑ رہے تھے یا کل کو مکافات عمل سے بچنا چاہتے تھے، دونوں صورتوں میں مجھے اس فریب سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے آپ کی اس غلطی کو معاف کرتی ہوں جو مجھے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے آپ نے کی تھی۔ شکر ہے

”ارے پار شکر کا مقام ہے یہ تو۔۔۔ مجھ سے پوچھو۔۔۔ میرا بس نہیں چل رہا کہ گاڑی بیچ سڑک روک کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دوں۔۔۔ میں تو ایسے خود غرض اور مطلبی لوگوں پر اپنی سوچ کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کروں اور تم اپنے قیمتی آنسو ضائع کر رہی ہو۔۔۔ دفع کرو اور ایک بات کان کھول کر سن لو کہ شادی کی تاریخ وہی رہے گی بس دو ماہ بدلے گا ان شاء اللہ۔۔۔ ذرا اپنی عقل استعمال کرو کی تو پتا چلے گا کہ یہ میری دعائیں ہی تھیں جنہوں نے وقت پر تمہیں ان فریبی لوگوں سے بچا کر میرے لیے محفوظ رکھا۔۔۔ اور اب میں اور کسی رسک لینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم نہیں جانتیں آیت کہ میری محبت تم سے اتنی پرانی۔۔۔ اتنی شدید ہے تمہارے کسی اور کے ہونے کے تصور نے میری جان ہی نکال دی تھی۔“ ایک جذب سے اس نے کہا۔

”اچھا۔۔۔ ابھی سے ایسی باتیں مت کرو۔۔۔ میں نے ابھی ہاں نہیں کی۔“ اس کی داستان محبت لمبی ہونے سے پہلے ہی آیت نے پٹنا کر اسے روک دیا۔

”کمال ہے یار! آمنہ بھابھی کتنی ہیں کہ اظہار محبت نہ کرنے کی پاداش میں آیت تم سے دور ہو گئی اور اب آیت محترمہ تو ابھی محبت کے حرف میم کا عشرِ عشر بھی نہیں سن سکیں۔“ وہ منہ ہٹا کر بولا تو اس کے اس انداز پر آیت بے اختیار کھکھلا کر ہنس دی تھی۔

ساری کشاف دھل جانے کے بعد والی شفاف اور ساہو ہنسی جس نے سدیس کا اندر تک مطمئن کر دیا تھا۔

”میرے اللہ کا خاص کرم ہو گیا مجھ پر آیت بی بی! ورنہ تم نے تو اپنے ساتھ مجھے بھی ڈوبنے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا اپنی کزن کو میرا نمبر دے کر۔ پتا نہیں کیسی سائیکو لڑکی ہے کہ میرے روڈی بیو کے باوجود دن میں کئی مرتبہ کلز کرتی ہے اور تو اور خود سے رشتہ کی پیش کر دیا اپنا کہ آیت کی خواہش ہے کہ مجھے سدیس کی دامن بننا چاہیے۔ مت پوچھو کہ میرا دل کیا جا کر تمہارا لگا دیا ہوں اسی وقت۔“

آیت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کیونکہ زاشی اسے سدیس اس سے کتنی محبت کرتا ہے کے کئی قصے سنا چکی تھی اور یہ بھی کہ وہ اس سے شادی کے لیے اصرار کر رہا ہے۔ تب آیت نے دل میں سوچا تھا۔ ہونہ جھوٹا پہلے مجھ پر ڈورے ڈالے جب میں نے انکار کیا تو زاشی کو پھنسا لیا۔

”تم۔۔۔ تم اب اس کی کوئی کال ریسیو نہیں کرو گے۔۔۔ بلکہ وہ سم ہی نکال کر پھینک دو۔ ایک نمبر کی جھوٹی لڑکی ہے وہ بلکہ تم اسے جلد از جلد یہ اطلاع بھی دو گے کہ اب تم سے کوئی مطلب نہ رکھے کیونکہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“

”کس سے ہو رہی ہے؟ اس کے بارے میں کیا کہوں۔“ آیت کے غصے سے کسی گئی بات کو سن کر اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

”مجھ سے اور کس سے۔۔۔“ اس کے ترنت جواب پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور فوراً ”جیب سے موبائل نکال کر نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی اس نے ہو ہو وہی الفاظ دہرائے جو آیت نے کہے تھے۔ اس کے بعد دوسری طرف کا جواب سنے بغیر سیل آف کر اس میں سے سم نکال کر اسے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دو ٹکڑے کر کے باہر اچھالا اور گاڑی دوبارہ سے اشارت کر دی۔

”کوئی اور حکم ہے تو حکم کیجئے ملکہ عالیہ!۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ اور کچھ نہیں بس گاڑی تیز چلاؤ۔ ہمیں رات گہری ہونے سے قبل گاؤں پہنچنا چاہیے۔ تالی جی اور تایا بہت یاد آرہے ہیں اور ابھی تو آمنہ سے بھی معافی مانگنی ہے مجھے۔“ آسودگی کا سانس لیتی آیت سیٹ کی پشت سے سر نکالتے ہوئے بولی تو سدیس نے مسکراتے ہوئے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

چودھویں کا چاند بھی مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ سفر میں تھا۔





انجمنِ قیامِ قیام

موحد نے گوکہ ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا۔ مگر ایک مرد کے ہاتھ کا تھپڑ مہر ماہ کو ہلا گیا۔ وہ سلگتے گال پر ہاتھ رکھے پہلے تو بے یقینی سے موحد کو دیکھتی رہی پھر ٹھوگیا پیش میں آگئی۔ لال بھبھو کا چہرہ لیے اس نے دونوں ہاتھ موحد کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا اور غرائی۔

"ہاؤڈیر یو؟" (تمہاری ہمت کیسے ہوئی)

وہ اس کے دھکے سے اپنی جگہ سے تھوڑا سا لڑکھڑا گیا۔ وقتی غصے کی لہر گزرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ مہر ماہ پر ہاتھ اٹھانے کی کتنی گری ہوئی حرکت کر چکا تھا۔ مہر ماہ کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے وہ اس قدر شدید بے یقینی اور صدمے کی زد میں تھی کہ رو بھی نہیں پائی تھی۔

"اور تم۔۔۔ تم کیا کرتی پھر رہی ہو جانتی ہو؟ اللہ جانے کس سے مل کر ایک لاکھ دے کر آگئیں۔ یہ سب باتیں میں جا کر آغا جان یا تمہاری فیملی کو بتاؤں تو پھر پتا چلے نہیں۔ کہاں سے آیا وہ محرم تمہارا؟" موحد اس سے بھی اونچی آواز میں دھاڑا۔ وہ مہر ماہ کو خود پر حاوی ہونے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔

"نکاح میرا ہوا ہے میں نے خود اسے وہاں دیکھا تھا۔ اس سے بات کی تھی۔ مہر ماہ کے احساسات بگھلنا شروع ہوئے تو رونا بھی آنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مگر نکاح کے وقت تم نے اسے اپنے مقابل نہیں دیکھا مہر ماہ۔ اور نہ ہی تمہارے پاس کوئی نکاح نامہ موجود ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم ایک فضول شخص کی باتوں میں آکر نہ صرف اس سے بلیک میل ہو رہی ہو بلکہ اسے اپنا محرم بھی سمجھ رہی ہو۔" وہ اس کی بات سن کر تیز مگر ناگوار لہجے میں بولا۔

"شٹ اپ۔۔۔" وہ غصے سے چلائی۔ اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

"تم یہ مت بھولو کہ تم سے بھی میرا محرم کا رشتہ نہیں ہے۔ خواجہ میرے دادا بننے کی کوشش مت کرو۔ میں اپنی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے جو چاہے اور جیسے جی چاہے ویسے ہی کروں گی۔"

موحد تیز نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"اندھا دھند بھاگنے والے منہ کے بل گرا کرتے ہیں تو چوٹ بہت سخت لگا کرتی ہے مہر ماہ آفندی!"

"تم اپنی نصیحتیں اپنے پاس ہی رکھو تمہارا اصل کیا ہے وہ آج میں دیکھ چکی ہوں۔" اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے ہوئے جی سے کہا تو اندر ہی اندر وہ ندامت کے ڈھیر تلے دبا۔ مگر مہر ماہ کے سامنے اس وقت اس شرمندگی کا اعتراف کرنا گویا اسے پہاڑ پر چڑھانے کے مترادف تھا۔

"وہ صرف تمہاری بد تمیزی کا کامیابی کا ایکشن تھا مہر! تم بہت غلط کرنے جا رہی ہو۔ ایک انجان شخص سے بنا کسی



رشتے کے طلاق کا مطالبہ کرنا بالکل پن ہے اور کچھ نہیں ملوہ اسے وارن کر رہا تھا۔
 "شٹ اپ!" وہ اسی جی اور صدے کی گرفت میں تھی۔ "تم ایسا کوئی حق نہیں رکھتے مجھ پر کہ اپنا غصہ اس طرح دکھاؤ۔"

آئم سوری۔۔۔ لیکن میں یہ سارا معاملہ گھر والوں کو ضرور بتاؤں گا۔ "وہ شانے اچکا کر بولا۔ تو انداز معذرت والا تو بالکل بھی نہیں تھا۔ اسی بات نے مہر ماہ کو اور سلگایا۔
 "ضرور بتانا۔ اب تو ویسے بھی وہ مجھے طلاق دینے پر راضی ہو گیا ہے۔" وہ تلخی سے کہہ کر پلٹی۔ موحد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کہاں سر دے مارے۔
 کچھ کہنے کو لب کھولے۔ مگر مہر ماہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ ہتھیلی پر مکا مار کر رہ گیا۔

مہر ماہ کی ضد نے صبح معنوں میں اس کا سر گھما کر رکھ دیا تھا۔ اللہ جانے کس کو وہ زبردستی کا نیر آفندی بنا کر اس کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی تھی۔ اور اب اگر وہ شخص اسے نقلی طلاق نامہ بھی پکڑا دیتا تو۔۔۔ موحد گویا جلتے کوئلوں پر گھڑا تھا۔

☆☆☆

"موحد۔۔۔" وہ اپنے آفس میں داخل ہونے لگا تھا جب مبین صاحب اسے آواز دیتے تیز قدموں سے چلتے اس کی طرف آئے۔ وہ دروازے پر ہی رک گیا تھا۔ انہوں نے پاس آ کر بڑی شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ گویا اس پر اعتماد اور مان کا اظہار تھا۔ آخر کو داماد تھا اب۔

"یار کل سے چیک تمہاری ٹیبل پر پڑا ہے۔ تم نے سائن نہیں کیے۔"
 "اس چیک کے ساتھ کوئی ڈیٹیل نہیں ہے کس مد میں اتنی بڑی رقم طلب کی جا رہی ہے۔" اس کی پیشانی پر ایک بل پڑا تو مبین صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ کا خفیف سا دباؤ بڑھایا۔

"جتنی اب تو داماد ہو گئے ہو۔ اب تو یہ تفصیلات اور گہرائیاں چھوڑو۔ چیک سائن کرنے کے لیے کیا یہ حوالہ کافی نہیں کہ اب سرسہوں میں تمہارا "موحد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے اپنے شانے پر سے ان کا ہاتھ اتار کر دونوں ہاتھوں میں تھام کر سہلایا اور ان کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

"حقیقت تلخ ہے مگر سچ تو یہی ہے کہ آپ کا داماد نیر آفندی ہے۔ میں تو محض کھٹ پکٹی داماد ہوں۔۔۔" وہ اس کھلی بے عزتی پر اپنی جگہ جامد سے ہو گئے۔ موحد نے ان کا ہاتھ ہلکے سے تھپتھپایا اور نرمی سے بولا۔
 "اب جلدی ہے اس چیک کی ڈیٹیل بھجوائیے۔ تاکہ میں سائن کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکوں۔" انہیں

یونہی ساکت چھوڑ کر آفس میں داخل ہو گیا۔
 مبین صاحب دروازہ بند ہوتے ہی گڑبڑا کر ہوش میں آئے۔

"الو کا پٹھا۔۔۔" انہوں نے دانت پیسے۔ ادھر ادھر دیکھ کر کسی کے نہ ہونے کا یقین کرتے ہوئے جیب سے رو مال نکال کر ماتھے پر جھکتا پسینہ صاف کیا اور تیز قدموں سے لفٹ کی جانب بڑھ گئے۔
 وہ اندر جا کر کرسی میں دھنسن گیا اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔ مگر جب دل ہی کو سکون نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ اسے مسلسل مہر ماہ پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ مہر ماہ ایسا بولڈ اسٹیپ

بھی لے سکتی ہے۔ کل اسے پھڑکار کر جو شرمندگی ہو رہی تھی اب وہ ختم تھی اور جتنا بھی وہ اس معاملے کو سوچتا اسے مزید غصہ ہی آ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ مہر ماہ کو اس معاملے سے آئندہ کے لیے دور کیسے رکھے۔ لیکن اس کے ذہن کا جیسے درساوا ہوا۔ وہ بے ساختہ سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کا ہاتھ اپنے موبائل کی طرف بڑھا۔ پیشانی پر

بل لیے وہ کوئی خبر ملاحظہ نہ تھا۔ مگر دوسری طرف سے مسلسل نمبر بندیا رہا تھا۔ اس نے لائن ڈسکنیکٹ کر کے موبائل پہنچا کر دھکیل دیا۔

"نمیر آفندی۔۔۔" اس نے دانت کچکپائے تو چہرے کے حساس حصے غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

نفرت۔۔۔ اور شدید نفرت۔

"موحد آفندی۔۔۔" گو گو بیل۔ وہ شدت سے روئی تھی کمرے میں آ کر۔ اس کی جرات کیسے ہوئی مجھے تھپڑ مارنے کی۔ بار بار یہ خیال اسے ترپاتا۔ کیوں نہ میں نے بھی جولا تھپڑ مارا۔ اسی وقت بدلہ اتر جاتا اور یہ پچھتاوا تو نہ ہوتا۔ شمرہ کمرے میں داخل ہوئیں تو اسے روتے دیکھ کر پریشان سی تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

"مہر۔۔۔ کیا ہوا؟"

مہر ماہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے انہیں دیکھا مگر منہ سے کچھ بولے بنا دوپٹے سے چہرہ خشک کرنے لگی۔ وہ اس کے پاس آ بیٹھیں۔ آنسوؤں سے چہچہاتا چہرہ اور گلگلی ہوئی آنکھیں۔

"موحد نے کچھ کہا ہے کیا۔؟" کسی بیٹے پر پہنچ کر انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔ جیسے اپنے کہے لفظوں کا یقین نہ ہو مگر ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ گویا بات برائے بات۔ مگر مہر تو پھٹ ہی پڑی۔

"اور کون ہے اس گھر میں جس کی اتنی جرات ہو۔ تھپڑ مارا ہے آپ کے بیٹے نے مجھے۔" شمرہ کو کرنٹ سا لگا۔ بے یقینی سے مہر ماہ کو دیکھا۔

"آپ جانتی ہیں اس نکاح کی حقیقت کو۔ پھر اس نے کس حق سے مجھے مارا؟"

"مگر کیوں۔۔۔ کس بات پر۔۔۔ کچھ بتاؤ تو مہر ماہ۔ میرا دل پریشان کر دیا تم نے تو۔ موحد ایسا کیسے کر سکتا ہے۔" وہ واقعی سن کر ہرٹ ہوئی تھیں۔ مہر ماہ نے ساری بات انہیں بتا دی جسے وہ دم سادھے سنتی رہیں۔

"میرے اللہ۔۔۔" آخر میں وہ دم بخود مہر کو دیکھنے لگیں۔ "تم جا کر نمیر سے نہ صرف مل آئیں بلکہ اسے پیسے بھی دے ڈالو؟"

"ہاں تو کیا ہوا۔۔۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ میں نمیر سے بات کروں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔"

"یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونا شروع ہو جاؤ۔" شمرہ کو اعتراض ہوا۔ "اور تمہیں کیسے پتا کہ وہ نمیر ہی تھا؟" وہ مضطربانہ انداز میں بے جلت پوچھنے لگیں۔

"میری تو سمجھ میں نہیں کہ ہا کہ" آپ دونوں "کو کیسے پتا ہے کہ جس سے میں مل کر آئی ہوں وہ نمیر نہیں ہے" مہر ماہ ہو کر بولی تو وہ گڑبڑا کر مہر ماہ کو دیکھنے لگیں۔

"میں اسے بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں آئی! وہی اغوا کے دوران ملا تھا مجھے۔ اور کوئی ہوتا تو مجھے طلاق دینے پر راضی ہوتا کیا؟ وہ پیسے لے کر مجھے طلاق دینے پر بھی راضی ہے۔" وہ دھماکے پر دھماکا کر رہی تھی۔ شمرہ منجھدی اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھیں۔ آخری جملہ سن کر گویا ان کا سکتہ ٹوٹا۔ سر سراتے لہجے میں پوچھا۔

"طلاق۔۔۔؟"

"جی ہاں۔۔۔ میں بیوقوف نہیں ہوں کہ ایک لاکھ یونہی ضائع کر دوں۔ آگے کا معاملہ طے کر کے آئی ہوں اس کے ساتھ۔"

"یا اللہ۔۔۔" شمرہ کا دل کسی شے میں جکڑ گیا۔ کیا بیوقوفی کر رہی تھی وہ۔ اور ماننے کو تیار بھی نہیں تھی۔

"یہ معاملہ موحد پر چھوڑ دو مہرہ! اس پر اعتبار کر کے نکاح کیا ہے تو اب باقی کا معاملہ بھی اسی کو سلجھانے دو۔"
 "موحد کا تو نام بھی مت لیں آنٹی۔ وہ غصے اور سختی سے بولی۔ "معاف کیجئے گا۔ مگر اس نے جتنی مدد کرنا تھی
 کر لی۔ اب تو بس اللہ مجھے ایک لاکھ روپیہ دے تو میں وہ موحد کے منہ پر ماروں۔"
 "اسے تمہاری نادانی پر غصہ آ گیا ہوگا مہرہ۔ ورنہ وہ بہت سوئٹ ہے۔ میں سختی سے پوچھوں گی اس سے۔
 آئندہ وہ جرات نہیں کرے گا تمہارے ساتھ ایسی بد تمیزی کرنے کی۔" شمرہ نے اس کا رخسار تپتہ پتہ پایا۔ مگر مہرہ ماہ کو
 ان کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔
 "یہ معاملہ مجھے ہی سلجھانا ہے آنٹی! نمیر نے کہا ہے کہ میں یہ معاملہ کسی سے بھی شیئر نہ کروں ورنہ وہ ہمیشہ
 کے لیے روٹوش ہو جائے گا۔ یہ تو میں ہی بیوقوف ہوں جس نے آکر سیدھا آپ کے اس سوئٹ بیٹے سے ذکر
 کر کے انعام میں بھڑکھڑا لیا۔"

"بالفرض وہ پیسوں کے بدلے طلاق دینے پر راضی بھی ہے تو یہ سوچا ہے کہ یہ روپے آپ کے کہاں
 سے؟" مہرہ ماہ کے پاس اس بات کا بہت اچھا سا جواب تھا مگر وہ یہ جواب سچ وقت پر سچ آدمی کے سامنے دینا
 چاہتی تھی۔ اس لیے محض دل ہی دل میں ہونہ کہہ کر بس خاموشی سے سر جھکا دیا۔ تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

تزئین کی آمد خوشی کا استعارہ تو کبھی بھی نہیں رہی تھی خصوصاً مہرہ ماہ کے لیے۔ اب بھی وہ آئی تو ٹی وی لاؤنج
 میں اپنا فورٹ ڈراما نشر کر رہی دیکھتی مہرہ ماہ وہاں سے اٹھنے کو پر تو لنے لگی۔ مگر وہ تانی جان سے رکی سائل کرتے
 ہوئے تاثرات لیے سارہ چچی کے کمرے میں ٹھس گئی۔ مہرہ ماہ کی طرف تو اس نے دیکھا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ اگر
 تو شام کی چائے کا وقت نہ ہوتا اور سب نے چائے اکٹھے پینے کی روایت نہ قائم رکھی ہوتی تو مہرہ ماہ کمرے سے
 باہر ہی نہ آتی۔

"آگئی فساد کی جڑ۔۔۔" تانی جان بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی تھیں۔ تزئین کے جانے کے بعد وہ
 پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی مگر مجال یہ ہے جو ایک بھی لفظ سمجھ میں آیا ہو اسے یاد آ گیا کہ موحد کو کہاں سے پتا چلا
 ہوگا کہ مہرہ ماہ نے طلال سے فون پر بات کی تھی۔ یہ یقیناً تزئین ہی ہوگی۔
 "اف۔۔۔ ایک تو زمانے بھر میں ذلیل ہونے کو بس میں ہی رہ گئی ہوں۔ اور وہ کینہ طلال۔۔۔ ہر بات
 بیوی کو بتاتی اتنی ضروری بھی نہیں ہوتی۔۔۔" وہ خود ترسی کا شکار ہوئی بجھے دل کے ساتھ پیٹھی ٹی وی کو کھورتی
 رہی۔ ملاحظہ دھب سے اس کے پاس بیٹھی تو وہ بری طرح چوگی۔

"کہاں گم ہوا آبی۔ کبھی اشتہار بھی اتنی دجسٹی کے ساتھ دیکھتا ہے کوئی؟"
 وہ فریسی بولی تو مہرہ ماہ نے اس کے کھلے ہوئے چہرے کو نظر لگنے کے ڈر سے نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھا۔ کبھی وہ
 بھی ایسی ہی سن موجی ہوا کرتی تھی۔ پھر مدھم سا مسکرا دی۔
 "بس ایسے ہی کچھ خاص نہیں آرہا تھا نی وی پر تو اٹھ کر کمرے میں جانے والی تھی۔"

"انہوں۔۔۔ ابھی تو چائے آرہی ہے۔"

"میرے کمرے میں دے جانا ملی۔۔۔" تزئین آئی ہوئی ہے اور میں اس کا سامنا بھی نہیں کر
 چاہتی۔ مہرہ ماہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ معترض ہوئی۔
 "کوئی ضرورت نہیں ان سے چھنے کی۔ چھینا تو انہیں چاہیے جنہوں نے دیوار گرتے ہی راستے بنانے والے
 حرکت کی ہے۔ یہ تمہارا گھر ہے آبی اور شمرہ آنٹی کتنی اچھی ہیں، چچی کے سامنے سپورٹ کرتی ہیں ہمیں۔"

"چھپ نہیں رہی یار۔ بس ویسے ہی طبیعت سست سی ہو رہی ہے ذرا" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ہاتھ سے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ "میری جائے کمرے میں دے جانا۔"

"آبی! تم تو شادی کے بعد لگتا ہی نہیں اسی گھر میں رہ رہی ہو۔ پرانی لگنا شروع ہو گئی ہو" ملاحظہ منہ بسورا۔ مگر وہ ان سنی کرتی لاؤنج سے نکل گئی۔

"اوکرموں والی۔۔۔ بتاؤ تو سہی بات کیا ہے۔ پھر جھگڑا کر کے آگئی ہو میاں سے؟" سارہ چچی اس کی بھیس بھیس سے تنگ آ کر تنک کر بولیں تو تزئین کا رونانی الفور بند ہوا۔

"آپ بھی یہی سوچتی ہیں کہ میں جان بوجھ کر لڑتی ہوں اس سے؟"

"جو نظر آئے گا وہی کہوں گی نا۔ انسان دل کی مرضی پر چلے تو راستے کے دھکے اور ٹھوکریں کھانے کو بھی تیار رہے۔" وہ صفا چٹ کہتی تزئین کو بہت ظالم لگیں۔

"آپ بس میرا ہی قصور نکالیے گا۔ مگر اس بار تو میں آغا جان سے فیصلہ کروا کر ہی جاؤں گی۔ مہرماہ میری زندگی تباہ کرنے پر تکی ہوئی ہے۔" انہیں جھٹکا لگا۔

"کیا مطلب؟"

"ابھی تک میرے شوہر کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی امی۔ اس کا چکر چل رہا ہے طلال کے ساتھ۔ اسی لیے تو کسی اور سے شادی کرنے کے بجائے مودھ کی آڑی ہے اس نے تاکہ میرے طلاق لیتے ہی مودھ کو خیر باد کہہ کر طلال کے ساتھ پھر سے سیٹنگ کر لے۔" اس کا حساب کتاب کلیئر تھا۔ چچی جان کا منہ کھلا رہ گیا۔

"کیا مطلب۔۔۔ کون سا چکر؟ تمہیں کیسے پتا۔"

"اس کے آفس فون کیا تھا اس نے۔ کتنی دیر نہیں لگاتی رہی اس کے ساتھ۔ مجھے طلال کے پی اے سے پتا چلا۔" تزئین تملارہی تھی۔ اس کا مودھ کے کان بھرنے کا بھی پکارا رہا تھا۔

"اوہو۔۔۔ وہم نہ کیا کرو تزئین۔ غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے تمہیں۔ اس نے بعد میں اس کے ساتھ چپیں لگانی ہوتیں تو چھوڑتی ہی کیوں طلال کو۔۔۔؟" وہ گڑبڑا پیش مگر بہت محتاط انداز میں اسے سمجھانا چاہا۔ انہیں یاد آیا انہوں نے ہی مہرماہ سے طلال کو فون کروایا تھا۔ مگر یہ بات اتنی جلدی کھلے گی ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ مگر انہوں نے بیٹی کو یہ بتانے کی غلطی ہرگز نہیں کی کہ یہ شوٹا انہی کا چھوڑا ہوا ہے مگر جس بات سے بچنے کے لیے انہوں نے مہرماہ کو اندھے کنویں میں اتارا تھا وہ پھر سے ہو کر رہی تھی۔ تزئین بی بی پھر سے آفندی ہاؤس میں موجود تھیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اب اگر الزام اپنے سر لیتیں تو تزئین بھڑک اٹھتی۔

☆☆☆

مودھ کو آتے ہی شمرہ نے آڑے ہاتھوں لیا۔ تو وہ بستر کے کنارے بیٹھ کر پیروں کو جوتوں کی گرفت سے آزاد کرنا خاموشی سے ان کی ساری جھڑپ سنا رہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے ہاتھ اٹھایا کیسے اس پر؟" غصے میں ہر بات کے بعد وہ بے یقینی سے پوچھتیں۔ وہ چپلوں میں پاؤں ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ اس کے ایکشن کاری ایکشن تھا ماما! آپ نے اس سے پوری بات پوچھی ہوتی تو پتا چلتا آپ کو" وہ غصے سے بولا۔

"پھر بھی تمہیں کوئی حق نہیں تھا کہ تم اس کو مارتے؟"

"سوری۔۔۔ شدید غصہ آ گیا تھا۔ مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ وہ کتنے اٹلے سیدھے کام کر رہی ہے۔ پتا نہیں کس

کولاکھ روپیہ پکڑا آئی ہے اور اب لاکھوں روپیہ دے کر اس سے طلاق لینے والی ہے۔
 ثمرہ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ ڈوبنے والا ہاتھ پاؤں مارے بغیر ڈوب جائے۔۔۔ بہت خوب۔۔"
 "جیسے ہاتھ پیر مار رہی ہے نا ویسے بھی ڈوبنے کا ہی خدشہ ہے۔"

"وہ اس سارے معاملے میں بے قصور ہے موجد! اور اب وہ اپنے بل بوتے پر اس دلدل میں سے نکلنا چاہ رہی ہے تب بھی تمہاری نظروں میں قصور وار ہے۔" انہیں تاسف ہوا۔
 "وہ کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو کر نہیں بیٹھ سکتی ماما۔" وہ جھنجھکیا۔
 "پیر شکاری کے شکنجے میں آجائے تو انسان خاموش نہیں بیٹھ جاتا۔ جتنی طاقت ہوتی ضرور لگاتا ہے جان بچانے کے لیے۔" وہ جل کر بولیں۔

"ماما پلرز۔۔۔ اس کی بے جا جذباتیت نے میرا پہلے ہی دماغ خراب کیا ہوا ہے۔ اسے کہہ دیجیے گا۔ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھایا تو قطعاً ساتھ نہیں دوں گا اس کا۔" وہ ان کی مزید سرزنش سے بنا اپنی بات کہتا دواش روم میں بند ہو گیا۔ ثمرہ گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔ بہت وقت ہوا اب بچے والدین سے ایک قدم آگے کے فیصلے کر لیا کرتے ہیں۔ ان کا دل بھی بجھ سا گیا تھا۔

☆☆☆

شام کی جائے اس نے تنہا اپنے کمرے میں بی بی۔ اور ابھی وہ چائے کا خالی کپ سا بیڈ ٹیبل پر رکھ کر سیدھی ہی ہوئی تھی کہ ہلکا سا کھٹکھٹانے کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے موجد کو اندر آتے ہوئے ناگواری سے دیکھا۔

"اگر تو تم اسے صرف اپنی ماما کا روم سمجھ کر آتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے مسٹر۔ یہاں میں بھی رہتی ہوں۔" اس کا انداز کڑوا تھا۔

"صرف ماما کا روم سمجھتا تو ان کی موجودگی میں آتا۔" وہ آرام سے کہتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر اس کے عین سامنے بیٹھا تو وہ اس کا مطلب جان کر فوراً اٹھ گئی۔ موجد نے اس کی کلائی تھام کر اسے روکا۔

"ہاتھ چھوڑو موجد! میں تم سے کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ مشتعل ہوئی۔

"میں تمہاری مرضی کا پابند نہیں ہوں مہر! اور میں یہاں اس لیے آیا ہوں کیونکہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ سنجیدہ تھا۔ مگر وہ بدستور کلائی چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ موجد نے کلائی ہی سے پکڑے ہوئے اسے دوبارہ سے بستر کے کنارے پر بیٹھا دیا۔

"تم انسان کہلانے کے لائق نہیں ہو موجد! یہ بات پتا ہے تمہیں۔" اپنی کلائی سہلاتے ہوئے وہ تلخی سے بولی تھی۔

"تم نے طلال کو فون کیوں کیا تھا؟" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ مہر ماہ چونکی۔ اس کا موجد سے بات کرنے کا بالکل بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر تین کو دیکھ کر اس کے دماغ کی گھنٹی بج اٹھی وہ تھینا اسی کیس کو لے کر یہاں آئی تھی۔
 "چچی جان نے کہا تھا مجھے۔ ان فیکٹ ریویوٹ کی تھی۔" اکثرے انداز میں بتایا تو وہ شکی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"کس مقصد کے لیے ریویوٹ کی تھی انہوں نے؟"
 "اب ہر بات کی تفصیل تمہیں بتانی ضروری ہے کیا۔" وہ چڑ گئی۔

"ہاں۔۔۔" وہ قطعیت سے بولا۔ پھر اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "کاغذوں میں ہی سہی مگر ہمارا نکاح ہو چکا ہے اور کوئی دوسرا انسان پہنچا یہ بٹھا کر کہے کہ موحد آفندی کی بیوی کسی غیر مرد کو کال کرتی ہے تو وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا مہر!"

اس کے لب و لہجے سے جھلکتی تپش نے مہر ماہ کو زروس کر دیا۔ کتنی شرمندگی ہو رہی تھی اس کے منہ سے یہ سب سن کر۔

"تم جانتے ہو کہ یہ نکاح نہیں ہوا پھر۔۔۔" وہ تنک کر کہنے لگی تھی کہ موحد تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ گیا۔

"آغا جان نہیں جانتے۔۔۔ دنیا نہیں جانتی اب کیا میں لکھ کر گلے میں ڈال لوں کہ ہمارا نکاح جھوٹا ہے؟ وہ آغا جان کے سامنے یہ مسئلہ اٹھائے گی تب کیا جواب دو گی تم؟"

وہ خالی ذہن لیے اس کا چہرہ دیکھے گئی۔

بعض لوگوں کا امپریشن آپ اپنے ذہن میں جتنا بھی برا بنانا چاہو وہ اس سے اچھے ہو کر آپ کو ملتے ہیں۔

"مجھے واقعی سائرہ چچی نے کہا تھا کہ میں طلال کو سمجھاؤں کہ وہ اپنا گھر تباہ نہ کرے۔ اور ترمین کو یقین دلائے کہ ہمارا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔" وہ انک کر بولی۔ موحد ایک تنک اسے دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس بھرتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی بیوقوف بھی ہو سکتی ہو۔" اس کے جزیے نے مہر ماہ کو تپایا۔

"تم سے شادی کے لیے ہاں بھی بھرنے سے پہلے مجھے بھی یقین نہیں تھا اس بات کا۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"تمہاری چچی صاحبہ تمہیں بہت کامیابی کے ساتھ تمہیں اس مشکل میں پھنسا چکی ہیں سمجھیں تم۔" وہ ڈپٹ کر بولا۔

"تو تمہیں کس بات کی فکر ہے میں جانوں اور میری مشکلات۔"

"میرے خیال میں، میں تمہیں اس کاغذی نکاح سے فارغ کر دوں تاکہ آغا جان تسلی کے ساتھ تمہیں کہیں اور نکا دیں پھر تم اپنی مرضی کرنی پھرنا۔" وہ سلگ کر کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مہر ماہ کا دل گہری کھائی میں ڈوب کر ابھرا۔ اسے خیال آیا کیسے مشکل کے وقت میں شمرہ نے اسے بچانے کے لیے موحد کا نام اس فرضی نکاح کے لیے پیش کر دیا تھا اور آج تک جتنا بھی نہیں تھا۔ لیکن موحد کے یہ الفاظ۔۔۔ اف!!

"مجھے تم سے کوئی۔۔۔ اچھی امید بھی نہیں ہے" وہ تلخ ہوئی۔

"رکھنا بھی مت۔ ابھی جب آغا جان کے سامنے پیش ہو گی تو جواب سوچ کر آنا۔" وہ آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے کہہ کر زور سے دروازہ مارتا چلا گیا۔ مہر ماہ نے دروازے کی زوردار آواز پر آنکھیں سکیڑ کر مچپیں۔

"میری کون سی زبان نہیں جواب دینے کے لیے۔ اور چچی جان کا دماغ خراب ہے جو مکر میں کی۔۔۔ بڑا آیا ہونہ۔" وہ اس کے جانے کے بعد اونچی آواز میں بولی تھی۔ مگر دل کا ایک گوشہ مضطرب سا ہو گیا۔ جانے آندھی کس سمت کھٹنے والی تھی۔

اس بار ترمین نے آغا جان کے اسٹڈی روم کو نہیں بلکہ کھانے کی میز کو اپنے نالہ و فریاد کے لیے چنا۔ مہر ماہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھی تو اسی وقت اس کے برابر والی کرسی گھسیٹی نی۔ مہر ماہ کو کوفت نے گھیرا۔ موحد اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ (ہونہ۔۔۔ مجھے کیا) وہ لا پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ سائرہ چچی ترمین کو بڑھا بڑھا کر ڈشز پیش کر رہی تھیں۔ فرزین اور ملاح آہستہ آہستہ باتوں میں اپنا کھانا ختم کر رہی تھیں۔ ترمین نے سب سے پہلے کھانا ختم کیا۔

"اور لو نا۔۔ چاول بھی ذرا سے لیے تم نے۔ یہ گاجر کا حلوہ چکھو کھایا ہی کیا ہے تم نے۔" چچی جان کا بس نہیں چل رہا تھا بیٹی کے منہ میں نوالے بھی ڈالنا شروع کر دیتیں۔
 "نہیں بس۔۔۔ کھانا کھانے نہیں آئی ہوں میں یہاں امی "دوہ" تھکے لہجے میں بولی تو اس "شروعات" پر مہرماہ کا نوالہ حلق میں پھنسے لگا۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" آغا جان کو بھی دھیان آئی گیا۔
 "طبیعت کو تو چھوڑیں آپ قسمت کی بات کریں۔ وہی خراب ہے میری "دوہ" فوراً نہ صرف بات کو گھما کر اپنے مطلب پر لانی بلکہ آنکھوں میں ایک آدھ آنسو بھی بھر لیا۔ بشمول مہرماہ سب کے کھانا کھاتے ہاتھ ٹھٹھکے۔ ماسوائے موحد کے جو ابھی بھی رغبت سے بریانی ختم کر رہا تھا بلکہ ابھی کانٹے سے ایک اور شامی کباب اٹھا کر پلٹ میں رکھا۔

"خیریت تو ہے یا؟" سہیل آفندی تک سارہ چچی نے تڑپنے کا نیا پھڈا نہیں پہنچایا تھا۔ کچھ شاید یہ بھی خیال ہو کہ وہ خود ملوث نہیں اس سلسلے میں۔ اب انہوں نے تشویش سے پوچھا تو تڑپنے نے تیز نظروں سے مہرماہ کو دیکھا جو ست روی سے کھانا کھا رہی تھی۔

"یہ سب آپ مہرماہ سے پوچھیں۔ ابھی بھی جس کا نام میری سسرال میں گونج رہا ہے "دوہ" منہ پھٹ انداز میں بولی تو کبھی کو حیرت کا جھکا لگا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟" بتائی جان سب سے پہلے سنجھلیں اور ناگواری سے کہا۔

"یہ سوال آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہے۔"

مہرماہ نے سارہ چچی کی طرف دیکھا جو ٹھٹھکی سے پریشان نظر آ رہی تھیں۔

"آپ پوچھیں مہرماہ سے آغا جان۔ اس کا کیا مطلب بنتا ہے کہ یہ ابھی بھی طلال سے رابطہ رکھے ہوئے ہے "تڑپنے" نے گویا دھماکا ہی کر دیا تھا۔ مہرماہ کو اپنی سانس تنگ بڑنی محسوس ہوئی جب اس نے سارہ چچی کے چہرے پر بے گانگی دیکھی انہوں نے مہرماہ سے نگاہ ملا کر پھیر لی یعنی وہ اس معاملے میں اس کو ڈیفینڈ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ مہرماہ کو فوری طور پر اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا جو اس نے چچی جان کی بات مان کر کی تھی۔ آغا جان نے بے یقینی سے مہرماہ کو دیکھا بلکہ وہاں موجود ہر شخص کے چہرے کے تاثرات میں یہی بے یقینی موجود تھی۔ وہ کھنکھاری اور چچی جان کو دیکھا۔

"آپ نے تڑپنے کو ساری بات نہیں بتائی چچی جان؟" اور جواباً سارہ چچی کے تاثرات ایسے معصومانہ جیسے انہیں دنیا جہاں کی خبر نہ ہو۔
 "کون سی بات؟"

اور بس۔۔ مہرماہ کا دل بے آواز ہی ٹوٹ گیا۔ اسے چچی جان سے قطعاً یہ امید نہ تھی۔ موحد نے پانی کا گلاس لیوں سے لگائے ہوئے مہرماہ کو ایک جتانے والی نظر دیکھا۔ اس کی رنگت فحش تھی۔ اب تو اگر وہ چچی جان کا نام لے کر ساری بات بتا بھی دیتی تو کوئی اس کی بات تب تک نہ مانتا جب تک کہ چچی جان ہامی نہ بھرتیں مہرماہ کی سچائی کی۔ اس نے آدھا گلاس پانی مہرماہ کے آگے رکھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
 "بی بی لو"

سکون سے کہہ کر اس نے حاضرین پر نظر ڈالی جن میں سے کچھ مضطرب تھے تو کچھ بے یقین۔ جبکہ آغا جان بشکل غصہ ضبط کیے جواب کے منتظر بیٹھے تھے۔

"جچی جان کا قصور نہیں ہے مہر۔۔ بڑھتی عمر یا دداشت کم کر دیتی ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا اور آغا جان کو پہلے سوال کا جواب دیا۔

"جی آغا جان! مہر نے میرے کہنے پر ہی طلال سے بات کی تھی! مہر ماہ کی آنکھ میں نمی سی تیر گئی۔ اس نے موحّد کا دیا ہوا گلاس دونوں ہاتھوں کی گرفت میں مضبوطی سے تھام لیا۔ جچی جان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ تم یہ کہ وہ موحّد کے جھوٹ کو پہنچ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

"مگر کیوں موحّد۔۔۔ اسکی کیا ضرورت پیش آگئی تھی کہ تم نے میری بیٹی کے سر میں بیٹی خاک ڈلوانے والا کام کر دیا۔" تائی جان ناگوار سی سے بولیں۔

"مہر کو بچانے کے لیے جھوٹ مت بولو۔" تزئین پھونکاری۔

"کوئی بھی شوہر اپنی بیوی کو "ایسے" معاملے میں نہیں بچایا کرتا۔ اگر وہ قصور وار ہو تو۔" موحّد نے چیمٹی

نظروں سے جچی جان کو دیکھا۔ وہ خجل سی تھیں۔

"آپ کی بیٹی جو آئے دن میکے آ کر بیٹھ جاتی ہے اور نام مہر کا بدنام۔ بقول تزئین کہ طلال ابھی تک اپنے ماضی کو نہیں بھولا۔ تو مائی ڈیر جچی جان۔ میں نے مہر سے کہا کہ وہ طلال کو ایک بار سمجھا ہی دے اپنے لفظوں میں کہ اسے ماضی سے زیادہ اپنا حال پیارا ہے۔ اور یہ کہ وہ میرے ساتھ کتنی خوش ہے۔ اور وہ اللہ کا بندہ سمجھ گیا۔ مگر یہ محترمہ آدمی پونی بات سن کر پھر سے بوریا ستر پلیٹ کر وار دھو گئیں۔ مہر ماہ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اس کا دل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

تزئین نے تیز نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"آپ کو پتا تھا ساری بات کا۔ تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتائی؟"

"اے لو۔۔۔ کہا تو ہے کہ یاد نہیں رہی تھی۔" وہ ڈھٹائی سے بولیں۔ مہر ماہ نے چہرہ موڑ کر نرم آنکھوں سے

موحّد کو دیکھا جو اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اب پلیٹ میں انڈوں کا حلوہ نکال رہا تھا۔

"تم بھی اب ذرا عقل کو ہاتھ مارو تزئین آئندہ میں تمہارے گھر کے کسی بھی مسئلے میں مہر ماہ کا نام نہ سنوں۔" آغا جان نے برے موڈ کے ساتھ تزئین کو وارننگ دی تھی۔ مہر ماہ ابھی تک ساکت بیٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے جو طوفان تزئین کی بات نے اٹھایا تھا وہ مہر ماہ کو چھوئے بنا گزر گیا تھا۔

جانے کیوں مگر ہم جن لوگوں کا احسان لینا نہیں چاہتے اکثر قسمت انہی کو ہمارا نجات دہندہ بنا دیتی ہے۔

"تھینک یو۔۔۔" مہر ماہ نے کمرے میں جاتے موحّد کی راہ میں حائل ہو کر نرم لہجے میں کہا تو اس نے گہری

سانس بھری۔

"صرف اس لیے کہ اب تمہارا نام میرے نام کے ساتھ منسلک ہے مہر۔" جتا کر کہا۔

"واٹ ایور۔" (جو بھی ہے) وہ بے شکل بولی۔

"جچی جان نے جو کیا ہے اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"میری بات پر تو تم نے بھی یقین کیا ہی نہیں۔" وہ جتا کر بولا۔ مگر مہر ماہ فی الحال تو اسی سکون میں تھی کہ اس

کی غلطی ڈھانپ دی گئی تھی۔

اور زیر آفتدی کا بھی پول اس سے اگلے ہی دن کھل گیا۔ آنے والی کال اٹینڈ کرتے ہی مہر ماہ کو خیال آیا کہ

نیر آفتدی کی آواز اس روز سے مختلف لگ رہی تھی جب وہ اسے شاپنگ مال میں ملا تھا۔

"کاغذات تیار کروا لیے تم نے؟" مہر ماہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کون سے کاغذات۔۔۔؟"

"طلاق کے نمبر آفندی۔۔۔ اب یہ مت کہنا کہ کون سی طلاق۔ میں ایک لاکھ تمہارے منہ پہ مار چکی ہوں۔ اب کرو گے تو پیسہ دینے کے بجائے لاک اپ میں بند کروا کے طلاق لوں گی۔" وہ گرم ہوئی۔
 "آفندیز کی جائیداد کا حصہ دار ہوں محترمہ۔۔۔ ایک لاکھ لوں گا میں۔۔۔ اور وہ بھی تم سے۔۔۔
 ہونہ۔" وہ طنز یہ بولا مہر ماہ کو چکر سا آیا۔

"وہ تم ہی تھے نمبر۔ جھوٹ مت بولنا میرے ساتھ۔" وہ ضبط کھوکھو کر چلا اٹھی۔
 "مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ مگر میں ایک ہی بار آفندیز کے گلے میں انگلی ڈال کر اپنا حصہ نکلاؤں گا۔" وہ ناگواری سے بولا۔
 "تو وہ کون تھا۔۔۔ جو تمہارے گھڑیں میرے سامنے آتا رہا؟ کیا وہ تم نہیں تھے؟" مہر ماہ نے بڑی آس سے

پوچھا۔ اب اگر وہ انکار کر دیتا تو مہر ماہ پھر سے بندگی میں آکھڑی ہوتی۔
 "وہ ذرا بیخود تھا میرا۔ اسی نے کڈ نیپ کیا تھا تمہیں۔ اسی کو تھپڑ مارا تھا تم نے۔" اس نے اطمینان سے کہتے ہوئے مہر ماہ کے سر پر دھکا کیا۔

لحہ بھر کی بے یقینی کے بعد مہر ماہ نے گالیوں کے علاوہ ہر کونسا دے دیا اسے۔
 "تمہاری وجہ سے اس غلیظ شخص کی ہمت ہوئی مجھے بلیک میل کرنے کی۔" وہ ہانپنے لگی۔
 "بس۔۔۔ اب دل ہلکا ہو گیا نا؟" وہ سکون سے پوچھ رہا تھا۔
 "مجھے طلاق چاہیے نمبر۔ کسی بھی قیمت پر۔" وہ بھنپتے ہوئے لہجے میں بولی۔
 "مل سکتی ہے مہر ماہ آفندی۔" وہ اسی پرسکون انداز میں بولا تو مہر ماہ کو لگا جیسے اس کے کانوں نے کچھ غلط سنا ہو۔

"کتنے پیسے۔۔۔؟" وہ یہ غلٹ بولی۔

"پیسہ تم سے نہیں آغا ذوالفقار سے لوں گا مہر ماہ جو حق ہے میرا۔"
 "تو پھر۔۔۔؟" وہ بے تاب ہوئی۔ "اپنا مطالبہ بتاؤ۔"
 اور جو مطالبہ اس نے کیا اس نے مہر ماہ کے چاروں طبق روشن کر دیے۔
 "مگر یہ بات یاد رکھنا۔۔۔ چاہے وہ اصل نمبر تھا یا تم ہو۔ لیکن اب ایک پیسہ بھی نہیں دوں گی تمہیں۔" اس کی پوری بات سننے کے بعد مہر ماہ نے ایک بار پھر اسے یاد دہانی کروائی تھی۔

☆☆☆

مہر ماہ بہت غلٹ میں کہیں جانے کو تیار ہوئی اور کبیر سے گاڑی نکالنے کو کہا۔

"بی بی آپ کو ڈراپ کر کے پھر میں وہیں رگوں گا۔" اس نے باور کرایا۔

"ہاں ہاں۔ کھڑے رہنا۔ رپورٹ جو دینی ہو گی تم نے اپنے موحد سر کو۔" وہ ہلکا سا طنز کرتی گاڑی میں آ بیٹھی۔ اور ویسے بھی جس کام بلکہ معرکے کے لیے وہ جا رہی تھی اس میں کبیر کا وہاں موجود ہونا تقویت ہی کا باعث تھا۔

☆☆☆

تائی جان اور شرہ چچی کے دل کے حالات تو اللہ ہی جانے مگر بظاہر اب وہ دونوں آپس میں کبھی کبھار گپ شپ کر لیا کرتی تھیں۔ ابھی بھی تائی جان انہیں سائرہ چچی کی مہر ماہ کے ساتھ کیے جانے والی نا انصافی کا بتا رہی

تھیں۔ اور ساتھ موحد کی مدح سرائی بھی جاری تھی۔
 "سارہ نے تو میری بچی کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ موحد تو صحیح معنوں میں بیٹا ثابت ہوا ہے ہمارا!"

شرہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھیں۔
 اسی وقت کوریڈور میں سے مہرماہ کی آواز آئی۔ وہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔
 "چلیں نا۔ آپ کا اپنا کمرہ ہے۔ ادھر چلیں لی وی لاؤنچ ہے یہاں۔"
 تانی جان حیران سی ادھر متوجہ ہوئیں۔ شرہ نے بھی ادھر چہرہ موڑ لیا۔ اگلا لمحہ بہت بے یقین کر دینے والا اور حیران کن تھا۔ مہرماہ کے ساتھ اندر آنے والے کو کچھ وقت سے ہی کبھی مگر وہ دونوں ہی پہچان گئی تھیں۔ مگر یہ پہچاننا ایک قیامت کے مترادف تھا۔ شرہ تو تنگ سی ہنسی رہ گئیں۔ لیکن تانی جان نے آگے بڑھ کر متوحش سا ہو کر مہرماہ کا بازو ہلایا۔

"کون ہے۔ کسے اندر لیے چل آ رہی ہو؟"
 "امی یہ میری والدہ ہیں۔ آپ کی سب سے چھوٹی دیورانی۔ پہچان تو گئی ہوں گی آپ۔" وہ ہلکے لہجے میں بولی۔ تانی جان کی آنکھیں چھٹی کی چھٹی رہ گئیں۔ جبکہ شرہ کو بے یقینی کا شدید جھٹکا لگا۔ پہلے سے کمزور مگر آج بھی سوگوار سے حسن کی مالک زرنگار۔۔۔
 ہاں وہ زرنگار روقار آفندی ہی تھی۔ حیران سی نظروں سے سارے گھر اور ان عورتوں کو دیکھتی۔ نیر و قار آفندی نے آفندی ہاؤس میں قدم رکھ دیا تھا۔ تانی جان کے دل کو جیسے کسی نے زور سے مٹھی میں بچھ لیا۔

☆☆☆
 شرہ کسی کے بولنے سے پہلے ہی زرنگار سے اٹھ کر نہ صرف ملیں بلکہ تانی جان اور چچی جان کے کچھ بولنے کے قابل ہونے سے پہلے ہی انہیں تھام کر اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔ تانی جان جیسے ہڑبڑا کر ہوش میں آئیں۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟ آغا جان کا پتا ہے نا۔ جان سے مار ڈالیں گے تمہیں۔" انہوں نے مہرماہ کا بازو سختی سے پکڑ کر جھجھوڑتے ہوئے کہا تو خود ان کا لہجہ ہی اتنا دہشت زدہ سا تھا کہ مہرماہ کا حلق خشک ہونے لگا۔ مگر ہمت ہارنے کا مطلب تو قسمت سے ہار جانا ہوا کرتا ہے۔ اور وہ اتنی بار قسمت سے ہاری تھی کہ اب صرف جیتنے ہی کا ارادہ تھا۔

"میں اسے اپنے گھر میں لائی ہوں امی۔ آپ نے دیکھا ہوگا آنٹی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔" اپنا بازو ان کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے وہ باغیانہ انداز میں بولتی انہیں مرنے کے قریب کر گئی۔ چچی جان نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"بکواس بند کرو اور اس گناہوں کی پولی کو چھوڑ کر آؤ جہاں سے اٹھا کر لائی ہو۔" تانی جان غرائیں۔
 "اور اس شرہ کی کیا بات کرنی ہو تم۔ اسے تو نہ کل اعتراض تھا و قار کی شادی پر اور نہ آج اس کی بیوی کے پھر سے آ جانے پر۔" چچی جان نے لقمہ دیا۔

"اللہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر لے آئی ہے اسے۔ میں نے تو سوچا تھا۔ مرکپ گئی ہو گی کہیں۔ مگر ذلیل لوگ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے۔" تانی جان کا لہجہ نفرت بھرا تھا۔
 "تمہیں اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ اب تم شادی شدہ ہو؟" چچی جان نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

"آپ لوگوں کو بھی تو میرا دوسرا نکاح کرواتے ہوئے یہ خیال نہیں آیا۔"
 "بد بخت۔۔۔ آغا جان تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔ کیوں اس طوفان کو گھر میں اٹھالائی ہو۔" تائی
 جان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس خود لڑکی کا گلہ ہی دبا ڈالیں۔
 "یہ میرا اور میری سسرال کا معاملہ ہے امی۔ اگر ان لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں تو آپ کو بھی نہیں ہونا
 چاہیے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ کر چلی گئی۔

"لو جی۔۔۔ اب دو، دو شوہر اور دو، دو ساسیں بنائیٹھی ہے آپ کی بیٹی۔" تائی جان کا سکتہ چچی جان کے
 تسمخہ نہ لہجے پر ٹوٹا تھا اور پہلی بار انہیں اس طنز کا کوئی جواب نہ سوجھ پایا۔ دل چاہ رہا تھا بیٹی کی اس نادانی پر سینہ
 کو بی شروع کر دیں۔

"سالوں پہلے جو کام نہ ہو سکا وہ بھلا اب کون ہونے دے گا؟ ارے آغا جان نے تو سکے بیٹے کو اس ملعون
 عورت کے پیچھے گھر سے نکال دیا تھا۔ پوتا کیا معنی رکھتا ہے ان کے لیے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ نہ
 صرف انہیں موحد کی صورت اپنا پوتا بل چکا ہے بلکہ وہ اس پر جان بھی چھڑکتے ہیں۔" چچی جان نے تجزیہ پیش
 کیا۔

"میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا ساثرہ! اس لڑکی پر تو اللہ جانے کس چیز کا سایہ ہو گیا ہے۔" وہ ٹڈھال
 تھیں۔

"بھائی صاحب کو فون کریں۔ فوری طور پر اس ناپاک کے قدم اس گھر سے باہر نکالیں۔ آغا جان تو واقعی
 طوفان مچا دیں گے۔" چچی جان نے ہمدردی سے انہیں دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ وہی سنہیا نہیں اب آکر برسوں کی بنائی عزت کو۔" تائی جان کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ تیزی
 سے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی تھیں۔ ایک طوفان تھا جس نے آفندی ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

"نمیر مجھے طلاق دینے پر راضی ہے۔ اگر اس کی ماں کو اس گھر میں اس کا حج مقام دیا جائے اور جائیداد میں
 ان دونوں کا حصہ بھی۔" مہرماہ نے صاف لفظوں میں اعلان کیا تو تائی جان کے کلیجے پہ ہاتھ بڑا۔ دل چاہا مہر کو
 دھنک کر رکھ دیں وہ جتنا اسے بچانے کی کوشش کرتی تھیں اتنی ہی وہ غلامت میں گرنے والی حریفیں کر رہی تھیں۔

"ان کا حق بنتا ہے واقعی۔" ثمرہ کی بات سن کر تائی جان مرنے کے قریب ہو گئیں۔
 "یہ کیا کھیل کھیلا ہے تم نے ثمرہ! تمہیں کیوں اعتراض نہیں ہے مہر کے اس اقدام پر۔ تمہارے موحد کے
 نکاح میں ہے وہ۔"

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اس سے بھی پہلے وہ نمیر کے نکاح میں ہے" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر
 جتانے والے انداز میں کہتی تائی جان کو کُن کر گئیں۔

☆☆☆

موحد سب سے پہلے گھر آیا تھا۔ اس کے پیچھے ہی تایا جان اور چچا جان کی واپسی کبیر کے ساتھ ہوئی۔۔۔ آغا
 جان دوسرے ڈرائیور کے ساتھ زمینوں کے دورے پر گئے ہوئے تھے مگر شام تک ان کی واپسی بھی متوقع تھی۔
 سب سے ہی وی لاؤنچ میں موجود تھے ماسوائے مہرماہ کے۔ جو زرنکار کے ساتھ کمرے میں بندھی۔
 تائی جان نے داماد کا چہرہ کھوجا جو بے تاثر تھا۔

"مہرماہ بلاشبہ میری بیٹی کسی موحد! مگر میں اس کی اس بے وقوفی میں بالکل بھی شریک نہیں ہوں۔ تم فورا
 سے پہلے اس عورت کو یہاں سے نکال باہر کرو" وہ خاموش نظروں سے ان کا چہرہ دیکھے گیا۔ (یہ چہرہ سالوں بعد

بھی نفرت سے نیلا ہی تھا۔)

"برسوں پہلے آغا جان نے بھی یہی کیا تھا۔" چچی جان نے کہا۔ (برسوں پہلے کی ایک رات اسے ٹوٹ کر یاد آئی)

"ضروری نہیں کہ جو غلط کام برسوں پہلے ہوا وہ آج بھی اسی انداز میں کیا جائے۔" یہ ثمرہ کا طنزیہ لہجہ تھا۔ (برسوں پہلے بھی فقط یہی آواز زرنگار کے حق میں بولی تھی)

"آپ کو تو نہ کل اعتراض تھا زرنگار پر اور نہ آج ہوگا بھابھی" چچی جان بد مزہ سی ہو کر بولیں۔

"وہ تمہاری بہو ہے ثمرہ! اور تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا اس کی اس حرکت سے" "مبین صاحب کو ثمرہ کے پرسکون (بلکہ پرسکوت) رویے پر سخت اعتراض تھا۔

"بڑوں کی غلطی کو اگر بچے سدھارنا چاہیں تو بچوں کو غلط نہیں کہنا چاہیے بھائی صاحب۔" وہ اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"آج اس کہنے نے اپنی ماں کو اس گھر میں بھیجا ہے کل کو خود بھی آ گیا تو ہم کیا کر لیں گے موحہ!" سہیل آفندی کا تو دماغ ہل گیا تھا، صد مانی کیفیت میں بولے۔ پہلے ہی سارا کچھ موحہ کے قبضے میں جاتا دکھائی دے رہا تھا اور سے اب یہ میر اور اس کی ماں کا منٹنا۔۔۔ یعنی جائیداد میں دوسرا پید حصہ دار۔

"تم جا کر چٹنج کرو موحہ! یہ مسئلہ آرام سے حل ہونے والا ہے۔" ثمرہ نے نظر بھر کر بیٹے کو دیکھا جس کے تاثرات میں چھپی آزر دگی ایک ماں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ موحہ ایک بھی لفظ کہے بنا چلا گیا۔ چچی جان بد مزہ ہوئیں۔

"کوئی حل تو نکالنے دیا ہوتا بھابھی!"

"حل تو سالوں پہلے بھی غلط ہی نکالا گیا تھا۔" ثمرہ سلگتے لہجے میں بولیں۔

"تو تم کیا چاہتی ہو ثمرہ! کہ ہم اس عورت اور اس کے بیٹے کو سر پر بٹھالیں۔ کل کو وہ نکاح نامہ لے کر آ گیا۔ کورٹ میں چٹنج کر دیا تو کیا ہوگا، یہ جانتی ہو؟" "مبین آفندی برامان کر چکی سے بولے۔

ثمرہ نے طنزیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ "شکر ہے یہ بات آپ کو بھی یاد ہے کہ مہر ماہ کسی اور کے نکاح میں ہے اور اس نکاح کی حیثیت اپنی جگہ مصمم ہے۔" وہ چپ رہ گئیں۔

"اب تو وہ نکاح ختم ہو چکا ثمرہ! موحہ سے شادی ہو گئی ہے مہر دکی تمہاری ہی بہو ہے وہ۔" تانی جان جلدی سے بولیں۔

"ہم سب بعض ایسی حقیقتوں سے واقف ہوتے ہیں جن کی سچائی سے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ مگر محض ذاتی فائدے کے لیے ہم اس سچائی کی نفی کرتے رہتے ہیں اور سچائی کی نفی کرنا بدترین جرم ہے۔ روحانی بھی اور اخلاقی بھی۔"

"مہر دکہاں ہے۔ اس کی تو خبر لوں میں۔" "مبین صاحب اٹھے۔ ثمرہ نے اچھتی نظران پر ڈالی۔

"اس سے جو بھی بات کرنی ہوگی وہ موحہ کرے گا بھائی صاحب!"

"چلیں جی۔ قصہ تمام شد۔ اب تو جو بھی قیامت آتی ہے وہ آغا جان کے شام کو آنے پر ہی آئے گی۔" سہیل آفندی طنزیہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ مگر پیچھے ایک مہیب خاموشی چھوڑ گئے جس میں آنے والے وقت کی خوفناک آہیں سنائی دے رہی تھیں۔

موحہ نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

"کون ہے؟" مہر ماہ کی محتاط سی آواز آئی۔

"موحد"

جولبا اندر خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ تھوڑی دیر بعد غم لہجے میں بولی۔ "اگر تو باقی سب کی طرح تم بھی ان کو دھکے دے کر باہر نکالنے کا ارادہ رکھتے ہو تو میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

موحد نے لب بھینچے۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دروازہ کھولو مہر! مجھے بات کرنی ہے تم سے آغا جان کی واپسی سے پہلے۔"

ذرا توقف کے بعد دروازہ کھل گیا۔ موحّد کی نگاہ دروازہ کھولنے والی مہر ماہ کے بجائے اس کے شانے کے پار نظر آتے چہرے پر پڑی تو وہ ساکت سا کھڑا رہ گیا۔ زرنگار اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے آئیں تو مہر ماہ نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے مہر ماہ کو پیچھے ہٹا کر موحّد کو دیکھا اور اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تو مہر ماہ دھک سی رہ گئی۔ اس نے بے اختیار موحّد کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

"ان کی یادداشت متاثر ہے موحدا! چلیز، اب تم بھی ان سب کی طرح مت۔۔۔۔۔" مہر ماہ حفظ ماتقدم کے طور پر ان کی حمایت میں وہ تفصیل بتانے لگی جو خیر نے فون پر اسے کوہتا کی تھی مگر اس کی آواز موحدا کا اگلا رد عمل دیکھ کر حلق ہی میں گھٹ گئی۔ اس نے زرنگار کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے رخساروں پر رکھ لیے۔ اس کا چہرہ زرنگار کے ہاتھوں کی اوک میں آگیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



اُجالوں کی بستی



کسی راستے کی
تلاش میں



میرے خواب
لوٹا دو



فون نمبر:
32735021

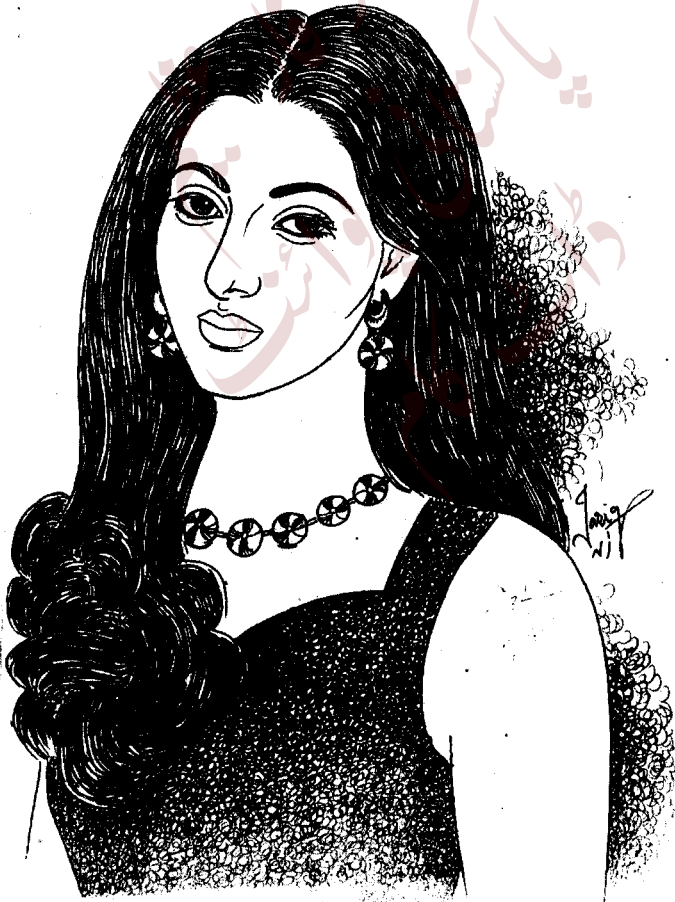
منگوانے
کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

سکھائی تھیں

میں بیار کی لکڑی کے منقش دروازے کھڑکیاں ڈیرائن
کروائے تھے اعلیٰ قسم کی لکڑی کے تیار کردہ
دروازے کھڑکیاں آج بھی ویسے کے ویسے ٹھنڈے
مضبوط اور صندل جیسی خوشبودیتے تھے۔ یہی خوشبو
کہانیوں کو ہوا کے دوش پہ پھینکتی اور قلم تک لاتی
تھی۔

لکڑی کی بنی پرانی طرزی کھڑکیوں سے کہانیاں پہلے
جھانکا کرتی تھیں۔ وہ رائٹنگ میبل پر بیٹھ کر ان کا
انتظار کیا کرتی تھی پھر آہستہ آہستہ انہیں کانٹوں
پر اتارنے لگی۔ یہ حویلی جس میں گلاب کی مہک
سمبھلی تھی۔ یہ تحسین کے دادا جان کی ملکیت سے ہوتی
ہوئی تحسین تک آئی تھی۔ انہوں نے خود اپنی نگرانی



تحسین اور اس کا ساتھ پچیس برس پرانا تھا۔
تحسین آج بھی روز ازل کی طرح اس سے محبت کرتے
تھے اور اس محبت میں وہ اکیلے تھے۔ اولاد کوئی نہیں
تھی۔ فقط محبت تھی۔
”تحسین! آپ نے چائے پی لیا؟“ اس نے کچن سے
ہی آواز لگائی۔

باہر سرخ اینٹوں والے فرش پر میز اور کرسیاں لگی
تھیں۔ وہیں وہ دونوں صبح کی چائے پیتے تھے۔ پیالیاں،
سائروں اور شکر دانوں سے فکراتیں اور پھر شام تک
خاموشی چھا جاتی۔ کیونکہ تحسین کے جانے کے بعد گھر
میں صرف اسی کا وجود تھا موتیا چنبیلی اور گلاب کے
پودوں کی خوشبو سارے گھر میں اسے ڈھونڈتی پھرتی
”نہنت تحسین“ نہنت تحسین“ اور اوپر صندوقی
کھڑکیوں میں کتابیاں آکے اس کا انتظار کرتیں۔
چائے کے دو کپ اور شکر دانیاں سفید نیلی، جانے
کیوں وہ صبح صبح پھیلاوا بہت سا پھیلاوا پھیلا دیتی،
حالانکہ وہ بندوں کا کام کتنا تھا اور موتیے اور گلاب کی
گوڑی کتنا وقت لے سکتی تھی مگر وہ وقت کو بہت مہینچ
لیتی تھی بہت آگے تک۔
تحسین کا دفتر پانی والی مٹکنی کے ساتھ ہی تھا۔ وہ
پیدل جاتا اور پیدل ہی واپس آتا۔ گلی میں عورتیں صبح
کے وقت ہی پوتلی سناتی دیتیں۔
”اے ناصرو! بولو! اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔
ناشتا کر لو۔“ ایسے میں وہ بھی ان آوازوں میں اپنی آواز
شامل کر لیتی اور اٹھ کے باورچی خانے سے ہی آواز
دیتی۔
”تحسین! آپ نے چائے پی لیا؟“

چائے کا کپ بہت دیر میں ختم نہیں ہوتا مگر ہوا کے
دوش پر اس کی آواز کو بھی تیرنا چاہیے تھا۔ بس بولنا تھا
صبح کے وقت۔ ورنہ تحسین نے تو بھی اولاد کی خواہش
نہیں کی۔ وہ تو جس دن سے نہنت اس کی زندگی میں
شامل ہوئی تھی پچھلے پچیس سال سے وہ کسی کی ضرورت
ہی محسوس نہ کر سکا تھا یا شاید ضرورت تھی ہی نہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

حساب دل رہے دو



نیلہ عزیز

قیمت - 400/- روپے

منگوانے کا پتہ:

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

کر سامنے آ بیٹھا ہے۔ ”اچھا بی بی! اللہ بہت دے اللہ
بخت جگائے وہ بوڑھی فقیرنی بننے کی کوشش کر رہی
تھی۔ تمہاری عمر دعائیں لینے کی ہے دینے کی نہیں
چھوٹی سی فقیرنی۔“ اس نے اس کے سر کو ہلکا سا گھمایا،
”تمہارا نام کیا ہے؟“

بخت ہے جی میرا نام۔ وہ ہنس بڑی اور پھر تھپلا اٹھا
کر نکل گئی پھر ایک معمول سا بننے لگا اسے اس کا انتظار
رہنے لگا۔ ٹھنڈا فرش اس کے پیروں کے لمس کا منظر
رہنے لگا۔ وہ بھی روز ہی آنے لگی ناشتہ کرنے۔ وہ اس
کے لیے چائے بنانے لگی نجابنے کیوں وہ اچھی لگی تھی
اس نے بخت میں دلچسپی لیتا شروع کر دی۔ اس کے
معصوم جواب اسے محظوظ کرنے لگے۔ اسے مزہ
منظور کی گنجشک گفتگو بھی پسند نہیں تھی اور غیبت
تو ہرگز نہیں اور نہ ہی فرزاند خاتون کی لگائی بھائی۔
بخت اسے اچھی لگنے لگی۔

اتوار کو تحسین اور اپنا ناشتا بنایا تو اس کے دوپراٹھے
اور سنہرا انداز ڈھک کے رکھ آئی۔
”آج صاحب گھر پہ ہیں، چھٹی ہے ناں!“ وہ بلا وجہ
ہی خوش تھی۔

”اچھا ہم بھی دیکھیں انہیں جن کی موجودگی نے
آپ کو خوش رکھا ہے۔“
پھر اس کی ہنسی میں تحسین کی ہنسی بھی شامل ہو
گئی۔ ناشتہ بڑے ہی خوش گوار ماحول میں ہونے لگا۔
بخت اچھی لڑکی تھی اور اس کی ہنسی بھی بہت پیاری
تھی۔ تحسین بھی اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔
”کیا کھائی ہو؟ کیسے رہتی ہو؟“ وغیرہ وغیرہ۔

زینت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی تھی۔ نوالے
حلق میں اٹکنے لگے اور کہانیاں او اس درد کے رنگ میں
رنگنے لگیں۔ کیا یہی محبت تھی۔ اتنے کچے رنگ کی کہ
بس پہلی ہی بارش آخری چوٹ ثابت ہوئی تھی۔ اوپر
والی کھڑکیوں سے نیچے جھانکتی تو آنسوؤں کی دیر چادر
کچھ بھی دیکھنے نہ دیتی۔

تحسین سے اپنے آپ کو جذبات کو مخفی رکھنا وہ

تو وہ یوں چیختے چلاتے لڑتے جھگڑتے تھے کہ زینت کو
انہیں چپ کروانا پڑتا تھا۔ ”بے چارے باری باری شیش
صبح صبح کا وقت تھا اور کلندہ یہ قسم کی رفتار بہت تیز تھی
مگر چلا لاک زمین داری کی پھرتیاں اس سے بھی بڑھ کر وہ
قدم قدم پر اپنے ہونے کا احساس دلاتا تھا۔ ٹھک ٹھک
نیچے دستک تھی اور ذرا زور کی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ
نیچے اترنے لگی۔ ہو گا کوئی پیر۔“

”ای! کہہ رہی ہیں وہ اندازے دے دیں۔ دائیہ
دے دیں تھوڑی دیر کے لیے۔“

”یا پھر جیم“ مگر آگے کچھ اور ہی تھا۔
”ای بی بی! ناشتہ کراوے بڑی بھوک لگی ہے۔“
بھکارن تھی وہ۔

”آؤ اندر آ جاؤ۔“ اس نے دروازہ کھول کر جگہ
دی۔

”اچھا جی“ وہ اس کے پیچھے بھاری دروازے کو
دھکیلتی گیلری سے ہوتی ہوئی پچن تک آگئی تھی۔ میز
کے گرد دو کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک پر وہ
تک چلی تھی۔ ”تو ناشتہ کرو۔“ وہ اندازے اور پراٹھے
اس کے آگے رکھ چکی تھی۔ جسے ایک منٹ میں وہ
ہڑپ کر گئی تھی۔

”گھر تو بڑا صاف ستھرا ہے جی۔“ وہ اب فارغ ہو
کے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ پلیٹ میں اب صرف
پارک کٹی ہوئی مرچیں رہ گئی تھیں جنہیں اس نے
نہیں کھلایا۔ مٹی والے ہاتھ دوپٹے سے صاف کر کے
بٹھی تھی۔

”کہاں سے آئی ہو؟“ اس نے سوال کیلئے ساتھ
ہی جو خالی پلاٹ پڑے ہیں نالوں پہ آئے ہیں۔“

”اچھا وہ حاجی صاحب کے خالی پلاٹ۔“

”تم روز مانگنے نکلتی ہو؟“ وہ سولہ سترہ سال کی
گھٹکھریا لے ہالوں والی لڑکی تھی۔ ”نہیں ابھی وہ تو لیاں
جاتی ہے۔ میں تو آج نکلی ہوں ذرا دیکھیں تو یہ اونچے
اونچے مکان بھلا ہیں کیسے؟“ وہ اوپر دیکھ رہی تھی متعجب
لکڑی کی کھڑکیوں کو۔ اسے لگا جیسے ایک کروار مجسم ہو

بہت پہلے سے جانتی تھی۔ محبت قربانی تو ہمیشہ سے دیتی آئی ہے۔ وہ بھی قربانی دینے چلی تھی۔ محبت توجہ پیار کی قربان گاہ کی طرف اس کے قدم خود بہ خود بڑھنے لگے۔

”نہیں چاہیے مجھے جھوٹی محبت۔ جو ترس کھا کے جھوٹی میں کھٹکھٹائے سکوں کی صورت گری ہو۔“
”اسے خالص محبت چاہیے تھی جس میں کسی قسم کا کھوٹ نہ ہو۔“

”وہ آئی نہیں آج؟“ اتوار کے دن کی چمک ماند پڑنے لگی پھکی پھکی بے رس۔

وہ میز پر ناشتا کر رہے تھے مگر دھیان بخت کی ہی طرف تھا۔

”جانتی ہے ہر روز ہی۔ کبھی آپ سے پہلے کبھی آپ کے جانے کے بعد۔“

وہ خود کو لاپرواہا ظاہر کر کے کھانے میں مگن ہو گئی۔ دم کی گئی چائے کا سنہرا پن نچانے کیوں کھوسا گیا۔ شکر دانیان زہر بھری دکھائی دینے لگیں۔ پھر وہی رو دینے والی عورتوں جیسی۔ ہر عورت جیسی عاتوت آئینے کے سامنے کھڑی وہ خود کو دیکھے جا رہی تھی۔

”تو یہ بھی نہنت ابلکے ابلکے سنہرے سفیدی مائل

بال در میانہ قد اور محبت سے جی آنکھیں جو سب کو

کھینچ لیتی تھیں کیونکہ محبت تو باندھ لیتی ہے چاہے

کوئی جتنا بھی وحشی ہو۔ سکون مل جاتا ہے اسے۔ اس

نے محبت کے سہارے زندگی گزار دی تھی۔ سو وہ

سہارا بھی چلا۔ اس کی آنکھیں بھی بہت مونی نہ تھیں

جیسے بخت کی اس جیسے بال بھی کھٹکھٹایا لے سنہری نہ

تھے نہ آنکھوں میں وہ بات جو اس میں تھی۔ وہ صاف

ستھری ہو کے عورت لگتی تھی اور اگر بخت مانی نہادھو

لتی تو حور لگتی۔ جیسے آسمان سے سیدھا ان کے سرخ

فیرش پر قدم دھرا ہو۔ وہ بلاشبہ گدڑی میں چھپا لعل

تھی اور وہ اس حویلی جیسے گھر کا چراغ تھی۔ چراغ

چلائے جاسکتے ہیں، بجھائے جاسکتے ہیں مگر لعل وہ صرف

ایک ہوتا ہے۔ صرف ایک۔ اسے نہ کوئی چراغ دیتا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

500/-	آئندہ دل	بلا دل
1000/-	راحت چیم	دروم
500/-	رشانہ رحمان	زنگی اک دوٹی
200/-	رشانہ رحمان	خوشی کا کوئی کمر نہیں
500/-	ٹاڑیہ چوہری	شہر دل کے دروازے
250/-	ٹاڑیہ چوہری	حیرت انگیز شہر
450/-	آبیہ مرزا	دل ایک ہر جوں
500/-	فاطمہ بخار	آنکھوں کا شہر
600/-	فاطمہ بخار	بہل بھلیاں تیری کیاں
250/-	فاطمہ بخار	کھلا دے دنگ کالے
300/-	فاطمہ بخار	پہ کیاں ہے چارے
200/-	فرخندہ عزیز	سجھا ہے عورت
350/-	آبیہ مداتی	دل اُسے دھڑلایا
200/-	آبیہ مداتی	کھرنا چائیں خواب
250/-	فوزیہ یاسمین	دکھ کر دھڑکی سہائی سے
200/-	ہتری سید	الوں کا چاند
500/-	انصاف غفرانی	رنگ خوشبو ہولناک
500/-	رشید جمیل	درد کے قلعے
200/-	رشید جمیل	آج کلن چاہئے نہیں
200/-	رشید جمیل	درد کی منزل
300/-	نجم عمر قریشی	سرمسید میر سے سفر
225/-	بیمنہ غفرانی	تیری مدد میں مل گئی
400/-	ایم اسلمہ خیر	نام آرزو

ہے جی میرا۔“ وہ جیسے اداس ہو گئی تھی۔
 ”میں تمہیں بہت اچھا سوٹ دلاؤں گی اور کچھ
 سوٹ میری الماری میں ہیں وہ بھی لے جانا۔“
 وہ اسے ایک دم بہت پیاری لگی تھی۔ بلکہ وہ تھی
 ہی بہت اچھی لڑکی اس کی طرف سے نہنت کامل مکمل
 صاف تھا۔

”تمہارا سوٹ کل ہی آجائے گا اور ہاں چوڑیاں بھی
 آکے لے جانا۔“ وہ ٹوٹے دل سے مسکرائی تھی۔ اس
 کا شوہر بے ایمان تھا۔ ایک ایسی لڑکی پر جو پہلے سے
 کسی کے نکاح میں تھی وہ نیچے آئی تھی جہاں تحسین
 موجود تھے۔

”یہ آج اتنی خوش کیوں ہے۔“ وہ پوچھ بیٹھے۔
 ”کیونکہ اگلے ہفتے اس کی شادی ہے۔“ اس کے
 اندر کی بیوی ہلکی سی جاگی تھی۔
 ”اچھا اللہ نصیب اچھے کرے بلکہ ہر بیٹی کی قسمت
 کھولے۔ بڑی ہی پیاری بیٹی ہے یہ بخت۔“ سچ نہنت!
 اگر ہماری کوئی بیٹی ہوتی تال تو ایسی ہی ہوتی۔“ وہ
 آزدگی سے مسکرائے۔ ”بلکہ مجھے تو وہ بیٹی ہی لگی
 ہماری۔“

”ہائیں!“ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا جی چاہا کہ پھوٹ
 پھوٹ کر روئے۔ اس نے تو بدگمانی کو دل میں جگہ دی
 تھی۔ بدگمانی جو شیطان کی طرف سے ہے وہ بے حد
 دکھی ہو چکی تھی۔ سارے شوہر واقعی ایک جیسے نہیں
 ہوتے۔ وہ گلاب اور موتیا کی خوشبو کو واپس آتی
 محسوس کرنے لگی تھی مگر اس خوشبو کو اسے اندر
 اتارنے سے پہلے وہ اپنے دل سے بدگمانیوں کے ٹیرے
 نکال باہر کرنا چاہتی تھی۔ اس کے دل اور آنکھوں میں
 صرف محبت ہونی چاہیے تھی اور کچھ نہیں۔

بخت ان کی زندگیوں سے تو چلی گئی مگر جاتے جاتے
 ایک کہانی اتنی کہانی ان دونوں کے درمیان چھوڑ گئی
 تھی اس بار کہانی کھڑی کے راستے نہیں بلکہ پراثر ہر
 دروازے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

ہے نہ کوئی اٹھانے دیتا ہے۔ وہ سرمایہ تھی اور وہ محبت
 اور دنیا میں جھوٹی سچی محبتیں مل ہی جاتی ہیں اگر
 سرمائے کا ڈھیر موجود ہو۔ وہ بے کار بھی بے کار زمین
 ہے۔ جس پر کوئی پھول نہ اُسنکا تھا وہ بخر بھی بے آب و
 گیاہ صحرا آج اس نے میووں لب اسٹک ہونٹوں کو
 چھوا تک نہیں۔ سب غم لکھنے بال ہاتھوں سے ہی
 سنوار کر اور آگئی۔ نیچے تحسین اخبار پڑھ رہے تھے۔
 دروازہ کھلا تھا۔ وہ سیدھا اندر ہی چلی آئی تھی اور
 تحسین نے اسے آواز نہ دی تھی۔ وہ میز سے کرسیوں
 تک کا سفر مسکراتے ہوئے کر رہی تھی۔ تحسین نے

اندر سے اسے ناشتہ لاکر دیا تھا۔ بیٹش کی طرح وہ جلدی
 جلدی کھا رہی تھی اور آج اس کی ہنسی تھکنے میں نہیں
 آتی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اوپر سے نہنت نے
 سب دیکھا اور دیکھتی رہ گئی اور پھر کرسی پر ڈھسے سی گئی۔
 بخت معصوم سی لڑکی تھی اور وہ ٹوٹی ہوئی عورت پھر
 پیڑھیوں پر وہم و گم کی آواز آنے لگی کوئی اوپر آ رہا
 تھا۔ وہ آنسو صاف کر کے پھر سلجھی ہوئی عورت میں
 بدل گئی آنے والی بخت تھی۔

”بی بی! آپ یہاں بیٹھی ہیں اور میں نیچے آپ کا
 انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ خوشی سے بھری کھڑی تھی اور
 وہ غم سے ٹوٹی پڑی تھی۔
 ”وہ جی کھڑی آگیا ہے واپس۔“ اس کی آنکھیں
 خوشی چمکانے لگیں۔

”کون ہے گھری“ وہ غائب مافی سے پوچھنے لگی وہ
 پچھلے آٹھ گھنٹے سے بولے جارہی تھی اور وہ نہ سن
 رہی تھی نہ دیکھ پائی۔ ”تمہارا بھائی؟“
 ”او نہیں جی۔“ وہ شرمائے لگی۔ ”وہ میرا گھر والا
 ہے۔ جی نکاح ہوا تھا ہمارا آپ رخصتی ہونے جارہی
 ہے۔“ وہ لال سرخ رنگ میں رنگ گئی تھی۔

”اچھا!“
 ”اگلے ہفتے کو شادی ہے میری۔ آپ مجھے کوئی اچھا
 سوٹ بچوتے دے دوں گا۔ بالکل فلوں والے جیسے وہ
 ہنستی ہے۔ کاجل۔ اماں نے تو بڑا ای سا وہ ساسوٹ بنایا



مری غزل ہے کسی خوش نظر کا آئینہ
کسی کا عین ہے میرے ہنر کا آئینہ

یہ چاند ہے کہ ستاروں نے پھیرنے کے لیے
چراغ الیہ ہے کسی بے خبر کا آئینہ

وہ درج عشق سلامت کہ جس نے یوسف کو
بنادیا تھا زلیخا کے گھر کا آئینہ

یہ کس کے عین کی آرائشوں کا سلسلہ ہے
شبِ سیاہ کا شانہ، سحر کا آئینہ

کوئی بھی شکل مکمل نظر نہیں آتی
یہ کس نے توڑ دیا ہے نظر کا آئینہ

میں اک مصوٰدہ رفتارِ وقت ہوں شبنم
مرا کلام ہے میرے سفر کا آئینہ

شبنم رومانی

دل کے ہر زخم کو پلکوں پہ سجایا تو گیا
آپ کے نام پہ اک جتن منایا تو گیا

خیر اپنا نہیں یا غنی ہی سمجھ کر ہم کو
تیری محفل میں کسی طود بلایا تو گیا

اب یہ بات ادد کہ زندوں میں بھی زنجیریں ہر
ہم کو گلشن کی بلاؤں سے بچایا تو گیا

دل پہ چڑھ کے بھی خوش ہیں کہ ہمیں اس دل پر
اس پہانے ہی سہی، اپنا بنایا تو گیا

اب یہ قسمت ہی نہ جاگے تو کرے کیا کوئی
روز و شب ایک نیا طوفان اُٹھایا تو گیا

غنتہ کمنوی

بے ثبات کی دنیا موسموں میں اُتری ہے

پھول بن کر آئی ہے

گلشنوں میں اُتری ہے

آنسوؤں میں اُتری ہے

دل میں کچھ برس جی کر آگئوں میں اُتری ہے

چل دیے خطابن کر

عشق کی حکایت کے لوگ بے وفابن کر

جسم و جاں کے پردے میں قیس کی قبائبن کر

راستے کی مٹی پر عکس ہیں دُعاؤں کے

کچھ قدم ہیں غیروں کے کچھ ہیں آشنائوں کے

بارہا گئے ہم نے قافلے جفاؤں کے

عکس بے گناہوں کے

نام بارگاہوں کے... کس قلم نے لکھے ہیں

مشورے ہواؤں کے

جیلانی کامران

وہ دوست تو نہ تھا، ہاں آشنا تھا... وہ بھی گیا

وفاؤں کی گئی، اک بے وفا تھا... وہ بھی گیا

خوشی جو دیتے تھے، وہ لوگ تو گئے کب کے

وہ شخص جو مجھے غم دے رہا تھا... وہ بھی گیا

وہ ہی کیا، کوئی بھی منزل سے دوشتا نہیں

مگر حسین سا اک رہتا تھا... وہ بھی گیا

خدا کے واسطے اب بولو... کس کو ٹوکو گے،

وہی تو شہر میں قاتل رہتا تھا... وہ بھی گیا

نکالو ڈھونڈ کے معشوقِ مہرباں کوئی

وہ گوسم تھا، غضب تھا، بلا تھا... وہ بھی گیا

نہ جانے اب میری عزتوں کا رنگ کیا ہوگا

جو میرے دل کو لہو کر رہا تھا... وہ بھی گیا

کلم ماجز

بھروسا

بیوی نے شوہر سے پوچھا۔ ”آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟“
شوہر نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔“
”پھر بتائیے اگر میں مر گئی تو آپ کیا کریں گے؟“ بیوی نے پوچھا۔
”مجنوں بن جاؤں گا۔“ شوہر نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”دوسری شادی تو نہیں کریں گے؟“ بیوی نے بے یقینی سے پوچھا۔
”دیکھو بیگم! پاگل کا کیا بھروسا..... وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ شوہر نے جواب دیا۔
(حمہ واجد)

خوش قسمت

نوجوان نے لڑکی سے شادی کی درخواست کی، جو اس نے قبول کر لی۔ لڑکے کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کر رہا تھا اور وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔
”مجھے امید نہیں تھی کہ تم ہاں کر دو گی۔ میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ میری تو شکل بھی ایسی نہیں کہ کوئی لڑکی ایک نظر ڈال کر دیکھنا پسند کرے۔“
”ہاں میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا۔“ لڑکی نے اعتراف کیا۔ ”پھر مجھے خیال آیا کہ تمہارا زیادہ وقت تو دفتر میں ہی گزرے گا۔“
(ثمرہ کاظمی..... نارتھ ٹاؤن آباد)

کوچ

شوہر نے بیوی کے سامنے بے تحاشا تھقبے لگاتے ہوئے کہا۔
”اے حمید صاحب کی بیگم بھی خوب ہیں۔ ہم کرکٹ کے کوچ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ہماری گفتگو سن کر وہ یہ سمجھیں کہ کوچ کے چار پیسے ہوتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر تھقبے لگانے لگے۔ ان کی بیوی بھی تھقبے لگانے میں شریک ہو گئیں۔ دونوں میاں بیوی جب دل کھول کر ہنس چکے تو بیوی نے سر کوئی کے انداز میں شوہر سے پوچھا۔
”اچھا تو کرکٹ کے کوچ کے کتنے پیسے ہوتے ہیں؟“
(عروہ خان..... کراچی)

رنگے ہاتھوں

”شادی کی رات آپ نے جو سونے کی انگوٹھی مجھے دی تھی وہ کہیں گم ہو گئی ہے۔“ بیوی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا تو شوہر نے جلدی سے کہا۔
”عجیب اتفاق ہے کہ آج میرے کوٹ کی جیب سے بھی ہزار روپے غائب ہیں۔ خیر مجھے ہزار روپے کا غم نہیں ہے۔“
”کیوں؟“ بیوی نے چونک کر پوچھا۔
”اس لیے کہ تمہاری کھوئی ہوئی انگوٹھی مل گئی ہے۔“
”کیا ج؟“ بیوی خوش ہو گئی۔ ”کہاں سے ملی؟“
”میرے کوٹ کی جیب میں تھی، جس میں سے ہزار روپے غائب ہوئے ہیں۔“
(حمیٰ بیک..... کراچی)

کروائی ورنہ حج تو تمہیں رہا کرنے پر تلا ہوا تھا۔“
 ملا ننگہ کوثر..... بسم اللہ پور

خوب گزرے گی.....

ایک لڑکا اور لڑکی پارک میں ٹھہرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کہہ رہی تھی۔

”میں حیرنا جانتی ہوں، ٹینس اور گولف کھیلتی ہوں، کار چلائی ہوں، رقص بھی بہت اچھا کر لیتی ہوں اب تم بتاؤ..... کیا کچھ کر لیتے ہو؟“

لڑکے نے فخریہ انداز میں کہنا شروع کیا۔
 ”میں بننا تک سکتا ہوں، کھانا بھی پکا سکتا
 ہوں، بستر بچھا لیتا ہوں، برتن اچھی طرح دھو لیتا
 ہوں، گھر کو صاف رکھنے کا سلیقہ ہے اور سب سے
 بڑھ کر یہ کہ بچوں کو سنبھالنے اور ان کی دیکھ بھال

کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔“

”آہا..... بہت خوب.....“ لڑکی خوش ہو کر بولی۔

”پھر تو ہم کو بہت جلد شادی کر لینی چاہیے۔“

(ارم کمال..... فیصل آباد)

شمارٹ کٹ

ایک آدمی گھبرا یا گھبرا یا سانسڑک پر پھر رہا تھا۔
اچانک اس نے ایک لڑکی سے پوچھا۔

”کیا آپ مجھے اسپتال جانے کا اشارت کرتی ہیں گی؟“

”جی ہاں۔ یہ جو سامنے سے موٹر آ رہی ہے اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔“

(صائمہ مشتاق.....حافظ آباد)

سومنات کاہت

ایک سرکاری اسکول میں اسپیکر صاحب نے ایک طالب علم سے پوچھا۔ ”مومنات کبت کس نے توڑا تھا؟“

طالب علم نے سمے ہوئے لمحے میں جواب دیا ”سرا!
میں نے تو ہرگز نہیں توڑا۔ آپ قسم لے لیجئے۔“

قصور

ایک دفعہ جنگل میں دن کے وقت چیتے اور گدھے میں بحث ہوئی۔ چیتے نے کہا۔ ”آسمان ٹیلا ہے۔“ گدھے نے کہا۔ ”کالا ہے۔“ اگرچہ بات چیتے کی ٹھیک تھی، پھر بھی چیتے نے کہا۔ ”پلو جنگل کے بادشاہ شیر کے پاس چل کر فیصلہ کرواتے ہیں۔“ دونوں شیر کے پاس گئے اور واقعہ سنایا۔ شیر نے کہا۔ ”چیتے کو جیل میں ڈال دو۔“ چیتے نے احتجاج کیا۔ ”بادشاہ سلامت! بات بھی میری درست اور جیل بھی مجھے جانا پڑ رہا ہے؟“ بادشاہ نے کہا۔ ”بات سچ اور جھوٹ کی نہیں، تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ایک گدھے سے بحث کی۔“

عقلمندی

ایک سنبھوس ڈاکٹر کے پاس گیا اور بولا۔
 ”گھر جا کے مریض کا چیک اپ کرنے کے
 لئے آپ کی فیس کتنی ہے.....؟“

ڈاکٹر: ”ایک سو پچاس روپے۔“

کنجش : میرے ساتھ میرے گھر تک

چلیں.....؟“ ڈاکٹر کی بائیک پہ دونوں کمر تک پہنچے تو

بجوس نے ڈاکٹر کو ایک سو پچاس روپے دیے۔

ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا۔ ”میریس جہاں“

کشمیر، مغل پورہ، کراچی، لاہور، اسلام آباد

الاکم تک کے حارسوں تک رہا تھا۔" "....."

(مسرت الطاف احمد..... کراچی)

کوشش

مجرم وکیل سے۔ ”کوشش کرنا مجھے عمر قید بھلے ہو جائے پھانسی نہ ہو۔“ وکیل نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے۔“

دوسرے دن مجرم وکیل سے۔ ”کیا بتا؟“ وکیل

شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بڑی مشکل سے عمر قید

انسپکٹر صاحب نے کلاس نیچر کو یہ بات بتائی تو کلاس
نیچر نے طالب علم کو مرغا بناتے ہوئے جواب دیا۔

”جناب اسی نے توڑا ہو گا۔ یہ بڑا شرارتی ہے۔“
انسپکٹر بھنایا ہوا ہیڈ ماسٹر کے پاس گیا اور کہا کہ ”آپ
کے اسکول کا یہ معیار ہے کہ کسی کو پتا ہی نہیں کہ
سومنات کابت کس نے توڑا تھا۔“

ہیڈ ماسٹر صاحب نے معذرت خواہانہ انداز میں
جواب دیا ”سراچ سو طالب علموں کا اسکول ہے اتنے
جھوم میں کیسے پتا لگایا جاسکتا ہے کہ سومنات کابت کس
نے توڑا۔ اسٹاف ویسے ہی کم ہے یہ سومنات اوھر اوھر
پر مارا گیا ہو گا۔“

انسپکٹر صاحب نے محکمہ تعلیم کے متعلقہ افسران کو
فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو اوھر سے
جواب آیا۔

”دیکھیں انسپکٹر صاحب! سومنات کابت جس نے
بھی توڑا ہو، پیسے تو آپ ہی کی تنخواہ سے کاٹے جائیں
گے کیونکہ اس اسکول کی نگرانی آپ ہی کی ڈیوٹی
ہے۔“

اقصی افضل، سرگودھا

حالت

ایک فقیر نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔
بڑی درد بھری آواز نکال کر بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک
خاتون کو روک کر بولا۔

”محترمہ! آپ جس حال میں مجھے اب دیکھ رہی ہیں
میں ہمیشہ ایسا نہیں تھا کوئی وقت تھا کہ۔“

خاتون اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معلوم
ہے پچھلی مرتبہ جب تم سے میرا سامنا ہوا تھا تو تم کو نگے
یا ہرے اور لکڑے تھے۔“

ملانکہ کوثر۔ بسم اللہ پور

جواب

فوجی ٹریننگ کے دوران آفیسر نے سپاہی سے

پوچھا۔

”تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

”رب نواز“ سر یہ بددوق ہے۔“

آفیسر ”یہ بددوق نہیں تمہاری عزت اور شان
ہے۔ تمہاری ماں ہے۔“

آفیسر دوسرے پٹھان سپاہی سے ”تمہارے ہاتھ
میں کیا ہے۔“

پٹھان ”سرا یہ رب نواز کی ماں ہے اور ہماری خالہ
ہے۔“

نسرین علی، میاں چنوں

موسم سرما کا فیشن

بیوی کافی دیر سے پریشان ہو رہی تھی۔ وہ بار بار
چھینل بدلتی، بھی اخبار اٹھا کر کھولنے لگتی۔

پاس ہی شوہر صاحب بیٹھے آفس کی فائلز دیکھ رہے
تھے اور بیوی کی جھلاہٹ اور بے چینی بھی۔ آخر کار سر
اٹھا کر بولے ”کیا ہوا؟“

بیوی روپا نہی ہو کر بولی ”میں اب تک یہ معلوم
کرنے میں ناکام ہو رہی ہوں کہ اس بار موسم سرما کا کیا
فیشن ہو گا؟“

شوہر صاحب فائلز پر نظر سے جما کر سنجیدگی سے
بولے ”ہمیشہ کی طرح دو قسم کے فیشن ہوں گے۔“
بیوی بات کاٹ کے خوش خوش بولی ”کون سے دو
فیشن؟“

شوہر نے جواب دیا ”ایک وہ جسے تم پسند نہیں کرو
گی اور دو سرمایہ گاہوں نے کی وجہ سے میں خرید نہ سکوں
گا۔“





سے اچھا سمجھنے لگے " اقرائے خالدہ سیاکورٹ

سخاوت،
حضرت علیؓ نے کسی نے پوچھا۔
"سخاوت کسے کہتے ہیں؟"

آپؓ نے فرمایا "سخاوت اسے کہتے ہیں کہ جو
بغیر مانگے ملے اور بخشش اسے کہتے ہیں جو
ملنے کے بعد ملے۔"

خلیفہ وقت،

حضرت یحییٰ بن مہران کہتے ہیں "مجھے پہلانی
نے بتایا کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کو دیکھا کہ وہ حجر پر سوار ہیں اور ان کا غلام خاں
ان کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے حالانکہ حضرت عثمانؓ اس
وقت خلیفہ تھے۔"

امیر المومنین،

خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے
ایک دفعہ ہم کو مجبوریں خریدیں اور انہیں اپنی چاد
میں ڈال کر اٹھائے گئے تو کسی نے ان سے کہا۔
"اے امیر المومنین! آپ کی جگہ میں اٹھا لیتا
ہوں۔"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "نہیں،
(یہ مجبوریں میں نے بچوں کے لیے خریدی ہیں اس
لیے) بچوں کا باپ ہی ان کے اٹھانے کا حق دار
ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت ابو عبد اللہ طارق بن اسیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ
سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔
"جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا اور اللہ کے سوا
دوسرے معبودوں کا انکار کیا تو اس کا مال اور خون
محفوظ (حرام) ہو گیا اور اس کے (بے باطن) کا حساب
اللہ کے ہاتھ ہے۔"
فائدہ مسائل۔

اس میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں جن کے
بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ صرف اللہ کی معبودیت
کا اقرار اور عزوجل کی معبودیت کا انکار۔

آزمائش ہے یا سزا،

حضرت علیؓ نے کسی نے پوچھا۔
"یہ کیسے پتا چلے گا کہ جو پریشانی یا مصیبت
ہم پر آئی ہے وہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے
یا سزا؟"

آپؓ نے جواب دیا۔

"جو مصیبت تجھے اللہ کی طرف سے ملے وہ
آزمائش ہے۔ جو مصیبت تجھے اللہ سے دھمکے
وہ سزا ہے۔"

نوال افضل گمن۔ کراچی

خود پرستی،

حضرت علیؓ نے پوچھا کیا۔
"انسان بڑا کب بنتا ہے؟"
آپؓ نے فرمایا "جب وہ خود کو دوسروں

خلیفہ کی برکت،

ماہک بن دینار کہتے ہیں کہ جب حضرت
عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو ہر دہے نہایت
عجب سے کہتے تھے۔
"فولن پر کون خلیفہ مقرر ہوا ہے جو ہماری
بکنروں کو بھرتے کچھ نہیں کہتے"

حکمت کے موتی،

حضرت علیؓ کی تلوار پر یہ اشعار کندہ تھے۔
ترجمہ۔
ہذا قتل سے نہیں ملتا، بلکہ مدق کا حصول
تو مقدمہ ہی ممکن ہوتا ہے۔
"اگر قوت باندھ ادا ملے کے ذریعے مددی
حاصل ہوتی تو پھر چٹروں کا مدق باندھ لیا آٹے"

جواب جاہلان،

عمر بن حبیبؒ نے اپنے آفرینے میں اپنے پوتے
کو نصیحت کی۔ انہوں نے کہا۔
"جو شخص نادان کے چھوٹے شر بردار بنے ہو گا۔
اس کو نادان کے بڑے شر بردار بنی ہو گا۔
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی نادان یا کسی فساد
آدی سے آہستہ کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اس
کا بہترین حل یہ ہے کہ اس کو برداشت کیا جائے۔
کیونکہ اگر اس کو جواب دیا گیا تو وہ نادان مجرّم کر
مزید بدنامی کرے گا۔
(مولانا وحید الدین خان، ملاذ حیات)

عز و تکبر،

ایک مشہور انگریزی مصنف ولیم لاکھتا ہے۔
"جڑائی جب بھی شروع ہوتی ہے، عز و
شروع ہوتی ہے۔ جڑائی کا جب بھی خاتمہ ہوتا ہے تو
انکساری کے ذریعے ہوتا ہے۔
* * *
خجامن فرینکلن نے کہا تھا۔

"جب تم دوسرے کے لیے اچھے ہوتے ہو تو
اپنے لیے بہترین ہوتے ہو۔"
مطلب یہ ہے کہ ہمارے اعمال، افعال، کلمات
جلد یا دیر ہماری طرف واپس آتے ہیں۔
مدد یا نمر یا نفعی یا نمر۔ کراچی

جدوجہد،

بیالوجی کے استاد نے طلباء کو بتایا کہ تسلی
کس طرح غلّ کو توڑ کر نکلتی ہے۔ پھر اس نے غلّ
ان کے سامنے رکھ دیا اور بتایا کہ دو گھنٹے بعد اس
پیشے سے تسلی نکلے گی اس نے انہیں منع کیا کہ کوئی
تسلی کی مدد نہ کرے۔ اس کے بعد وہ کلاس روم سے
باہر چلا گیا۔
ٹھیک دو گھنٹے بعد غلّ ٹوٹنے لگا اور تسلی باہر

آنے کی جدوجہد کرنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر
ایک طالب علم نے رہا نہ کیا اور اس نے استاد کی
ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے تسلی کی مدد کے
خیال سے غلّ کو توڑ دیا۔ تسلی آزاد ہو گئی لیکن
مقعدی ہی دیر بعد مر گئی۔
جب استاد کو بتایا تو اس نے طلباء کو سمجھایا
کہ غلّ کو توڑنے کی جدوجہد تسلی کو وہ قوت عطا
کرتی ہے جس سے وہ زندہ رہتی ہے۔ چونکہ طالب علم
نے اس کو جدوجہد نہیں کرنے دی تھی، اس لیے وہ
مر گئی تھی۔
زندگی میں محنت، کوشش اور جدوجہد ہمیں
مضبوط بناتی ہے اور ہم دنیا کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔
نمر و مقب۔ مگرین شی

اعتماد،

شاخ پر بیٹھا پرندہ شاخ کی کمزوری یا اس
کے چھوٹنے سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ اس کو شاخ پر نہیں
اپنے پروں پر اعتماد ہوتا ہے۔

گناہ،

گناہ ذہن کی مانند ہے جو کم ہو یا زیادہ، نقصان دہ ہوتا ہے۔

(اشفاق احمد)

تو لا افضل گمن۔ کراچی

بار بار دھوکا کھانا،

لیکن پروردی اچھی بات نہیں ہے لیکن بار بار دھوکا کھانا بھی سہ وقوفی ہے۔ کسی مفکر کا قول ہے۔ تم نے مجھے دھوکا دیا، انہوں نے تم پر، تم نے مجھے دوبارہ دھوکا دیا۔ انہوں نے مجھ پر، نادیر یاسر۔ گوجرہ

جو دیتے ہیں، وہی پالتے ہیں،

ایک کسان ایک بیکری طے کو ایک پاؤنڈ مکھن غذا نہ بچا کرتا تھا۔ ایک دن بیکری طے نے

سوچا کہ مکھن کا وزن کم کر کے دیکھ سکے ایک پاؤنڈ ہی ہے کم تر نہیں ہے۔ جب اس نے وزن کیا تو بتا کہ مکھن پونہ ایک پاؤنڈ نہیں ہے۔ اسے براعتہ آیا۔ اس نے کسان پر متوجہ کر دیا۔

بچنے کے کسان نے پوچھا: اس نے مکھن کا وزن کس طرح کیا تھا؟

کسان نے کہا: جناب ملا میں غریب آدمی ہوں میرے پاس ترازو نہیں ہے لیکن میں ایک دوسرے طرح سے مکھن کا وزن کرتا ہوں۔

بچنے پوچھا: وہ کیا طریقہ ہے؟ وہم کسان نے کہا: میں بیکری طے کو مکھن بچھنے سے کافی عرصہ پہلے سے ایک پاؤنڈ کی ڈبل روٹی خرید رہا ہوں۔ میں اس کی ڈبل روٹی کے برابر وزن کا مکھن اسے دے دیتا ہوں۔ اگر وزن پونہ نہیں ہے تو آپ ہی بتائیے کس کا قصہ ہے؟

وہم زندگی میں جو کچھ دیتے ہیں، وہی پالتے ہیں۔

مدیر، ایمان جمید۔ مدینہ کالونی

نیت،

شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

ایک بادشاہ اندامیک دودیش کا انتقال ہوا کسی نے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ نیت میں نہیں رہا ہے اور دودیش دودیش میں پڑا ہے۔ کسی بزرگ سے تعبیر معلوم کی تو کہا کہ وہ بادشاہ صاحب نیت و تاج تھا مگر دودیش کی تمنا کرتا تھا اور دودیشوں کی طرف بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

اور دودیش تھے تو فقیر رہے تو! مگر بادشاہ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اسی طرح اگر کوئی مسعد میں ہے اندام کا دل لگا ہوا ہے کہ جلدی غازی ہو اور میں اپنے کام کو جاؤں تو گویا وہ مسعد سے نکل چکا۔ اور کوئی بات میں ہے اندام کا دل مسعد غازی میں لگا ہوا ہے تو گویا وہ غازی ہی میں ہے۔

(ماخوذ از مجلۃ اہل دل)

دانیہ رحمن۔ لاہور

خیال میرا خوشبو سا،

نعت کا ملنا آدما نش ہے کہ تم نے شکر ادا کیا یا ناشکری کی۔

بد قسمتی محض بہتان ہے جو کہانوں کی طرف سے اللہ پر لگایا جاتا ہے۔

ماستہ ہنر بلا ہو، سوچ کی تہذیب تیز ہو، ہر قدم پر چوٹائی، تو قوسافت شکل سے کٹے ہوئی ہے۔

خواب وہ نہیں جو آپ سوچتے ہیں دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو آپ کو سوچنے نہیں دیتے۔

پھولوں سے محبت کرنے والے کیا مر دیکھا عیش، مام طور پر معمولی شکل و صورت کے ہوتے ہیں وہ پھولوں کی خوشبو سے، ان کی گہرے سے بہار نہیں کرتے ان کے ہونے سے پیا کرتے ہیں۔

سیدہ نہت ذہرا۔ کھر و پکا

خالد بیگانی کی سیریں

حلا shaft اوندنگی ناؤں

تیسری نگاہ لطف بھی ناسام ہی نہ ہو
دل تو وہ زخم ہے جسے آرام ہی نہ ہو
دھنک سی دے سی ہے در پہ پہ بادِ صبح
اسے جو خواب سن کوئی پیغام ہی نہ ہو
سونیا پانی

میں منور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ انگلیں ہماری کہاں سے لائے گا
تمہارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسے
تمہارے بعد یہ موسم بہت سستے لگا

مذرا ناظر، اعلیٰ ناظر گلستانِ جوہر
آکھ یوں ہوئی کہ اک جگنو نہ لکے ہاتھ سے
آکھ کو ایسے جبکہ کوئی ادبیل نہ ہو
پہلی سیر میں پہ قدم رکھ آفری سیر میں پہ آکھ
منزل کی جستجو میں مایگیں کوئی پل نہ ہو
نور، اقرا

کافذ کی ناؤں بھی ہے کھولنے بھی ہیں بہت
بچپن سے پھر بھی ہاتھ ملانا محال ہے
تبسم شام

آفس کی ذات سے منسوب ہیں تمام قصے
وہ ایک ہی شخص سرما یہ حیات کھڑا
نازہ بیٹی
میرے الفاظ میں تریب کہاں تھی اتنی
یہ کو منظور ہونے کے ملاقات کے بعد

گجراتی سسرز

کون سی رت ہے زملے میں نہیں کیا معلوم
اپنے دامن میں لیے پھرتی ہے حسرت ہم کو
زخم و وصل کے مرہم سے بھی شاید نہ پھر میں
بھریں ایسی علی اب کے مسافت ہم کو

حور وادہ گلستانِ جوہر

ایک بار ادھر بھی کیوں عرض تمنا نہ کروں
کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ
دانیہ

رہر دودھ محبت سے اُلجھا ہے غم، ہستی
کیا کیا ہیں یاد آ یا عجب یاد تری آئی
فانکہ ہیل

وہ بات بات پہ اپنی مثال دیتا ہے
کچھ اپنے آپ پر کم اعتبار ہے شاید
ماہ نور

دفا کا عہد تھا دل کو سنہالنے کے لیے
وہ ہنس پڑے تھے مجھے ہٹل میں ڈالنے کے لیے
افشاں شریف

مری مری ہو نہ سمجھ کے، مرے دل میں تے سلاہ تے
ترے ہاں تھے جواب تے، تری اک نگاہ میں آگئے
یاسین احمد

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے
اگر گیارہ جاں میں یہ نشر پھر بھی
ربیعہ طفیل

مجھے معلوم ہے وودہ نبیا ناصحت شکل ہے
مری کم ہستی انکار بھی کہنے نہیں دیتی
زینب عمران

ہم تو ہر موڑ بھجھا آئے تھے دامن لینا
جانے کس ماہ بہاروں کے خزانے کو
لاہور

گڑیا شاہ

فرصت کا رو بار شوق کے
ذوقِ نظارہ، جمال کہاں
مٹی اک شخص کے لغو سے
اب وہ روحانی خیال کہاں

مرآت شہرے مہر کبھی ہم کو بھی مہلت دیتا
اک دیا ہم بھی کبھی رخ سے جلاتے جاتے

آئینہ سعد
تجھے کیا خبر مر وصال نے ہمیں یکے زخم دیے یہاں
تری یاد کا بھی اک غلش، تری یاد کا بھی اب نہیں
وہ جولاہی ماں سے گزر گئے، انہیں کیا خبر ہے کہ شہر میں
کسی جاں نثار کا ذکر کیا، کوئی سوگوار بھی اب نہیں
یاسین کنول

آنکھ میں کون سے سمندر ہیں
جو بجکتے ہیں آنسوؤں کی طسوع
نازہ بتول
دوق صدق پر تیری عبادت، تیرا فسانہ، تیری حکایت
کتاب، ہستی جہل سے غولی، تیری محبت کا باب نکلا

اقرار عزیز
کون کونے صواب ہروں میں آنسو تھا ہے
وہ جو ایک درد کا تاج تھا، دکھان چھوڑ گیا
حاصلک
سب ہوتا ہے جیرے بھیر
فقط گزارہ نہیں ہوتا

عمر واپد خان
ہم نے گزرے ہمارے غول کا حوالہ جو دیا
ہم نے کہنے لگے، مات گئی، بات گئی

سونیا فونن
امید و نغم کے عود سے ہٹ کے دیکھتے ہیں
فلاسی دیر کو دُنیا سے کٹ کے دیکھتے ہیں

ملائکہ کوثر
بسم اللہ پود
اب کے سفر ہی اور تھا اور ہی کچھ مراب تھے
دشت طلب میں جا بجا، سنگ گرل خواب تھے
حشر کے دن کا غلغلہ، شہر کے ہام و دہر میں تھا
لگے ہوئے سول تھے، اگلے ہوئے جواب تھے

نہیدہ گل
نہیں تھی ترک گئے کبھی حل سے کبھی جلتے جلتے جلتے
یوں عمر ساری گزار دی یوں ہی زندگی کے سم سے
سنبھلی خند میں بھی ہوش میں تو جہاں ملاجھے دیکھ کر
نہ نظر ملی نہ زباں ملی یوں ہی سر جھاکے گزرتے
فائزہ بھٹی

دشت نہاں میں جسے چھوڑ آئے تم
سراجلے سے پوچھا ہے: پیار کیا تھا

آسیہ فرید
سبب جو ڈھونڈو گے تو عمر بیت جاتے گی
کہا نا یاد آتے ہو تو بس آتے ہو
مدد بخود ہی جہک
کیا خیر تم نے کس روپ میں دیکھا ہو گا
میں کہیں پتھر کہیں مٹی کہیں آئینہ ہو پتھر پتھر

ملائکہ کوثر
بسم اللہ پود
دل کے ٹوٹ جانے برابر ملا لیا کرنا
پتھروں کی بستی میں اپنے تو نوٹیں گے
نمرہ عاقب
یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے صمت مل کر انہیں دو گ ہیں کتابوں والے

ایمان جلبانی
مٹاؤں دیا خان جلبانی
اپنی پیاس کو لے کر کس کے پاس جاتا میں
حن کے پاس دریا تھے ان سے ہی لڑائی تھی

عذرا نامہ واقعی نامہ
اب اس سے ترک تعلق کر دوں تو مر جاؤں
بدن سے دودھ کا اس درجہ اشتراک ہوا
نہ پوچھ اپنی طرف سے لوٹنے کا عمل
کہ میں پہاڑ تھا، سمنا تو مشتبہ خاک ہوا



درستیکہ

شاین رشید



شہر یار منور

”کیا حال ہے جی.....؟“
”اللہ کا شکر ہے۔“

”کمرشلز میں تو آپ کو دیکھ رہے ہیں ڈراموں میں آپ نظر نہیں آ رہے؟“
”جی بس ایسا ہی ہے۔ کبھی کمرشلز تو کبھی ڈرامے۔“ ان شاء اللہ آپ جلد ہی دیکھیں گی ڈراموں میں۔“
”کیا انڈر پروڈکشن ہیں؟“

”جی..... جی ابھی ڈس کلوز نہیں کرنا چاہتا۔“
”اوکے جی..... کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں؟“
”بہت زیادہ نہیں ہوئے..... یہ کوئی پانچ سال پہلے 2012ء میں اس فیلڈ کو جوائن کیا تھا۔“

”مگر آپ کا ارادہ تو ملک سے باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا تھا؟“

”بالکل تھا..... اور ملک سے باہر جانے کی ساری تیاری ہو چکی تھی۔ گریجویشن میں گر چکا تھا۔ ماسٹرز کرنے مجھے جانا تھا۔ مگر اچانک ہی مجھے ڈراما سیریل ”میرے درد کو جو زبان ملے“ کی آفر آ گئی۔ اچھی پیش کش تھی۔ کردار بھی اسٹرونگ تھا تو سوچا کہ پہلے اسے کر لوں، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جاؤں گا۔“
”پھر گئے آپ؟“

”قہقہہ.....“ نہیں جی..... ابھی تک نہیں جاسکا۔ کہ ٹائم ہی نہیں ملا؟“
”اور پھر آپ نے سوچا ہوگا کہ ایک ڈگری

تولے ہی لی ہے۔ دوسری نہ بھی لی تو کوئی مسئلہ نہیں۔“
”نہیں..... نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ماسٹرز کرنا تو میرا خواب ہے اور اسے ضرور پورا کروں گا۔ ان شاء اللہ۔“

”ان ساری باتوں کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہی ڈرامے میں آپ کی اداکاری کو سراہا گیا ہوگا؟“
”بالکل ٹھیک آئیڈیا آپ نے لگایا۔ پہلے ہی ڈرامے میں بہت حوصلہ افزائی کی گئی اور دیگر ڈائریکٹرز کی آفرز بھی آنے لگیں، کچھ کمرشلز کی آفرز آ گئیں تو بس۔“

”تو بس پھر ”روزگار“ کی گاڑی چل پڑی..... اور یہی ذریعہ معاش بھی بن گیا؟“

رومیٹک، تھوڑا لطف اور کردار میری پہچان

بے۔۔۔۔۔ ”شہریار منور آپ منور عالم صاحب کے صاحبزادے ہیں جنہوں نے تمہارا امتیاز اور ستارہ امتیاز لیا ہے۔ کیا محسوس کرتے ہیں آپ؟“
”بہت فخر ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ ہم بھی ایسے ہی ہوں اور اللہ ہمیں بھی ایسی ہی عزت، شہرت

اور قابلیت عطا کرے۔ (آمین)“
”والدین کی کوئی بات جو گروہ سے باندھ لی ہو؟“
”جی ہاں۔ ہم چھوٹے تھے تو والدین ہمیں جلدی سونے کے لیے کہتے تھے اور صبح جلدی اٹھنے کے لیے کہتے تھے، اس وقت تو ان کی یہ بات بری لگتی تھی، مگر اب سوچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ والدین بچوں کے لیے جو کہتے ہیں وہی سچ ہوتا ہے۔ اس عادت کی وجہ سے اب ہم سب کا دل بہتر ہو گیا ہے۔“
”کبھی کوئی فیصلہ غلط ہوا؟ کوئی بچھڑا ہوا؟“
”اللہ اللہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جو فیصلہ کرتا ہوں اس میں دل سے زیادہ دماغ سے مشورہ لیتا ہوں۔ کیونکہ دل کے بارے میں مشورہ سچے کہ ”دل تو باگن“ ہے۔ تو اس دماغ کی بات مان کر کبھی کوئی بچھڑا نہیں ہوا۔“

”کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟“
”جی۔۔۔۔۔ ہمارا تعلق ”سہیون شریف“ سے ہے۔ والدہ کا تعلق قلات سے ہے اور وہ فلاور آرٹ سوسائٹی آف پاکستان کی وائس پریذیڈنٹ رہ چکی ہیں۔ والد صاحب ایئر فورس پائلٹ رہ چکے ہیں۔ ہم تین بھائی تھے۔ ایک بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اب ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔۔۔۔۔ اور میں 1988ء اگست کو پیدا ہوا۔ لیو میر استار ہے۔ او اور اے لیول کے بعد ”آئی ٹی اے کراچی“ سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی اور بس۔۔۔۔۔

”چلیں خوش رہیں۔۔۔۔۔ پھر بات ہوگی۔“
☆☆☆

”جی۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔“
پھر ”آسانوں پہ لکھا“ نے آپ کو شہرت کی بلند یوں پہ پہنچا دیا۔
”جی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ترقی کے دروازے کھلتے ہیں تو پھر ہر کام اچھا ہوتا جاتا ہے اور ابھی میرے کمرشلز کی تعداد ڈراموں سے زیادہ ہے اور کمرشلز میں پیسہ بھی زیادہ ہے۔ مگر تسکین اداکاری سے ہی ملتی ہے۔“

”محمد ود کا م کرنے کے قائل ہیں یا جوں گیا قبول کر لیا؟“
”محمد ود کام کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ مگر ہر آفر قبول کرنے کا بھی قائل نہیں ہوں۔ معیار ہمیشہ میری ترجیح رہی ہے۔ کیونکہ معیاری کام ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔“
”فیوج میں کیا، کیا خواہشیں ہیں؟“
”سچ پوچھیں تو میں فیوج پلاننگ کا قائل نہیں ہوں۔ کیونکہ انسان کی اگلی سانس کا بھر وسان نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے، انسان کے ہاتھ میں۔۔۔۔۔ اس لیے جہاں قسمت لے جائے گی چلے جائیں گے۔“
”شہرت پہ فخر ہوتا ہے؟“

”بہت زیادہ۔۔۔۔۔ مگر ڈرتا بہت ہوں۔ شہرت سے۔۔۔۔۔ بہت سنبھل کر چلتا ہوں کہ کہیں رب کو میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔“
”آج کل آپ کا ایک کمرشل بہت باپور ہو رہا ہے۔ بے ساختہ پر فارمنس دی ہے آپ نے؟“
”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ کئی لوگوں نے تعریف کی ہے۔“
”کسی ڈرامے کی آخر آئی ہے تو پہلی ترجیح کیا ہوتی ہے؟“
”ڈراما ٹیم ورک کا نام ہے تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ ٹیم میں کون کون شامل ہے۔ بس پھر اسی حساب سے کردار قبول کرتا ہوں۔“

”اور کردار کے لیے کیا ترجیح ہوتی ہے؟“
”وہ ہی ایک بات کہ کردار پارورفل ہو، کچھ کرنے کی گنجائش ہو۔۔۔۔۔ لوگ پسند کریں۔ تھوڑا

”کیا حال ہے جی؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”ماشاء اللہ آپ تو ہر دوسرے ڈرامے میں نظر

آ رہی ہیں۔ تھک تو جاتی ہوں گی؟“

”جی کیوں نہیں۔ تھکن تو ہوئی جاتی ہے۔

مگر کسی کو انکار کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پھر اگر کردار

اچھے ہوں تو بالکل بھی نہیں۔“

”ہر وقت رونے دھونے والے کردار۔۔۔۔۔ پور

نہیں ہو جاتیں کیا؟“

”ہو تو جاتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر آج کل تو کردار ہی

ایسے لکھے جا رہے ہیں تو کیا کریں۔“

”کیا عورت کی زندگی میں روٹا ہی لکھا ہے؟“

”ہمارے ڈراموں سے تو یہی لگتا ہے۔ ورنہ تو

آج کی عورت بہت بہادر اور بہت اسٹریٹنگ ہے۔

بے شک عورت آج بھی بہت مظلوم ہے۔ مگر اتنی

نہیں جتنا دکھایا جاتا ہے۔“

”شاید ریٹنگ کا چکر ہے؟“

”چکر نہیں۔۔۔۔۔ حقیقت ہے۔ جب آپ ایسے

موضوعات لیں گے، جہاں دوسروں کے گھر کے اندر

ناک جھانک ہوگی۔ جہاں مرد اپنی بیٹی کی سیکلی سے

محبت کرے گا۔ جہاں وفاداری کی کہوتے ہوئے

مرد دو تین شادیاں کرے گا تو ریٹنگ تو بڑھے گی،

کیونکہ ایسے موضوعات خواتین کے پسندیدہ

موضوعات ہوتے ہیں وہ عورت کو روتا ہوا دیکھ کر خود

بھی رونے بیٹھ جاتی ہیں۔“

”آپ کیا دیکھ کر کردار کی آفر کو قبول کرتی ہیں؟“

”اب زیادہ کچھ نہیں دیکھتی۔ یہ دیکھتی ہوں کہ

یہ کس قسم کی ماں کا رول ہے۔ دل کو بھا جاتا ہے تو لے

لیتی ہوں۔ نہیں تو انکار کر دیتی ہوں۔“

”جس دور میں آپ نے بی بی دی اور این ٹی

ایم میں کام کیا زیادہ کام ہوتا نہیں تھا۔ صرف سال

میں دو یا بہت ہوا تو کسی فنکار کو تین سیریلز مل جاتے

تھے۔ مگر شہرت آسمانوں کی بلندیوں تک ہوتی

تھی۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اور اس

کے بعد ہمارے زمانے میں بہت معیاری کام ہوا کرتا

تھا۔ ہم ہمیشہ ایسے کردار کو ترجیح دیا کرتے تھے، جو

بہت معیاری ہوتے تھے اور یاد رہ جانے والے

ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے برسوں کے بعد

ہمارے پرانے کرداروں کو اب بھی یاد کیا جاتا ہے اور

جب میں برسوں کے بعد پاکستان واپس آئی تو سب

نے گرم جوشی کے ساتھ مجھے دیکھ لیا۔“

”بالکل۔۔۔۔۔ آج بھی ہمارے سینئرز کی بہت

عزت ہے۔“

”بالکل۔۔۔۔۔ جی بہت عزت ہے اور یہاں

آ کر پہلے پہل تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ مگر پھر میں نے

بھی سمجھوتا کر لیا اور وہ یہ کہ جب ڈرامے کی سب

مائیں رورہی ہیں تو میں بھی رو لیتی ہوں۔ سب ٹیکٹیو

رول کر رہی ہیں تو چلو میں بھی کر لیتی ہوں۔“

”پھر بھی ان روز سے ہٹ کر کچھ کرنے کو دل

چاہتا ہے آپ کا؟“

”بالکل چاہتا ہے۔۔۔۔۔ میں تھر کی عورت کا یا صحرا

میں کسی بھگتی عورت یا روح کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔ کسی پاگل یا جانی معذور عورت کا رول کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی اچھا گیٹ اپ والا رول کرنا چاہتی ہوں۔

”امریکا آنا جانا تو لگانا ہی رہتا ہوگا؟“

جی..... بالکل..... کیونکہ وہاں کا چکر لگانا بہت ضروری ہوتا ہے اور جب میں پاکستان آئی تھی تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ دو تین ماہ سے زیادہ نہیں رہوں گی..... لیکن لوگوں کی محبت نے مجھے یہاں رہنے پر مجبور کر دیا۔

”اچھا..... گلد..... کھانا وغیرہ خود ہی پکاتی ہیں؟“

”روزانہ نہیں..... کبھی کبھار جب ٹائم مل جائے..... ورنہ تو عموماً رات کو گھر واپسی پہ کچھ نہ کچھ لے آتی ہوں۔“

”اور اس انڈسٹری کو آپ جیسی اچھی آرٹسٹ کی ضرورت بھی ہے..... فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟“

”شوق ہے پکانے کا؟“

”بہت..... اور بہت اچھا پکالتی ہوں..... الحمد للہ ہاتھ میں ذائقہ ہے۔“

”فارغ اوقات الحمد للہ زیادہ ملتے ہی نہیں ہے۔ دن رات مصروف رہتی ہوں اور زندگی کو انجوائے کرتی ہوں۔ بھی مل جائیں تو پھر اپنی کزنز



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



حزیر ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جمین
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹاؤ



نکھت عبد اللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر
32735021

منگوا لیں مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

طی۔ الف

روے کا نوٹ رکھا تو میں بہت خوش ہوئی اور چڑکھانے
باہر بھاگ گئی تھی۔ یہی میری منگنی تھی۔“

س : ”شادی سے پہلے جیون ساتھی کے بارے
میں کیا تصور تھا؟ کیا خیالیاں دیکھنا چاہتی تھیں؟“

ج : ”طارق (سببند) کی طرف سے یہ پسند کی
شادی تھی۔ جب بھی وہ ملتان آتے تو میرے لیے کوئی
نہ کوئی گفت ضرور لے کر آتے تھے اس وجہ سے وہ
مجھے بہت پسند تھے۔ تصور یہی تھا کہ وہ ہمیشہ مجھے ایسے
ہی پیارے پیارے گفت دیتے رہیں گے اور مجھے
پارک میں گھومنے کا بہت شوق تھا۔ یہی سوچتی تھی کہ
وہ اتنے اچھے ہوں کہ مجھے سیر کرواتے رہیں۔ اس وقت
تو خویوں کا کوئی خاص پتا نہیں تھا لیکن اب سوچتی
ہوں طارق صاحب تو خویوں کا مجموعہ ہیں۔“

س : ”منگنی کتنا عرصہ رہی؟ شادی سے پہلے فون
پر بات یا ملاقات؟“

ج : ”میری منگنی تقریباً ”پانچ سال تک رہی اس
وقت PTCL کا زمانہ تھا تو اکثر ہی طارق صاحب فون پر
بات کر لیتے تھے کیونکہ یہ میرے کزن تھے اس لیے
جب بھی میری کوئی اسٹوری کسی میگزین میں شائع
ہوتی تھی تو یہ فون کر کے میری حوصلہ افزائی ضرور
کرتے تھے۔ یہ ہر سال عید الفطر فیصل آباد سے ملتان
ہمارے گھر ضرور آتے تھے تو ظاہری بات تھی،
ملاقات بھی ہو ہی جاتی تھی۔“

س : ”شادی کے لیے کس شوق کی قربانی دینا
پڑی؟“

ج : ”شادی سے پہلے مجھے بابا سے جو بھی یا کٹ منی

س : ”شادی کب ہوئی؟“

ج : ”میری شادی 2005ء میں ہوئی جب میں
صرف 16 سال کی تھی۔“

س : ”شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟“

ج : ”شادی چونکہ بہت کم عمری میں ہوئی تھی اس
لیے مشاغل بچوں والے تھے۔ بھائیوں، کزنز اور
ماموں کے ساتھ کرکٹ کھیلنا، اپنی فرینڈز کے ساتھ
گڈے گڈیوں کی شادی رچانا اور گرمیوں کی چٹی
دھبوں میں پھول اور کلیاں میں کہانیاں لکھنا جس پر
ہمیشہ ڈانٹ پڑتی تھی۔“

س : ”شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی یا
بزرگوں کی؟“

ج : ”میری شادی میں مکمل طور پر بزرگوں کی مرضی
شامل تھی۔ میں تو صرف یہ سوچنے کے خوش ہوئی تھی
کہ شادی پر میں بھی دلہن والے کپڑے پہنوں گی۔
نئے نئے کپڑے، جوڑے، جوڑی ملے گی۔ میری خالہ
(ساس) نے میرے ناتا ابو کے قدموں میں اپنا دوشہ رکھ
کر ایموشنل بلیک میل کر کے میرا دوشہ لیا تھا اور ناتا ابو
کی بھی خواہش تھی کہ دونوں بہنیں آپس میں مل کر
رہیں مگر میرے ابو جی اس رشتے پر راضی نہیں تھے۔
ای نے پتا نہیں کس طریقے سے بابا کو منایا۔ بابا کا کہنا
تھا۔ میں غریب گھر میں اپنی بیٹی نہیں دوں گا اور فیصل
آباد بہت دور ہے۔ اتنی دور میں اپنی بیٹی کو بیانیے کا سوچ
بھی نہیں سکتا مگر قسمت میں یہ شادی ہونا طے تھی تو
محض نوسل کی عمر میں جب میں فائیکلاس میں تھی،
میرا رشتہ طے ہو گیا۔ خالہ نے میرے ہاتھ پر پچاس

نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا مگر ساس ناب کروچ گئی دیتی تھیں کہ اسی میں کھانا پکانا ہے۔ اپنی بھینس ہونے کے باوجود دودھ پٹا کچی لسی کی طرح ہوتا تھا۔ سارا دودھ بیچ کر تھوڑے سے دودھ میں بہت سارا پانی ملا کر رکھ دیتی تھیں تو چائے پینے کو بھی دل نہیں کرتا تھا مگر میں کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔“

س : ”میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس ہوا؟“

ج : ”امی کے گھر میں ماحول بہت پرسکون ہوتا تھا۔ میری ذرا سی تکلیف پر امی ابو کی جان پر ہن جاتی تھی۔ مجھے گرمیوں میں اکثر بہت شدید قسم کی گرمی لگ جاتی تھی۔ مجھے جب تک ڈرپ نہیں لگتی تھی۔ میں ٹھیک نہیں ہوتی تھی۔ شادی کے بعد میں درد سے تڑپتی رہتی تھی۔ کوئی مجھے میڈیسن بھی نہیں لاکے دیتا تھا۔ شوہر مجبور تھے جو بھی کہتے تھے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے اور مل اتنی ظالم تھی کہ ان کو کبھی مجھ پر ترس نہیں آیا۔ جب میری حالت زیادہ خراب ہو جاتی تو شوہر سرکاری ہسپتال لے جاتے تھے جہاں میری خراب حالت دیکھ کر وہ مجھے ڈرپ لگاتے جیسے ہی ہسپتال سے گھر آئی خالہ باتوں میں سنا دیتیں اب تم ٹھیک ہو گئی ہو“ اس لیے گھر کے کام سنبھالو اور میں چکراتے سر کے ساتھ گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔“

س : ”سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟“

ج : ”جب میری شادی ہوئی تھی تو بابا نے اور امی نے ایک ہی بات سمجھائی تھی، بیٹا اب وہی تمہارا گھر ہے، تمہیں وہاں ہی رہنا ہے جیسے بھی کر کے وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنا تمہارے خالہ خالو تمہارے امی ابو ہیں۔ ان کی ویسے ہی عزت کرنا جس طرح ہماری کرتی تھیں اور اللہ کی ذات باری تعالیٰ گواہ ہے۔ میں نے اپنے سسرال میں گدھوں کی طرح کام کیا۔ بھنے کپڑے پہن کر بھی خوش رہی ماکہ میری ساس مجھ

ملتی تھی میں اپنی کمائیاں لکھنے پر خرچ کرتی تھی اور باقی کے پیسے میں گھر کے ساتھ بن رہی مسجد میں بھیج دیتی تھی۔ مجھے کشمیری لوگوں (مقبوضہ کشمیر) کی مدد کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں بعض اوقات ساری پاکستان منی مسجد میں بھیج دیا کرتی تھی۔ شادی کے بعد مجھے اس شوق کی قربانی دینا پڑی۔“

س : ”شادی پر رسموں پر کوئی بد مزگی؟“

ج : ”میری شادی سنگامی طور پر ہوئی تھی۔ میں نے ایک استوری لکھی تھی ظالم ماں کے عنوان سے جو کہ خبریں سنڈے میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں میں نے اس فیملی کے اصلی نام لکھ دیے تھے۔ بچی تھی اتنا پتا ہی نہیں تھا کہ استوری میں اصل نام نہیں لکھتے وہ لوگ بابا کو دھمکیاں دیتے تھے کہ آپ کی بیٹی نے ہمارے ساتھ بہت برا کیا۔ میرے بابا نے کہا۔ جی ہے اس نے جو دیکھا وہ لکھ دیا پھر بابا نے میری شادی کرنے کا سوچا۔ مگنی تو وہی چچی تھی اس لیے شادی بھی جلدی کر دی گئی۔ جلدی کی شادی میں کوئی خاص رسمیں نہیں ہوئیں، صرف دودھ پلائی کی رسم ہوئی جس پر کوئی بد مزگی نہیں ہوئی۔“

س : ”شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟“

ج : ”شادی کے بعد ایک دم سے زندگی بدل کر رہ گئی۔ شرارتی لالہ ابل بچی سے میں یک دم ایک ہونہر گئی تھی۔“

س : ”شادی کے کتنا عرصہ بعد کام سنبھالا؟“

ج : ”مکلاوے کے فوراً بعد میں نے گھر کا پورا کام سنبھال لیا تھا۔“

س : ”میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟“

ج : ”زمن آسمن کا فرق تھا۔ شادی سے پہلے میں جب بھی کھانا پاتی تھی۔ کبھی زیادہ بھی پڑ جائے تو امی

کہا کہ کام چھوڑ دینا، کم کھالیں گے مگر نماز نہ چھوڑنا اور اللہ کا شکر ہے میرے شوہر پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ ہم تقریباً ”روزانہ ہی شام کو آونگ پہ جاتے ہیں جس پر ساس جلتی کر دیتی رہتی ہیں کیونکہ اب ان کا مجھ پر زور جو نہیں چلتا۔“

س : ”آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ کس حد تک کامیاب ہوئیں؟“

ج : ”بہت کوشش کی۔ خود کو مار کے، اپنی خواہشات کا قتل کر کے مگر میں کامیاب نہ ہوئی کیونکہ میری خالہ وہی 1965ء کے زمانے کی ہیں۔ وہ خود کو نہیں بدلتیں۔“

س : ”شادی شدہ بہنوں کے نام کوئی پیغام؟“

ج : ”میرا ان کے نام بھی پیغام ہے کہ صبر سے اچھے وقت کا انتظار کریں، جو بھی ہو ساس سر کی خدمت کریں اور ان سے کوئی صلہ مت مانگیں۔ اچھا وقت دیر ہی سے سہی، آتا ضرور ہے۔“

س : ”غیر شادی شدہ کے نام پیغام؟“

ج : ”ان کو یہ۔ کہنا ہے کہ اپنے والدین سے یہ ہی کہیں کہ رشتہ دیکھتے وقت یہ فرود دیکھیں کہ لڑکا پانچ وقت کا نمازی ہے۔ رزق حلال کمانے والا ہے؟ اگر وہ نیک ہو گا، عیادت گزار ہو گا، محنت سے رزق حلال کمانے والا ہو گا تو اس کی تھوڑی کمائی میں بھی برکت ہوگی اور بہت زیادہ ہو جائے گی۔ حرام کا پیسہ جتنا زیادہ ہو گا اتنا ہی جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ رزق حلال بہت جلدی پھلتا پھوٹتا ہے۔“



سے خوش رہیں۔ کبھی ان کو آگے سے پلٹ کر جواب نہیں دیا مگر میری تمام خدمت ضائع نہ گئی۔ اکثر جب میری حالت زیادہ خراب ہو جاتی تھی تو مجھے میکے بھیج دیا جاتا تھا جہاں امی مجھے نئے کپڑے، نئے جوتے لے دیتی تھیں۔ ان سب کے بلوجود مجھے پھر بھی امی کی کتنی رہیں کہ بیٹا! کوئی بات نہیں اچھے دن بھی ضرور آئیں گے۔ کبھی خالہ کو برانہ کہنا۔ ان کی بیشہ عزت کرنا۔ اس لیے سسرال والوں سے توقعات ابھی پوری نہ ہوئیں۔“

س : ”پہلے بچے کی پیدائش پر سسرال والوں کا رویہ؟“

ج : ”اللہ کی ذات کی کوئی مصلحت ہے کہ اس نے مجھے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہوا ہے اور ہم دونوں میاں بیوی اللہ کی رضامیں، بخوشی راضی ہیں مگر اولاد نہ ہونا میرا ایسا جرم ہے جس پر آج تک مجھے ذہنی اذیت کا نشانہ نہ بنایا جاتا ہے مگر میرا صبر ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ اللہ مجھے اولاد ضرور دے گا۔ یہ میرا اللہ پر کامل ایمان ہے۔“

س : ”سسرال میں آپ کو وہ مقام ملا جو آپ کا حق تھا؟“

ج : ”بالکل بھی نہیں ملا۔ میں اپنی تمام تر خدمت کا صلہ اللہ سے مانگتی ہوں۔ انسانوں سے وابستہ توقعات کبھی پوری نہیں ہوتیں۔“

س : ”جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ رہنا؟“

ج : ”مجھے تو جوائنٹ سسٹم پسند تھا مگر جب شادی کے آٹھ سال بعد خالہ نے نہایت حقارت سے یہ کہہ کر علیحدہ کیا کہ تمہارا میاں کام نہیں کرتا۔ اتنی تنخواہ

میں مل کر ایہ پورا نہیں ہوتا۔ اب بھی وہی میاں ہے، وہی کام ہے، اتنی ہی تنخواہ ہے اور الحمد للہ میں طاری صاحب کی فیملی میں سب سے زیادہ خوش حال ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے شوہر سے یہی



پیش کی تاکہ فیصلہ ہو جائے کہ اس حسین و جمیل لڑکی کا خاوند بننے کا کون حق دار ہے حضرت آدم علیہ السلام قربانی کے دن وہاں موجود نہ تھے بلکہ خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ گئے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا:

”اے آدم! کیا تم جانتے ہو کہ میرا ایک گھر زمین میں ہے۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”اے اللہ! نہیں۔“ فرمایا۔ ”میرا گھر مکہ کی سرزمین پر واقع ہے۔ تم وہاں جاؤ۔“

اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے آسمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم میرے بعد میری اولاد اور اہل خانہ کی امانت داری کے ساتھ حفاظت کرنا۔ مگر آسمان نے یہ ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے زمین سے کہا مگر اس نے بھی انکار کر دیا۔ پھر پہاڑوں سے کہا، انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ پھر قاتیل کو کہا، اس نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور کہا۔

”آپ شریف لے جائیں، واپس لوٹیں گے تو آپ اپنے اہل خانہ کو اس حالت میں پائیں گے جو آپ کو خوش گردے۔“

پس حضرت آدم علیہ السلام چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد قربانی کا واقعہ ہوا۔ جب دونوں نے قربانی کی تو ہاتیل نے ایک صحت مند جانور اور قاتیل نے غلے کا ایک ڈھیر قربانی کے طور پر پیش کیا۔

جب آگ آئی تو اس نے ہاتیل کی قربانی کو کھالیا اور قاتیل کی قربانی کو چھوڑ دیا جس کی وجہ سے قاتیل سخت غصہ میں آ گیا اور کہا کہ میں ضرور تمہیں قتل کر دوں گا تاکہ تو میری بہن سے نکاح نہ کر پائے۔

ہاتیل نے جواب میں کہا کہ: ”اللہ تو متقیوں

ہاتیل اور قاتیل

روئے زمین پر سب سے پہلا قاتیل بن آدم کے ہاتھوں سرزد ہوا کہ اس نے اپنے بھائی ہاتیل کو قتل کیا۔ قاتیل کے نام میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض ”قین“ بعض ”قائین“ یعنی ”قائین“ اور بعض ”قاتیل“ کہتے ہیں۔ جس سبب سے ہاتیل قتل ہوا، اس میں بھی اہل علم کا اختلاف ہے۔

ایک جماعت کا کہنا ہے کہ دونوں بھائیوں میں جھگڑے کی وجہ آدم کی ایک بیٹی سے نکاح تھا اور بعض فرماتے ہیں کہ قربانی کا قبول نہ ہونا اس کا سبب تھا۔

اولاد آدم کے نکاح

حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں جو بھی لڑکا پیدا ہوتا اس کے ساتھ ایک لڑکی پیدا ہوتی پس وہ پہلے حمل سے پیدا ہونے والے بچوں کا دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے بچوں سے نکاح کر دیتے۔

یہاں تک کہ ان کے ہاں دو (دو حمل سے) بیٹے ہاتیل اور قاتیل پیدا ہوئے۔ قاتیل کاشت کار اور ہاتیل چرواہا تھا۔ قاتیل بڑا تھا اور اس کے ساتھ پیدا ہونے والی بہن انتہائی حسین و جمیل تھی۔ ہاتیل نے قانون کے مطابق قاتیل کی بہن سے نکاح کرنا چاہا مگر قاتیل نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی، تیرے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی سے زیادہ حسین و جمیل ہے لہذا اس سے نکاح کرنے کا مستحق میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔ ان دونوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام نے قاتیل کو حکم دیا کہ وہ قانون شکنی نہ کرے مگر قاتیل نے انکار کر دیا جس کی وجہ سے ایک جھگڑے کی صورت پیدا ہو گئی۔ فیصلہ کے لیے دونوں نے اللہ کے حضور قربانی

کی ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔“

پس قاتیل، ہاتیل کو قتل کرنے کے لیے تلاش کرتا رہا۔ ہاتیل پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چراتا تھا۔ ایک دن وہ تلاش کرتے کرتے اس کے پاس جا پہنچا۔ بکریاں گھاس چر رہی تھیں اور ہاتیل پاس سویا ہوا تھا۔ قاتیل نے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور اس کا سر پھل دیا۔ ہاتیل مر گیا۔ قاتیل نے اس کو ویسے ہی بے گورو کفن چھوڑ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس کا کیا کرے؟

پس اللہ تعالیٰ نے دو کوے جو آپس میں بھائی تھے، ان کو بھیجا، انہوں نے آپس میں لڑائی کی اور ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ قاتل کوے نے مقتول کوے کے لیے زمین میں گڑھا کھودا اور اس میں ایسے ڈال کر مٹی سے دبا دیا۔ جب قاتیل نے یہ منظر دیکھا تو کہا: ”ہائے میں اس کوے سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اس طرح اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔“

ابن اسحاق بعض اہل کتاب سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں خطا واقع ہونے سے قبل حضرت حوا سے قربت فرمائی، پس وہ حاملہ ہو گئیں۔ بوقت زچگی انہوں نے کسی بھی قسم کی تکلیف نہ اٹھائی، نہ درد اور کمزوری محسوس کی اور نہ ہی کچھ کھانے کی خواہش ظاہر کی اور نہ ہی بوقت ولادت کسی قسم کا خون دیکھا، اس لیے کہ جنت اجنبی پاکیزہ جگہ ہے اس حمل کی ولادت سے قین (قاتیل اور اس

کی جڑواں بہن پیدا ہوئی۔) پھر جب ممنوعہ درخت کا پھل کھایا اور خطا کا ارتکاب ہو گیا اور وہ دونوں زمین کی طرف اتار دیے گئے تو یہاں آ کر آدم و حوا کی قربت ہوئی تو اس حمل کی زچگی کے وقت انہوں نے تکلیف، درد، کمزوری محسوس کی اور خون بھی دیکھا اور نقاہت کے سبب عیش کی کیفیت آ گئی۔ اس حمل سے ہاتیل اور اس کی جڑواں بہن پیدا ہوئی۔

حضرت حوا جب بھی حاملہ ہوتیں تو دو جڑواں بھائی بہن کے ساتھ حاملہ ہوتیں۔ آدم کے چالیس بچے ان کے پہلو سے بیس مرتبہ کے حمل سے پیدا ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی لڑکا اپنی جڑواں بہن کے علاوہ جس بہن سے چاہتا نکاح کرتا تھا۔ اس زمانے میں جڑواں بہن کے علاوہ سب بہنیں حلال تھیں۔ اس لیے کہ اس زمانے میں اپنی ماں اور بہنوں کے علاوہ اور کوئی عورت نہ تھی لہذا اسل انسانی میں اضافے کی غرض سے اس بات کی اجازت دی گئی۔

ابن اسحاق ”ایک روایت میں اہل کتاب کے علماء سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے قین کو حکم دیا کہ وہ اپنی جڑواں بہن کا نکاح ہاتیل سے کر دے اور ہاتیل کو حکم دیا کہ وہ اپنی جڑواں بہن کا نکاح قاتیل سے کر دے۔ ہاتیل نے بات مان لی مگر قاتیل نے انکار کر دیا اور ہاتیل کی بہن سے نکاح کو ناپسند کیا اور اپنی جڑواں بہن کی طرف رغبت ظاہر کی اور کہا کہ ہمارا ختم جنت سے ہے اور ان کا ختم زمینی ہے اس لیے میں اپنی جڑواں بہن کے ساتھ شادی کا جائز حقدار ہوں نیز یہ کہ قاتیل کی بہن نہایت حسین و جمیل تھی جس کی وجہ سے وہ اس پر مر مٹا اور اس کے نفس نے اسے اس بات پر پختہ کر دیا۔ ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا۔

اعتذار

صائمہ اکرم جو ہدیری اپنے ماموں کی وفات کے باعث اس دفعہ ”شہر زاد“ کی قسط تحریر نہ کر سکیں۔ ان شاء اللہ قارئین اعلیٰ اہل قسط پڑھ سکیں گے۔

”اے بیٹے! یہ تیرے لیے حلال نہیں لیکن اس نے اپنے باپ کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا پھر آدمؑ نے کہا تم بھی قربانی کرو اور تمہارا بھائی ہاتیل بھی قربانی کرے گا۔ جس کی قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول کی وہ اس کا مستحق ہوگا۔“

قین زراعت پیشہ تھا اور ہاتیل بکریاں چراتا تھا۔ سو قین نے قربانی کے لیے گندم پیش کی اور ہاتیل نے اپنی تندرست اور توانا بکریوں میں سے ایک بکری قربان کی اور بعض کے قول کے مطابق ایک گائے قربان کی۔ اللہ تعالیٰ نے سفید آگ بھیجی جس نے ہاتیل کی قربانی کو کھالیا، قاتیل کی قربانی کو چھوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جانور کی ہی قربانی کی جاتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ہاتیل کی قربانی قبول فرمائی اور وہ اس فیصلہ میں قین (قاتیل) کی بہن کا حقدار بن گیا جس پر قاتیل انتہائی غضب ناک ہو گیا۔ اس پر تکبر و بڑائی چھا گئی اور شیطان نے اسے مکمل طور سے مغلوب کر لیا۔ پس اس نے اپنے بھائی ہاتیل کا پیچھا کیا۔ وہ اس وقت اپنے ریوڑ میں تھا۔ قاتیل نے وہاں پہنچ کر اسے قتل کر ڈالا۔

اہل تورات کہتے ہیں کہ جس وقت قین (قاتیل) نے اپنے بھائی ہاتیل کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ ”تمہارا بھائی ہاتیل کہاں ہے؟“ اس نے کہا: ”میں نہیں جانتا اس لیے کہ میں اس پر محافظ نہیں تھا۔“

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارے بھائی کے خون نے مجھے زمین سے پکارا ہے لہذا اب تو ملعون ہے۔ اس زمین میں جس کا منہ تیرے لیے میں نے کھول رکھا تھا۔ تیرے ہاتھ اپنے بھائی کے خون سے آلود ہیں۔ جب تو نے یہ کام زمین میں کیا تو اب زمین تیرے لیے اپنی بھتی نہیں اگائے گی اور اب تو زمین میں گھبراہٹ ہو جائے گی۔“

قین نے کہا: ”میری خطا آپ کی مغفرت سے بڑھ گئی؟ آج آپ نے مجھے زمین سے نکال دیا

(یعنی اس کے منافع سے محروم کر دیا) اور میں اس میں دہشت زدہ اور گھبراہٹا ہوا بن کر رہوں گا پس جو شخص مجھ سے ملے گا، مجھے قتل کر ڈالے گا۔“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اس طرح نہیں ہوگا کہ جو شخص زمین میں قتل کرے تو اس کے ایک قتل کے بدلے سات قتل کا بوجھ اس پر ڈالا جائے گا لیکن جو تیرے طریقہ پر قتل کرے گا اس کا قتل سات قتل کے برابر شمار ہوگا۔“

اللہ تعالیٰ نے قین (قاتیل) میں ایک نشانی مقرر فرمادی تاکہ جو اسے پائے قتل نہ کر سکے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ قتل کا سبب یہ تھا کہ ان کو قربانی کے ساتھ اپنا قرب حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں نے قربانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک کی قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور دوسرے کی رد کر دی۔ ان میں سے ایک بڑا کاشت کار تھا اور دوسرا چرواہا۔ دونوں کو قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت آدمؑ کا جو بیٹا (ہاتیل) بکریاں چراتا تھا اس نے ایک عمدہ، تندرست، خوبصورت اور اپنی پسندیدہ ترین بکری کی قربانی کی اور جو بیٹا کاشت کار تھا اس نے بے کار، بدبھم اور اپنے بدترین ناپسندیدہ اناج کی نذر پیش کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے بکری والے کی قربانی قبول فرمائی اور اناج والے کی رد کر دی۔ مقتول بھائی دو آدمیوں سے بھی زیادہ قوی تھا۔ لیکن اس نے گناہ سے بچنے کے لیے اپنے بھائی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی دولت کا یہ حال تھا ان میں سے کوئی بھی ایسا مسکین نہ تھا کہ جس کو خیرات دی جاسکتی۔ قربانی صرف تقرب الہی کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ان کے دل میں آئی اور انہوں نے آپس میں کہا کہ کاش ہم قربانی کے ذریعہ

تقرب الہی حاصل کر لیتے۔ اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ آدمی جب تقرب کے طور پر قربانی کرتا اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا تو اس پر آگ بھیج دیتا جو اس کی قربانی کو کھاجانی اور اگر اللہ راضی نہ ہوتا تو آگ بجھ جاتی۔ پس ان دونوں نے قربانی کی۔ ان میں سے ایک چرواہا تھا اور دوسرا کاشت کار۔ چرواہے نے اپنی بکریوں میں سے عمدہ تندرست بکری قربانی کے طور پر پیش کی اور کاشت کار نے کچھ اناج بطور نذر پیش کیا۔ سو آگ ان دونوں کے درمیان اتری لیکن بکری کو کھاجانی اور اناج کو چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنے لگا۔

”کیا تم لوگوں کے درمیان اس طرح چلو پھرو گے حالانکہ لوگ نہیں جانتے کہ تیری قربانی قبول ہوئی اور میری مردود۔ اللہ کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا اور لوگ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے کہ ایک بہتر ہے اور ایک کمتر۔ بلکہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔“

دوسرے بھائی نے یہ سن کر کہا: ”اس میں میرا کچھ قصور نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی نذر قبول کرتا ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں۔“

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ جب قاتیل نے اپنے بھائی ہاتیل کو قتل کر دیا تو اپنی بہن قلیجا کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر یونانی پہاڑ سے اتر کر ٹھہریں کے مقام کی طرف بھاگ گیا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے قاتیل سے فرمایا تھا۔ توجا، لیکن تو مسلسل خوف زدہ ہی رہے گا اور جس کو بھی تو دیکھے گا اسی سے توجان کا خطرہ محسوس کرے گا پس اس کی اولاد میں سے جو بھی اس پر گزرتا وہ اس پر پتھر برساتا۔ قاتیل کا ایک لڑکا ناپیتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔ قاتیل کے پوتے نے اپنے باپ سے کہا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت حوا کے بطن سے آدم کی ایک سو بیس اولادیں ہوئیں اور ہر حمل سے ایک جوڑا پیدا ہوتا تھا۔ پہلوگی کے نیچے قاتیل اور اس کی بہن قلیجا اور سب سے آخر میں عبدالغیث اور اس کی جڑواں بہن امتا المغیث پیدا ہوئے۔

لیکن ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ان کی کل اولاد چالیس تھی اور یہ بیس حمل سے پیدا ہوئی تھی نیز ابن اسحاق نے یہ بھی کہا کہ ان میں سے بعض کے نام ہم تک پہنچے اور بعض کے نہیں۔ جن کے نام ہم تک پہنچے وہ پندرہ مرد اور چار عورتیں ہیں۔

- آدم علیہ السلام کے بیٹوں کے نام
- 1- قین 2- ہاتیل 3- شیث 4- اباد 5- بالغ
 - 6- اٹالی 7- توبہ 8- بنان 9- شبوبہ 10- حیان
 - 11- ضرائس 12- ہذر 13- بحود 14- سندل
 - 15- بارق

آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے نام

- 1- قلیجا 2- لیذا 3- اشوٹ 4- حزورہ

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت حوا

انتقال پر ملال

سورافلک کے والد شاہ محمد قیوم صدیقی کا رضائے الہی سے انتقال ہو گیا ہے۔ قارئین سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

عبدی رکھو ورنہ میں اس کو قتل کر دوں گا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ”میں نے تمہاری بات مانی تھی جس کے نتیجے میں مجھے جنت سے بے دخل کر دیا گیا۔ بحث و تکرار کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام نے شیطان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور بچے کا نام عبد الرحمن رکھا۔ پس ابلیس لعین نے اس بچے کو قابو کر کے قتل کر دیا۔

پھر جب دوسرا بچہ پیدا ہوا تو شیطان نے پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔ مگر حضرت آدم نے اس مرتبہ بھی شیطان مردود کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور نومولود کا نام صالح رکھا۔ شیطان نے اس بچے کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد جب تیسرا بچہ پیدا ہوا تو شیطان نے کہا۔

”تم صرف اس صورت میں اپنے بچے مجھ سے بچا سکتے ہو کہ آئندہ ہونے والے بچے کا نام عبد الحارث ہو (ابلیس کا پہلا نام حارث تھا) ابلیس تو مردود ہونے کے بعد نام دیا گیا۔“

یہ تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت آدم و حوا کی بعض اولاد کی وفات ان سے پہلے ہو چکی تھی اور اس باب میں اس کے علاوہ بھی متعدد روایات ”حسن“ کی تردید کر رہی ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ زمین پر سب سے پہلی وفات آدم علیہ السلام کی ہوئی۔

حضرت آدم علیہ السلام کا جائنشین

حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک سو تیس سال ہونے کے بعد حضرت حوا کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور یہ قاتیل و ہاتیل کے واقعہ کے پچاس برس بعد کا واقعہ ہے۔ اہل تورات کہتے ہیں کہ یہ بیٹا تنہا پیدا ہوا اور شیث کے معنی ان کے ہاں ہمتہ اللہ اور شیث ہاتیل کے بدل کے طور پر تھے جیسے کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حوا کے بطن سے شیث نامی لڑکا اور غور نامی لڑکی پیدا ہوئی۔ اس لڑکے کی پیدائش پر حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا تھا کہ یہ اللہ کا عطیہ (ہمتہ اللہ) ہے جو ہاتیل کا بدل ہے۔ اس لفظ کو عربی میں شیث،

سے حضرت آدم علیہ السلام کے جو اولاد ہوتی تو انہیں اللہ تعالیٰ کا عہد قرار دیا جاتا، اور ان کے نام عبد اللہ، عبید اللہ وغیرہ رکھے جاتے لیکن ان کی بہت جلد وفات ہو جاتی۔ ابلیس لعین ان دونوں کے پاس آیا اور کہا کہ اگر تم ان بچوں کے نام اس کے علاوہ رکھو جو کہ اب رکھتے ہو تو یہ زندہ رہیں گے اس کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آدم و حوا نے عبد الحارث رکھا۔ حضرت حوا جب پہلے بیٹے کے ساتھ حاملہ ہوئیں اور انہوں نے بوجھ محسوس کیا۔ ابلیس لعین ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”اے حوا! تمہارے پیٹ میں کیا ہے؟“

انہوں نے کہا ”مجھے کیا معلوم کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے نکلے گا؟ ناک سے یا کان سے؟“

انہوں نے کہا ”میں نہیں جانتی۔“
ابلیس لعین نے کہا۔ ”اگر یہ صحیح سلامت نکل آیا تو کیا تم میری بات مانو گی اور جو میں کہوں گا اس پر عمل کرو گی؟“ حوا نے حامی بھری۔

ابلیس نے کہا کہ اس کا نام عبد الحارث رکھنا (ابلیس لعین کا اصل نام حارث تھا)۔

حضرت حوا نے کہا ”ٹھیک ہے۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے اس کا تذکرہ کیا کہ میرے خواب میں کوئی آیا اور اس نے اس طرح کی باتیں کہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ شیطان تھا۔ تم اس سے بچ کر رہنا۔ یہ ہمارا دشمن ہے جس نے ہمیں جنت سے نکلوا دیا تھا۔ پھر حضرت حوا کے پاس شیطان دوبارہ آیا اور اس نے اسی بات کا اعادہ کیا۔ حضرت حوا نے ہامی بھری۔ لہذا جب وضع حمل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے سلامتی کے ساتھ بچے کو پیٹ سے نکال دیا تو حضرت حوا نے وعدہ کے مطابق بچے کا نام عبد الحارث رکھ دیا۔

سدیٰ سے مروی ہے کہ حضرت حوا کے ایک بیٹا ہوا۔ ان کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ اس کا نام

سریانی میں شاث اور عمرانی میں شاث کہتے ہیں۔ ان ہی کو آدم علیہ السلام کا جانشین بنایا گیا۔ ان کی پیدائش کے وقت حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک سو تیس برس تھی۔ محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے شیت کو بلایا اور اس سے عہد لیا اور دن رات کی گھڑیاں اور اوقات سکھائے اور ہر ساعت میں کسی نہ کسی مخلوق کا عبادت کرنا بتلایا۔ یعنی ہر گھڑی کوئی نہ کوئی مخلوق عبادت الہی میں مصروف ہوتی ہے اور فرمایا ”کہ اب میرے عزیز بیٹے! غمگین نہ رہو زمین میں طوفان آئے گا اور وہ سات سال ٹھہرے گا اور ان کو وصیت لکھوائی۔ پس حضرت شیت علیہ السلام اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے وصی اور جانشین ہوئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد ساری حکومت و بادشاہت ان ہی کے لیے ہو گئی۔ اس وقت تمام بنی آدم حضرت شیت علیہ السلام کی ہی اولاد ہے اور یہ اس وجہ سے کہ شیت کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمام نسل فنا اور ختم ہو گئی اور ان میں سے کوئی باقی نہ رہا صرف شیت کی نسل چلی لہذا اب تمام لوگ شیت کی ہی اولاد سے ہیں۔

جماعت کے پاس جاؤ اور انہیں السلام علیکم کہو۔“
پس وہ فرشتوں میں آئے اور انہیں سلام کیا انہوں نے جواب میں علیکم السلام ورحمۃ اللہ کہا۔
پھر آدم علیہ السلام اپنے رب کی جانب لوٹ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تیرا تیری اولاد کا آپس میں ملنے وقت کا سلام ہوگا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے دو مٹھیاں بھریں اور فرمایا کہ ان میں سے ایک کو اختیار کر لے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو اختیار کیا (چن لیا) اور اس کے تو دونوں ہی دائیں ہاتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے دو مٹھی کھولی تو اس میں آدم علیہ السلام کی تمام اولاد کی صورت تھی اور ہر آدمی کے پاس اس کی مدت عمر بھی لکھی ہوئی تھی اور آدم کی عمر ایک ہزار سال درج تھی۔ ان میں ایک جماعت انتہائی نورانی صورت تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا۔
”اے میرے رب! یہ کون لوگ ہیں جن پر نور چھایا ہوا ہے۔“

آدم علیہ السلام کی عمر

حضرت آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق اہل علم کے درمیان معمولی اختلاف ہے اور اس مسئلے میں جو احادیث ملتی ہیں وہ یہ ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور ان میں اپنی طرف سے روح پھونکی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ فرشتوں نے سجدہ کیا۔ آدم علیہ السلام بیٹھ گئے۔ ان کو چھینک آئی۔ انہوں نے الحمد للہ کہا۔

”اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: (تیرا رب تجھ پر رحم کرے)“ اور یہ بھی فرمایا ”کہ فرشتوں کی اس

دواؤں میں دیکھیں کیا تعداد کریم

Herbal

سوںہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

➤ اس کا شتال سے چھڑوں میں شگنم
➤ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
➤ بالوں کو صحت مند اور چمکدار بناتا ہے

قیمت 90/- روپے

مزعزی سے بھگوانے ہارے دارے سے بھگوانے والے

تین تین 250/- روپے تین تین 350/- روپے

اس میں ڈاک فریٹ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بڑے پیکٹ 10/- روپے سے بھگوانے کا ہے

پیش کش 53 مورخہ سید کٹ ماکے سے جاترہ روڈ کراچی۔

دکئی خریدنے کے لیے

کے مرزا ان اسٹ 37 مورخہ بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

وفات سے قبل گیارہ دن تک بیمار رہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے شیث علیہ السلام کو اپنا وصی بنایا اور ان کے لیے ایک وصیت نامہ لکھوایا اور وہ کتاب جس میں وصیت لکھی گئی تھی، اپنے بیٹے شیث کے سپرد کی اور اسے قاتیل اور اس کی اولاد سے چھپا کر رکھنے کا حکم دیا کیونکہ قاتیل نے حسد کی وجہ سے قاتیل کو قتل کر دیا تھا۔ پس شیث اور ان کی اولاد نے اس حکم کو جو ان کے پاس تھا قاتیل اور اس کی اولاد سے چھپا کر رکھا اور یوں قاتیل اور اس کی اولاد اس سے محروم رہے۔

اہل تورات کا یہ دعو ہے کہ آدم علیہ السلام کی عمر نو سو تیس سال تھی اور ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق ان کی عمر نو سو پچیس سال تھی۔

آدم کی تجہیز و تکفین

ابن اسحاقؒ سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام وصیت نامہ لکھ کر فارغ ہوئے تو ان کا انتقال ہو گیا (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے) ان کی وفات پر فرشتے جمع ہوئے اور ان کی

آباد اجداد کی وصیتوں کی مخالفت کا ارادہ کیا مگر جب یہ خبر یہود کو پہنچی تو یہود نے انہیں سمجھایا اور اس ارادے کو ترک کر دینے کو کہا مگر انہوں نے سمجھ نہ سنا اور سرکشی دکھائی اور قاتیل کی اولاد کے پاس پہنچ گئے اور جب ان کی ایجاد کردہ چیزوں کو دیکھا تو حیرت زدہ ہو گئے اور گانے بجانے کے آلات نے انہیں بہت متاثر کیا اور انہوں نے قاتیل کی اولاد میں سے ان عورتوں سے موافقت کر لی جو ان کی طرف مائل ہو رہی تھیں اور پھر وہ ان کے ساتھ چلی گئیں یہاں تک کہ سرکشی اور نافرمانی میں مشغول ہو گئے اور شراب نوشی اور بدکاری کھل کر سامنے آ گئی۔

فرمایا: ”یہ نبیوں اور رسولوں کی جماعت ہے جو میرے بندوں کی طرف بھیجے جائیں گے اس جماعت میں ایک صاحب نورانیت میں کچھ زیادہ نمایاں تھے مگر ان کی عمر صرف چالیس سال لکھی ہوئی تھی۔

آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے میرے رب! یہ کون سا نبی ہے؟

فرمایا۔ ”یہ تمہارا بیٹا داؤد ہے۔

عرض کیا۔ ”اس کی عمر صرف چالیس سال۔“

فرمایا ”یہی اس کی تقدیر میں لکھا ہے۔“

آدم علیہ السلام نے عرض کیا، ”اے میرے رب! میری عمر میں سے ساٹھ سال کم کر کے انہیں دے دیجئے۔“

رسول ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں ٹھکانہ عطا فرمایا پھر زمین کی طرف اتارا اور عرصہ دراز گزر جانے کے بعد جب ملک الموت (آدم) کی روح قبض کرنے آیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اے ملک الموت! کیا تم میرے پاس قبل از وقت (جلدی) نہیں آ گئے؟

ملک الموت نے کہا۔ ”میں نے ایسا نہیں کیا۔“

آدم نے کہا۔ ”کیا ابھی میری عمر میں ساٹھ سال باقی نہیں ہیں؟“

ملک الموت نے کہا۔ ”آپ کی عمر میں کچھ باقی نہیں ہے کیونکہ آپ نے اپنے رب سے درخواست کی تھی کہ میری عمر میں سے ساٹھ سال کم کر کے میرے بیٹے داؤد کو دے دیے جائیں۔“

آدم علیہ السلام نے کہا۔ ”میں نے ایسا نہیں کہا تھا۔

رسول ﷺ نے فرمایا: ”آدم علیہ السلام بھول گئے اور ان کی اولاد بھی اسی طرح بھول جاتی ہے۔ آدم علیہ السلام نے انکار کیا اور ان کی اولاد بھی اسی طرح انکار کرتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لکھی ہوئی کتاب رکھے گا اور گواہوں کے ساتھ فیصلے فرمائے گا۔“

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی



شرکت کرنی ہیں۔ وہ مودی کو خواتین کا مسیحا قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ ”مودی کے آنے سے خواتین کو ان کے حقوق ملے ہیں۔ (کون سے حقوق.....؟ بھارت میں..... اور خواتین کو حقوق؟ اچھا مذاق ہے جی۔) سلی آغا کو حال ہی میں بھارتی شہریت ملی ہے جسے پاکستانیوں نے بہت خوش ہیں (جب ہی تو.....؟)



مشورہ

ریمہ خان کا کہنا ہے کہ ملک میں موجود نوجوانوں کی صلاحیتوں سے صحیح معنوں میں استفادہ نہیں کیا جا رہا (واہ بھئی ڈاکٹر صاحب نے ریمہ کی اردو اتنی بہتر کر دی کہ وہ.....) یہی وجہ ہے کہ ہمارے آرٹسٹ پڑوسی ملک کا رخ کرتے ہیں۔ (وجہ..... بھئی سمجھیں ناں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت

انکار

سلی آغا نے بالآخر پاکستانی ہونے سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”میں کراچی میں پیدا ضرور ہوئی ہوں مگر پاکستانی نہیں ہوں (شکرا الحمد للہ یہ وہ نہیں ہم کہہ رہے ہیں بھئی.....!) میرے والدین اور دادی امرتسر سے تھے۔ اور ان کے پاس انڈین پاسپورٹ تھے۔ (پاکستان بننے سے پہلے سب کے پاس تھے تو کیا.....؟) میرے ماموں بھارتی فوج میں کام کرتے ہیں۔ (تے توں.....؟)

میرے پاس بھی پاکستانی پاسپورٹ نہیں۔ برطانوی پاسپورٹ رہا ہے۔ اور اس وقت میرے پاس انڈین پاسپورٹ بھی ہے۔ اور میں انڈیا میں رہائش پذیر ہوں۔ سلی آغا آج کل بھارت کی سیاست میں بھرپور حصہ لیتی نظر آتی ہیں اور بھارتی حکمران پارٹی بی جے پی کے جلسوں اور میٹنگوں میں



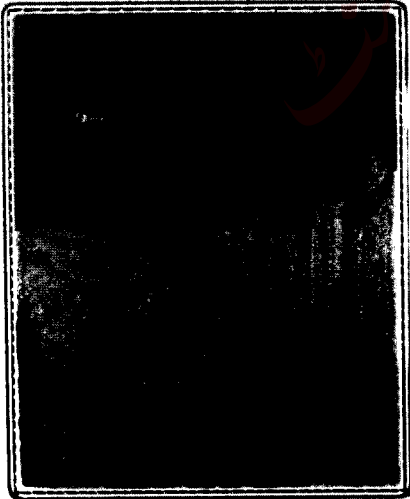


کی خوشی کی وجہ ان کے دو مشہور ڈرامے جو آج کل ٹیلی کاسٹ ہو رہے ہیں جن میں سچل علی نے اپنی بہترین اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں، نہیں بلکہ ان کی خوشی کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے پسندیدہ ہدایت کار کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ (تو باتی ہدایت کار کیا نا پسندیدہ ہیں۔ یا تھے؟) سرمد کھوسٹ اس ڈرامے کے ہدایت کار ہیں۔ عمران عباس اور سچل علی کو پہلی بار ایک ساتھ ڈرامے میں کاسٹ کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ عرفان کھوسٹ اور مرینہ خان بھی اس کی کاسٹ میں شامل ہیں۔ سچل علی اس بارے میں کہتی ہیں کہ ”کہتے ہیں کہ خواب سچ بھی ہو جاتے ہیں۔ میرا خواب بھی سچ ہو گیا ہے۔ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ میں سرمد سر کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔“

(سچل! خواب میں بھی ڈراما.....؟)

احساس

سید نور کی فلم ”چین آئے نہ“ فلم فلاپ ہوئی۔ جیسے کہ آج کل بننے والی تقریباً تمام فلمیں ہی ہو رہی ہیں۔ لیکن اس کی وجہ سے فلموں کے بیرون ملک



ہوگی۔) اور بھارت نے ہمیشہ پاکستانی فنکاروں کی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سینئر فنکار ایک اکیڈمی کا درجہ رکھتے ہیں (جی اگر سینئر ہی وہاں کام کر رہے ہوں تو.....؟) ان کی رہنمائی میں نئے آرٹسٹ اپنے فن کو بہتر انداز میں اجاگر کر سکتے ہیں۔ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو چاہیے کہ وہ میرٹ پر آنے والے نئے فنکاروں کو کاسٹ کریں۔ (ارے بھی فلم ساز اور ہدایت کار تو خود.....؟) تاکہ نوجوان نسل بھی پاکستانی فلموں کی جانب راغب ہوں اور فلم انڈسٹری کی ترقی کا سبب بنیں۔ میں پاکستانی فلم انڈسٹری کی بحالی کی خواہش مند ہوں (کیا صرف باتوں کی حد تک.....؟) اور اس کے لیے ضروری ہے پرانے لوگ.....؟ خاص طور پر اداکاری کے میدان میں ٹی وی (نہیں..... پلیز) اور اسٹیج کے باصلاحیت فنکاروں کو آگے لانا چاہیے تاکہ انڈسٹری میں نئے فنکاروں کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاسکے (ٹی وی اور اسٹیج، تو نئے کہاں سے ہوئے؟)

خواب

اداکارہ سچل علی آج کل بہت خوش ہیں لیکن ان



سرمایہ کار بہت مایوس ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ اس کی وجہ اس کی کاسٹ بھی کہہ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں پروڈیوسر جاوید صدیقی کا کہنا ہے کہ ”المیہ یہ ہے کہ ابھی آپ کی انٹرنیٹ پاؤں پاؤں چلنا بھی شروع نہیں ہوئی اور اداکاروں کے خزانے آسمان پر ہیں۔ ہم نے ٹی وی کی کئی ہیر و منر کو ارد وچ کیا۔ مرد اداکاروں میں بھی تمام بڑے ناموں کو کال ٹی لیکن ان کے خزانے دیکھ کر فیصلہ کیا کہ نسبتاً نئے چہروں کو لیا جائے۔ جاوید صدیقی نے مزید کہا کہ ”نواد خان اور علی ظفر کو تو میں پاکستانی ایکٹری نہیں مانتا ان کی شناخت بولی ووڈ ہے۔ (لیکن نواد خان کے کریڈٹ پر تو بڑے ٹی وی ڈرامے ہیں؟) مگر فہد مصطفیٰ، مہوش حیات اور ماہرہ خان وغیرہ کا ابھی سے یہ حال ہے تو آگے چل کر کیا کریں گی۔ (وغیرہ کے بھی نام بتا دیتے تو..... اچھا تھا) یہ لوگ بھی ان رویوں کے ساتھ لے جتے نہیں بن سکتے۔ ہم پاکستانی باہر رہ کر پاکستان کے مثبت امیج کے لیے اتنا سوچتے ہیں لیکن ان ایکٹرز کو ذرا احساس نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ (پیسہ کما رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟)

اعزاز

پاکستان کے شہر پشاور سے تعلق رکھنے والی مریم نسیم کچھ انوکھا کرنے کے شوق میں ویٹ لفٹر بن گئیں۔ مریم اس بارے میں کہتی ہیں کہ وہ دس سال قبل ملبورن آئی تھیں جہاں اپنے وزن کو کم کرنے کے لیے انہوں نے جم جوائن کیا اور وہیں سے انہیں ویٹ لفٹنگ کا شوق ہوا۔ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرتے ہوئے مریم نسیم کا کہنا تھا کہ ”جب وہ ویٹ لفٹنگ کے پہلے مقابلے میں شرکت کرنے والی تھیں تو بہت نروس تھیں۔ لیکن میری فیملی نے مجھے بہت سپورٹ کیا کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر جوبابا میں نے بھی ان کا نام نیک نامی کے ساتھ فخریہ انداز میں روشن کیا۔“ مریم نے مزید بتایا کہ ان کے

دادا نے انہیں ایک ویڈیو میں ویٹ لفٹنگ کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی والدہ کو کہا کہ اگر یہ لڑکی پیسے کے لیے یہ سب کر رہی ہے تو اس سے کہو یہ نہ کرے، اسے چھٹی رقم چاہیے وہ ہم اسے دینے کو تیار ہیں۔ دادا کی یہ سوچ شفقت آمیز تھی لیکن یہ اس سوچ کی عکاسی تھی جس سے ہماری سوسائٹی آج بھی دوچار ہے۔“

شکایت

شوہز میں ریشم کا آنا جانالگا رہتا ہے۔ کبھی وہ فلمی پردے پر تو کبھی ٹی وی اسکرین پر نظر آتی رہتی ہیں۔ چھپلے دنوں ایک فیشن وڈیو میں ریشم کو لیا گیا اور اسے سوشل میڈیا پر بھی ڈال دیا گیا۔ اس بارے میں ریشم کا کہنا ہے کہ ”سوشل میڈیا ان کے لیے نیا ہے۔ کیوں کہ جب وہ شوہز میں آئی تھیں تو اس کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ صرف اخباروں کے ذریعے ہماری محنت یا کاوش سامنے آتی تھی۔ اب تو مشہور ہونا بہت آسان ہو گیا۔ اس زمانے میں اتنے سارے چینلز اور سوشل میڈیا بھی نہیں تھا۔ لوگ راتوں رات اشار نہیں بنتے تھے بلکہ ہمیں بڑی محنت کے بعد اپنی شناخت ملی۔ اب تو

(جسارت)

(خالد امچ لودھی۔ دل کی باتیں)

☆ میری عمران خان سے درخواست ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار دیا تو آپ نذر محمد گوندل کو چیف جسٹس آف پاکستان بنا دیجئے گا۔ ظفر گوندل کو چیئرمین ٹیب لگا دیجئے گا۔ فردوس عاشق عوان کو وزیر داخلہ، نور عالم کو الیکشن کمیشن کا چیئرمین، امیر اعوان کو وزیر قانون بنا دیجئے گا۔ مصطفیٰ کھر کو پنجاب کا گورنر لگا دیجئے گا۔

مصمص بخاری کو وزیر خزانہ، بیرسر سلطان کو وزیر اعظم
آزاد کشمیر بنا دیا جسے گا اور فواد چوہدری کو اٹارنی جنرل بنا
دیئے گا۔

قائد اعظم کا خواب ایک ہی رات میں شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔ یہ پشاور اپنا پاکستان نیا کورپاکستان ہو جائے گا۔

(جاوید چوہدری سے زیر و پوائنٹ)

خاموشی

عائشہ عمر کے بہترین اور قریبی دوست اظفر رحمان نے شادی کر لی۔ (نہ نہ نہ نہ عائشہ عمر سے نہیں، کسی اور سے) اور اتنی خاموشی سے کی کہ کسی کو خبر ہی نہ ہونے دی۔ حد تو یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر ہر بات کرنے والے اظفر اس بات کو گول کر گئے۔ شادی میں اظفر رحمان کے قریبی ماٹل دوستوں (عائشہ عمر نہیں بھیجی۔ جی عائشہ اس شادی اور ولیمے میں شریک نہیں ہوئیں، کیوں؟) نے اس میں شرکت کی جن میں موش حیات سرفہرست رہیں۔ ویسے اظفر اپنی شادی کو اتنا خفیہ کیوں رکھ رہے تھے یہ ہم بھی سوچ رہے ہیں اور آپ۔؟

کئی محاذ

میرا سبھی اداکاری کے میدان میں تو نام بنائی رہی ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی وہ کئی محاذوں پر برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ وہ مختلف انٹرنیشنل اخبارات میں مضامین لکھتی ہیں۔ یاد رہے میرا سبھی ماضی میں ایک امریکی اخبار میں بطور اسٹنٹ بک ایڈیٹر بھی رہ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ سنا ہے کہ میرا سبھی اداکاری کے ساتھ ساتھ ایک کتاب پر بھی کام کر رہی ہیں۔ (بھئی صحافی ماں باپ کی بیٹی جو ہوئیں) لیکن ان کی والدہ آج کل ان سے شادی کے موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میرا جلد از جلد شادی کر لے۔ سو یکھیں میرا بھئی آپ کی میرا نہیں میرا سبھی کیا کہتی ہیں جبکہ میرا کی دادی بھی اکثر ان سے یہ سوال کرتی ہیں اور میرا سبھی اس سوال پر ہنس دیتی ہیں۔ (فیصلہ کب کرتی ہیں میرا سبھی یہ تو وقت یہ لگائے۔)

موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

عربین راس

ضروری اشیا:-

چاول ایک پاؤ

پسندے ایک پاؤ

شملہ مرچ ایک عدد (کیوب میں کاٹ لیں)

ہری پیاز ایک عدد (چوپ کر لیں)

سویا ساس دو کھانے کے چمچے

سکشمش گارنشنگ کے لیے

سفید مرچ پاؤ ڈر ایک چوتھائی چائے کا چمچ

ہرے زیتون سجاوٹ کے لیے

بند گو بھی (چوپ کر لیں) آدھا کپ

کارن فلور ایک کھانے کا چمچ

نمک حسب ذائقہ

تیل تین کھانے کے چمچے

لہسن کے جوے تین عدد (چوپ کر لیں)

لیموں کارس ایک چائے کا چمچ

ترکیب:-

چاول ابال کر الگ رکھ دیں۔ گوشت پر کارن

فلور اور نمک لگا کر فرانی کر کے پلیٹ میں نکال لیں۔

پین میں تیل گرم کر کے لہسن - فرانی کر لیں۔ اس

میں بند گو بھی، ہری پیاز، شملہ مرچ شامل کر کے ہلکا

سائل لیں اس کے بعد چاول، سویا ساس، سفید مرچ

پاؤ ڈر، نمک اور لیموں کارس ڈال کر 2-3 منٹ پکا کر

ڈش میں نکال لیں اور زیتون اور سکشمش سے گارنش

کر کے پیش کریں۔

چکن چاٹ

ضروری اشیا:-

مرغی کا گوشت ایک پاؤ

اجزاء:-

چکن

پیاز

تیل

آدھا کلو

ایک عدد

حسب پسند

آلو (اچھے ہوئے) تین سے چار عدد

پیاز ایک عدد

شملہ مرچ ایک عدد

ہری مرچیں تین سے چار عدد

لہسن کٹا ہوا آدھا چائے کا چمچ

نمک حسب ذائقہ

چاٹ مسالا ایک کھانے کا چمچ

براؤن شوگر ایک کھانے کا چمچ

کٹی لال مرچ ایک چائے کا چمچ

پاپری حسب ضرورت

ہر ادھنیا حسب ضرورت

تیل حسب ضرورت

ترکیب:-

مرغی کی چھوٹی بوٹیاں بنوائیں۔ آلو چوکور کاٹ

لیں۔ پیاز، شملہ مرچ باریک کاٹ لیں۔

گوشت میں لہسن پیسٹ، نمک اور کئی ہوئی

لال مرچ ڈال کر ابال لیں۔

جب گوشت گل جائے تو نکال لیں اور تھوڑے

سے گرم تیل میں ڈال کر فرانی کر کے ڈش میں آلو

پیاز، شملہ مرچ، ہری مرچیں، نمٹا براؤن شوگر، کئی

لال مرچ، چاٹ مسالا اور پاپری چمڑک کر کس

کریں اور ہرے دھنیے سے گارنش کر کے سرو کریں،

مزے دار چاٹ تیار ہے۔

حیدر آبادی دم چکن

دہی	آدھا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ
ادرک لہسن	دو چمچے	ایک چائے کا چمچ
سرخ مرچ	ایک چمچ	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	ایک چوتھائی چمچ	حسب ذائقہ
کالی مرچ	آدھا چمچ	ایک کھانے کا چمچ
پسาดھنیا	آدھا چمچ	دو عدد
ٹماٹر	ایک عدد	چار، چھ عدد
کاجو پے ہوئے	دو چمچے	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ	چار کھانے کے چمچے
زردے کا رنگ	ایک چمچی	زردے کا رنگ
ترکیب:-		کیوڑا

آدھے دہی کو پھینٹ کر اس میں ٹماٹر کے سلائس، پودینہ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، لیموں کے سلائس کس کر کے الگ رکھ دیں۔ سرخ مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، سیاہ مرچ پاؤڈر، سفید زیرہ پاؤڈر اور ثابت گرم مسالا ایک برتن میں کس کر لیں۔ اس میں آدھا کپ ٹماٹر، تیز پات اور پیاز ڈال کر ہلکی گلابی ہونے تک فرانی کر لیں۔ بونگ کا گوشت شامل کر کے بھون لیں۔ اس میں لہسن، ادرک پیسٹ اور تمام کس مسالا ڈال دیں، نمک اور بقیہ دہی اور کھی شامل کر کے دھیمی آنچ پر گوشت کو اچھی طرح گلا لیں جب کھی اوپر آ جائے تو کبھی بڑی پتلی میں دو کھانے کے چمچے کھی شامل کر کے چاول کی تہہ لگائیں۔ اس پر بونگ مسالے کی تہہ لگائیں اور چاول ڈال کر اس پر ٹماٹر، پودینے اور دہی کا کچھڑا ڈال دیں۔ آخر میں چاول ڈال کر کیوڑا اور زعفرانی رنگ چھڑک کر دم پر لگادیں۔ مزیدار بریانی تیار ہے گرم گرم پیش کریں۔

میدے کی میٹھی نکیلیہ

اجزاء:-
میدہ
ڈھائی کپ

مزے دار بریانی
ضروری اشیا:-
بونگ کا گوشت (ہڈی والا)
چاول باستی
(الائی، لونگ، دار چینی، نمک اور تیز پات
ڈال کر ابال لیں)

دہی
ٹماٹر (کول سلائس کاٹ لیں)
پودینہ، ہرا دھنیا
ہری مرچیں (سلائس کر لیں)
لیموں (سلائس کاٹ لیں)
سرخ مرچ پاؤڈر
ہلدی پاؤڈر
دو کپ
چار عدد
آدھا، آدھا کٹھی
چھ، آٹھ عدد
دو عدد
دو کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ

1 1/2 چائے کا چمچ
حسب ضرورت
1 عدد
سجاوٹ کے لیے
سجاوٹ کے لیے
سجاوٹ کے لیے
دو چمچ

ثابت سیاہ مرچیں
تیل
پیاز
ہری مرچیں
ادرک
لیموں
آٹا

ایک چنگلی
دو کھانے کے چمچ
ایک کھانے کا چمچ
ایک چوتھائی چمچ
ڈیڑھ کپ
دو عدد
تانے کے لیے

نمک
گھی یا تیل
خشک دودھ
کھانے کا سوڈا
ہسی چینی
انڈے
تیل یا گھی

ترکیب :

پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں ہا: ڈال کر سنہرا کریں۔ اس کے بعد اس میں گوشت، ہٹسن، ادرک پیسٹ اور نمک ڈال کر دس منٹ تک درمیانی آگ پر فرائی کریں۔

تو بے رسوٹھ پاؤڈر، زیرہ، لونگ، بڑی الائچی، دار چینی، جاتقل، ثابت سیاہ مرچیں ڈال کر بھون کر پیس لیں۔ فرائی کیے ہوئے گوشت میں لال مرچ پاؤڈر اور پسپا ہوا مسالا ڈال کر تھوڑی دیر تک بھونیں۔

اس کے بعد گوشت کھنے کے حساب سے پانی ڈال کر گوشت کھنے تک پکائیں۔ گوشت گل جائے تو تھوڑے سے پانی میں آٹا گھول کر شامل کریں اور مسلسل چمچ چلاتے ہوئے درمیانی آگ پر پکائیں تاکہ گٹھلیاں نہ بن جائیں۔ اس کے بعد آج دھیمی کر کے ڈھکن ڈھک کر روغن اوپر آنے تک پکائیں، مزیدار

چکن نہاری تیار ہے۔ سرونگ ڈش میں نکال کر ہری مرچوں و ادرک سے گارنش کر کے لیموں کے ساتھ سرو کریں۔

میدے میں نمک ملا کر چھان لیں۔ اس میں ہسی چینی، خشک دودھ اور گھی/تیل ڈال کر کس کر لیں۔ کھانے کا سوڈا اور انڈے بھی شامل کر دیں اور دودھ یا پانی سے گوندھ لیں اور آدھے گھنٹے کے لیے ڈھانپ کر رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس کی موٹی روٹی تیل کر کسی کڑیا برتن سے گول یا حسب پسند پیس کاٹ لیں اور ایک کڑائی یا پین میں گھی گرم کر کے اسے تل لیں۔ سنہری ہونے پر ہلٹ دیں۔

دونوں طرف سے سنہری ہو جائے تو نکال کر کسی کاغذ پر رکھ دیں تاکہ گھی اس جذب ہو جائے۔ مزے دار میدے کی میٹھی لکیر تیار ہے۔ اسے آپ کچھ دن رکھ کر بھی کھا سکتی ہیں۔

چکن نہاری

ضروری اشیاء :

1 کلو

1 کھانے کا چمچ

حسب ذائقہ

1 چائے کا چمچ

ایک چوتھائی چائے کا چمچ

1 1/2 چائے کا چمچ

6 عدد

2 عدد

1 کلو

1 1/2 چائے کا چمچ

مرچی کا گوشت

ادرک، ہٹسن پیسٹ

نمک

لال مرچ پاؤڈر

سوٹھ پاؤڈر

زیرہ

لونگ

بڑی الائچی

دار چینی

جاتقل





نیم گرم پانی، لیموں اور شہد

ہو جاتا ہے۔

4۔ جلد کو صاف شفاف اور چمک دار بناتا ہے،

کیونکہ پیٹ کی خرابی سب سے زیادہ ہماری جلد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہاضمہ کا نظام درست ہو تو جلد صاف شفاف نظر آتی ہے۔

5۔ وزن کم کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

لیموں ایک قسم کے قابض پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کی

وجہ سے پیٹ بھر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ لہذا کسی

پسندیدہ چیز کے کھانے کی خواہش کم ہو جاتی ہے۔

نیم گرم پانی، شہد اور لیموں آپ کے وزن کو

تیزی سے کم کرتے ہیں۔

دہی جلد اور بالوں کے لیے انتہائی مفید

آر آپ کی جلد مر جھاتی ہوتی ہے۔ چہرے پر

چمک نہیں تو چہرے پر دہی لگائیں۔

ایک نشوونما پر یا ردی لے کر اس کو پانی سے تر

کر لیں۔ اسے چہرے پر پھیریں۔ چہرہ تم ہو جائے

گا۔ اب دو چمچے گاڑھے دہی کے لیں اور چہرے پر

آہستگی سے مساج کریں اور دس، پندرہ منٹ کے

لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد سادہ پانی سے چہرہ دھو کر

صاف کر لیں۔

جلد صاف شفاف اور چمک دار نظر آئے گی۔

بال روکھے، خشک اور بے جان نظر آئیں تو

ایک چمچ سرسوں کے تیل میں دو چمچے دہی اور ایک انڈا

ملا کر پھینٹ لیں۔ اس محلول کو بالوں میں لگائیں۔

تیس منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر بالوں کو اچھے شیمپو

سے دھو لیں۔ بال چمک دار ہو جائیں گے۔

☆

صبح نہار منہ نیم گرم پانی کے ساتھ شہد اور لیموں کا رس پینا صحت کے لیے انتہائی فائدہ مند اور کثیر مستحبا جاتا ہے۔ شہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذاؤں میں سے ہے اور اس کے بے شمار فائدے ہیں۔

بنانے کا طریقہ :-

ایک بڑے گلاس میں نیم گرم پانی لیں۔ اس میں آدھے لیموں کا رس نیچوڑیں اور ایک چائے کا چمچ شہد شامل کر دیں۔ چمچے سے اچھی طرح ملائیں اور پی لیں۔

یہ شربت پینے کے کم از کم ایک گھنٹے بعد چائے

یا کافی پیئیں۔

لیموں، شہد اور نیم گرم پانی کو باہم ملا کر پینے کے

بہت سے فوائد سامنے آئے ہیں۔ چند ایک یہ ہیں۔

1۔ صبح نہار منہ لیموں، شہد کو نیم گرم پانی میں

ملا کر پینے سے نظام ہضم تیز ہو جاتا ہے۔ لیموں میں

جواہر پائے جاتے ہیں وہ جگر کو متحرک کر دیتے ہیں۔

لیموں میں موجود سٹرک ایسڈ ہاضمہ کے نظام میں

شامل ہو کر جسم سے غیر ضروری مضر مادوں کو خارج

کرنے میں مدد دیتا ہے۔

2۔ قبض دور کرتا ہے۔ قبض تمام بیماریوں کی جڑ

ہے۔ قبض کی شکایت کو فوری حل کرنے کے لیے یہ

محلول نہایت بہترین ہے۔

3۔ ہمارے پیٹ میں بے شمار زہریلے مادے

موجود ہیں جو پیٹ کے حصے پر چپک کر بیماریوں کا

باعث بنتے ہیں، نیم گرم پانی میں شہد اور لیموں ڈال

کر پینے سے ان زہریلے مادوں سے چھٹکارا حاصل